امجد اسلام امجد

شہر در شہر

شہر در شہر

سفرنامے

امجد اسلام امجد

قوسین

شہر
در
شہر
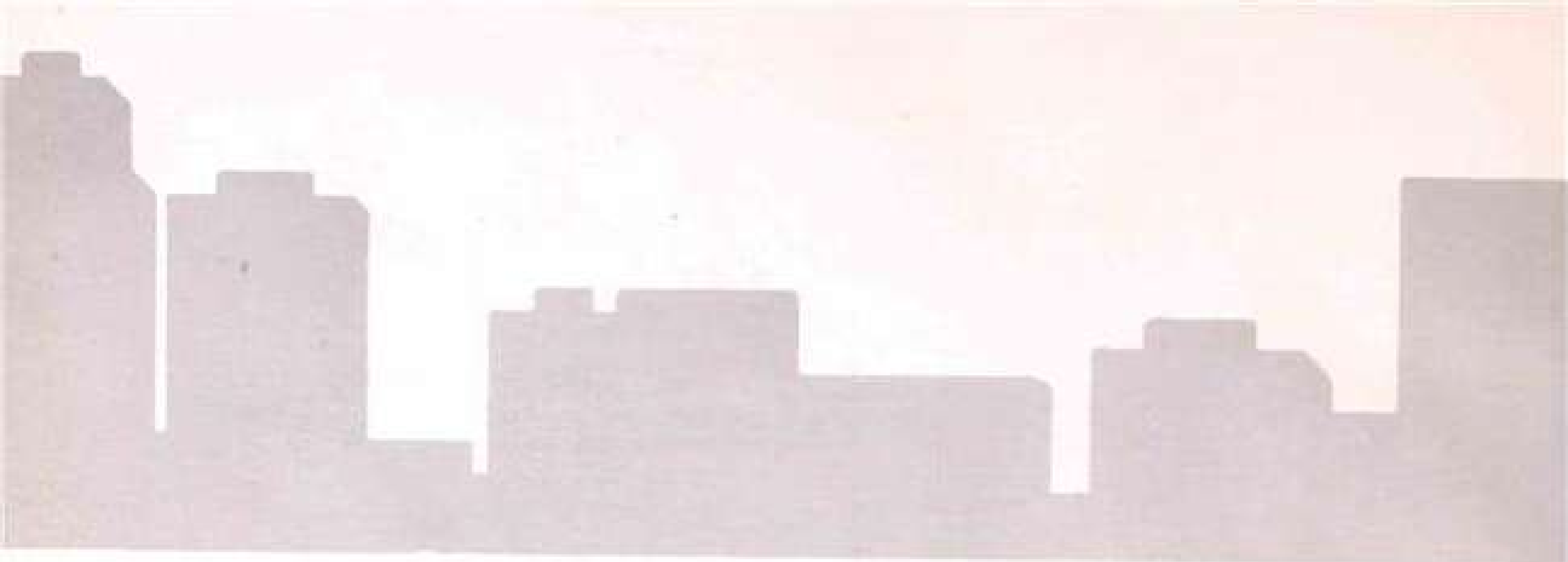
باراوّل : ۱۹۸۸

ناشر : سلیم و ریاض
قوسین ۔ ۱۵، سرکلر روڈ ، لاہور

طابع : رشید احمد چودھری
مکتبہ جدید پریس لاہور

سرورق : اقبال مہدی

قیمت : ۱۲۰ روپے

جمیل الدین عالی

اور

پروین شاکر

کے نام

ترتیب

۱

شہر در شہر

—— ۲ ——

ہندوستان میں سات دن

ایک اور سفر

لندن میں مشتاق احمد یُوسفی صاحب نے ملاقات کے دوران بڑے خلوص اور دلسوزی کے ساتھ مجھے سفر نامہ لکھنے سے منع کیا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اُن جیسے باکمال آدمی کا مشورہ نہ ماننا کوئی آسان فیصلہ نہیں تھا۔ میں نے اُن کے اِس مشورے کے محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ سفر ناموں سے اُن کی بیزاری کی اصل وجہ ان کی حالیہ بہتانات اور حقیقت نگاری کے پردے میں کی جانے والی وہ فکشن نگاری ہے جس نے سفر نامے کو ناول یا چھوٹے چھوٹے رومانی افسانوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے آپ میں جھانکنے کی کوشش کی اور جاننا چاہا کہ میں یہ سفر نامہ کیوں لکھنا چاہتا ہوں اور یہ کہ کہیں اس حکایت کو لذیذ اور دراز تر بنانے کے لیے میرا ارادہ بھی افسانہ طرازی کا تو نہیں؟

میں نے محسوس کیا کہ میرے اس مجوزہ سفر نامے کے سکوپ میں یہ باتیں شامل نہیں ہیں اور اس رُوداد سفر کو لکھنے کی بنیادی وجہ اصل میں اپنے مشاہدات، تجربات اور احساسات میں آپ لوگوں کو شریک کرنا ہے کہ یہی ''اِبلاغ'' کی خواہش ہر لکھنے والے کی تخلیقی جبلّت کا فطری تقاضا ہوتی ہے۔ بہرحال میں یوسفی صاحب کا ممنون ہوں کہ اُن کے انتباہ کی وجہ سے روانیِ تحریر میں جہاں جہاں بھی افسانہ طرازی کے مقامات آئے یا گنجائش پیدا ہوئی اُس سے میں صرفِ نظر کرتا چلا گیا۔ سو پیارے قارئین، اگر آپ کو اس کتاب میں ''بارہ مصالحے کی چاٹ'' نہ ملے تو میرے علاوہ یُوسفی صاحب کو بھی اس کا ذمّہ دار گردانیے گا۔

یہ کتاب دو علیحدہ علیحدہ سفروں کی کہانی ہے جن کے درمیان تقریباً تین برس کا زمانی فاصلہ ہے

اور جب یہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گی تو تین مزید برس گزر چکے ہوں گے۔ اس تاخیر کی کہانی میں قارئین کی دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں چنانچہ اس کی تفصیلات بیان کرنا صرف صفحے کالے کرنا ہوگا جس سے اس لیے بھی احتراز بہتر ہے کہ پہلے ہی ہر طرف سے بے معنی اور بے مقصد الفاظ کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔

اس کتاب کا نام "شہر در شہر" اس لیے رکھا گیا کہ یہ دونوں سفر "مشاعروں" کے حوالے سے کیے گئے تھے اور یوں مجھے ساٹھ باسٹھ دنوں میں تقریباً چودہ شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ لندن کے علاوہ کسی شہر میں پانچ دن سے زیادہ قیام نہیں رہا سو یوں سمجھیے کہ میں نے ان شہروں کو صرف چھو کر دیکھا ہے، ان سے مصافحہ یا معانقہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یادوں کے اس ارژنگ کو لفظوں میں قید کرنے کا ایک فائدہ یقیناً ہے کہ اس طرح پھول نہ سہی اُن کی مہک ضرور باقی رہ جاتی ہے۔ یہ کتاب میرے لیے اس مہک کا ایک ذاتی استعارہ ہے لیکن اُمید ہے میرے قارئین بھی اس مہک کو اپنے دل و جان سے قریب پائیں گے کہ انسانوں کے غم اور خوشیاں لاکھ انفرادی ہوں ان کے احساس اور تاثیر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔

اس کتاب کے "شکاگو" والے باب میں میری ایک بہت پیاری بھابی سعیدہ عرفان کا تذکرہ آپ کو ملے گا۔ گزشتہ برس تقدیر نے اُس کے سانسوں کی رسد یکدم منقطع کر دی اور میرے ذہن پر پھر اُس بہت بڑے "کیوں" کو نقش کر دیا جس کے اسرار اور دہشت سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میری وہ عزیز بہن یا بھابی، جو کچھ بھی وہ تھی، اب خاک کا رزق بن چکی ہے لیکن اُس کی محبت اور خلوص اُن تمام لوگوں کی زندگیوں میں زندہ اور جاوداں ہے جنہیں اُسے دیکھنے اور اُس سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس دُنیا سے اس عمر میں "کیوں" اُٹھالی گئی، اس کا جواب تو شاید مجھے کبھی نہ مل سکے لیکن اُس بے نیاز پروردگارِ عالم سے میری التجا ہے کہ وہ اس مرحومہ کی رُوح کو اپنے پیارے اور پسندیدہ لوگوں کی صف میں رکھے کہ اس دُعا کے سوا ہم پیچھے رہ جانے والے اُسے اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔

اس کتاب میں میرے بہت سے ہم سفروں، میزبانوں، قدردانوں اور ملاقات کرنے والوں کا تذکرہ ہے، عین ممکن ہے وقت کی کمی کی وجہ سے کچھ لوگوں کے بارے میں میرے تاثرات وہ نہ ہوں جو اصل میں ہونے چاہئیں تھے اور کسی کے بارے میں میرے قلم سے کوئی ایسا جملہ نکل

گیا ہو جو اس کی شخصیت کا صحیح ترجمان نہ ہو لیکن میں سب احباب کو یقین دلاتا ہوں کہ اس میں قصور میری نیت کا نہیں۔ میرا مقصد کسی کا مذاق اُڑانا یا دل دکھانا قطعاً نہیں ہے اگر سہواً ایسا ہو گیا ہو تو میں متعلقہ خواتین و حضرات سے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

امجد اسلام امجد

۲۴۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء
۲۲۔ ممتاز سٹریٹ، گڑھی شاہو،
لاہور

۱

شہر در شہر

سامانِ سفر

پیرس

مونٹریال — ۱

میامی

واشنگٹن

ٹورنٹو — ۱

کیلگری

ونی پیگ

آٹوا

مونٹریال — ۲

ٹورنٹو — ۲

ایڈمنٹن

لاس اینجلس

شکاگو

ٹورنٹو — ۳

لندن

سامانِ سفر

برسوں پہلے جب کلیم الدین احمد نے اُردو غزل کو "نیم وحشی صنفِ سُخن" کہا تھا تو ادب اُردو کے حلقوں میں کم اور ایم۔اے۔ اُردو کی کلاسوں میں اس کا بہت چرچا ہوا تھا۔ اب سے اٹھارہ برس پہلے جب میں اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے۔ اُردو کی کلاس میں داخل ہوا تھا تو یہ جُملہ کم وبیش ہر نقّاد کے یہاں کسی نہ کسی رنگ میں سُنائی دے رہا تھا۔ موجودہ طالب علموں سے گزشتہ دنوں بات چیت کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ اس کی بازگشت ابھی تک فضا میں تیر رہی ہے۔ اس حوالے سے "مشاعرے" کے ادارے پر غور کیا جائے تو یہ کچھ کچھ "چڑیا گھر" کے قریب نکلے گا کہ اس میں قدم قدم پر اس وحشت کے شکار اپنی اپنی بولیاں بولتے نظر آتے ہیں۔ میر تقی میر سے ایک شعر موسوم ہے جس سے کچھ محققین کو اختلاف ہے۔ شعر یُوں ہے:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خُوب کیا

اب یہ شعر میر کا ہے یا نہیں، اس سے مجھے یا آپ کو غرض نہیں کہ شعر بہر حال اچھا ہے اور اچھے شعر کے سلسلے میں شعر دیکھنا چاہیے، شاعر کی رجسٹریاں نہیں چیک کرنا چاہییں۔ ہاں اس کے دُوسرے مصرعے میں ترمیم کی گنجائش ہے یعنی اگر یہ یُوں ہو:

'مشاعرہ' تو دلِ ناتواں نے خُوب کیا

تو اس بظاہر بے ضرر سے مصرعے میں تلازمات کا ایک جہاں آباد ہو جائے گا، مثلاً یہی دیکھیے کہ وطن عزیز سے بارہ ہزار میل دُور، منفی ۲۵ درجے سنٹی گریڈ درجۂ حرارت میں، ایک طویل و عریض برفستان میں دو تین سو شریف حضرات و خواتین" واہ واہ، سُبحان اللہ، مکرّر ارشاد اور پھر عطا فرمائیے گا" کا شور مچا رہے ہیں اور ہم لوگ انہیں دے غزلوں پر غزلیں سُناتے چلے جا رہے ہیں۔

اس عالم میں جمیل الدین عالی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا :
"بھئی امجد صاحب، یہ آپ کے کلیم الدین احمد قسم کے صاحبان کچھ بھی کہہ لیں، یہ ساری غزل ہے
بڑی سخت جان چیز ... نہ یہ خود مرے گی نہ اُردو کو مرنے دے گی۔"
اس پر مجھے یاد آیا کہ تین برس قبل ایوانِ غالب، دہلی میں ہم چند پاکستانی شعرائے کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا انتظام کیا گیا تھا جو بعد میں مشاعرے میں تبدیل ہو گیا۔ وہاں کلیم الدین احمد بھی موجود تھے (انہیں غالباً انہی دنوں پدم شری یا کوئی اور اسی نوع کا بڑا اعزاز ملا تھا) اور خُوب بڑھ چڑھ کر داد دے رہے تھے۔ اب یہ اعجاز غزل کا تھا یا مشاعرے کا، اس کا فیصلہ مُشکل ہے۔

تو ہُوا یوں کہ یہ مشاعرے ہمیں کھینچ کر شمالی امریکہ کے پانچ ہفتے کے ایک مشاعراتی دورے پر لے گئے۔ اس دوران میں ہم نے کینیڈا کے چھ اور امریکہ کے تین شہروں میں مشاعرے پڑھے اور ہر جگہ سامعین نے ہمیں لیموں کی طرح نچوڑ کر سُنا۔ ہم کُل چار لوگ تھے : پاکستان سے میرے علاوہ جمیل الدین عالی اور پروین شاکر اور ہندوستان سے علی سردار جعفری۔ ہم سب کو تقریباً آدھ آدھ گھنٹہ فی کس پڑھنا پڑتا تھا اور چونکہ مشاعروں میں پڑھنے والی چیزیں ہر شاعر کے پاس چند ہی ہوتی ہیں اس لیے پروگرام کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ہم چاروں کو ایک دُوسرے کا تقریباً سارا مشاعراتی کلام زبانی یاد ہو گیا تھا۔

لیکن یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ تھا کیا، اور کیسے شروع ہُوا۔ گزشتہ تین چار برس سے شعرا کی کچھ ٹولیاں بیرونِ پاکستان مشاعروں میں خاصی کثرت سے آجا رہی ہیں۔ خُود میرے اپنے پاسپورٹ پر لگی ہوئی دونوں غیر ملکی مہروں کا تعلق مشاعروں سے ہے : انبالہ کے راجندر ملہوترہ فیم "شامِ بہار" اور پھر اس کے بعد متحدہ عرب امارات کے مشاعرے۔ یہ دونوں سفر چونکہ لگ بھگ ایک ایک ہفتے کے دورانیے کے تھے اس لیے ان میں انگریزی والے suffer کی کیفیت پیدا نہ ہو سکی۔ گھر والی اور بال بچوں نے بھی یہ چار دن کی جُدائی تو کوئی بات نہیں، سمجھ کر اس صُورتِ حال سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر اب جو امریکہ اور کینیڈا سے مشاعروں کی دعوت آئی تو ساتھ مسائل کا ایک انبار لائی۔ فاصلوں کی طوالت، محکمے سے چھٹی، گھر سے

اتنی لمبی دُوری، مجوزہ ٹی وی سیریل "وقت" کے سلسلے میں التوا کا بندوبست، سٹیج ڈرامے "کس کو کہہ رہے ہو" کے ضمن میں آرٹ کونسل سے ڈیٹ لینے اور متعلقہ آرٹسٹوں سے بات چیت کا مسئلہ، "امروز" میں ہفتہ وار کالم "چشمِ تماشا" کی باقاعدگی کو قائم رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گزشتہ برسوں میں جو گروپ امریکہ اور کینیڈا کی طرف گئے تھے وہ کوئی اچھی خبریں لے کر نہیں آئے بلکہ کچھ احباب تو باقاعدہ روتے ہوئے آئے تھے کہ سفر کی کثرت اور مشاعروں کی افراط نے ان کا بھرکس نکال دیا ہے۔ ایک دو حضرات تو ایسے بھی ملے جو سنجیدگی سے شاعری ترک کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

کراچی کے دوستوں سے تو اس سلسلے میں اتنا رابطہ نہیں رہا مگر لاہور اور راولپنڈی سے جو بھی گیا حیران پریشان سا واپس آیا۔ برادرم منیر نیازی چونکہ پہلے سے حیران واقع ہوئے ہیں اس لیے ان کی حالت سراسیمگی کی حدوں کو چھُو رہی تھی۔ البتہ ایک کشور ناہید تھیں جو جیسی خوش خوش گئی تھیں اس سے زیادہ خوش واپس آئیں۔ سو یہ تو کشور کا کمال ہے کہ وہ ہر مقام پر ہنس سکتی ہے۔

آغازِ سفر سے کوئی دو تین ماہ قبل برادرم عزیز و بزرگ جمیل الدین عالی سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ ٹورنٹو سے اشفاق حسین کا خط آیا ہے۔ آپ کا پتا پُوچھا ہے اور ساتھ ہی یہ دریافت کیا ہے کہ کیا آپ نومبر میں ایک مہینے کے لیے کینیڈا آ سکتے ہیں۔ میں نے اسے ایک رسمی قسم کا استفسار سمجھا کیونکہ ایسے پروگراموں کی اطلاع سال میں کئی مرتبہ ملتی اور بجھتی رہتی ہے۔ مَیں نے سرسری سے انداز میں اپنا این او سی دیا مگر ساتھ ہی اُن خدشات کا اظہار بھی کیا جو گزشتہ رہروانِ شوقِ مشاعرہ کو پیش بلکہ در پیش آ چکے تھے۔ عالی بولے: "ارے بھائی، مَیں تو خود ان تجربات سے گزرا ہوں بلکہ دو بار کا 'کینیڈا گزیدہ' ہوں مگر اب حالات کچھ اور ہیں۔ ان لوگوں نے بھی اپنے تجربات سے سیکھا ہے اور ہم نے بھی۔ چنانچہ اب کے سفر میں وہ 'خر کاری' نہیں ہو گی اور مشاعرے بھی پہلے کی نسبت بہت کم رکھے جا رہے ہیں۔ کُل نو مشاعرے ہیں۔ ہر ہفتے اور اتوار کو مشاعرے ہوں گے اور باقی کے پانچ دن گھومنے پھرنے اور آرام کرنے کے لیے چھوڑے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "جناب، آپ تو مجھ سے کم و بیش میری عمر جتنے سینئر 'مشاعرہ باز' ہیں، آپ کو تو پتا ہے منتظمینِ مشاعرہ کے کھانے اور دکھانے کے دانت علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ آپ نے

ان کے بارے میں غالب کا وہ شعر نہیں سُنا :

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا"

عالی نے شعر کے اس نئے محلِ استعمال کی داد دی اور بات آئی گئی ہو گئی ۔ میں نے اس واقعے کا ذکر دوستوں اور گھر والوں سے بھی نہیں کیا کیونکہ اس وقت نہ میری نیت تھی اور نہ اس پروگرام کے صورت پذیر ہونے کا یقین مگر جب ایک رات گیارہ بجے کے قریب کراچی سے عالی صاحب کا فون آیا کہ اشفاق کے سسر اعجاز بزمی صاحب میرا ٹکٹ لے کر آ گئے ہیں اور تیرہ نومبر کو روانگی ہے تو چند لمحے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے ۔ مُستقبل قریب کی بے شمار مصروفیات سوالیہ نشان بن کر میرے سامنے قطاریں باندھنے لگیں ۔ عالی پروگرام کی تفصیلات بتانے لگے مگر میرا ذہن انھی چکروں میں اُلجھا ہوا تھا کہ عالی صاحب کو کس طرح بتاؤں کہ میرا اتنے لمبے عرصے کے لیے گھر سے نکلنا ممکن نہیں ۔ وہ منتظمین تک میری معذرت پہنچا دیں مگر جب عالی نے یہ کہا کہ میں نے آپ کی رضامندی کی اطلاع انہیں پہنچا دی تھی اور آپ کو لانا انہوں نے میرے ذمے لگا دیا ہے تو میرے لیے بات کرنا بہت مُشکل ہو گیا ۔ اسلام آباد کی ملاقات میں رواداری میں کی گئی بات کمٹ منٹ بن جائے گی ، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا ۔ میں نے سوچا بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں : پہلے تول ، پھر بول ۔

فون رکھنے کے بعد میں نے فردوس کو آواز دی جو دُوسرے کمرے میں بچّوں کے یونیفارم برلیس کر رہی تھی ۔ پہلے تو وہ میری بات کو مذاق سمجھی مگر جب اسے یقین ہو گیا کہ میں سنجیدہ ہوں اور عالی صاحب میرے حوالے سے وعدہ بھی کر چکے ہیں تو وہ بھی پریشان ہو گئی اور کچھ ایسے مسئلے پیش کیے جو مسائل کی فہرست میں پہلے سے شامل نہیں تھے ۔ میں نے حوصلہ ہار دیا کہ ان حالات میں سوائے معذرت کے میرے پاس کوئی چارہ نہیں لیکن اگلے روز جس جس دوست سے بات کی اس نے بہت جھاڑ پلائی کہ عقل کرو ، ایسا موقع روز روز نہیں ملتا ۔ اتنی لمبی مُفت سیر مل رہی ہے ، دُنیا دیکھو گے ، تمہارے علم ، تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہو گا ۔ تمہاری ذات اور تحریریں نئے امکانات سے آگاہ ہوں گی اور پتا نہیں کیا کیا ہو گا ۔

دُنیا دیکھنے کا چور تو ہر شخص کی طرح میرے دل میں بھی بیٹھا تھا چنانچہ اب میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اگر اس دعوت کو قبول کر لیا جائے تو مسائل کیسے حل ہوں گے۔ اس ضمن میں مختلف بزرگوں اور مشاہیر کے اقوال نے بے حد مدد دی جن میں سفر کے فضائل کے ساتھ ساتھ اس بات پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ دُنیا کے کام دریا کے پانی کی طرح ہمہ دم رواں دواں رہتے ہیں اور کسی شخص کے رُکنے یا اِدھر اُدھر ہو جانے سے زندگی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا چنانچہ اگلے دن کا سُورج غروب ہونے سے پہلے میں نے متعلقہ مسائل اور ان کے ممکنہ حلوں کی ضرب، جمع، تقسیم کی اور رات کو عالی صاحب سے فون پر پتا کیا کہ سفر کے لیے مجھے کیا کیا تیاریاں کرنی چاہییں۔

عالی نے پوچھا: "آپ نے زیادہ سے زیادہ کتنی سردی دیکھی ہے۔" مَیں نے کہا: "اپنے لاہور میں دسمبر جنوری خاصے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ ہمارے غلط العام میں قلفی اور دلی کے روزمرے میں قفلی جم جاتی ہے۔" عالی کی مسکراہٹ ٹیلیفون پر نظر آئی۔ بولے: "برف باری کے سلسلے میں آپ کا کتنا تجربہ ہے؟" مَیں نے بتایا کہ دو تین بار مری کی برف باری دیکھی ہے۔ عالی نے پوچھا: "کیسی لگی؟"

"دیکھنے میں اچھی، بھگتنے میں تکلیف دہ۔ ہڈیوں میں سردی گھسنے لگتی ہے۔"

عالی نے کہا: "کینیڈا میں اِن دنوں نارمل درجۂ حرارت چھ سے تیس درجے منفی سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔"

"اتنا تو ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے۔ میں نے کئی بار ٹی وی پر دیکھا اور سُنا ہے۔"

"بھائی میرے آپ نے فارن ہائٹ میں سُنا ہو گا!"

مجھے اپنی غلطی کا احساس تو ہو گیا مگر میں نے ڈھیٹ بن کر ہنستے ہوئے کہا: "تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے بھائی — جتنے زیادہ سے زیادہ گرم کپڑے رکھ سکو، رکھ لینا۔ ہم اُونی بنیان کے اُوپر دو سویٹر، خالص کشمیری پشمینے کی، ان پر گرم کوٹ اور اس کے اُوپر ایک اوورکوٹ پہنتے ہیں جو خصوصی طور پر سائبریا کی برفستانی ہواؤں کے لیے بنایا گیا ہے مگر اس کے باوجود سردی مسلسل مزاج پُوچھتی رہتی ہے۔"

میں نے اپنی عمر کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا :

" وہ تو ٹھیک ہے عالی صاحب، مگر آخر لوگ وہاں رہتے بستے اور کام بھی تو کرتے ہیں۔ سردی برحق مگر یہ آپ کچھ زیادہ مبالغے سے کام نہیں لے رہے ؟"

" دیکھو بھائی ہمارا کام آپ کو سمجھانا تھا، سو سمجھائے دے رہے ہیں۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔ ویسے احتیاطاً کسی سے پوچھ لیجیے گا کہ منفی درجۂ حرارت کیا ہوتا ہے ؟"

عالی صاحب کے لہجے کی سنجیدگی اور میری حجت سے پیدا ہونے والی کبیدگی نے فون کی اس گفتگو کا درجۂ حرارت بھی خاصا گرا دیا تھا چنانچہ میں نے زبردستی ہنستے ہوئے کہا :

" تو ٹھیک ہے، میں اپنے سارے گرم کپڑے رکھ لیتا ہوں۔ اوور کوٹ نہیں ہے، یہاں سے خریدا تو بہت مہنگا پڑے گا، وہیں سے لے لوں گا، کوالٹی بھی اچھی مل جائے گی۔"

" مگر وہاں تک پہنچیں گے کیسے ؟"

اب میں سچ مچ ڈرا ___ باقی دُنیا کے جغرافیے کے بارے میں بھی اپنی معلومات خاصی متنازعہ فیہ ہیں مگر کینیڈا کے بارے میں خصوصاً اس کے موسم کے بارے میں تو میں سچ مچ بہت کم جانتا تھا۔ سو اس وقت تو میں نے عالی صاحب سے وعدے وعید کر لیے کہ نیچے پہننے والے گرم پاجامے (long John) ، اُونی جرابیں اور برف میں چلنے والے خصوصی جُوتے ساتھ لے کر آؤں گا لیکن دل میں کچھ کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی کہ اگر وہاں اتنی ہی زیادہ سردی ہے تو کس حکیم نے کہا ہے کہ وہاں ضرور جاؤ۔ بیوی سے بات کی مگر اس کا جغرافیہ مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہے چنانچہ اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کینیڈا میں اتنی زیادہ سردی کیوں، کیسے اور کب سے ہے !

کوئی دو دن بعد دوپہر میں پروین شاکر کا فون آیا۔ آواز میں کچھ عجیب طرح کی دہشت اور گھبراہٹ تھی۔ سلام دعا کے بعد فوراً بولی :

" امجد بھائی ___ یہ عالی صاحب تو وہاں کے بارے میں عجیب عجیب باتیں بتا رہے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ خواہرِ عزیزی بھی سردی اور برف کی متعلقہ تفاصیل سے آگاہ ہو چکی ہے لیکن لہجے میں سرسری پن قایم رکھتے ہوئے پوچھا :

" کیوں، کیا ہوا ؟"

کہنے لگی: "میرے تو دو بکس صرف گرم کپڑوں سے بھر گئے ہیں۔ اُونی استر والے دو جُوتے آرڈر دے کر بنوا چکی ہوں۔ جانوروں کی کھال کے بنے ہوئے دستانے، ٹوپی اور گلے میں ڈالنے والا مفلر نما فر بھی خریدا ہے مگر عالی صاحب اب بھی مطمئن نہیں۔ آخر ایسی بھی کیا قیامت ہو گی وہاں؟"

مَیں نے گول مول سا جواب دیا:

"ہاں بھئی، میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر اب عالی صاحب کہہ رہے ہیں تو...... تمہیں پتا ہے وہ ساری دُنیا بار بار گھومے ہوئے ہیں اور دو دفعہ کینیڈا بھی جا چکے ہیں...... اگرچہ ان کی ہدایت میں ضرورت سے زیادہ احتیاط محسوس ہوتی ہے مگر چونکہ...... تو لہٰذا...... تم یوں کرو کہ البتہ...... جیسا وہ کہتے ہیں ویسا ہی کرو!"

میرے اس لہٰذا، اگرچہ، گویا اور البتہ سے پروین کا پہلے سے بیٹھا ہوا حوصلہ مزید بیٹھ گیا۔ کہنے لگی: "میرے تو ڈیپارٹمنٹل امتحان کا چکر پھنسا ہوا ہے، شاید میں جا ہی نہ سکوں۔"

مَیں نے خود نروس ہونے کے باوجود اسے حوصلہ دیا اور سمجھایا: "عالی صاحب دراصل اس احتیاط میں اپنی عمر کو بھی شامل کر رہے ہیں۔ وہ مُجھ سے اٹھارہ سال اور تم سے چھبیس برس بڑے ہیں، اس کو بھی تو حساب میں جمع کرو۔"

اَب پتا نہیں یہ میری ان باتوں کا اثر تھا یا پروین کی اپنی قوتِ خُود اعتمادی کہ گفتگو کے اختتام تک وہ کینیڈا کی سردی کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھی۔

۱۲ نومبر کو میں باکمال لوگوں کی لاجواب پرواز کے مزے لیتا ہوا نصف گھنٹہ تاخیر سے کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تو عزیزی محمد اشرف، جو طالب علمی کے دنوں میں محمد اشرف شاہین ہوا کرتا تھا اور طلباء کی ترقی پسند اور انقلابی جماعت کا لیڈر ہونے کے باوجود پانچ وقت کا نمازی تھا، ایئرپورٹ پر میرا منتظر تھا۔ اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو سے الائیڈ بینک کے زونل چیف اور اے وی پی ہونے اور اس کے بعد کوڈک فلم والوں کی پاکستان میں پہلی لیبارٹری کا انچارج ہونے تک اٹھارہ برسوں کی شب و روز محنت کا بہت معمولی سا اثر اس کے بالوں کے رنگ پر نظر آتا تھا لیکن اس کا دُبلا پتلا جسم اور بچوں جیسا چہرہ دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عمر کی چالیس بہاریں دیکھ چکا ہے۔

اس نے بتایا کہ گھر جانے سے پہلے کچھ دیر ہمیں انٹر فلو ایڈورٹائزنگ کے دفتر میں رُکنا ہے کیونکہ وہاں ان کی لیبارٹری کی اشتہاری فلم تیار ہوئی ہے جسے دیکھنے اور پاس کرنے کے لیے پروگریسو ٹریڈرز کے مالکان صدیق اور ادریس صاحبان بھی آ رہے ہیں اور مجھے اس موقعے پر خاص طور سے مدعو کیا گیا ہے۔ انٹر فلو کے طاہر خاں سے بھی میری پہلے کی سلام دعا ہے اور صدیق اور ادریس برادران سے بھی ایک رشتۂ محبت استوار تھا چنانچہ تیس سیکنڈ کی اشتہاری فلم دیکھنے کی یہ محفل تین چار گھنٹے تک جمی رہی۔

اگلی صبح میں پروگرام کے مطابق ٹھیک دس بجے عالی صاحب کے دفتر پہنچ گیا جہاں اسلامیہ کالج کے دنوں کے دوست افسانہ نگار عباس رضوی سے ملاقات ہوئی جو عالی صاحب کے سیکرٹری / پی آر او کا کام کر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ عالی صاحب کا فون آیا تھا، وہ پہنچنے ہی والے ہیں۔ عباس رضوی عالی صاحب کے بتائے ہوئے تقریباً بتیس مختلف کاموں کی انجام دہی میں مصروف تھا چنانچہ اسے پریشانی سے بچانے کے لیے میں نے اخبارات منگوا لیے اور ایسی دلجمعی سے انہیں پڑھنا شروع کیا جیسے آج اخباروں میں سچ مچ کوئی خبر آ گئی ہو۔

عالی آئے تو میں اخباروں کی پرنٹ لائن تک دو مرتبہ پڑھ چکا تھا۔ مجھ سے تاخیر کی معذرت کے دوران انہوں نے اتنے ٹیلی فون کیے اور اپنے پی اے اور عباس رضوی کو اتنے بے شمار کام لکھوائے کہ معذرت کا جملہ تقریباً ایک گھنٹے میں مکمل ہوا۔

عالی صاحب کی لُغت میں دو جُملے مجھے بہت پسند آئے۔ جہاں ہم عام طور پر 'وغیرہ وغیرہ' کہنا چاہتے ہیں وہاں عالی صاحب 'تو چل میں چل' کہتے ہیں مثلاً:

"جگر صاحب کا ترنم ایک مخصوص انداز کا تھا۔ ان کے بعد ہم نے اور زہرہ (نگاہ) نے اسے پکڑا اور پھر تو چل میں چل۔"

ان کا دُوسرا محبوب تاثریہ جملہ یا لفظ 'چیر ڑقنات' ہے۔

"بھئی اللہ بخشے فلاں بزرگ بڑے چیر ڑقنات شاعر تھے۔"

"ایسا چیر ڑقنات قسم کا کھانا خُدا پھر کبھی نہ کھلائے۔"

عالی بہت محبت کرنے والے انسان ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گُزرے ہی نہیں ان کے

بھیدی بھی ہیں۔ ادیبوں کی سیاست وغیرہ کا جتنا تجربہ انہیں ہے شاید ہی کسی اور زندہ ادیب کو ہو۔ تجربے اور عمر میں بھی ہم سے بہت بڑے ہیں چنانچہ سفر کے سلسلے میں وہ مجھے اور پروین کو بچوں کی طرح ہدایات دے رہے تھے۔ میں تو ان کا مزاج دان ہونے کی وجہ سے ان کی اس وقت کی گھبراہٹ اور ہم دونوں کے بارے میں محافظت اور رہنمائی کے جذبے کو سمجھ رہا تھا مگر پروین، جو اپنی جگہ پر بہت لیے دیے رہنے والی خاتون ہے، خاصی جُز بُز ہو رہی تھی خصوصاً جب پاسپورٹ گھر چھوڑ آنے پر عالی نے اسے جھاڑ پلائی تو وہ سخت پریشان ہو گئی۔ صُورتِ حال خاصی گھمبیر تھی کیونکہ پاسپورٹ کے بغیر ہمیں پیرس کا ویزا نہیں مل سکتا تھا اور قونصلیٹ کے ویزا آفس کے بند ہونے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ اگر ہم پاسپورٹ پروین کے گھر سے لینے جاتے تو قونصلیٹ کا وقت ختم ہو جاتا۔ بہرحال ہم نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور کسی نہ کسی طرح پیرس کا ویزا لینے میں کامیاب ہو گئے۔

واپس پہنچے تو عالی ابھی تک اپنے سفر کی فہرستوں میں اُلجھے ہوئے تھے اور اپنے بریف کیس کو بار بار کھول اور بند کر رہے تھے (جس کا کوئی واضح مطلب آخر تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا) کہ ان کے دفتر کے ساتھی امجد علی صاحب کمرے میں آئے۔ چونکہ عالی صاحب کو مدت سے جانتے تھے اس لیے اُن پر ان کی پریشانی کا کوئی اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ اُلٹا وہ اس صُورتِ حال سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ عالی صاحب نے ان کے ذمے بھی چار چھ کام لگائے جس پر امجد علی صاحب نے مسکراتے ہوئے یقین دہانی کرائی کہ سب کام ہو جائیں گے، آپ تسلّی سے تشریف لے جائیں اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے عالی کے بارے میں بزبانِ انگریزی یہ جُملہ کہا :

"Not to know him is a tragedy, but to know him is a greater tragedy."

(عالی سے متعارف نہ ہونا ایک المیہ ہے مگر ان سے متعارف ہونا اس سے بھی بڑا المیہ ہے۔)

عالی سے میرا تعارف کئی برس پُرانا ہے لیکن سفر کے ان پانچ ہفتوں میں ان کو قریب سے جاننے کا موقع ملا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مجموعی طور پر عالی بہت ہی اچھے انسان ہیں اور امجد علی صاحب کے جُملے کا آخری حصّہ محض تفننِ طبع کے طور پر تھا۔ ویسے وہ خُود بھی حقیقت کے بجائے رعایتِ لفظی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایسا ہی مظاہرہ ایک جگہ آسکر وائلڈ نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

"Some people are wise and others are other wise."

سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور tension کی وجہ سے پیٹ میں چوہے گشت کر رہے تھے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اب ہمیں اپنے اپنے گھروں کو چلنا چاہیے۔ کچھ کھا پی کر آرام کر لیں کیونکہ آگے لمبا سفر ہے۔ عالی نے اپنے مخصوص انداز میں دو تین ہنکارے بھرے، دانتوں پر اُنگلی پھیری اور ہمارے اداکار بھائی طلعت حسین کی طرح لمبے وقفے لیتے ہوئے بتایا کہ ہمارے لنچ کا انتظام موجود ہے اور ساتھ ہی اپنے مربیانہ طنز کے ساتھ کہا:

"بھئی آپ دونوں بڑے لوگ ہیں، ملک کے مشہور ڈراما نگار، شاعر اور دانشور ہیں اور یہ خاتون بھی حکومتِ پاکستان کی اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود بہت بڑی شاعرہ ہیں اس لیے اگر اس لنچ کو خاطر خواہ نہ پائیں تو فدوی کو معاف فرمائیں کیونکہ ہم یہی کچھ کھاتے اور کھلاتے ہیں۔"

میں نے کہا: "عالی صاحب، اس کھانے کا تعلق ہمارے اوصافِ حمیدہ سے کیوں قائم کیا جا رہا ہے؟"

بولے: "بھئی تم جدید نسل کے لوگ ہو، ہمیں دل سے مانتے وانتے ہو نہیں اس لیے ذرا تم لوگوں سے احتیاط ملحوظ رکھ کر بات کرتے ہیں۔"

شروع شروع میں عالی صاحب کا یہ انداز پروین کو بہت کھلتا تھا چنانچہ اس نے اپنی ناراضگی کا اظہار اس طرح کیا کہ کباب کا تھوڑا سا ٹکڑا کھا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا حالانکہ مجھے یقین ہے اس وقت اسے معقول بھوک لگی ہوئی تھی۔ عالی صاحب اپنے جُملے اور اس کے ردِ عمل سے بے خبر پھر سے اپنے پی اے اور عباس رضوی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور ان سے اُن تمام کاموں کے بارے میں فائنل رپورٹ لے رہے تھے جن کا سلسلہ نہ معلوم کتنے دنوں سے جاری تھا۔ مختلف جگہوں پر ٹیلیکس کے ذریعے پیغامات پہنچانے تھے، کتابیں جمع کرنی تھیں، کتابت کا کام تھا، انجمن اُردو کے مسائل تھے، بینکنگ کونسل کی طرف سے اشتہاری فلموں کی تیاری کا مسئلہ تھا، سفر کے لیے بکس کی خریداری تھی، بینک سے متعلق اعلیٰ سطح پر کچھ تبدیلیاں ہونے والی تھیں، ان کا تذکرہ چل رہا تھا، مختلف ٹیلی فون نمبر ڈھونڈے جا رہے تھے، کلام کے مسودے اور مطبوعہ کلام کے مسائل درپیش تھے، گزشتہ دنوں ڈیفنس کے علاقے میں پانی آ جانے کی وجہ سے گھر کے سامان کی جو متاثرہ

چیزیں تھیں ان کی مرمت اور صفائی کے ضمن میں مختلف ہدایات تھیں اور انہی کے درمیان وقفے وقفے سے ہمیں سفر کے سلسلے میں آخری ہدایات دینے کا سلسلہ جاری تھا کہ امیگریشن والوں سے کیا بات کرنی ہے اور کس طرح کرنی ہے۔

جب میں عالی صاحب کے دفتر سے اشرف کے گھر کی طرف چلا تو مجھے پورا یقین تھا کہ عالی ایئرپورٹ پر نہیں پہنچ سکیں گے کیونکہ ان کے مذکورہ مسائل کے پھیلاؤ کو سمیٹنا الہ دین کے جن کی بساط سے بھی باہر تھا لیکن وہ ہم دونوں سے پہلے ایئرپورٹ پر موجود تھے اور طیبہ بھابھی کو بتا رہے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں انہیں کیا کیا کام کس کس طرح سے کرنے ہیں لیکن یہاں ان کی آواز میں وہ استحکام اور زور نہ تھا جس کا مظاہرہ ہم نے دفتر میں دیکھا تھا ___ وجہ صاف ظاہر ہے۔

مجھے چھوڑنے کے لیے اشرف کے ساتھ ساتھ اختر شاہ المعروف اختر حسین جعفری 'کسٹم والا' بھی آیا تھا۔ چونکہ ہمارے شاعر دوست اختر حسین جعفری (آئینہ خانہ والے) بھی ایکسائز اور کسٹم کے محکمے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہم نے ان دونوں میں تمیز اور تفریق کے لیے 'کسٹم والے' اور 'آئینہ خانہ والے' کی شناخت مقرر کی ہوئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں دوستوں میں نوکری کے علاوہ اگر کوئی قدر مشترک ہے تو وہ ہماری دوستی ہے۔ اس فرق سے مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے:

دو سوداگر دوستوں نے ایک ساتھ گھوڑے خریدے۔ شام کے وقت ایک سرائے میں اُترے اور گھوڑوں کو تھان پر باندھ دیا۔ کھانا کھا کر سونے لگے تو ایک نے دوسرے سے کہا:
'بہتر ہے ہم گھوڑوں پر نشانیاں لگا دیں تاکہ صبح ہمیں اپنا اپنا گھوڑا پہچاننے میں دقّت نہ ہو۔'
دوسرے نے سرزنش کرتے ہوئے کہا: 'تم بھی نرے بدھو ہو۔ دونوں کو نشانیاں لگانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم اپنے گھوڑے کی دُم کاٹ دو، دُم والا گھوڑا میرا بغیر دُم کے تمہارا۔'
ایسے ہی کیا گیا مگر جب صبح اُٹھ کر دیکھا تو کسی ستم ظریف نے دوسرے گھوڑے کی دُم بھی کاٹ دی تھی۔ اب تو دونوں بہت پریشان ہوئے۔ اگلی رات فیصلہ ہوا کہ ایک گھوڑے کا کان کاٹ دیا جائے تاکہ پہچان میں دقّت نہ ہو لیکن اگلی صبح دونوں دوست یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے کہ کسی نے دوسرے

گھوڑے کا کان بھی کاٹ دیا تھا۔
دونوں دوست پریشان کھڑے تھے، اچانک ایک نے چٹکی بجا کر کہا: 'اس مسئلے کا ایک حل میری سمجھ میں آیا ہے۔'
'وہ کیا؟' دوسرے نے پوچھا۔
'ایسے کرتے ہیں، کالا گھوڑا تم لے لو سفید میں لے لیتا ہوں۔'
ایئرپورٹ پر پروین کے میاں صاحب (ڈاکٹر نصیر) اسے چھوڑنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ یہاں پروین کی کسٹم افسری کام آئی اور وہیں کھڑے کھڑے ہمارے سارے کام ہو گئے۔ سامان مانٹریال تک براہِ راست بُک ہو گیا۔ امیگریشن کے فارم وغیرہ بھرے گئے اور ایئر فرانس کے عملے سے بہتر سیٹوں کے لیے بات چیت بھی ہو گئی۔ عالی نے اپنے مخصوص برانڈ کے سگرٹوں کے دو کارٹن منگوائے اور ایک ایک میرے اور پروین کے سامان میں اس احتیاط سے رکھوایا کہ کہیں کینیڈا کے کسٹم والے زیادہ سگرٹوں پر اعتراض نہ کریں۔
عالی کی یہ احتیاطیں دیکھ کر میں نے کہا:
"عالی صاحب! آپ کو تو انجمنِ احتیاط پسند مصنفین کا صدر ہونا چاہیے تھا۔"
ایئر فرانس کی فلائٹ رات سوا بارہ بجے کی تھی یعنی اصولی طور پر ہمیں اگلے دن میں سفر کرنا تھا۔
چلتے چلتے طیبہ بھابھی نے مجھے روکا اور عالی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا:
"لو بھئی اب میرا میاں تمہارے حوالے ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ واپسی پر میں نے تم سے پوری رپورٹ لینی ہے۔"
میں نے عالی کی طرف دیکھا۔ بولے:
"کوئی نئی بات نہیں۔ میاں، چالیس برس سے یہ اسی طرح ہماری جاسوسی کر رہی ہیں۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں مگر ان کے وسوسے کم نہیں ہوئے۔ انہیں اب بھی شبہ ہے کہ ذرا موقع ملا اور ہم نے کسی میم سے نکاحِ ثانی پڑھوا لینا ہے۔"
طیبہ بھابھی مسکرائیں اور بولیں:
"تم نے کوئی کم کوشش نہیں کی میاں۔ میں روک کر نہ رکھتی تو اب تک پتا نہیں تم کیا کیا

کر چکے ہوتے۔"

میاں بیوی کی اس مزیدار نوک جھونک کو دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ محبّت اور رفاقت کا گھنا اور سرسبز پیڑ وقت کے طوفانوں کو کتنی آسانی سے روک لیتا ہے۔

ایئر فرانس کے جمبو جیٹ طیّارے میں ہم تینوں کے علاوہ رنگدار نسل کے صرف دو اور مسافر تھے اور ان میں سے ایک میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ملکوں کے باشندے نقوش کے اعتبار سے اتنی گہری مماثلت رکھتے ہیں کہ ان کی قومیت کا کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا۔ میں نے اپنے ہم نشین کی طرف چور آنکھوں سے دیکھا جو انگریزی کا ایک ناول انتہائی خضوع و خشوع سے پڑھ رہا تھا۔ اس کا تعلق چین، جاپان، انڈونیشیا، کوریا، ویت نام اور اسی طرح کے کسی بھی ملک سے ہو سکتا تھا۔

فرانس کے حسن اور لطافت کے قصّوں سے ادب اور فنونِ لطیفہ کے میدان بھرے پڑے ہیں لیکن جہاں تک ہماری نظر جا سکی کوئی ایسا چہرہ نظر نہ آیا جو ہماری نظر کو روک لیتا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ہم تینوں کی سیٹیں الگ الگ تھیں۔ پروین اپنی سیٹ میں سمٹی ہوئی ان دو سفید فام ادھیڑ عمر لوگوں کو تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جو اس کے دائیں بائیں بیٹھے ارغوانی شراب سے شغل فرما رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہاں پروین کی جگہ برادرم منیر نیازی ہوتا تو وہ 'اُمّ الخبائث' کی اس افراط کو کس نظر سے دیکھتا!

عالی صاحب اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی میم سے ہمہ تن محوِ گفتگو تھے۔ بڑی بی کو بھی شاید مُدّت کے بعد کوئی سامع ملا تھا، اس لیے وہ بہت چہک چہک کر بول رہی تھیں۔ مَیں نے دوبارہ اپنے ہم نشین پر نظر ڈالی، وہ ابھی تک صفحہ ۱۱۰ پر رُکا ہوا تھا۔

یکایک جہاز میں روشنی سی ہو گئی۔ مَیں نے چونک کر دیکھا۔ دھاریدار مردانہ قمیض، سکرٹ اور کوٹ میں ملبوس ایک چہکتی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہ کسی مسافر سے بات کر رہی تھی۔ فرانس کے روایتی حُسن اور نزاکت کی زندہ تصویر۔ مَیں نے عالی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی بڑی بی کو بھول کر ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایک دم عطاءالحق قاسمی کا جملہ یاد آیا جو اس نے

پی آئی اے کی ایک فلائٹ کے دوران ایئرہوسٹس کو دیکھ کر کہا تھا :

"ایک بات ہے یار، اسلام کہیں اور آیا ہے یا نہیں اس کا تو مجھے پتا نہیں البتہ پی آئی اے میں ضرور آگیا ہے۔ دیکھو نا، انہوں نے چُن کر ایسا عملہ رکھا ہے جسے دیکھ کر دل میں کوئی بُرا خیال آہی نہیں سکتا۔"

اپنے اخروٹی بال جھلاتی اور مسکراہٹوں کے خوان لٹاتی ہوئی وہ مختلف مسافروں کو چھوٹے چھوٹے ڈبے سے تھمارہی تھی۔ چند لمحوں میں وہ ہماری سیٹوں تک پہنچ گئی۔ میرے ساتھ والے گورے مسافر نے پیکیٹ لیتے ہوئے 'میغسی' کہا۔ عالی نے مجھے بتایا کہ فرنچ میں شکریہ کہنے کے لیے 'میغسی' بولتے ہیں اور یہ آواز غ اور گ کے درمیان کہیں ہوتی ہے۔ میں نے بھی حوصلہ کر کے اس قتالہ کو 'میغسی' کہا۔ اب پتا نہیں یہ میرے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے تھا یا میرے تلفظ میں کوئی ایسی بات تھی اس نے جواب میں مجھے فرنچ میں دو تین جملے کہے اور آخر میں ایک 'میغسی' بھی جڑ دیا۔ میں نے پریشان سا ہو کر اس کی طرف دیکھا اور انگریزی میں بتایا کہ میں فرنچ نہیں جانتا۔ اس پر اس نے کم و بیش میرے ہی جیسی نیم انگریزی میں بتایا کہ اس کی فرانسیسی کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہے اور اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں بلا تکلف اسے بتاؤں۔ غالباً اس قسم کی صُورتِ حال میں مرحوم ساحر لدھیانوی کو یہ اشتباہ ہوا تھا کہ :

یہ تبسّم یہ تکلّم تری عادت ہی نہ ہو

اس کے دیے ہوئے پلاسٹک کے چھوٹے سے بیگ کو کھولا تو اس میں سے کپڑے کے جُوتے، روشنی سے بچنے اور سونے کے لیے آنکھوں پر باندھنے والی پٹی، ٹوتھ برش، سیفٹی ریزر، شیونگ کریم اور ٹوتھ پیسٹ برآمد ہوئے۔ میں نے اپنے برابر والے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں کتاب کے بجائے کسی اور طرف تھیں۔ وہ اس عفیفہ کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے بس چلے تو اُتار کر کلیجے میں رکھ لے۔ اس پر مجھے اس شخص کا قصہ یاد آیا جو کام کی تلاش میں پہلی بار لندن جا رہا تھا۔ یار دوستوں کی گفتگو، انگریزی فلموں اور اپنی سوچوں کی وجہ سے اس کے ذہن پر 'میمیں' کچھ اس طرح سوار تھیں کہ لندن کے قریب پہنچ کر جب اس کے ساتھی نے اس کا کندھا ہلا کر کہا کہ لندن آگیا ہے تو وہ غنودگی کے عالم سے ہڑبڑا کر جاگا اور چاروں طرف دیکھ کر بولا :

"لنڈن آگیالے ــــ میماں کتھّے نیں ؟"

(لنڈن آگیا ہے ــــ میمیں کہاں ہیں ؟)

میرے ہم نشیں کے منہ سے کچھ بے معنی سی آوازیں نکلیں اور اس کا داہنا ہاتھ دو تین مرتبہ عجیب سے انداز میں اُٹھا مگر کسی بُتِ نیم خواب کی انگڑائی کی طرح راستے میں ہی کہیں رہ گیا۔ مجھے شبہ سا ہوا کہ بھائی صاحب انگریزی میں 'پیدل' ہیں اور اس وقت ابلاغ کے مسئلے میں گرفتار ہیں۔ اپنے شبے کی تصدیق کے لیے میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں اس کے چہرے پر ایک بدحواس سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہیں چپک کر رہ گئی۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا:

"یہ ایئر ہوسٹس بڑی بے پروا ہوتی ہیں، آپ غالباً اسے بلانا چاہ رہے تھے۔"

اس پر اس نے اتنے زور اور تکرار سے yes, yes کہا کہ اردگرد کے مسافر چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

میں نے کہا: "وہ واپس آرہی ہے، جو بھی کہنا ہے کہو، پھر آن کہا رہ جائے گا۔"

اس کے منہ سے پھر اسی قسم کی بے معنی آوازیں نکلیں اور اس کا ہاتھ ہلنا شروع ہو گیا۔ اب مجھے پتا چلا کہ ہاتھ کی حرکات سے دراصل وہ لفظوں کا کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ عفیفہ کڑی کمان کے تیر کی طرح اس کی طرف دیکھے بغیر آگے نکل گئی۔ اس عزیز نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا:

"ہمارے ایک شاعر مرزا غالب نے اس موقعے کے لیے ایک شعر کہہ رکھا ہے۔ انگریزی ترجمے کے بعد اس میں کچھ رہ تو نہیں جائے گا، پھر بھی تم احتیاطاً سُن لو۔" اس کے بعد میں نے اسے ترجمے کے ساتھ غالب کا یہ شعر سُنایا:

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

دامن کھینچنے کی بات اس کے دل کو لگی۔ وہ کانوں تک سُرخ ہو گیا اور نظریں جُھکا کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا:

"کہیں بُرا نہ مان جائے۔"

اَب میں محتاط ہو گیا کیونکہ وہ عزیز اُردو شاعری کو سنجیدگی سے برسرِ عمل لانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے بات بدلنے کے لیے اس کا اتا پتا پُوچھا۔ وہ پتا نہیں کب کا بھرا ہوا بیٹھا تھا، اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس نے پیدائش سے لے کر اب تک کی اپنی ساری زندگی کے اہم واقعات مجھے سُنائے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ بی ایس سی کرنے کے بعد محکمہ جنگلات میں افسر لگا ہوا ہے اور اب ایک کورس کرنے کے لیے دو سال کے وظیفے پر سویڈن جا رہا ہے۔ یہ اس کا پہلا ہوائی سفر ہے۔ اس کی ایک بیوی اور ایک ہی بچہ ہے (جن کی تصویریں مجھے اس نے ثبوت کے طور پر ساتھ ہی دکھا دیں)۔ اسے زیادہ انگریزی نہیں آتی وہ مجھ سے قلمی دوستی کا خواہشمند ہے اور یہ کہ اسے بہت دیر سے پیاس لگی ہوئی ہے مگر ایئر ہوسٹس اس کی بات نہیں سُنتی اور اگر سُنتی ہے تو سمجھتی نہیں۔

میں نے کہا: "اس میں اس بے چاری کا اتنا قصور نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں اور مجھے بھی پتا نہیں چلا کہ دونوں بار تم نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی یا محض ورزش کر رہے تھے۔" اس پر وہ عزیز حسبِ سابق ایک نروس سے انداز میں مسکرانا شروع ہوا اور مسکراتا ہی چلا گیا۔

مَیں نے اس کی مسکراہٹ کاٹتے ہوے کہا: "تو تمہیں پینے کے لیے کچھ چاہیے؟"

اس پر اس نے پہلے تو زور زور سے یس یس کہا پھر ایک دم کچھ سوچ کر رُکا اور نو نو کی گردان شروع کر دی۔

مَیں نے کہا: "بھائی ایک بات پر قائم رہو۔ ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں پیاس لگی ہے مگر میں پیوں گا نہیں۔" انگریزی میں اس کا جملہ کچھ یُوں تھا:

"I am thirsty, but no, I won't drink."

میں اس کی بات سمجھ گیا مگر محض مزا لینے کے لیے بولا:

"سویڈن میں تو بہت سردی ہوتی ہے۔ وہاں کیا کرو گے؟ وہاں تو پیے بغیر گزارہ مشکل ہے۔"

اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر رازداری سے بولا:

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں کبھی کبھی پی لیتا ہوں مگر یہاں نہیں پیوں گا کیونکہ ابھی مجھے

دو تین جہاز بدلنے ہیں۔"

مَیں نے کہا: "لو تم یہ میرے والا آرنج جوس پیو میں اور منگوا لیتا ہوں۔"

اس نے کچھ دیر سوچا اور غالباً اس نتیجے پر پہنچا کہ ایئر ہوسٹس سے بات کرنے کی نسبت میرا احسان اُٹھا لینا بہتر ہو گا۔ جُوس پینے کے بعد اس نے پھر مُسکرانا شروع کر دیا۔

میں نے مڑ کر پروین کی طرف دیکھا۔ وہ اس اثنا میں اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے منکیر نکیروں سے کچھ مذاکرات کر چکی تھی کیونکہ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ کی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور پروین کونے والی سیٹ پر ایئر فرانس والوں کی سفید اُونی چادر میں لپٹی ہوئی تقریباً سو رہی تھی۔ میں نے عالی صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا جس سے وقفے وقفے کے بعد ہنکارے نشر ہو رہے تھے۔ اُن کی ہم نشین بزرگ شیمپین کا گلاس سامنے رکھ کر "اندیشہ ہائے دُور و دراز" میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور سوچا کہ اس کے آرائش خم کا کل کے دن کیسے ہوں گے مگر دیر تک غور کرنے کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

میرا ہم سفر ابھی تک صفحہ ۱۱۰ پر رُکا ہوا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی مگر مَیں نے جھلاہٹ کو چھپاتے ہوئے پوچھا: "کیا پڑھ رہے ہو؟"

اس نے جواب دینے کی بجائے مسکراتے ہوئے کتاب کا ٹائٹل میرے سامنے کر دیا۔ کوئی فضول سا جاسوسی ناول تھا۔ میں نے محض بات کرنے کے لیے پُوچھا: "کیسا ہے؟"

بولا: "پتا نہیں —" پھر میری حیرت کو دیکھ کر وضاحت کی کہ اصل میں وہ یہ کتاب اپنی انگریزی بہتر بنانے کے لیے پڑھ رہا ہے۔

مَیں نے کہا: "انگریزی کے سلسلے میں تو شاید یہ کتاب تمہاری کوئی خاص مدد نہ کر سکے۔"

کہنے لگا: "نہیں میں مشکل لفظوں پر نشان لگاتا جا رہا ہوں، یہاں شرم کی وجہ سے ڈکشنری نہیں کھول رہا۔"

اس کی یہ بات سُن کر میرا ذہن انگریزی اور ہمارے جیسے ملکوں کے لیے اس کی ضرورت اور اہمیت کی طرف چلا گیا۔ اس جدید اور تیزی سے ترقی کرتی ہوئی دُنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی

کی تحصیل کس قدر ضروری ہے اور ہمارے پاس اس تک رسائی کے لیے انگریزی کے سوا کوئی راستہ نہیں مگر ہم نے ۳۷ برس سے اس اہم مسئلے کو بے کار بحثوں کا موضوع بنا رکھا ہے۔ اُردو کے لیے شاید ہم دل سے کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے مگر اس عمل میں انگریزی کا بستر بھی گول کر دیا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے مڈل اور میٹرک میں انگریزی لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی جو استطاعت بہم پہنچائی تھی ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم بی اے پاس طالب علم میں بھی اتنی صلاحیت نہیں پیدا کر سکتا۔ ملک کی تعلیم حاصل کرنے والی آبادی کا ۹۰ فیصد اُردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرتا ہے اور جدید علوم کے دروازے پر پہنچ کر منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا، کی مثال سراسیمہ سا ہو کر رُک جاتا ہے۔ نہ اسے اُردو آتی ہے نہ انگریزی اور نہ کوئی اور مضمون۔

میں نے قدرے ہمدردی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ اب کے مجھے اس کی مسکراہٹ زیادہ بُری نہیں لگی۔ اس کی اس مسکراہٹ میں تیسری دُنیا کے پڑھنے لکھنے والوں کی مخصوص بےبسی اور حیرانی تھی۔ وہ اس جمِ غفیر کا ایک تنہا مسافر تھا جو ایک ایسی دوڑ میں شریک تھا جہاں ہرنوں کا مقابلہ کچھوؤں سے کرایا جا رہا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے مگر اس سے پہلے کہ میں مغربی سامراج اور جمہوری اور اشتراکی غنڈہ گردی کے بارے میں مزید کچھ سوچتا وہ پھر آ گئی۔ اب وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے آتش کا یہ شعر یاد آ گیا:

صیاد نے تسلیِ بُلبل کے واسطے
کُنجِ قفس میں حوض بھرا ہے گلاب کا

کھانے کی مقدار اور شکل و صورت خاصی معقول تھی۔ مگر اب مشکل یہ آ پڑی تھی کہ کہیں اس میں سؤر صاحب شامل نہ ہوں۔ میں نے ایک ایک چیز کو چیک کرنا شروع کیا۔ سلاد، مکھن، پنیر، چٹنی، روٹی، سویٹ ڈش اور کراکری کو نکالنے کے بعد دو چیزیں بچ گئی تھیں۔ ایک تو کچھ سینڈوچ نما چیز تھی اور دُوسری طرف چاولوں اور اُبلی ہوئی سبزیوں کے درمیان پڑا ہوا ایک سفید سا گوشت کا ٹکڑا تھا جو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کو کانٹے سے ایک طرف کرتے ہوئے اپنے ہم سفر سے کہا:

"میرا خیال ہے تم بھی سؤر نہیں کھاتے ہو گے۔" اس نے ایک بار پھر پہلے زور زور سے

یس یس اور پھر نو نو کہا اور پھر دونوں کی وضاحت یوں کی کہ وہ بھی میری طرح مسلمان ہے اور سؤر نہیں کھاتا۔ اب میں نے سینڈوچ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سؤر کے گوشت کے بارے میں میری معلومات صرف اتنی تھیں کہ یہ سفید سفید ہوتا ہے۔ ایک بار میں نے اسے ابوظہبی کے ایک ہوٹل میں دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اسے نوش جان کرنے والے سب کے سب غیر ملکی نہیں تھے۔ سینڈوچ میں جہاں اور بہت کچھ تھا وہاں سفید رنگ کا ایک قتلہ سا بھی تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ پنیر ہے۔ ہم سفر سے چونکہ تصدیق یا تردید حاصل کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا اس لیے میں نے اس فتنۂ قیامت کے مڑنے کا انتظار کیا اور بتایا کہ میں مذہبی وجوہ کی بنا پر سؤر نہیں کھا سکتا اس لیے وہ میری رہنمائی کرے کہ اس کھانے میں سؤر کہاں کہاں ہے؟

اس نے دل میں سؤر جگا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ اس کھانے میں سؤر کہیں بھی نہیں ہے۔ میں نے سفید ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے کہا کہ یہ ٹرکی ہے۔ سینڈوچ والے قتلے کا پتا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پنیر ہی تھا۔ میں 'میگنسی' کہہ کر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے ہی لگا تھا کہ وہ بولی:

"سؤر تو اس کھانے میں نہیں ہے لیکن جن دونوں چیزوں کا تم نے پوچھا ہے ان کی تیاری میں سؤر کی چربی ضرور استعمال ہوئی ہے۔"

میرا ہاتھ وہیں رُکے کا رُکا رہ گیا۔ بڑی دلسوزی اور اپنائیت کے ساتھ بولی:

"مجھے افسوس ہوا کہ اس وقت ہم آپ کو کچھ اور پیش نہیں کر سکتے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے لیے کچھ آملیٹ وغیرہ بنا سکتی ہوں۔"

اس نے یہ بات کچھ اس ادا سے کہی کہ مجھے بے اختیار برادرِ عزیز مستنصر حسین تارڑ یاد آگیا۔ میں نے سوچا ہم خوامخواہ اس عزیز کی باتوں پر شک کرتے رہے۔ یہاں تو واقعی ایک رنگین داستانِ محبت کا آغاز ہوا چاہتا ہے مگر اس سے پیشتر کہ میں اس سے آئندہ ملاقات کے وقت اور مقام کے بارے میں کچھ بات کرتا وہ مجھ سے پچھلی سیٹ والے ایک مسافر پر تقریباً جھکتے ہوئے بولی:

"آپ کے لیے گرم دودھ میں ابھی لا رہی ہوں۔"

اس کے اس ہرجائی پن کو دیکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ 'اے طائرِ لاہوتی اس

رزق سے موت اچھی' اور میغیسی کہہ کر اسے ہدایت کی کہ ٹرے اُٹھا لو، میرا اس وقت کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا اور ہو سکے تو مجھے ایک گلاس آرنج جوس اور لادو۔ اس نے بتایا کہ ٹرے وہ واپسی پر اُٹھائے گی البتہ آرنج جُوس جتنا چاہو ابھی مل سکتا ہے۔ آرنج جوس پینے کے بعد میں نے اپنے ہم سفر پر نظر ڈالی جو اپنی ٹرے کی طرف مسلسل متذبذب نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میرا شانہ ہلایا اور بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا :

"یہ سؤر کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے ؟"

اس پر میں نے اُسے احمد ندیم قاسمی صاحب کا سُنایا ہوا ایک واقعہ سنایا جو کچھ یوں ہے کہ ۱۹۵۶ء میں پاکستانی اخباروں کے ایڈیٹروں کا ایک وفد چین گیا جس کی قیادت صوبہ سرحد کے مرحوم لیڈر خان غلام محمد لونڈ خور کر رہے تھے۔ قاسمی صاحب بتلاتے ہیں کہ چینی کھانوں کے ساتھ بھی حرام حلال اور سؤر کا مسئلہ لگا ہوا تھا اور اگرچہ سب لوگ کھانے میں بے حد احتیاط کرتے تھے مگر ایک دن غلطی سے لونڈ خور سؤر کا ایک ٹکڑا کھا گئے۔ جب انہیں اپنی غلطی کا پتا چلا تو ان کی حالت بُری ہو گئی۔ متلی، اُبکائیاں اور اُلٹیاں شروع ہو گئیں۔ گلے میں اُنگلیاں مار مار کر انھوں نے معدہ خالی کیا اور تین دن تک بستر پر پڑے رہے۔ ندیم صاحب کا کہنا ہے کہ میں اور فیض صاحب تیسرے دن اُن کے پاس بیٹھے تھے، اُن کی طبیعت چونکہ سنبھل چکی تھی اس لیے ہم لوگوں نے شرارتاً پوچھا :

"خاں صاحب، جو ہوا سو ہوا مگر یہ بتائیں کہ تھا کیسا ؟"

لونڈ خور نے اپنے مخصوص سرحدی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا :

"خنزیر کا بچّہ، تھا بہت مزیدار۔"

اَب انگریزی زبان میں اسے یہ سمجھانا کہ 'خنزیر کا بچّہ' ہمارے صُوبہ سرحد کی طرف گالی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اپنی جگہ پر ایک الگ مخمصہ بن گیا جیسے اگر لفظ 'سالے' کا انگریزی میں ترجمہ کر کے کسی کو brother-in-law کہا جائے تو یہ گالی سے زیادہ خیر سگالی کا اظہار نظر آئے گا۔ خیر میں نے کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا دیا کہ خان غلام محمد لونڈ خور کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے بے خیالی کے انداز میں ٹرے کی مختلف چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ غالباً اسے

بہت زیادہ بھوک لگی تھی۔ پھر ٹرکی کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا :

"یہ ٹرکی کیا ہوتا ہے۔ کوئی ٹرکش ڈش ہے کیا ؟"

میں نے کہا : "نہیں، یہ ایک پرندہ ہے جو امریکہ میں بہت کثرت سے پایا جاتا ہے۔"

بولا : "حلال ہے۔"

میں نے کہا : "گوشت تو اس کا غالباً حلال ہے البتہ اس کا ذبیحہ ہونا مشکوک ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔"

کہنے لگا : "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ میں تو اس طرح کی ہر چیز پر بسم اللہ پڑھ کر شروع ہو جاتا ہوں۔ زندہ رہنے کے لیے اتنی لچک تو رکھنی چاہیے۔"

میں نے کہا : "یہاں تک تو میں تم سے متفق ہوں مگر یہ سؤر کی چربی کچھ ... ... ؟"

اس پر وہ پھر سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اسے آسانی مہیا کرنے کے لیے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں اور چادر منہ پر لے کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سچ مچ اونگھ آگئی۔ کچھ دیر بعد میری آنکھ کھلی تو اس کی ٹرے غائب تھی البتہ کتاب اور اس کا صفحہ نمبر ۱۱۰ اپنی جگہ پر موجود تھے۔

حلال اور حرام کے اس چکر پر مجھے دلدار پرویز بھٹی یاد آگیا۔ بھٹی ایک بہت اچھا دوست اور ٹی وی اور سٹیج کا مشہور کمپیئر تو ہے ہی مگر اس کا اصل کمال آوازوں کی نقالی ہے۔ مختلف لوگوں کی آوازوں، بولنے کے انداز اور مخصوص حرکات کی جتنی خوبصورت اور مکمل نقل وہ اُتارتا ہے بہت کم لوگ اس معیار کو پہنچتے ہیں۔ ایک دفعہ اس نے دوستوں کی محفل میں ایک بہت مشہور مولانا کی نقل اُتار کر سنائی جس میں حرام اور حلال کے اس مسئلے کو ایک بہت ہی انوکھے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ میں اس کی تفصیل بیان تو کرتا مگر وہ جو غالب نے کہا ہے کہ :

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی

خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

تو ظاہر ہے اس نے یہ بات یونہی تو نہیں کہی تھی۔

پیرس

ہمارا پیرس پہنچنے کا وقت صبح سات بجے تھا جب کہ میری گھڑی ساڑھے نو بجا رہی تھی۔ ہم نے سوچا ہم خواہ مخواہ اپنے پی آئی اے والوں کو برا بھلا کہہ دیتے ہیں جب کہ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ عین اسی وقت ایر ہوسٹس کی پہلے فرنچ میں اور پھر انگریزی میں آواز آئی کہ ہم پیرس کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ وہاں درجۂ حرارت ۴ درجے سنٹی گریڈ ہوگا اور پیرس ٹائم کے مطابق ہم وہاں سات بجے لینڈ کریں گے۔ میں نے مڑ کر پروین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایک دم یاد آیا کہ دوبئی کی ایک فلائٹ پر بھی ٹائم زون کا یہ مسئلہ پیدا ہوا تھا اس لیے میں نے فوراً بڑے پُراعتماد اور تجربہ کار مسافر کی طرح سرسری انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "ٹائم ڈفرنس ہے"۔

پروین نے بھی جواب میں اسی قسم کے اعتماد سے سر ہلایا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ ٹھیک سے پتا اُس کو بھی نہیں ہے۔

پیرس کے ہوائی اڈے کی وسعت اور مصروفیت کے بارے میں بہت کچھ سُنا اور پڑھا تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ 'شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ'، تو اس کا پتا وہاں پہنچ کر چلا۔ جہاز نیچے اُترنا شروع ہوا اور اس عمل میں ایک طرف کو جُھکا تو عالی والی سائڈ کی کھڑکی سے چند لمحوں کے لیے نیچے کا منظر نظر آیا۔ حدِ نظر تک جہاز ہی جہاز تھے۔ یوں لگتا جیسے ہوائی جہازوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں اقبال کا ایک بھولا بھٹکا اور بہت کم معروف شعر ذہن میں گونج گیا:

فضا میں تیرتے پھرتے ہیں تیرے طیارے
مرا جہاز ہے محرومِ بادباں، پھر کیا!

اور اس کے ساتھ ہی ۱۳ برس قبل لکھی ہوئی اپنی ایک نظم 'جدائی کی پانچویں سالگرہ' کی کچھ لائنیں جیسے مجسّم سوال بن کر سامنے کھڑی ہو گئیں۔ زمان و مکان کے رشتے بھی کیسے عجیب

ہوتے ہیں۔ ایک وقت ہیں جو لمحہ تلوار کی طرح سر پر لٹکتا ہے گزرتے ہوئے ماہ و سال کی دھند میں کیا چور سا بن کر آنکھ مچولی کرتا ہے اور وہ مقام، جہاں سے پاؤں اٹھ کے نہیں دیتا تھا، بعض اوقات یوں گزر جاتے ہیں کہ پتا بھی نہیں چلتا۔ یوں تو اس فضا سے روزانہ کئی سو طیارے گزرتے ہیں اور پھر ان کے اس سفر کا ریکارڈ صرف کاغذوں میں رہ جاتا ہے مگر وہ ایک جہاز جو اٹھارہ برس پہلے ایک اُداس شام میں یہاں سے گزرا تھا اپنے ساتھ کیا کیا کچھ لے گیا تھا۔ نظم کی لائنیں ایک ایک کر کے دھیان کے اُفق پر ستاروں کی طرح ٹوٹنے لگیں :

جی میں ہے آج کی شب اس کے لیے جاگ کے کاٹی جائے
وہ جو آنکھوں سے پرے
اجنبی دیس کی گمنام ہواؤں میں کہیں بیٹھی ہے
کیا محبّت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ میں
اس کے چہرے کو خدّ و خال میں لا کر دیکھوں !
سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں اس کی جبیں کیسی تھی !
ہونٹ کیسے تھے ؟ بدن کیسا تھا ؟ آنکھیں کیا تھیں ؟
بس یہی یاد ہے ، وہ جیسی نظر آتی تھی
اُس سے کہیں اچھی تھی
(یہ مہ و سال کا طوفان بہت ظالم ہے
وہ اگر پاس بھی ہوتی تو کسے علم ہے ، کیسی ہوتی !)

جب کبھی کوئی جہاز
غم کی بے چین ہواؤں سے گزرتا ہے تو دل
شامِ فرقت کے تصوّر سے لرز اُٹھتا ہے
شامِ فرقت جو حقیقت ہے مگر خواب نما لگتی ہے

چاند جب اَبر کے ٹکڑوں میں سفر کرتا ہے
تو یوں لگتا ہے
میں بھی اِک اَبر کا ٹکڑا ہوں جسے تیرا وصال
ایک لمحے کی رفاقت میں ملا
اے مرے گزرے ہوئے چاند، مجھے تیرا وصال
تیرا یک لمحہ وصال
دائمی ہجر کے اندوہِ مسلسل کے عوض بار نہیں
اے مجھے اَبر کے ٹکڑے کی طرح چھوڑ کے جانے والے
تیرے بخشے ہوئے لمحے کے عوض
کیا مجھے دینا پڑا، اس سے سروکار نہیں

میرے دل پر ایک اُداسی سی چھانے لگی۔ میں نے سوچا کیا ہر جذبے کی قیمت بس یہی ہے کہ وہ گزرے ہوئے لمحوں کے خس و خاشاک میں ایک بے نام تنکے کی طرح گم ہو جائے؟ اور اگر یہی ہے تو پھر سچ کیا ہے؟ وہ جذبہ جو زمان و مکان کے اس آشوب میں سدا دمکنے والا ہے کہاں ہے؟ کہاں سے آئے گا؟ کہیں ہے بھی یا نہیں؟

کیسی عجیب بات ہے ہم جن چیزوں کو صدق دل سے سچ جانتے اور مانتے ہیں سمے کی دیمک ہماری آنکھوں کے سامنے آہستہ آہستہ انہیں بھی کھاتی چلی جاتی ہے اور ہم تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں۔ وقت خدا ہے یا اس کا روپ! اتنی طاقت اور کسی میں تو ممکن نہیں۔

پیرس کے ہوائی اڈے پر عالی صاحب کے بنک سے گاڑی متوقع تھی۔ سامان چونکہ مانٹریال تک بک ہو چکا تھا اس لیے ہم بہت جلد ایئرپورٹ سے باہر نکل آئے۔ موسم سرد مگر خوشگوار تھا۔ معلوم ہوا کہ ہم چارلس ڈی گال ایئرپورٹ پر اترے ہیں اور یہاں سے پیرس شہر تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ یعنی یوں سمجھیے کہ ہمیں لاہور جانا تھا مگر گوجرانوالہ اتار دیے گئے۔ بنک کے ایک نوجوان اہل کار ذاکر موٹر لیے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ چھ برس سے یہاں ہیں

اور پیرس کے چپے چپے سے واقف ہیں۔
عالی صاحب اس کیفے کی باتیں کر رہے تھے جہاں سارتر بیٹھ کر کافی پیا کرتا تھا اور یہ سمجھا رہے تھے کہ ہم لوگوں کے پاس گھومنے پھرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے ہیں اس لیے ہمیں بہت سی چیزوں کو ایک نگاہِ غلط انداز سے دیکھنا ہوگا۔
مَیں نے کہا اس طرح کے دیکھنے کو اقبال نے 'می نگرم و می روم' کہا ہے جس کا پنجابی ترجمہ ہمارے ایک دوست نے 'ویکھدے جاؤ تے لنگھدے جاؤ' کیا ہے۔ پروین نے کہا: "یہ تو اسی طرح کا دیکھنا ہوا جیسے امریکن ٹورسٹ دنیا کو دیکھتے ہیں۔ ڈائری پر کسی جگہ کے قابلِ ذکر مقامات کی فہرست بنالی اور پھر ٹورسٹ بس کی کھڑکی سے دیکھ کر اس پر ٹِک (✓) کا نشان لگا دیا"۔
ذاکر نے سڑک سے نظریں ہٹائے بغیر دریافت کیا: "اگر آپ پسند کریں تو ہم پہلے عنایت صاحب کی طرف چلیں۔ وہ ناشتے پر آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"
معلوم ہوا کہ عنایت صاحب پیرس میں بنک کے انچارج ہیں اور انہوں نے ہی یہ گاڑی بھجوائی ہے۔ ہم نے عالی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کیونکہ ناشتے کا مطلب کم از کم ایک گھنٹے کا نقصان تھا جو موجودہ حالات میں بہت زیادہ تھا۔
عالی نے پیرس کی سڑکوں اور قابلِ دید مقامات کے بارے میں ذاکر سے ایک طویل گفتگو کی جس کا ماحصل یہ نکلا کہ ہم شانز الیزے سے ہوتے ہوئے آئفل ٹاور، مجسمۂ آزادی اور سوماخت کا چکر لگا کر عنایت صاحب کی طرف جائیں گے۔ ان کا فلیٹ دریائے سین کے بالکل کنارے پر واقع ہے یوں دریائے سین بھی نمٹ جائے گا۔
اس پر مجھے وہ امریکن ٹورسٹ یاد آیا جس نے ٹیکسی کی کھڑکی سے جھانک کر دریائے سَین کو دیکھا تھا اور ڈرائیور سے کہا تھا:

"O.K. Seen. Now Let's have a look on that stupid tower."

میں نے یہ واقعہ اپنے ساتھیوں کو سنایا تو وہ بہت ہنسے اور اس کے بعد سے جب بھی ہم نے کسی چیز کو جلدی جلدی میں دیکھا یہ جملہ ہمارا کوڈ ورڈ بن گیا۔ ہم میں سے کوئی ایک کہتا: سَین اور باقی دونوں جواب دیتے: سِین۔ اس سِین پر مجھے اپنے ایک سابق وزیر صاحب بہت

یاد آرہے ہیں۔ مشہور ہے کہ جب وزارت کے پہلے دن ان کے سامنے فائلوں کا ڈھیر لگایا گیا تو وہ گھبرا گئے اور اپنے سیکرٹری سے پوچھنے لگے کہ ان کا میں کیا کروں؟

سیکرٹری نے کہا: "سرکار سارا کام تو نیچے کے افسران کرتے ہیں۔ آپ ان پر صرف سین لکھ کر دستخط کر دیا کیجیے۔ جہاں کوئی آرڈر وغیرہ لکھوانا ہو گا وہ میں آپ کو بتا دیا کروں گا۔" شام کو فائلیں وزیر صاحب کے دفتر سے واپس پہنچیں تو سب پر اردو میں 'س' لکھا ہوا تھا۔

معلوم یہ ہوا کہ اس وقت ہم جس سڑک پر رواں دواں ہیں پیرس کی سرکلر روڈ ہے جو شہر کے گرداگرد ایک دائرے کی شکل میں چلتی ہے یعنی اگر ہم اس سڑک پر بغیر مڑے چلتے چلے جائیں تو واپس اسی مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔

دائرے کا یہ سفر انسانوں اور تہذیبوں کے اندر بھی ہوتا ہے مگر وہاں یہ اتنا منظم اور مربوط نہیں ہوتا۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے اور اس بحث کے اندر کئی ضمنی مباحث بھی ہیں اس لیے فی الوقت اس پر مٹی ڈالتے ہیں۔ مٹی ڈالنے پر مجھے سعادت حسن منٹو یاد آرہے ہیں۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ منٹو کا شعر کا خانہ خاصا خالی تھا اور وہ شاعروں اور شاعری کو کوئی خاص لفٹ نہیں دیتے تھے البتہ غالب کے سلسلے میں ان کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا مگر شعر انہیں اس کے بھی یاد نہیں رہتے تھے۔ قاسمی صاحب سے روایت ہے کہ بات کرتے کرتے منٹو جب غالب کے کسی شعر کا حوالہ دینا چاہتے تھے اور شعر یاد نہیں آتا تھا تو کچھ یوں بات کرتے تھے:

"ارے بھئی احمد ندیم قاسمی، وہ کیا شعر ہے تمہارے اس مرزا غالب کا۔۔ ۔۔ کیسا کمال کا شعر ہے۔۔ ۔۔ بھئی وہ جس میں آتا ہے کہ۔۔ ۔۔ ۔۔ واہ واہ کیا غضب کا شعر ہے۔ ارے بھئی وہ۔۔ ۔۔ جس میں وہ کہتا ہے کہ۔۔ ۔۔ کچھ 'خندہ ہائے گل'۔۔ ۔۔ اور۔۔ ۔۔ پتا نہیں کیا۔۔ ۔۔ آخر میں کچھ شراب وغیرہ کا تذکرہ ہے۔۔ ۔۔ کیا تھا۔۔ ۔۔ چلو مٹی پاؤ۔"

اتنی لمبی تمہید اور تعریف کے بعد یہ 'چلو مٹی پاؤ' منٹو ہی کہہ سکتے تھے۔

ذاکر نے بتایا کہ تقریباً ہر پانچ میل کے بعد اس سڑک سے شہر کے اندر ایک سڑک جاتی ہے جو شہر کی سڑکوں کے اندرونی نیٹ ورک سے مل جاتی ہے چنانچہ آپ کو شہر کے جس حصے میں بھی جانا ہو اس کے قریب سے exit لے لیں اور پہنچ جائیں لیکن اگر آپ اپنی مطلوبہ exit کسی طرح

نہ لے سکیں تو سمجھ لیجیے کہ پندرہ بیس میل کا چکر پڑ گیا۔

رفتم کہ خار از پا کشم ، محمل نہاں شُد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شُد

میں نے سوچا یہ پیرس شہر تو کسی مورخ کا ڈیزائن کیا ہوا لگتا ہے۔ تاریخ میں بھی تو ایک غلط موڑ صدیوں کا فرق ڈال دیتا ہے۔

باہر سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ موٹر کے شیشوں پر کہرا سا جمنا شروع ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران پیرس کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ تعمیرِ نو کی وجہ سے شہر میں جدید عمارتوں کی افراط ہے لیکن قدیم طرزِ تعمیر کی حامل عمارتیں ایک مخصوص سحر کی حامل ہیں۔ شانزالیزے پر پہنچے تو وہی ہوا جو اکثر بہت زیادہ توقعات کے بعد کسی چیز کو پہلی نظر دیکھنے پر ہوتا ہے۔ ایک چوڑی سی سڑک جس کے دائیں بائیں تین تین چار چار منزلہ عمارتیں جن کے گراؤنڈ فلورز پر دکانیں، ہوٹل، دفاتر اور شاپنگ سٹور ___ مگر یہ سب کچھ تو اپنے لاہور کی شاہراہِ قائدِ اعظم اور کراچی کی بندر روڈ اور الفی پر بھی اسی طرح ہے۔ لوگ بھی خال خال دکھائی دے رہے تھے۔ عالی نے شاید ہمارے چہروں سے ہماری مایوسی پڑھ لی تھی۔ بولے :

"بھئی اس سڑک کا حُسن دیکھنا ہے تو یہاں شام کو آؤ اور موسمِ بہار میں آؤ۔ اس شہر کے کلچر سے شناسائی پیدا کرو، اس کی ہواؤں میں گھومو پھر یہ اپنا آپ تم پر منکشف کرے گا۔ شانزالیزے اتنی جلدی کسی سے بات نہیں کرتی، اس سے مکالمے کے لیے تمہیں اس کے عشوے اور غمزے اُٹھانے پڑیں گے۔"

مَیں نے کہا : "عالی جی، اگر عشوے اور غمزے اٹھانے کے بعد بھی آشنائی سڑک سے ہی ہونی ہے تو اس سے بہتر نہیں کہ آدمی کوئی اور کام کر لے کیونکہ بقولِ اقبال :

سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا۔"

عالی صاحب جھنجلا کر بولے : "بھئی معاف کیجیے گا امجد صاحب، آپ میں اگر حسِ جمال کی اتنی ہی کمی ہے جس کا مجھے اندازہ نہیں تھا تو کم از کم بیچارے اقبال پر تو رحم کیجیے۔ اس نے یہ مصرعہ، جو آپ نے نہایت بے موقع پڑھا ہے، شانزالیزے کے لیے نہیں کہا تھا۔"

پروین بولی : "دراصل اس سڑک کے بارے میں اس قدر سنا اور پڑھا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ انوکھا سا، غیر معمولی سا تصور تھا کہ پتا نہیں کیسی ہوگی مگر یہ تو بالکل عام سی سڑک ہے۔ اس پر اس کے سپیلنگ بھی عجیب سے ہیں۔"

اب عالی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا، بولے :

"بھئی معاف کرنا، بڑے بد ذوق لوگ ہو تم...... شانزا لیزے صرف ایک سڑک نہیں یہ ایک تہذیب، ایک تاریخ ہے اور تہذیب اور تاریخ کا پتا یوں موٹر میں بیٹھ کر طائرانہ نظر ڈالنے سے نہیں چلتا۔"

موٹر میں خاموشی چھا گئی جسے چند لمحوں کے بعد ذاکر نے توڑا۔ وہ عالی سے پوچھ رہا تھا کہ پہلے آئفل ٹاور دیکھیں یا مو ماخت کا چکر لگا لیں۔ عالی نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا :

"بھئی ان صاحبان سے پوچھ لو، ہو سکتا ہے انہیں موں ماخت سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو اور یہ وہاں پہنچ کر مجھ سے پوچھیں کہ اگرچہ یورپ کی ساری بڑی آرٹ کی تحریکیں یہاں سے چلی ہیں اور دنیا بھر کے بڑے بڑے مصوّر یہاں بیٹھ کر پینٹ کرتے رہے ہیں اور یہ کہ یہ جگہ مصوروں کے لیے خواب کی حیثیت رکھتی ہے مگر یہاں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا، یہ تو ایک عام سا، فضول سا، چوک سا، ہے۔"

اس عام سا، فضول سا، چوک سا، میں 'سا' کی جو کثرت تھی اس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوگیا کہ شانزا لیزے کے حضور میں ہم نے جو گستاخی کی ہے اس کا تکدّر عالی کے دل و دماغ پر ابھی تک چھایا ہوا ہے چنانچہ میں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا :

"عالی صاحب یہ موں ماخت یا مو ماخت گویا بڑی توپ جگہ ہے۔ آپ تو یہاں پہلے بھی آچکے ہیں، ہمیں کچھ اس کے بارے میں بتائیے؟"

عالی اس بھرّے میں آگئے اور انھوں نے موں ماخت کی تاریخ پر روشنی ڈالنی شروع کی۔

میں نے پروین کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے 'ویل ڈن' کہا۔

اب ہم شہر کے قدیم حصے میں تھے۔ سڑکیں کہیں کہیں خاصی تنگ تھیں۔ اسی طرح کی ایک

تنگ سڑک پر چلتے چلتے ہم ایک بڑے سے گرجے کے سامنے پہنچے جس کے نام اور تاریخی اہمیت پر اگرچہ عالی نے خاصی روشنی ڈالی تھی مگر اس وقت مجھے اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں آ رہا سوائے اس کے کہ اس کے بائیں پہلو سے جو راستہ جاتا تھا وہ اس علاقے میں نکلتا تھا جسے موں ماختت کہتے ہیں۔

ذاکر کیمرہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس گرجے کی سیڑھیوں پر تصویر ضرور بنوائیں، یہ پیرس کی ایک اچھی یادگار ہو گی۔ ہم پوز بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ذاکر نے کیمرہ ایڈجسٹ کرنا شروع کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ شٹر دباتا پتا نہیں کس طرف سے چار پانچ لڑکے ہاتھوں میں اخبار لیے ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے حلیوں میں غربت اور بد معاشی اس طرح رل مل گئے تھے کہ ان کا اصل چہرہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ عالی نے چلا کر ہمیں خبردار کیا:

"جیبیں بچاؤ، یہ جیب کترے ہیں۔"

میں نے ایک ہاتھ جیب پر رکھ کر دوسرے سے اُن کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ انگریزی ملی فرانسیسی میں کچھ کہہ رہے تھے جس میں سے سوائے "موسیو" اور "نیوز پیپر" کے اور کوئی لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ عالی نے انہیں جھڑک کر پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور بتایا کہ ہمیں اخبار نہیں چاہیے، مگر ان نوجوانوں کی حرکات و سکنات میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ کچھ فاصلے پر لوگ گرجے میں آ جا رہے تھے مگر کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ عالی نے 'پولیس، پولیس' کہہ کر ہوا میں چند آوازیں دیں جس پر وہ لڑکے ہمیں چھوڑ کر ذاکر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ عالی نے کہا: "چلو، چلو، یہاں سے جلدی سے نکل چلو۔"

مَیں نے سوچا یہ عالی صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا ان چار پانچ غریب غربا سے لڑکوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح کے دس دس بارہ بارہ سال کے لڑکے تو ہمارے یہاں بھی بسوں کے اڈوں پر سامان وغیرہ اٹھانے کے لیے مسافروں پر یونہی حملہ آور ہوتے ہیں۔ میں عالی کی پولیس، پولیس کی آوازوں پر دل ہی دل میں ہنستا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آیا۔ عالی نے بتایا کہ پیرس میں یورپ کے مختلف غریب ممالک اور لبنان اور فلپائن وغیرہ سے مہاجرین آتے رہتے ہیں اور ان کی نوجوان نسل اپنی تفریح اور منشیات کے حصول کی خاطر معمولی سی رقم کے لیے

کچھ بھی کر سکتی ہے۔ میں ان کے اس خدشے کی تردید میں کچھ کہنے کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ ذاکر تیز تیز چلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا بٹوا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا :

"میں یہاں چھ سال سے ہوں، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

ہم نے پوچھا : "کیا ہوا ؟" اس نے بتایا کہ اُن چار پانچ لڑکوں نے اسے گھیر کر اخبار بیچنے کی کوشش کی۔ اس نے احتیاط کے طور پر کیمرہ وغیرہ سنبھالنے کی کوشش کی، اس اثنا میں پتا نہیں کس طرح انھوں نے اس کا بٹوا نکال لیا۔

"بٹوا — ؟" میں نے حیرت سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بٹوے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں — یہ دیکھیے۔"

"مگر یہ تو آپ کے پاس ہے۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔ اس پر اس نے بتایا کہ ان لوگوں نے بٹوے سے رقم نکال کر بٹوا اس کی طرف اچھال دیا اور خود بھاگ گئے۔

"تم نے انھیں پکڑا کیوں نہیں ؟ ہمیں کیوں آواز نہیں دی ؟"

"آپ کو میں کیا آواز دیتا .. .. دو منٹ میں تو یہ سارا واقعہ ہوا ہے اور اگر میں ان سے لڑنے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔ اس طرح کی وارداتیں یہاں روز ہوتی ہیں اور میں تو اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ پرس مجھے واپس مل گیا ہے کیونکہ میرے سارے کارڈ اور کاغذات اسی میں ہیں۔"

اب مجھے عالی صاحب کی 'پولیس' پولیس کی صدا کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ میں نے سوچا اچھا ہی ہوا جو میں نے عالی صاحب کی اس احتیاطی تدبیر پر اپنی تنقید کا اظہار نہیں کیا ورنہ ہاتھوں ہاتھ بے عزتی ہو جاتی — اور دل میں سوچا کہ یہ واقعہ چل کر اپنے دوست احمد نسیم کو سناؤں گا جو آج کل لاہور شہر کا کوتوال (S.S.P.) لگا ہوا ہے اور کہوں گا کہ بھائی تمھارے 'پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی' والے نعرے پر میں نے جو جملے کسے تھے وہ واپس لیتا ہوں کہ خدا کی اس زمین پر سلامتی ہمارے یہاں ہی نہیں کہیں بھی نہیں ہے۔

ذاکر کے بٹوے میں زیادہ رقم نہیں تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق ڈھائی تین سو فرانک تھے مگر اس واقعے نے طبیعت کچھ بدمزہ سی کر دی۔ سرزمینِ فرنگ پر ہمارا پہلا تجربہ جیب کٹنے کا تھا۔ میں نے سوچا تین صدیوں تک ان ملکوں نے ہمیں لوٹ لوٹ کر کھایا ہے، اب ان کے کھانے کے دانت گر چکے ہیں مگر ہماری جیبیں اب بھی ان کی دستبرد سے محفوظ نہیں۔ پھر خیال آیا کہ کچھ بھی ہو یہ جیب کترے اپنے سیاسی پیشروؤں سے بہرحال بہتر ہیں کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم انہوں نے بٹوا ہی واپس کر دیا ہے۔

بٹوے میں پڑے ہوئے ذاکر کے مختلف کریڈٹ کارڈز، ڈرائیونگ لائسنس، ملازمت اور رہائشی ویزا کے کاغذات وغیرہ جیب کتروں کے کسی کام کے نہیں تھے مگر ان کے بغیر وہ بے پناہ مشکلات میں مبتلا ہو سکتا تھا چنانچہ جس طرح آدمی موت کو دیکھ کر بخار پر راضی ہو جاتا ہے اسی طرح ذاکر نے بھی اس نقصان کو صبر شکر کے ساتھ برداشت کر لیا مگر وہ جو یورپ والوں نے مشرق کا بٹوا چرا رکھا ہے اس کا کوئی اتا پتا نہیں مل رہا۔ اگر کسی بھائی کو خبر ہو تو اطلاع دے اور اگر چور صاحبان خود پڑھیں اور اسے واپس کر دیں تو ان کی بڑی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس بٹوے میں جتنی رقم تھی وہ بے شک اسے اپنے پاس رکھ لیں مگر اس میں جو ہماری تہذیب، ثقافت، تاریخ، قومی شعور اور عزتِ نفس کے کریڈٹ کارڈز تھے انہیں ضرور لوٹا دیں۔

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا

سرزمین افرنگ پر پاؤں دھرتے ہی اس واردات کی وجہ سے جو ذہنی دھچکا ہم لوگوں کو لگا اس کا تاثر گویا پوری فضا میں پھیل گیا تھا۔ سردی، بارش، کہر، زیادہ زیادہ کپڑوں میں لپٹے ہوئے کم کم لوگ اور دس گھنٹے کی فلائٹ کی تھکن نے مل جُل کر ماحول میں ایک عجیب سی بے کیفی پیدا کر دی تھی۔ موں مانحت ظاہری وضع قطع کے اعتبار سے ایک احاطہ سا تھا جس کے چاروں طرف مختلف دکانیں تھیں جن میں مصوری کے فن سے متعلق اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ اکثر دکانیں اس وقت بند تھیں اور ان کے بند دروازوں کے سامنے فٹ پاتھ پر مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے مصور چھابڑی والوں کی طرح اپنی اپنی تصویروں کے خوانچے لگائے بیٹھے تھے۔ عالی

نے بتایا کہ یہ لوگ سکیچ ڈرائنگ میں بڑی مہارت رکھتے ہیں اور چند منٹوں میں آپ کی تصویر آپ کو سامنے بٹھا کر بنا دیتے ہیں اور انہی لوگوں میں سے دنیا کے بعض بہت نامور مصوّر بھی ہوئے ہیں۔ عالی نے یہ بھی بتایا کہ اس جگہ پر آنا اور اپنا مقام بنانا مصوّر کا خواب سمجھا جاتا ہے اور یوں بہت مہنگی جگہ بھی ہے۔

ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نما عورت خاصی دیر سے ہماری طرف نگراں تھی۔ پروین کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے ایک بڑی کشادہ سی مسکراہٹ ہم چاروں کی طرف کچھ یوں پھینکی جیسے کہہ رہی ہو: "To whom it may concern."

پروین نے اس کی مسکراہٹ واپس کرنے کی کوشش شروع کی ہی تھی کہ وہ عفیفہ اپنی فرانسیسی یا کچھ اور ملی انگریزی سمیت اس پر گویا ٹوٹ ہی پڑی۔ دونوں میں کچھ دیر مذاکرات ہوتے رہے پھر پروین ہماری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے لہجے سے اس کی ایکسائیٹ منٹ ہویدا تھی، بولی:

"یہ بہت بڑی فنکارہ ہے۔ دس منٹ اور بیس امریکی ڈالرز کے عوض یہ میری تصویر بنانے کو تیار ہے۔"

عالی نے کہا: "بی بی، شوق سے تصویر بنواؤ مگر یہاں سودے بازی بھی ہوتی ہے۔ اگر تم اپنے لہجے کی ایکسائیٹ منٹ اور اس کی فنّی صلاحیتوں سے مرعوبیت کا اظہار تھوڑا سا کم کرلو تو میرا خیال ہے تمہارا یہی کام دس ڈالر میں ہو جائے گا۔"

ہم نے یہ بات چیت اُردو میں کی تھی چنانچہ اس دوران میں وہ مصوّرہ 'حافظ جی' کی طرح ہماری طرف دیکھتی رہی۔ اس 'حافظ جی' کی تفصیل یہ ہے کہ پنجابی میں قرآن مجید حفظ کرنے والے افراد کے علاوہ نابینا لوگوں کو بھی حافظ جی کہہ کر بلایا جاتا ہے۔ اسی طرح کے ایک حافظ جی شہر کی ایک گلی سے گزر رہے تھے جہاں دو عورتیں لفظوں کی جنگ میں مصروف تھیں اور ایک دوسرے پر مختلف بددعاؤں، گالیوں اور طعنوں کے تیر و نشتر چلا رہی تھیں، مثلاً: اللہ کرے تو بیوہ ہو جائے، تجھے لاکڑا کاکڑا نکلے، تجھے ٹی بی ہو جائے، تیرا خاوند تجھے چھوڑ دے، وغیرہ وغیرہ۔ اس دوران میں ایک عورت کی نظر حافظ جی پر پڑی تو اس نے کہا:

" اللہ کرے تیرا بیاہ حافظ جی سے ہو جائے ۔"

اس پر دوسری عورت نے جوابی حملہ کیا : " میرا بیاہ کیوں ہو، تیرا کیوں نہ ہو ۔" اس کے بعد وہ دوسرے کوسنوں کی طرف متوجہ ہو گئیں مگر حافظ جی گلی کے درمیان بُت بن کر کھڑے ہو گئے۔ عورتوں کا جوش و خروش ذرا کم ہوا تو حافظ جی نے اپنی لاٹھی زمین پر ماری اور کہا :

"بی بیو، حافظ جی کے لیے کیا حکم ہے؟ کھڑے رہیں کہ چلے جائیں؟"

میں نے اس بی بی کو بتانے کی کوشش کی کہ بیس امریکی ڈالر ہمارے معاشیات اور منصوبہ بندی کے اعلیٰ ماہرین کی شبانہ روز کوششوں کی وجہ سے ہمارے تین سو روپوں کے برابر ہوتے ہیں اور یہ کہ تین سو روپے ایک عام پاکستانی آرٹسٹ ایک ہفتے میں بھی نہیں کما پاتا۔ اُس بی بی نے تیسری دنیا کی اس اپیل کو ایک کان سے سُنا اور دُوسرے سے اُڑا دیا۔ اس پر میں نے گاہکوں کا مخصوص داؤ استعمال کیا اور یہ کہہ کر بات ختم کرنے کا تاثر دیا کہ ہم دس ڈالر دے سکتے ہیں۔ سودا منظور ہے تو بسم اللہ، نہیں تو تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی چنانچہ اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا : " ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آجاؤ۔" میں نے کہا : " تصویر میں نہیں یہ خاتون بنوائے گی۔" اس پر اس نے وہی ہاتھ پروین کے کندھے پر رکھ دیا اور ایک ایسی نظر سے اس کا جائزہ لیا جیسے کہہ رہی ہو : "چلو یہ بھی کیا بُری ہے۔"

پروین اس بی بی کے ساتھ اس سٹوڈیو کی طرف روانہ ہوئی جو کہیں قریب ہی تھا اور ہم تینوں ایک کیفے میں بیٹھ گئے جس کی کافی کے بارے میں عالی نے بتایا تھا کہ اسے پینا گویا پیرس کی ایک اعلیٰ تہذیبی روایت کو نبھانا تھا۔ انہوں نے اس کیفے کی تاریخی اہمیت کے بارے میں اور بہت سی باتیں بھی بتائی تھیں جو اس وقت مجھے یاد نہیں آرہیں۔ کیفے دیکھنے میں عام سا تھا زیادہ بھیڑ بھی نہیں تھی۔ ہم ایک ایسے کونے میں بیٹھے جہاں سے ہمیں باہر کا منظر اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں بیٹھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پروین کو ہمیں ڈھونڈنے میں دقت نہ ہو۔ کیفے کے اندر کا ماحول کچھ کچھ اپنے پاک ٹی ہاؤس جیسا تھا۔ دو تین بیرے بڑی بے نیازی سے آجا رہے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص انتہائی خضوع و خشوع سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ ہمارے ساتھ والی میز پر دو مصور نما آدمی خاموش بیٹھے ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جا رہے تھے۔ دائیں کونے

والی میز پر ایک بوڑھا آدمی حلقۂ اربابِ ذوق کے خالد محمود لڈو کے انداز میں کسی اجنبی زبان میں زور زور سے کچھ بول رہا تھا۔ اس کے سامعین اس کے دلائل سے کم اور جوش سے زیادہ مرعوب دکھائی دے رہے تھے۔ ایک گیا گزرا سا جوڑا انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ میں نے عالی سے کہا:

" یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ ازراہِ محبت نہیں بلکہ اس وجہ سے پکڑ رکھا ہے کہیں دوسرا بھاگ نہ جائے۔"

عالی نے مسکرا کر میرے خیال کی داد دی اور اپنے مخصوص انداز میں دو چار ہنکارے بھر کر دانتوں پر انگلی پھیری۔ میں نے کہا:

" ان بیرا حضرات کو متوجہ کس طرح کیا جاتا ہے؟"

عالی بولے: " دراصل یہاں لوگ ایک کپ کافی منگوا کر گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں اس لیے بیرے بھی جلدی نہیں کرتے۔ آج کل آف سیزن ہے ورنہ یہاں بیٹھنے تو کیا کھڑے ہونے کے لیے جگہ نہیں ملتی مگر روایت کا احترام اتنا ہے کہ اُس وقت بھی ایک کپ کافی کے ساتھ جب تک چاہے بیٹھے رہیے کوئی آپ کو اُٹھنے کے لیے نہیں کہے گا۔"

" مگر اس سے تو ہوٹل والوں کا بہت نقصان ہوتا ہوگا۔"

" ہوا کرے۔ انہی روایات کا نام تو پیرس ہے۔"

اس دوران میں ایک بھولا بھٹکا بیرا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہمارے اِرد گرد ڈولنے لگا۔ عالی نے اسے بلیک کافی اور بیئر کا آرڈر دیا۔ وہ الہ دین کے جِن کی طرح پلک جھپکتے میں دونوں چیزیں لے آیا۔ میں اس کی پھُرتی پر عش عش کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ نگاہ پیالیوں پر پڑی۔ ہمارے یہاں بعض چینی ہوٹلوں میں قہوے کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی پیالیاں رکھی جاتی ہیں جن کی کل اوقات دو گھونٹ سے زیادہ نہیں ہوتی مگر یہ پیالیاں تو ان کی بھی خالہ جان تھیں جن کی تہہ میں کوئی ڈارک براؤن قسم کی چیز پڑی ہوئی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اپنے قلعہ گوجر سنگھ والے ڈاکٹر ظہیر کی خوراک اس سے بڑی ہوتی ہے۔ میں نے عالی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے حسبِ معمول اس کے تاریخی خواص اور تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالی جس کا ماحصل یہ تھا کہ مقدار پر نہیں معیار پر نظر رکھو۔

میں نے کافی کی مقدار کے حساب سے چینی کی دو کیوب اس میں ڈالیں اور ایک گھونٹ بھرا مگر اس ایک گھونٹ نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ زندگی میں بُری بھلی بہتیری قسم کی کافی پینے کا اتفاق ہوا ہے مگر یہ پتا نہیں کیا چیز تھی کہ گھونٹ حلق سے نیچے اُترنا عذاب ہو گیا۔ اس پر وہ بے نیاز قسم کا بیرا سر پر آ کر کھڑا ہو گیا اور یوں دیکھنے لگا جیسے اپنے کمالِ کافی سازی کی تعریف سُننا چاہتا ہو۔ میں نے بڑی دقت سے اس کالے کڑوے اور بد مزہ گھونٹ کو گلے سے نیچے اُتارا اور گلے کو مسلتے ہوئے کہا :

"اب پتا چلا ہے کہ یہاں لوگ ایک کپ کافی سامنے رکھ کر گھنٹوں کیوں بیٹھے رہتے ہیں۔"

عالی نے اپنا مخصوص ہنکارا بھرا اور مسکرا کر کہا :

"اب آپ کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ان پیالیوں میں کافی کی مقدار اتنی کم کیوں رکھی جاتی ہے۔"

ہماری اس جملہ بازی سے ذاکر کی طبیعت بھی قدرے بحال ہوئی، اس نے کہا :

"میرا خیال ہے پکاسو نے یہی کافی پی کر تجریدی مصوری کا آغاز کیا تھا۔"

بیرا ہماری اس گفتگو کو شاید اپنی کافی کے لیے تعریفی ریمارکس سمجھ رہا تھا کیونکہ اس نے خالص فرانسیسی انداز میں بڑی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے ہمیں بتایا کہ ہم چاہیں تو انہی پیسوں میں ایک بار اور اتنی ہی کافی پی سکتے ہیں۔ میں نے بڑے مربیانہ انداز میں اس کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس کی کافی بہت اچھی ہے مگر ہم لوگ صبح کے وقت زیادہ کافی نہیں پیتے۔ عالی نے میری بے بسی کا مزا لیتے ہوئے کہا :

"آپ کافی نوش جان کیجیے کیونکہ کپ میں کافی چھوڑنا یہاں کے آداب کے خلاف ہے۔"

میں نے کہا : "عالی صاحب، ہم اپنے وطن میں کون سے اتنے آداب پرست ہیں جو ان کے آداب کی پابندی کریں گے۔ آپ کو سقراط بننے کا چاؤ ہے تو بڑے شوق سے زہر مار کیجیے، بندہ بے ادب ہی بھلا۔" ہماری یہ نوک جھونک جاری تھی کہ پروین کیفے میں داخل ہوئی۔ اس کی ناک سردی کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھی۔ اس نے سکیچ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے ایک جھُرجھُری لی اور کہا: "جلدی سے مجھے کافی پلوائیے، توبہ توبہ بہت سردی ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں اسے کافی کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرتا، ذاکر نے بیرے

کو ایک اور کافی لانے کو کہہ دیا۔ میں بھی یہ سوچ کر چُپ ہو رہا کہ کہیں کافی کی اتنی مخالفت سے 'پیینڈو' ہی نہ اسٹیبلش ہو جاؤں۔ پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ انگریزی زبان و ادب کی طالبہ ہونے کی وجہ سے یورپ کی تہذیبی روایات سے پروین کی دلچسپی بہت زیادہ ہے اور وہ محض اس روایت کا حصہ بننے کے لیے چھوٹی موٹی تکلیفیں ہنس کر برداشت کر سکتی ہے۔ کافی آئی، پروین نے ایک گھونٹ بھرا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ گویا میرے والے گھونٹ کا 'ایکشن ری پلے' تھا۔ اس نے کافی کی کڑواہٹ کم کرنے کے لیے چینی کے دو اور کیوب پیالی میں ڈالے، انہیں اچھی طرح ہلا کر دوسرا گھونٹ بھرا اور پھر پیالی ایک طرف سرکا دی۔ میں نے مزا لینے کی خاطر بڑے سرسری انداز میں پوچھا:

"کیوں؟ مزا نہیں آیا۔"

بولی: "کچھ عجیب سا ذائقہ ہے۔"

"یہ ذائقہ کافی کا نہیں پیرس کی تہذیب کا ہے۔"

"ہائے نہیں۔ پیرس کی تہذیب تو بہت اچھی ہے۔ اتنا حُسن یورپ تو کیا دنیا کی کسی اور تہذیب میں نہیں۔"

میں نے کہا: "اگر پیرس کی باقی تہذیبی روایات بھی اس کافی جیسی ہیں تو ہماری طرف سے 'استعفیٰ مرا بہ حسرت و یاس' ہی سمجھو۔" بیرا برتن اُٹھانے آیا تو پیالیوں میں بچی ہوئی کافی دیکھ کر اس کا مُوڈ آف ہو گیا۔ پروین نے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

"اگر حفیظ ہوشیارپوری اس وقت یہاں ہوتے تو ان کا مشہور شعر کچھ یوں ہوتا:

پی لو دو گھونٹ کہ کافی کی ہے بات حفیظ
صاف انکار سے خاطر شکنی ہوتی ہے"

اب ہم پروین کے سکیچ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سکیچ بُرا نہیں تھا۔ دس ڈالر میں تو بالکل ہی بُرا نہیں تھا مگر اس میں موں ماخت والی بات نہیں تھی۔ پروین نے بتایا کہ مصورہ نے فرانسیسی زبان میں اپنے دستخطوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ تصویر موں ماخت میں بنائی گئی ہے۔ تاریخ بھی درج ہے۔

میں نے کہا: "بس یہی اس تصویر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسے بھی اس کافی

کی طرح سمجھو، ذائقہ جیسا بھی ہے مگر اس میں پیرس کی تاریخ اور تہذیب گھلی ہوئی ہے۔ اگر کوئی تصویر کے معیار پر اعتراض کرے تو اسے موں ماخت کا حوالہ چپ کرا دے گا۔"

کیفے سے نکلتے ہوئے میں نے انہیں ایک مشاعرے کا واقعہ سنایا جو کچھ یوں ہے :

مشاعرہ زوروں پر تھا۔ مرحوم عبدالحمید عدم غزل پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب نشے میں جھومتے جھامتے ہال میں داخل ہوئے اور بلند آواز میں کہنے لگے : "بند کرو یہ بکواس۔ عدم صاحب کو بلاؤ۔ ہم عدم صاحب کو سننا چاہتے ہیں۔"

کسی شخص نے انہیں بتایا کہ آپ آرام سے بیٹھ جائیں، عدم صاحب ہی کلام سنا رہے ہیں۔ اس پر ان صاحب نے ایک لمبی سی واہ کی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولے :"عدم صاحب ہیں تو واہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ .. .. .. سبحان اللہ۔ مکرر۔ ارشاد۔"

موں ماخت سے واپسی پر آئفل ٹاور کے سائے میں چند منٹ رکے۔ صبح صبح کا وقت، بارش اور نومبر کی سردی، اس پر ذاکر کی جیب کٹنے کے واقعے اور موں ماخت کی عبرت ناک کافی نے طبیعت کچھ ایسی بدمزہ کر دی تھی کہ موٹر سے باہر نکلنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس التوا کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عنایت صاحب ناشتے پر ہمارے منتظر تھے اور اصولاً اس وقت تک ہمارے بارے میں ان کی تشویش زوروں پر ہونی چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ جو کچھ دیکھنا ہے انہی چار گھنٹوں میں دیکھنا ہے۔ روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد۔

عنایت صاحب کا خوب صورت اپارٹمنٹ اپنی وضع قطع، سلیقے اور لوکیشن کے اعتبار سے خاصا مہنگا نظر آتا تھا۔ لفٹ کے ذریعے تیئیس منزلیں پلک جھپکتے میں گزر گئیں۔ دریائے سین کی طرف کھلنے والی بڑی کھڑکی سے میں نے ارد گرد کی عمارتوں کو دیکھا اور پھر نیچے نگاہ ڈالی۔ پتا نہیں کہاں سے یگانہ کا ایک مصرعہ دھیان کی سکرین پر روشن ہوا اور پھر دیں جلنے بجھنے لگا:

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا

ماچس کی ڈبیوں جیسی عمارتیں اور ان کے درمیان بہت سے بونے اور ڈنکیاں۔ (din key cars) سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا مشہورِ زمانہ دریائے سین جس کے

ایک پُل کے قریب مجسمۂ آزادی عمارتوں کی بلندی اور انسانوں کی پستی کو اپنی پتھریلی آنکھوں سے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ عالی نے بتایا کہ واپسی پر اُن کا ارادہ تین چار دن پیرس رُکنے کا ہے اور وہ یہ سارا عرصہ اسی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر گزارنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا : "یعنی آپ سین کو پُوری طرح 'seen' کرنے کے چکر میں ہیں"۔ پروین نے اپنی نیند بھری آنکھیں بڑی مشکلوں سے کھولتے ہوئے عالی کے خیال کی تائید کی اور کہا کہ اس منظر کو وہ بھی تین دن تک بغیر تھکے دیکھ سکتی ہے۔

عنایت پچاس پچپن برس کے دُبلے پتلے، پُرخلوص اور پھرتیلے 'نوجوان' تھے۔ موصوف نے شادی کا تکلّف نہیں فرمایا تھا اور ان کے خیالات اور زندگی کے حالات سُن کر اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا یہ فیصلہ کچھ اتنا غلط بھی نہ تھا۔ افسوس کہ اس موضوع کے حوالے سے جتنے لطائف ہم نے آپس میں exchange کیے ان میں سے ایک بھی قابلِ اشاعت نہیں۔

سین کے دوسرے کنارے پر واقع عمارتوں کے ایک سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عنایت صاحب نے بتایا کہ اس علاقے میں ان مشہورِ زمانہ خواتین کے محلات اور مکانات ہوا کرتے تھے جنھیں عرفِ عام میں 'مادام' کہا جاتا ہے۔ ان وسیع القلب خواتین میں سے کچھ انتہائی ادیب اور فنکار نواز واقع ہوئی تھیں۔ جس طرح ہر غیر معمولی دولت مند کے پیچھے کسی نہ کسی جرم کا ہاتھ ہوتا ہے اسی طرح بیشتر غیر معمولی فنکاروں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مادام ہوا کرتی تھی۔ عنایت صاحب کے اس رواں تبصرے پر عالی جی نے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری اور کہا: "کتنے اچھے زمانے تھے وہ۔"

مادام کے ذکر پر کئی الحاقی مضامین بھی گفتگو کا حصہ بن گئے۔ پروین چند منٹ آرام کے لیے ساتھ والے کمرے میں جا چکی تھی اس لیے ہماری گفتگو بڑی تیزی سے مردانہ تر ہوتی چلی گئی۔ سینہ بسینہ چلنے والے ان واقعات میں سے ایک جو سب سے کم ضرر ہے، عقل مند قارئین کے لیے بطور اشارہ پیش کرتا ہوں :

انقلاب فرانس کے دنوں میں ایک مادام 'ح' کے حسن و جمال اور مہمان نوازی کا بہت شہرہ تھا مگر ان سے ملاقات کی فیس اُن بھلے وقتوں میں بھی پانچ سو فرانک تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہزاروں عشاق

ان کا نام سُن کر ٹھنڈی آہیں بھرتے اور اپنی کم ظرف جیبوں کا ماتم کر کے رہ جاتے تھے۔ انہی دنوں اُس نواح میں ایک فوجی بٹالین اتری۔ مادام 'ح' کی شہرت اس کے جوانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ ساٹھ فرانک ماہانہ تنخواہ میں مادام کے بارے میں سوچنا دیوانے کے خواب سے کم نہ تھا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے سو اس مسئلے کا حل بھی ایک بزرجمہر نے نکال لیا۔ طے یہ پایا کہ بٹالین کے ڈھائی سو جوان دو فرانک فی کس کے حساب سے چندہ دیں۔ اس کے بعد لاٹری نکالی جائے اور جس خوش نصیب کا قرعہ نکل آئے وہ مادام سے ملاقات کی سعادت حاصل کرے۔

خوش نصیب جوان جب پانچ سو فرانک کی تھیلی لے کر مادام کے درِ دولت پر حاضر ہوا تو مادام اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس مفلس سپاہی کے پاس اتنی بڑی رقم کیسے ہو سکتی ہے؟ تھوڑی سی جرح کے بعد جوان نے رقم کا راز اُگل دیا۔ مادام یہ سُن کر بے حد خوش ہوئی کہ اس کے چاہنے والے اس تک پہنچنے کے لیے کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں چنانچہ اس نے جوان سے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ جوان کے جذبے سے اس قدر خوش ہوئی ہے کہ اس ملاقات کے عوض اس سے کوئی رقم وصول نہیں کرے گی۔ جوان کی بانچھیں کھل گئیں۔ مادام کی صحبت اور پانچ سو فرانک یعنی چوپڑی اور دو دو، مگر روانگی کے وقت اس کی حیرت اور پریشانی کی حد نہ رہی جب مادام نے دو فرانک اسے دیتے ہوئے کہا: "میں نے کہا تھا نا 'تم' سے میں کوئی پیسہ نہیں لوں گی۔"

یعنی زور کس پر ہوا 'تم' پر۔

عنایت صاحب کا دفتر شانزالیزے پر تھا۔ وہاں ہماری سڑکوں کی طرح بڑے بڑے بورڈ لگانے کا رواج نہیں تھا۔ عمارتوں اور بورڈوں کے انداز، سائز اور رنگ مخصوص علاقوں میں مخصوص طرح کے تھے۔ نیشنل بنک اور پی آئی اے کے دفاتر ایک ہی عمارت کے ایک ہی فلور پر ایک دوسرے کی بغل میں واقع تھے۔ پی آئی اے، پیرس کے مینیجر عطاء اللہ بڑے خوش نما اور خوش گفتار آدمی تھے۔ معلوم ہوا کہ موصوف ۵۰-۱۹۴۹ء میں حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری ہوا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے حلقے سے متعلق مختلف لوگوں کی خیر خبر پوچھتے رہے اور اس دوران میں عالی صاحب نے فون پر تقریباً تین چار ملکوں میں اپنے بینکر دوستوں کو بینکنگ کے میدان میں ہونے والی ان تبدیلیوں

سے آگاہ کیا جوان کی روانگی سے چند گھنٹے پہلے رُونما ہوئی تھیں۔

ترقیوں اور تبادلوں کی ان خبروں کے ہجوم میں پروین اور میں تنہا ہو گئے۔ نیند اور تھکن سے بُرا حال تھا مگر دو گھنٹے بعد اگلی فلائٹ تھی سو جاگنا بھی ضروری تھا۔ ہم نے پیرس کے ویو کارڈز منگوائے اور جلدی جلدی گھر والوں کو اپنی اب تک کی خیریت کی اطلاع لکھ کر عطا صاحب کے سپرد کیے کہ انہیں پوسٹ کروا دیں۔ عنایت صاحب کو ہم سے آدھ گھنٹہ بعد والی کسی فلائٹ پر فرینکفرٹ جانا تھا اور ان کا اصرار تھا کہ ہم لنچ ان کے ساتھ کریں۔ بڑی مشکلوں سے انہیں قایل کیا کہ جہاز کی خوراک اور آپ کے بھرپور ناشتے کے بعد اب کسی لنچ کی گنجائش نہیں۔ عالی کا اصرار تھا کہ چاہے چند منٹ کے لیے سہی، ہمیں پیرس کی مشہورِ زمانہ آرٹ گیلری 'لُوور' کا (جسے بے تکلفی سے 'لُو' بھی کہا جاتا ہے) ایک چکر ضرور لگانا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ لیونارڈو کی بنائی ہوئی اصلی 'مونا لیزا' داخلی دروازے سے صرف تین منٹ کے فاصلے پر ہے اور اس قدر قریب آکر اسے نہ دیکھنا ایک ایسا جُرم قبیح ہے جسے اہلِ ذوق، معاشرہ، دیکھنے سُننے والے اور ہماری آیندہ نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

عالی صاحب کے اس ڈرانے دھمکانے کا مجھ سے زیادہ پروین پر اثر ہوا اور اس نے فلائٹ مِس کرنے کا چانس لیتے ہوئے اعلان کیا کہ 'لُوور' ضرور جانا چاہیے۔ دفتر سے نکلے تو بارش بدستور جاری تھی۔ میں نے کہا:

"لُوور اتنی بڑی تاریخی اور اہم جگہ ہے کہ اسے چند منٹوں کے لیے دیکھنا اس کی توہین کرنا ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ ہم واپسی پر پیرس رُکیں اور لُو کو جی بھر کر دیکھیں مگر افسوس میرے اس انتہائی سنہرے مشورے پر کسی نے کان نہ دھرا اور ہمارا قافلہ لُو کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک جگہ گاڑی رُکی۔ عالی نے اُنگلی سے اشارہ کر کے بتایا کہ لُوور کا مرکزی دروازہ وہ سامنے ہے اور ذاکر کو ہدایت کی کہ وہ ہمیں جلدی سے ایک چکر لگوا لائے۔ پروین نے حیرت سے کہا: "اور آپ ...... آپ نہیں چلیں گے؟"

"میرا یہ کئی بار کا دیکھا ہوا ہے۔ تم لوگ پہلی بار آئے ہو، تم جاؤ۔ میں یہیں گاڑی میں کچھ دیر آرام کروں گا۔"

میں نے کہا: "عالی صاحب، اس وقت مجھے ایک ایسا شعر یاد آ رہا ہے جو میں نے اپنی

طالب علمی کے دنوں میں نظیر صدیقی کی کتاب 'تاثرات و تعصبات' کے ایک مضمون میں پڑھا تھا۔ مضمون میں کیا تھا یہ تو مجھے یاد نہیں البتہ وہ شعر آپ کے اس وقت کے طرزِ عمل پر انتہائی فٹ بیٹھ رہا ہے۔"

عالی بولے : " خیر آپ وہ شعر مجھے اتنی لمبی تمہید کے بغیر بھی سنا سکتے تھے۔ ویسے صاحب میں داد دیتا ہوں آپ کے مطالعے کی۔ کیا کیا چیزیں آپ نے پڑھ رکھی ہیں۔ بہت فرصت ہوتی تھی کیا آپ کو اُن دنوں میں ؟"

میں نے ان کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے کہا : " غالباً یہ شعر اجتبیٰ رضوی مرحوم کا ہے۔

آگ لگا کے شہر میں، فتنے جگا کے دہر میں
جا کے الگ کھڑے ہوئے، کہنے لگے کہ "ہم نہیں"

ذاکر نے موٹر کی ڈکی سے دو عدد چھتریاں برآمد کیں۔ میں نے بڑی مشاقی سے کام لیتے ہوئے ایک چھتری کھول کر پروین کو تھمائی اور دوسری اپنے لیے کھولنے کی کوشش شروع کی۔ تھوڑی دیر بعد اس کوشش میں ذاکر بھی شریک ہو گیا مگر پتا نہیں اس کا (یعنی چھتری کا) کوئی سپرنگ ڈھیلا تھا یا پُش بٹن میں کوئی خرابی تھی، چھتری نے اپنی لاج کا گھونگھٹ کھول کر نہیں دیا۔ پروین اس اثنا میں کافی آگے جا چکی تھی، میں نے ذاکر سے کہا :

" بھائی جتنا بھیگنا تھا بھیگ چکے ، اب حوصلہ کر کے ننگے سر ہی نکل چلو۔"

کہنے کو تو میں 'ننگے سر' کہہ گیا مگر ایک دم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے جلدی سے ذاکر کی طرف دیکھا۔ اب پتا نہیں یہ اس کی شرافت اور سعادت مندی تھی یا عقل اور حسِ مزاح کی کمی کہ اسے میرے 'فارغ البال' سر اور ننگے سر میں موجود رعایتیں نظر نہیں آئیں۔ میں نے سوچا اگر یہ جملہ میں نے عطاء الحق قاسمی کے سامنے یا لاہور میں اپنے دوستوں کی کسی بھی محفل میں کہا ہوتا تو میرا کیا حشر ہوتا!

بارش میں چلتے ہوئے پتا نہیں کیوں مجھے اپنا بچپن کا دوست شیخ رضا مہدی عرف جوجی یاد آگیا۔ اس کا سر بھی میری طرح بالوں سے تقریباً ہاتھ دھو چکا ہے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا:

"یار، یہ قدرت نے ہمارے بال اُڑا کر ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"کوئی بات نہیں یار جوجی شیخ — اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا یار۔ صبح سویرے جب میں دانت صاف کرنے کے لیے باتھ روم میں بیسن کے آگے کھڑا ہوتا ہوں اور سامنے لگے ہوئے شیشے میں اپنی صورت دیکھتا ہوں تو خود میرا اپنا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ دوسروں سے ہم کیا توقع کر سکتے ہیں۔"

سردی اور بارش کے باوجود لُو کے اندر خاصی رونق تھی۔ ہم نے جلدی جلدی ٹکٹ لیے اور رہنمائی کے بورڈ پڑھتے ہوئے اس ہال میں پہنچے جہاں 'مونا لیزا' رکھی ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ مونا لیزا کے درجنوں پرنٹس دیکھنے کے باوجود آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس تصویر، عورت یا اس کی مسکراہٹ میں کون سی ایسی خاص بات ہے جو اسے فن کی دُنیا میں اتنا بڑا مقام دیا جاتا ہے۔ خیال تھا کہ شاید اصلی مونا لیزا اس معمے کو حل کر دے مگر یہاں بھی ناکامی ہوئی۔ ذاکر کو شاید مونا لیزا سے کوئی نظریاتی اختلاف تھا کیونکہ اس نے اس پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی البتہ پروین بہت انہماک سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ حوصلہ کر کے اس پینٹنگ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کروں مگر یہ سوچ کر چُپ ہو رہا کہ خواہ مخواہ اپنی کور ذوقی اور فن ناشناسی کا ڈھنڈورا پیٹنے سے کیا فائدہ۔ میں نے بھی مونا لیزا کو دو تین منٹ تک انتہائی عاشقانہ انداز میں دیکھا اور منہ سے اسی طرح کے "اوہ، اوہ، مائی گاڈ، "Fantastic, Fabulous, Marvellous" قسم کے الفاظ ادا کیے جن کا اظہار ارد گرد کھڑے ہوئے تمام لوگ کر رہے تھے۔ خیال آیا کہ صائب نے کیا اچھا شعر کہا ہے:

صائب دو چیز می شکنند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سُخن شناس

تحسینِ ناشناساں کے اس شور میں پروین کی خاموش داد 'سکوتِ سُخن شناس' تھی یا کچھ اور، اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم نے جلدی جلدی ایک ملحقہ ہال کا چکر لگایا اور پھر بھاگم بھاگ عالی صاحب کے پاس پہنچے جو کوئی تین درجن ویو کارڈ سامنے رکھے دھڑا دھڑ لکھتے جا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر قلم روکے بغیر بولے:

"اگر راستے میں کہیں ٹریفک جام مل گیا تو اس فلائٹ کو مِس ہی سمجھو۔"

موں مانٹ سے چارلس ڈی گال ایئرپورٹ تک کا سفر کچھ ایسا تھا کہ اپنی جی ٹی روڈ کے ویگن اور بس ڈرائیور یاد آ گئے۔ 'وقت کم تھا اور مقابلہ سخت'، چنانچہ ذاکر نے گاڑی کچھ یوں چلائی جیسے پس ماندہ قومیں تاریخ کی دوڑ میں 'لیٹ' نکالنے کی کوشش کرتی ہیں مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ شارٹ کٹ مارنے کی بھی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اور کوئی راستہ ہمیں ایئرپورٹ تک نہیں لے جا سکتا تھا۔ میرا اور پروین کا یہ پہلا بڑا سمندر پار سفر تھا، اس لیے منسلکہ فلائٹ مِس کرنے کے نتائج و عواقب کے بارے میں ہم بالکل اندھیرے میں تھے سو ہماری پریشانی شدید ہونے کے باوجود کچھ ویگ سی تھی البتہ عالی صاحب اپنے گزشتہ سفروں کے اسی نوع کے تجربے سنا سنا کر ہماری دہشت میں مسلسل اضافہ کرتے جا رہے تھے۔ ہمارا پیرس کا ویزا محدود مدت کا تھا۔ اگر ہم اس وقت تک شہر سے نکل نہ جاتے تو تھانے کچہری کی نوبت آ سکتی تھی، اگلی فلائٹ کا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا ٹکٹ پیرس سے آگے ایئر کینیڈا کا تھا اور تھا بھی ناقابلِ انتقال۔ اب ایئر کینیڈا کی اگلی فلائٹ کب ہو گی اور اس پر ہمیں سیٹ مِل بھی سکے گی یا نہیں؟ اسی طرح کے اندیشہ ہائے دُور و دراز نے ہمیں گھیر رکھا تھا۔ میں ذاکر کو تیز چلانے یعنی مزید تیز چلانے کے بارے میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ میری نظر اپنے آگے جاتے ہوئے ایک بڑے سے ٹرک پر پڑی جس پر پانچ چھ ٹوٹی پھوٹی موٹریں لدی ہوئی تھیں۔ ذاکر نے بڑی مہارت سے اسے اوورٹیک کرتے ہوئے کہا:

"آج کل تو آف سیزن ہے۔ کرسمس کے دنوں میں تو ایک ایک دن میں سینکڑوں حادثے ہوتے ہیں۔ ہر دس پندرہ میل کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی گاڑی اُلٹی ہوئی نظر آتی ہے۔" میں نے تھوک کے ساتھ ہی اپنا لبوں تک آیا ہوا جملہ نگلا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ہم پیرس کے نواح میں سے گزر رہے تھے۔ عالی نے ہنکارے لیتے اور دانتوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بتایا کہ دُوسری جنگ عظیم میں جرمن فوجیں اسی راستے سے پیرس میں داخل ہوئی تھیں مگر ان کے اس انکشاف میں کسی نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور موٹر میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی جسے کبھی کبھی عالی جی کے ہنکارے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔

ذاکر کو اس صورتِ حال میں اپنی ذمے داری کا احساس بھی تھا اور تیز رفتاری پر پکڑے جانے کا

خوف بھی۔ اس تذبذب کی وجہ سے بعض اوقات وہ ایک دم رفتار کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور بعض اوقات یکدم بہت خطرناک تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہر دو صورتوں میں ہمارے پاس 'ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم' کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر ایک بہت بڑے ٹرک کے قریب سے گزرے جس پر نو بالکل نئی موٹریں لدی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس ٹرک کو دیکھ کر مجھے وہ کوئلوں والا ٹرک یاد آ گیا جس سے ہم بلوچستان کی ایک سنسان سڑک پر ٹکرائے تھے۔

ہوا یوں کہ ۱۹۸۱ء میں جشنِ سبی کے موقعے پر ایک مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مرحوم سید عابد علی عابد کے داماد اور معروف شاعرہ شبنم شکیل کے میاں شکیل احمد کوئٹہ میں حکومتِ بلوچستان کے سیکرٹری فنانس تھے۔ انھوں نے اپنے گھر پر ہماری دعوت کی۔ وہاں ان کے ایک دوست بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بے حد اصرار کے بعد ہمیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ صبح ہم سرکاری گاڑی کی بجائے ان کی ذاتی موٹر میں سفر کریں گے تاکہ راستے میں گپ شپ رہے۔ شکیل اور شبنم نے بھی ان کا ساتھ دیا اور یوں ہم اُن کی نئی نکور موٹر میں بیٹھ کر سبی کی طرف روانہ ہوئے۔ بخاری صاحب عجیب سرشاری کے عالم میں تھے۔ پُرانے فلمی گانے چل رہے تھے اور ہر گانے پر داد دینے کے لیے وہ بار بار مڑ کر مجھ سے اور عطار سے گفتگو کرتے تھے۔ اگرچہ سڑک صاف تھی اور بہت کم ٹریفک آ جا رہی تھی لیکن ان کے اس بار بار مڑنے سے ہم اندر سے بہت پریشان ہو رہے تھے۔ ضمیر صاحب نے تو ایک دو بار اشاروں اشاروں میں انہیں کہا بھی کہ وہ اپنا دھیان سامنے رکھیں مگر بخاری صاحب کچھ زیادہ ہی مُوڈ میں تھے۔ 'اب میرا کون سہارا' چل رہا تھا۔ بخاری صاحب نے ایک پہاڑی موڑ کاٹتے ہوئے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور پتا نہیں کیا کہا۔ میری اور عطار کی نظر ایک دم سامنے پڑی۔ تنگ پہاڑی سڑک پر ایک ٹرک موڑ سے چند گز کے فاصلے پر سڑک کے عین درمیان کھڑا تھا اور ہمارا ڈرائیور سرے سے اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا عطار کے منہ سے ایک چیخ سی نکلی۔ "بخاری صاحب!"

اب پتا نہیں یہ اس چیخ کا اثر تھا یا کچھ اور، بخاری صاحب کے سر اور پاؤں نے ایک ساتھ حرکت کی، بریک اور ٹکر کی ملی جلی آواز آئی اور ہماری موٹر ٹرک کے ساتھ ہم آغوش ہو گئی۔ چند لمحوں کے لیے یُوں محسوس ہوا جیسے ۔۔۔۔ در اصل اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ۔۔۔۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی جیسے بہت سے رنگ لہرائیں اور پھر ایک سفید سی بے رنگی میں تحلیل ہو

جائیں۔ میں بخاری صاحب کے پیچھے والی نشست پر تھا۔ جب میرے حواس قابو میں آئے تو میں نے دیکھا کہ ضمیر صاحب دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے بیٹھے ہیں۔ بخاری صاحب سٹیئرنگ پر جھکے ہوئے ہیں اور میرے ساتھ والی نشست پر عطا ایسے بیٹھا ہے جیسے کسی پتنگ باز کی آخری پتنگ بھی کٹ گئی ہو۔ پتا نہیں کدھر کدھر سے پانچ سات لوگ نکل آئے اور ہماری موٹر کے قریب جمع ہو گئے۔ باہر نکل کے دیکھا تو گاڑی کا اگلا حصہ بہت بُری طرح متاثر ہوا تھا۔ داہنی یعنی ڈرائیور والی سائڈ تو بالکل ہی تباہ ہو گئی تھی کیونکہ ٹکر سے بچنے کی کوشش میں یہی حصہ براہ راست ٹرک سے ٹکرایا تھا۔ میں نے پوری صورت حال کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بخاری صاحب کی غفلت ہی اصل میں ہمارے بچاؤ کا سبب بنی تھی۔ اگر وہ چند ثانیے پہلے ٹرک کو کاٹ کر سائڈ سے نکلنے کی کوشش کرتے تو اس وقت تک ہم سب فنا فی اللہ ہو چکے ہوتے کیونکہ ٹرک کے بعد صرف چار فٹ سڑک بچتی تھی اور اس کے بعد کوئی سو فٹ گہری کھائی تھی۔

تقدیر کے اس عجیب و غریب اتفاق پر حیران ہونے کے بعد ہم نے اپنی چوٹوں کا جائزہ لیا۔ حادثے کی شدت کے حساب سے ہماری چوٹیں بہت معمولی نوعیت کی تھیں۔ ضمیر صاحب کا سر شاید ونڈ سکرین سے یا چھت سے ٹکرایا تھا۔ وہ بھی تک ہکّے بکّے سے تھے۔ بقیہ تینوں اپنے پاؤں پر کھڑے تھے اور کل جسمانی نقصان چند خراشوں اور رگڑوں سے زیادہ نہ تھا۔ چند گھنٹے بعد میڈیکل ایڈ ملنے پر جب ضمیر جعفری صاحب پوری طرح حواسوں میں آ گئے تو انھوں نے بخاری صاحب کی ڈرائیونگ پر ایسا مزیدار تبصرہ کیا کہ وہ خطرناک حادثہ ایک دلچسپ واقعہ بن کر رہ گیا جس کے متعلق سوچ کر آج بھی ہنسی آجاتی ہے۔ کہنے لگے :

" بخاری صاحب، ہم نے تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ سکندرِ اعظم نے ہندوستان سے اپنا واپسی کا سفر اسی درّہ بولان کے راستے سے کیا تھا مگر قبلہ، آپ کی تیز رفتاری تو اس کی فوجوں کو بھی شرمندہ کر گئی ہے۔"

میں ابھی ذاکر اور بخاری صاحب میں مماثلتیں ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ موٹر ایک دھچکے سے رُکی اور ذاکر نے بتایا کہ ہم ایئر کینیڈا کے اڈے پر پہنچ گئے ہیں' آپ اُتریں' میں موٹر کھڑی کر کے آتا ہوں۔ ہم نے وقت کی تنگی کے پیشِ نظر اسے وہیں سے خدا حافظ کہنا چاہا مگر پھر خیال آیا اگر

واقعی فلائیٹ مس ہوگئی تو شاید ہمیں موٹر کی پھر ضرورت پڑے چنانچہ میں، پروین اور عالی صاحب کو اس گفت وشنید میں چھوڑ کر اور ان کی ٹکٹیں لے کر، ایر کینیڈا کے کاؤنٹر کی طرف بھاگا۔ ہماری فلائیٹ کے کاؤنٹر کے سامنے چار پانچ لوگ کھڑے تھے اور ایک خاصی گئی گزری سی عفیفہ انتہائی بیزاری سے انہیں بورڈنگ کارڈ دے رہی تھی۔ ایئر فرانس سے ایئر کینیڈا کا فرق صاف ظاہر تھا۔ اس اثنا میں پروین اور عالی صاحب بھی میرے ساتھ لائن میں لگ گئے تھے اور ہمارے بعد کوئی نہیں تھا۔ فلائیٹ کی رخصتی میں کل پندرہ منٹ تھے لیکن اس بی بی کے انداز و اطوار سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جہاز چلنے میں ابھی ایک دو دن کا وقت ہے۔ خدا خدا کر کے ہماری باری آئی مگر اس سے پہلے کہ وہ ٹکٹ میرے ہاتھ سے لیتی فون کا بزر بجا اور اس نے رسیور اٹھا کر فرانسیسی میں کسی سے بات شروع کی۔ اب پتا نہیں وہ بات ہی لمبی کر رہی تھی یا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کئی صدیوں کے بعد اس نے فون رکھا، ہم تینوں پر ایک مشتبہ سی نظر ڈالی اور ہمارے پاسپورٹ طلب کیے۔ عالی کے دو تین پاسپورٹ ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ اس نے عالی کی تصویر کی طرف دیکھا، پھر ہم تینوں پر نظر ڈالی اور پروین کی طرف انگلی کر کے بولی : "Is this your passport?"

کوئی اور وقت ہوتا تو پروین شاید اس طرح کے اشتباہ پر بہت زیادہ برا مانتی لیکن وہ یہ جملہ پی گئی اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی : "No, this is Mr. Aali's passport."

اب کے اس عفیفہ نے وہی مشتبہ نظر مجھ پر ڈالی مگر میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا تاکہ وہ عالی کو اچھی طرح دیکھ لے حالانکہ عالی کے پھیلاؤ کے پیش نظر اس کی ضرورت نہ تھی۔ گھڑی کی سوئی کے ساتھ ساتھ ہماری پریشانی بھی بڑھ رہی تھی مگر وہ ستمگر ایک پتھریلی اور برفیلی نظر کے ساتھ ہمارے پاسپورٹوں کو گھورے جا رہی تھی۔ عالی نے اپنا سائبیرین کوٹ کاؤنٹر پر رکھا اور اسے بتایا کہ ہمارے جہاز کی روانگی میں صرف دس منٹ رہ گئے ہیں۔ اب پتا نہیں یہ عالی کے کوٹ کا رعب تھا یا انگریزی کا، اس نے ہمارے پاسپورٹ کاؤنٹر پر رکھ دیے اور بورڈنگ کارڈ ٹائپ کرنے لگی۔ فون کا بزر پھر بجا۔ اس نے جلدی جلدی فرانسیسی میں کچھ کہا، بورڈنگ کارڈ میرے ہاتھ پر رکھا اور کسی انگریزی نما زبان میں کہا :

"جلدی کریں۔ جہاز ٹیک آف کے لیے تیار ہے۔"

وہ تو غنیمت تھا کہ کاؤنٹر سے جہاز تک کا فاصلہ بہت کم تھا۔ بس ایک گلی سی درمیان میں پڑتی تھی۔ ہوائی ٹریفک میں اضافے کے ساتھ ساتھ مسافروں کی سہولت کے لیے وقت اور فاصلے کے پیشِ نظر بڑے بڑے ہوائی اڈوں پر مختلف ہوائی کمپنیوں کے اپنے اپنے ٹرمینل بنا دیے گئے ہیں اور یوں ایک ہوائی اڈے کے اندر درجنوں چھوٹے چھوٹے ہوائی اڈے ہیں۔ آپ جس ایئر لائن پر سفر کر رہے ہیں اس کے مخصوص دروازے سے ایئر پورٹ میں داخل ہوں، باقی کی سب چیزیں (جہاز سمیت) آپ کے پاس پہنچ جائیں گی۔ خود کار سیڑھی نما کاریڈور ہوائی کمپنی کے ڈیپارچر لاؤنج سے سیدھا آپ کو جہاز کے اندر لے جاتا ہے۔ ہم افتاں و خیزاں جہاز کے دروازے پر پہنچے تو جہاز کا پورا عملہ جیسے ہمارے استقبال کے لیے جمع تھا۔ کاؤنٹر والی کی ایک ہم صورت مگر نسبتاً خوش مزاج ہمشیرہ نے ہمیں مسکرا کر خوش آمدید کہا اور بتایا کہ اسے ہمارے بارے میں اطلاع دی جا چکی ہے اور ہمارے لیے کوشر میل کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ میں نے اور پروین نے حیرت سے پہلے اس کی طرف اور پھر عالی کی طرف دیکھا۔ عالی نے کہا :

"گھبراؤ نہیں، یہ بتا رہی ہے کہ ہمارے لیے ذبیحہ گوشت کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ غالباً اشفاق نے ہمارے ٹکٹ کے ساتھ انسٹرکشن لکھوا دی ہوگی۔"

اس بار ہماری سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ تقریباً پانچ گھنٹے ہمیں سمندر کے اوپر پرواز کرنا تھا۔ میں نے ایک نظر جہاز پر ڈالی۔ خاصا درجہ دوم قسم کا جہاز تھا۔ میں نے کہا :

"عالی صاحب! مجھے یہ جہاز کچھ زیادہ قابلِ اعتبار دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے تو اپنے پی آئی اے کے جہاز بہتر ہیں۔ یہ تو فوکر فرینڈشپ کا بڑا بھائی لگتا ہے۔"

پروین نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سوال کیا : "لیکن ہماری پی آئی اے کا نام کہیں نظر نہیں آیا۔ ایئر کینیڈا اسے تو وہ بڑی ہی کمپنی ہوگی۔"

عالی نے کہا : "بی بی یہ یورپ ہے اور یہاں سے ہم امریکہ جا رہے ہیں۔ یہ اور ہی دنیا ہے۔ ہمارے باکمال لوگوں کی لاجواب پرواز مل ملا کر بیس پچیس جہازوں پر مشتمل ہے جب کہ صرف ایئر کینیڈا والوں کے تقریباً پانچ سو جہاز سروس میں رہتے ہیں اور اس طرح کی درجنوں کمپنیاں اس علاقے میں تیتروں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں۔"

پی آئی اے کی کوتاہ دامنی کا سُن کر پتا نہیں کیوں شرمندگی سی ہونے لگی چنانچہ میں نے ہوائی سفر سے متعلق لطیفے سنانے شروع کر دیے۔ تیسرے لطیفے پر جہاز نے ٹیک آف کیا اور پانچویں پر، ہمارے آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک گرگِ باراں دیدہ نے ہمیں اس طرح سے گھُور کر دیکھا جیسے اسے گوروں کی اس دنیا میں رنگ دار نسل کی ہنسی پسند نہ آئی ہو!

میں نے جواب میں گورے بابے کی طرف ایک دوستانہ مسکراہٹ پھینکی مگر اس کی بیزاری اور خشونت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ پائی۔ میرے دل میں پتا نہیں کیوں کچھ انتقامی قسم کے جذبات بیدار ہو گئے۔ میں نے سوچا: ہمارے اِرد گرد سبھی سیٹوں پر لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ آخر اس 'بابے' نے ہماری ہی طرف کیوں دیکھا ہے؟ اگلا لطیفہ میں نے آواز کا والیوم مزید بلند کر کے سنایا اور اس کا آخری حصّہ اور پنچ لائن انگریزی زبان میں سنائے تاکہ 'باباجی' کو معلوم ہو کہ ہمارے اور ان کے ٹکٹ کی قیمت ایک جتنی ہے اور یہ کہ لطیفے میں 'مغرب' کی تہذیب کا مضحکہ اُڑا کر اسے شرمندہ ہونے کا موقع دیا جائے۔ اب سوچتا ہوں تو وہ حرکت بڑی بچگانہ سی لگتی ہے مگر شاید یہی بچگانہ حرکتیں انسانی فطرت اور کردار کا اصل حُسن ہیں۔ میں نے اس وقت جو لطیفہ سنایا وہ اگرچہ پُرانا تھا مگر اس فرانسیسی بابے کے حوالے سے ہمارے دلی جذبات کا آئینہ دار تھا اس لیے مزا دے گیا:

ایک بار دو فرانسیسی نواب دریا کے کنارے سیرِ آب کا مزا لے رہے تھے۔ سامنے سے دو خواتین آتی نظر آئیں۔ ایک نواب نے مسکراتے ہوئے دوسرے کو آنکھ ماری اور کہا:

'وہ دیکھو، میری بیوی اور محبوبہ ایک ساتھ آ رہی ہیں۔'

'کمال ہے۔ کیسی عجیب بات ہے؟ میں بھی تمہیں یہی کہنے والا تھا۔' دوسرے نے جواب دیا۔

ایک تو میری آواز دانستہ طور پر بلند تھی اس پر اس بابے کے کان بھی ہماری طرف تھے، اس نے ایک غصیلی نگاہ مجھ پر ڈالی مگر میں اس اثناء میں دوسرا حملہ شروع کر چکا تھا:

پُرانے وقتوں میں انگریزوں کی ایک محفل میں 'واٹر لو' کی فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔ نپولین بونا پارٹ پر اپنی برتری اور فتح کے اظہار کے لیے مختلف لوگ باری باری بھُنے ہوئے سالم مُرغ

ہاتھوں میں تھام کر اُٹھتے اور مرغے کو دونوں ہاتھوں سے چیرتے ہوئے نعرہ لگاتے :
یُوں وہ نپولین بوناپارٹ کے نام سے بون۔اپارٹ Bone-apart. کی رعایتِ لفظی کا فائدہ اُٹھاتے ۔ جواب میں حاضرینِ محفل تالیاں بجا کر ان کو داد دیتے تھے ۔ آخر میں ایک بُڈھے سے ریٹائرڈ انگریز کی باری آگئی جو اس وقت تک گلے گلے وہسکی میں ڈُوب چکا تھا۔ موصوف اپنی جگہ سے لہراتے اور لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے ، مرغے کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اسے اپنے چہرے کے سامنے لائے مگر نشے کے زور میں یہ بھول گئے کہ اب انہیں کیا کہنا ہے، چند لمحے سوچتے رہے پھر مرغے کو چیرتے ہوئے بولے : نپولین۔۔۔!!

یا تو یہ لطیفہ اس بلبلے کی سمجھ میں نہیں آیا تھا ۔۔۔ یا وہ نپولین کے مخالفین میں سے تھا ۔۔۔ اور یا اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں جان بُوجھ کر اس طرح کے لطیفے سُنا رہا ہوں کیونکہ اس نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ یہ مسکراہٹ گویا صلح کی سفید جھنڈی تھی کیونکہ اس کے بعد اس نے اپنا دھیان سامنے کی طرف کر لیا اور سفر کے آخر تک پلٹ کر نہیں دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد فلم شروع ہو گئی ۔ ڈسٹن ہوفمین میرا پسندیدہ اداکار ہے اور اس کی اس فلم کی تعریف بھی خاصی سُن رکھی تھی اس لیے اگلے دو گھنٹے فلم دیکھنے میں گزارے ۔ یہ ایک ایسے اداکار کی داستان تھی جو غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا مالک تھا مگر اس پیشے سے متعلق ٹھیکیدار اسے خاطر میں نہیں لاتے تھے اور یوں وہ ایک ناکام اور مفلوک الحال اداکار کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک دن وہ ایک خاتون کا بہروپ بھر کر ایک ٹی وی سیریل میں سکرین ٹیسٹ کے لیے پہنچ جاتا ہے اور اس رول کے لیے منتخب ہو جاتا ہے۔ اس کا کردار ناظرین میں مقبول ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اسے مستقل طور پر وہ بہروپ اپنانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے کہانی میں بہت مزیدار سچوئیشنز پیدا ہوتی ہیں یہاں تک کہ اس سیریل کی ہیروئن، جس سے ڈسٹن عام زندگی میں محبت کرتا ہے، اسے اپنی سہیلی سمجھ کر اس کے سامنے لباس تبدیل کرتی اور اس کے ساتھ بیڈ میں سوتی ہے مگر وہ اسے بتا نہیں سکتا کہ وہ کون ہے۔ جب اس کے بہروپ کا راز کھلتا ہے تو سارا زمانہ اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا قایل ہو جاتا ہے ۔ وہ خاتون اس دھوکہ دہی کے انکشاف پر پہلے تو سخت ناراض ہوتی ہے مگر معاملے کی حقیقت جان کر اسے معاف کر دیتی ہے ۔ فلم کی کہانی ، پلاٹ اور تکنیکی

سائڈ پر کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر ڈسٹن ہوفمین نے جس خوبصورتی اور جزئیات نگاری کے ساتھ عورت کا کردار ادا کیا وہ اپنی جگہ پر اداکاری کا ایک معجزہ تھا۔ اس کا چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، بولنا، شرمانا، لڑنا جھگڑنا، آواز، انداز، لباس ہر چیز کمالِ فن کا شاہکار تھی۔ ہمارے یہاں بھی فلموں اور سٹیج پر کبھی کبھی مرد اداکار زنانہ رول ادا کرتے ہیں مگر ......

فلم ختم ہوئی تو میں نے اپنے ہم سفروں پر نگاہ ڈالی۔ دائیں یعنی پروین والے محاذ پر مکمل خاموشی تھی مگر بائیں طرف سے عالی کے خراٹے ایک مشینی تسلسل کے ساتھ جاری تھے۔ میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کر جہاز کے عقبی حصّے کی طرف چلا گیا۔ وہاں کھڑکی کے ساتھ ایک سیٹ خالی تھی وقت گزارنے کے لیے میں وہاں بیٹھ گیا اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف ایک عجیب سی سفیدی تھی جیسے ہم روئی کے گالوں میں پرواز کر رہے ہوں۔ جہاز چونکہ بہت زیادہ بلندی پر اُڑ رہا تھا اس لیے بادلوں اور سمندر کے رنگ آپس میں گھُل مل گئے تھے اور کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ جو سفید سی چادر نظر آ رہی ہے یہ اصل میں کیا ہے! میں نے سوچا: یہ عمرِ رواں کا سفر بھی تو ایسا ہی ایک دھند لکا سا ہے۔ اپنا ایک شعر یاد آگیا:

زمیں کی قید میں، مَیں ہوں، یہ میری قید میں ہے
کہاں پہ گھر ہے، کہاں ہے قفس؟ نہیں معلوم!

اس اتنی بڑی کائنات میں یہ جہاز کس قدر معمولی اور بے وقعت چیز ہے۔ یہ چار پانچ سو دو ٹنگے جاندار، جو اس میں بیٹھے ہیں، اس کائنات کے تناظر میں حشرات الارض سے لاکھوں گُنا چھوٹے اور بے وقعت ہیں مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مکمل کائنات ہے اور ان میں سے ہر ایک کے شعور میں اس کائنات کا اپنا ایک جداگانہ عکس ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ جہاز، جس میں مَیں اس وقت بیٹھا ہوں، یہ کس مکان اور زمان میں چل رہا ہے! چل بھی رہا ہے یا نہیں!

اس بنیادی سوال کی فلسفیانہ گھمبیرتا میں ایک دم مجھے اپنی بیٹی روشین کا وہ معصومانہ جملہ یاد آیا جو اس نے اپنے پہلے ہوائی سفر کے دوران کہا تھا۔ اس کی عمر اس وقت تین برس تھی۔ جہاز لاہور سے کراچی جا رہا تھا۔ جب اس کی اڑان میں ہمواری آئی تو کچھ دیر وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھتی رہی پھر

بڑے تشویش آمیز لہجے میں بولی :

"پاپا ــــ یہ جہاز چلتا کیوں نہیں ہے۔"

نیوٹن کے حرکت اور رفتار کے کُلیے پڑھنے کے بعد ہو سکتا ہے آئندہ چند برسوں میں اسے اس سوال کا جواب مل جائے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس اس سوال کا جواب اب بھی نہیں ہے۔

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں ، سو وہ بھی کیا معلوم !

اس وقت میرا جی بے حد چاہ رہا تھا کہ کائنات کی اس وسعت، ہمہ گیریت اور پُراسراریت پر کسی ایسے شخص سے بات کروں جس کی دلیل دماغ میں اُٹھنے والے سوالوں کے اس طوفان کو کسی ساحل سے ہمکنار کر دے مگر اس وقت میں خدا کی اتنی بڑی کائنات اور جہاز کے پانچ سو مسافروں میں اکیلا آدمی تھا ــــ اکیلا اور تنہا !!

یکدم جہاز کو جھٹکا سا لگا اور دُور نیچے مجھے سمندر کی ایک جھلک دکھائی دی۔ آسمان اور سمندر دونوں میری کمزوری ہیں۔ ان کی دہشت اور پہنائی میں اپنے ہونے کا احساس ہمیشہ مجھے ایک عجیب نشاط آمیز اُلجھن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ مجھ سے پہلے کتنے لوگوں نے یہ باتیں سوچی ہوں گی اور میرے بعد نجانے کتنی مخلوقِ خُدا اسی تذبذب کی گزرگاہ میں خیمہ زن ہو گی۔ غالب نے جو ہر آدمی کو 'بجائے خود اِک محشرِ خیال' کہا تھا تو وہ محض شاعرانہ ترنگ نہیں تھی۔ کیسی عجیب بات ہے، ہر آدمی ایک ہی 'خیال' سوچتا ہے مگر خیال پھر بھی نئے کا نیا رہتا ہے۔ یہ آدمی ہیں جو پُرانے ہوتے اور مٹتے رہتے ہیں :

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ اُس کی رہ گزر پھر بھی

مونٹریال - ۱

جہاز کے مونٹریال کی فضا میں پہنچنے کا اعلان ہوا تو جیسے جانِ تازہ جہان میں آئی۔ سیٹیں سیدھی ہونے لگیں۔ بوڑھی میموں نے اپنے بیگ کھولنے شروع کیے اور "آرائشِ خمِ کاکل" میں مصروف ہو گئیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کو دیکھ کر "اندیشہ ہائے دُور و دراز" کی جگہ کچھ اور قسم کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ جہاز ایک طرف کو جُھکا اور کئی ہاتھوں سے آئینے، لپ سٹکیں اور ہیئر برش گر پڑے۔ بہت سی خجالت آمیز مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور منزل کے قرب کی گرمی سے جہاز کے اندر کا درجۂ حرارت ایک دم بڑھ سا گیا۔

کراچی سے چلے ہوئے ہمیں تقریباً پچیس گھنٹے ہو چکے تھے مگر جہاز والوں کی اناؤنسمنٹ کے مطابق ہم ابھی تک تیرہ تاریخ میں تھے۔ پیرس سے مونٹریال تک چار گھنٹے مزید حساب کتاب کی نذر ہو گئے تھے، یعنی اب کل ملا کر ہم نو گھنٹے کہیں گم کر چکے تھے۔ چند برس پہلے میں نے ایک غزل کہی تھی جس میں دو شعر وقت کے اُلٹ پھیر کے حوالے سے تھے مگر اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن ان کا یہ پہلو بھی سامنے آئے گا :

گُزر گیا جو زمانہ اسے بُھلا ہی دو
جو نقش بن نہیں سکتا، اُسے مٹا ہی دو
گُزر رہا ہے جو لمحہ اسے امر کر لیں
مَیں اپنے خُون سے لکھتا ہوں، تم گواہی دو

مونٹریال میں متوقع سردی اور عالی صاحب کی ہدایات کے پیشِ نظر ہم نے خاصے گرم کپڑے لاد رکھے تھے مگر ایئر پورٹ کے شیشوں سے باہر کے منظر میں غیر معمولی سردی کا کوئی تاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اوور کوٹ کے بٹن بند نہیں کیے اور سامان کی ٹرالی پکڑ کر باہر کی طرف

چلنا شروع کیا۔ عالی حسبِ معمول اپنے بریف کیس کو بغیر کسی وجہ کے کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھے۔ جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو میں بیرونی دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ عالی تقریباً چیخنے کے انداز میں بولے:

"اے بھائی۔۔۔۔ اے بھائی امجد صاحب۔ خدا کا خوف کرو ۔۔۔ یہ کوٹ کے بٹن بند کرو اور مفلر لپیٹو ۔۔۔" اگرچہ اردو کی یہ بات چیت وہاں کسی کے پلّے نہیں پڑ سکتی تھی مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سب لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ڈھیٹ بن کر کہا:

"کچھ نہیں ہوتا، عالی صاحب، کوئی خاص سردی نہیں ہے ۔۔۔ وہ دیکھیے لوگ ایک کوٹ میں پھر رہے ہیں۔"

"وہ یہاں کے رہنے والے ہیں بھائی، تم گرم ملک سے آ رہے ہو اور گزشتہ پچیس گھنٹوں سے ایک معتدل درجۂ حرارت میں سفر کر رہے ہو، آپ کو اندازہ نہیں کہ یہ فوری ایکسپوزر آپ کو کن کن مسائل میں مبتلا کر سکتا ہے۔"

میرا پھر جی چاہا کہ میں عالی صاحب کو ان کی اور اپنی عمر کے بیس برسوں کا فرق بتاؤں مگر ان کے لہجے میں ایسی محبت اور اپنائیت تھی کہ میں نے محض ان کی تشویش رفع کرنے کے لیے ان کی تمام ہدایات مان لیں۔ مجھ سے فارغ ہو کر وہ پروین کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اس دوران میں احتیاطی تدابیر کے طور پر اپنے آپ کو اچھی طرح لپیٹ چکی تھی۔ عالی نے اس کی طرف دیکھ کر اطمینان آمیز انداز میں سر ہلایا اور کہا: "میاں، تم سے تو یہ خاتون ہی زیادہ عقل مند ہے حالانکہ مجھے تمہاری نسبت ان سے ایسی بات کی توقع بہت کم تھی ۔۔۔"

پروین شاید بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے اس نے اس مشروط تعریف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ہم ایئرپورٹ سے باہر نکل آئے جہاں ہمارے بنیادی میزبان اردو انٹرنیشنل کے اشفاق حسین اپنے ساتھیوں سمیت ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اشفاق ٹورنٹو میں قیام پذیر ہے اور اس پروگرام کی تمام تر تفصیلات اور تیاری اسی نوجوان کی مساعی کا نتیجہ تھیں۔ اشفاق سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۶ء میں کراچی آرٹس کونسل میں ہوئی تھی جہاں وہ پروگرام آفیسر تھا اور ان دنوں اس کا نام اشفاق شفق زیدی ہوا کرتا تھا۔ ان آٹھ برسوں میں اس کی شکل و

صُورت میں سر کے بالوں میں معمولی سی کمی کے علاوہ کوئی واضح تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پروین کی نظر بھی غالباً سب سے پہلے اشفاق کے بالوں پر پڑی کیونکہ اس نے اسے دیکھتے ہی میرے کان میں کہا :

"ارے ـــــ یہ اشفاق کو کیا ہوا ؟ یہ تو آپ کا ہم زُلف بنتا جا رہا ہے۔"

اس کے بعد معانقوں اور مصافحوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پچیس گھنٹے کے سفر کی تھکن کے بعد دماغ کچھ ایسا سُن سا ہو رہا تھا کہ کوئی بات ٹھیک سے پلّے نہیں پڑ رہی تھی۔ اشفاق کے تعارف کروانے کے دوران میں نے بہتیری کوشش کی کہ who is who (ہُو اِز ہُو) کی نشاندہی کر سکوں مگر جسمانی سُستی، اشفاق کی تیز گفتاری اور مصافحوں کی کثرت نے ہر چیز گڈ مڈ کر دی تھی۔ ان مصافحوں پر مجھے اپنے عزیز دوست، ڈراما نگار، اداکار اور ریڈیو پروڈیوسر جمیل ملک کے دفتر کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے مگر اس سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ اس جمیل ملک کا ہمارے راولپنڈی کے بزرگ شاعر اور دوست جمیل ملک سے کوئی تعلق نہیں، یہ اور بات ہے ریڈیو والے جمیل ملک کو شاعر جمیل ملک کی غزلوں کی داد اکثر ملتی رہتی ہے اور وہ اس داد کو نہائی مروّت اور احسان مندی کے ساتھ وصول بھی کرتا ہے۔ شاعر جمیل ملک اس طرح کی صُورتِ حال میں کیا کرتے ہیں، اس کا پتا نہیں۔ تو وہ واقعہ کچھ یوں ہے کہ جمیل ملک کے ریڈیو سٹیشن والے کمرے میں ہاؤس فُل تھا۔ کوئی بارہ تیرہ کے قریب دوست جمع تھے جس کی وجہ سے کُرسیاں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہی تھیں اور گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا۔ ایسے میں ایک دیہاتی سا فن کار اپنے دس بارہ سال کے بیٹے کے ساتھ اندر آیا اور باری باری سب سے ہاتھ ملانے لگا۔ اس کے اس عمل کی وجہ سے کمرے میں ایک افراتفری سی مچ گئی مگر کرسیوں کے اُوپر سے اور میز کے نیچے سے کسی نہ کسی طرح اس شیر مرد نے کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں سے ہاتھ ملا ہی لیا۔ اس کے بعد وہ جمیل ملک کی طرف اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے متوجہ ہوا مگر کچھ سوچ کر ایک دم رُکا اور مڑ کر اپنے بیٹے سے کہنے لگا : "مصافحہ کرا دیے۔"

اب بیٹے نے وہی مشق دہرانا شروع کی اور کرسیوں اور ٹانگوں سے بچتا بچاتا، اُلجھتا، گرتا اور سنبھلتا ہوا بالآخر تمام حاضرین سے ہاتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں

جمیل ملک اور اس لوک فن کار کے مذاکرات ختم ہو گئے تھے چنانچہ اب اس نے واپسی مصافحے شروع کیے۔ اس مضحکہ خیز صورت حال میں ہم سب، جو اپنے تئیں بڑے 'مذاقیے اور مخولیے' بنتے تھے، بے بسی کی تصویر بن چکے تھے۔ خدا خدا کر کے اس کے مصافحے ختم ہوئے مگر ابھی ہمارے اطمینان کا سانس خارج بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر اس آدمی نے خشونت بھری نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور سرزنش کے انداز میں کہا: "مصافحہ کراوئے"

معلوم ہوا کہ سب سے پہلے ہم آفاق حیدر صاحب کی طرف جائیں گے جہاں چائے پینے کے بعد تھوڑی دیر آرام کریں گے، اس کے بعد کھانا ہوگا، محفل جمے گی، مقامی ریڈیو کے لیے ہمارے انٹرویوز ریکارڈ کیے جائیں گے اور کچھ لوکل صحافی ہم سے مختلف ادبی مسائل پر بات چیت کریں گے۔

میں نے اور پروین نے رحم طلب نظروں سے عالی صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کی اپنی حالت بھی خاصی خراب ہو رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی کہ وہ ابھی ان بلاؤں کو ٹالنے یا کم کرنے کے لیے کچھ اقدام کرتے ہیں۔

مجھے اور عالی کو شبیر صدیقی کی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ پروگرام یہ بنا کہ شبیر ہمیں آفاق حیدر صاحب کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد ہمارا سامان اپنے گھر پہنچا دیں گے کیونکہ ہم دونوں کو انہی کے ہاں قیام کرنا تھا۔

ایئرپورٹ سے نکلے تو نکلتے ہی چلے گئے کیونکہ ہمارے میزبانوں کے گھر ایئرپورٹ سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر تھے۔ زندگی میں پہلے بھی کئی بار ایک دو راتیں مسلسل جاگنے کا اتفاق ہوا ہے مگر جیسی تھکن، سستی اور بوجھل پن اس وقت محسوس ہو رہا تھا وہ میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ ہمارا میزبان ہم سے باتیں کرنا چاہتا ہے، مگر نیند تھی کہ صفیں باندھے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میں شبیر کی باتوں کے 'ہوں' 'ہاں' میں جواب دیتا رہا اور اس دوران میں غالباً کئی بار ایک ایک دو دو منٹ کے لیے سویا بھی کیونکہ گفتگو کا سرا میرے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے عالی سے اپنی کیفیت بیان کی تو بولے:

"اسی کو Jet lag کہتے ہیں۔ یہ کیفیت ابھی کافی دیر رہے گی اور جب تک آپ ایک

بھرپور نیند نہیں لیں گے یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔"

موٹر اب رہائشی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے یک منزلہ گھروں میں لکڑی کا وافر استعمال تھا۔ ہر مکان کے آگے چھوٹا سا ڈھلوان نما ٹکڑا تھا جس پر غالباً گھاس ہوگی مگر اس وقت ان پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ سڑک صاف تھی مگر کاروں پر برف کی ڈھیریاں میر حسن کی مثنوی والے مولسری کے پھولوں کی یاد دلا رہی تھیں:

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے بھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

آفاق حیدر کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ پروین ہم سے پہلے نہ صرف پہنچ چکی ہے بلکہ بیڈ روم میں جا کر اس نے دروازہ بھی بند کر لیا ہے اور یہ تاکید کی ہے کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے، وہ سونا چاہتی ہے۔ عالی نے شکایتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا:

"بھئی آپ اپنی اس خواہرِ عزیزی کو سمجھائیں۔ یہ لوگ یہاں ہمارے استقبال کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ تھکن اپنی جگہ مگر دنیا داری بھی تو نبھانی پڑتی ہے۔"

میں نے کہا: "عالی جی، اسے کچھ دیر آرام کر لینے دیں۔ وہ تو بے چاری یوں بھی نازک اور دھان پان سی ہے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ مجھے لوگوں کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے۔"

آفاق حیدر سے تعارف ہوا۔ موصوف انڈین سول سروس میں تھے، لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں اور عرصہ بارہ برس سے مونٹریال میں یہاں کے ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ آفاق صاحب دبلے پتلے سے کم گو قسم کے آدمی تھے۔ شروع میں تو میں ان کی کم گوئی کو ان کی سول سروس کا تحفہ سمجھتا رہا مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ اس میں ان کے گریڈ سے زیادہ ان کی طبیعت کا دخل ہے۔ بیگم آفاق لکھنؤ گئی ہوئی تھیں۔ ان کی واپسی ایک ہفتے تک متوقع تھی۔ آفاق صاحب نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اپنے برِصغیر کی طرح یہاں مرد لوگ چائے روٹی کے لیے عورتوں کے محتاج نہیں ہوتے کیونکہ یہ سب کام انہیں سیکھنے پڑتے ہیں۔ چائے کی میز پر اشیائے خورد و نوش کی افراط دیکھ کر ہمیں آفاق کے سگھڑ پن کا اندازہ ہوا۔ میں نے کہا:

"اگر یہ سب کچھ آپ نے خود تیار کیا ہے تو آپ کی بیگم کو مبارکباد دینی چاہیے۔ ماشاءاللہ آپ تو امورِ خانہ داری میں سگھڑ بیبیوں کو بھی مات کرتے ہیں۔"

جی تو چاہ رہا تھا کہ ان سے سلائی کڑھائی اور کشیدہ کاری کے بارے میں بھی دریافت کرتا مگر پہلی ملاقات کی جھجک اور وجود میں اُترتی ہوئی تھکن آڑے آگئی۔

ابھی ہم لوگ چائے کی میز پر ہی تھے کہ کچھ اور لوگ آگئے۔ غالباً انہیں فون پر ہمارے آنے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ مصافحوں کا ایک اور دَور چلا، مسکراہٹوں کے تبادلے ہوئے اور مختلف النوع قسم کے سوالات کا سلسلہ ایک بار پھر جاری ہوگیا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے شبیر صدیقی کا جس نے غالباً ہماری حالت کا اندازہ کرلیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ ابھی اس کے ساتھ چلیں، کچھ دیر آرام کریں اور پھر نہا دھوکر اور فریش ہوکر کھانے کے وقت یہاں پہنچ جائیں۔ حاضرینِ محفل نے ہماری طرف دیکھا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ اس طرح ہمارا جانا اخلاقی اعتبار سے کچھ ایسا مستحسن نہیں مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ اگر اخلاق کا دامن تھامے رکھتے تو ہوش کا دامن ہاتھوں سے نکل جانے کا ڈر تھا۔

شبیر کے گھر پر اُس کی فرانسیسی نژاد نو مُسلم کینیڈین بیوی فرانسین فائزہ صدیقی ہماری منتظر تھی۔ فرانسین اُس کا خاندانی، فائزہ اسلامی اور صدیقی ازدواجی نام تھا۔ خوش مزاجی اُس خاتون کے چہرے پر جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ اُس نے بڑی دلچسپ اُردو میں ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہمارے کمرے اُوپر والی منزل میں تھے۔ اُس نے ہمیں اُن کے بارے میں یُوں اطلاع دی۔ افسوس کہ لہجہ نقل نہیں ہوسکتا:

"آپ کے کمرے اُوپر تیار ہیں۔ آپ سب سے پہلے آرام کرنا پسند کریں گے یا کچھ پینا ہے؟ چائے بھی تیار ہے اور کافی بھی، جوس بھی مل سکتا ہے۔"

ہم نے آرام کرنے کا عندیہ ظاہر کیا تو فائزہ نے رُوئے سخن اپنے شوہر کی طرف موڑا:

"آپ کچھ پییں گے، میاں صاحب!"

ایک میم کے منہ سے 'میاں صاحب' کے الفاظ نے کچھ ایسا مزا دیا کہ چند لمحوں کے لیے

میری تھکن جیسے غائب ہی ہو گئی۔ میں نے پہلی بار شبیر کے گھر کا غور سے جائزہ لیا۔ خوبصورت، صاف ستھرا، آرام دہ اور محبت کی خوشبو سے مہکتا ہوا یہ گھر اپنے اندر اپنائیت کی ایک عجیب سی مہک لیے ہوئے تھا۔ ہر چیز میں ایک 'نکھ' سا تھا اور میزبانوں کے رویے میں ایسا گہرا خلوص تھا جو صرف اچھی رُوحوں سے مخصوص ہے۔

کھانے کا وقت آٹھ بجے تھا اور اس وقت پونے سات ہو رہے تھے۔ عالی نے کہا:

"مجھے آپ کی تھکن کا اندازہ ہے مگر اپنے بیس سالہ غیر ملکی سفروں کے تجربے کی بنیاد پر میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس وقت سونے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اس صورت میں آپ آفاق کے کھانے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔"

اس متوقع صورتِ حال کا کچھ کچھ اندازہ مجھے بھی تھا چنانچہ ہم نے تیز اور گرم کافی سے اپنی سستی کو بھگانے کا پروگرام بنایا اور منہ ہاتھ دھو کر شبیر کے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھ گئے۔ فائزہ کافی بنانے میں مصروف ہو گئی اور شبیر کیمرہ لے آیا۔ گرم گرم کافی، فوٹوگرافی اور فرانسین کی اُردو اور پنجابی کی خوشگواری میں سوا گھنٹہ گویا پلک جھپکنے میں گزر گیا۔ ویسے وقت کے یوں بے وقت گزر جانے پر سب سے اچھا تبصرہ ایک سردار جی کا ہے:

دو سردار جی ریلوے سٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ اُن کی مطلوبہ ٹرین چار گھنٹے لیٹ ہے۔
ایک نے کہا: چلو واپس چلتے ہیں، پھر آجائیں گے۔ اس پر دوسرے نے کہا:
"چھوڑو یار، چار گھنٹے کا کیا ہے؟ گپ شپ کرتے ہیں، پانچ منٹ میں گزر جائیں گے۔"

آفاق حیدر کے گھر دوبارہ پہنچے تو وہاں جیسے میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی تیس کے قریب احباب جمع تھے۔ پروین کا پتا کرایا گیا مگر اس نے اُٹھنے سے صاف انکار کر دیا۔ عالی صاحب اس بات پر بہت جھلائے مگر میں نے انہیں ایک بار پھر پروین کے خاتون ہونے، دھان پان ہونے اور تھکا ہوا ہونے کا حوالہ دیا اور یوں یہ بات آئی گئی ہو گئی۔

کھانے کے بعد ریڈیو انٹرویو کا سلسلہ شروع ہوا۔ انٹرویو کرنے والے صاحب کا تعلق غالباً ادب اور ریڈیو کے علاوہ ہر چیز سے تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں اُن کی کھانے کے دوران کی جانے والی گفتگو سے ہی ہو گیا تھا مگر اب جو انہوں نے انٹرویو شروع کیا تو ہمیں اُن کی معلومات اور

صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہُوا۔ موصُوف کو کینیڈا میں آباد ہوئے تقریباً بیس برس ہو چکے تھے اور وطن کے حالات، ادب، فنونِ لطیفہ اور معاشرتی تبدیلیوں کے بارے میں اُن کی بے خبری کی عمر بھی تقریباً اسی قدر تھی۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو ادب و فن پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ یہ رٹا رٹایا جملہ ضرور بولتے ہیں کہ فن کار اور مفلسی لازم و ملزوم ہیں اور یہ کہ اعلیٰ فن کی تخلیق کے لیے فنکار کا بُرے حال اور بانکے دیہاڑے ہونا ضروری ہے چنانچہ انہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز جس جملے سے کیا وہ کچھ یوں تھا :

" میں آپ کو مونٹریال میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب شاعر لوگ ہوائی جہازوں پر سفر کرنے لگے ہیں اور انہیں اتنی دُور دُور بلایا جاتا ہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے ؟"

میرے تو جیسے سر میں لگی اور تلووں میں بُجھی۔ میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا :

" جی ہاں ، اصل میں آپ احباب جب تلاشِ معاش کے لیے وطن سے نکلے ہیں اور روٹی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان علاقوں میں آباد ہوئے ہیں تو آپ کے اندر کی تہذیبی پیاس نے فنکاروں کے اس طرح کے دوروں کو ممکن بنا دیا ہے۔"

میرا جملہ شاید میری مسکراہٹ کے باوجود زیادہ تیز تھا کیونکہ اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی جس کے دوران ٹیپ کے چلنے اور عالی جی کے ہنکاروں کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

آفاق حیدر نے اپنی سول سروس کی ٹریننگ کو کام میں لاتے ہوئے ایک گول مول سی تقریر کی جس کا مفہوم غالباً یہ تھا کہ انٹرویو کرنے والے صاحب کے جملے کا مطلب وہ نہیں تھا جو ہم سمجھے ہیں بلکہ وہ لفظ کے غلط انتخاب کی وجہ سے وہ کچھ کہہ گئے ہیں جو وہ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ ہمارا ارادہ بھی محاذ آرائی کا نہ تھا اس لیے میں نے ایک خوش دلانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کی وضاحت کو قبول کر لیا لیکن ابھی مسکراہٹ میرے چہرے پر ہی تھی کہ وہ صاحب پھر بولے، کہنے لگے :

" آفاق صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میرا اشارہ آپ لوگوں کی طرف نہیں تھا۔ آپ تو ہمارے عزیز مہمان ہیں۔ میں تو شاعروں کی بات کر رہا تھا۔"

اب معلوم ہوا کہ 'عذرِ گناہ بدتر از گناہ' کا اصل مطلب کیا ہے۔

عالی کو ایک جھرجھری سی آئی۔ انہوں نے جلدی جلدی انگلی دانتوں پر پھیری اور ان صاحب سے براہِ راست سوال کیا:

"آپ کو پتا ہے ہم لوگ کون ہیں اور یہاں کس لیے آئے ہیں؟"

"جی کیوں نہیں؟ آپ ماشاء اللہ اتنے مشہور شعراء حضرات ہیں اور شمالی امریکہ میں مشاعرے پڑھنے آئے ہیں۔" وہ صاحب بولے۔

"تو پھر آپ کن شاعروں کی بات کر رہے تھے؟"

عالی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اول تو وہ بحث میں شامل نہیں ہوتے لیکن اگر ہو جائیں تو پھر کسی قسم کی رُو رعایت نہیں کرتے چنانچہ جوں جوں وہ صاحب اپنی بات کی وضاحت اور اپنے دفاع میں دلیلیں دیتے توں توں عالی کے حملوں کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

اس عذرِ گناہ پر مجھے ریڈیو سٹیشن، لاہور کا ایک واقعہ بہت یاد آیا کیونکہ اس میں بھی عذرِ گناہ ایسا ہی بدتر از گناہ تھا۔

پاکستان ٹائمز، لاہور کے حمید شیخ مرحوم روزانہ رات کو ریڈیو سے خبروں پر انگریزی میں تبصرہ کیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے پہنچتے، ڈیوٹی افسر سے اپنے سکرپٹ کا مسودہ لیتے اور اسے live broadcast کرا دیتے۔ ایک دن وہ پہنچے تو ڈیوٹی افسر نیا تھا اور ایک چپڑاسی پر اپنی افسری کا رعب جھاڑ رہا تھا۔ اس نے اشارے سے حمید شیخ کو ایک طرف بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر چپڑاسی کو ڈانٹنے لگا۔ پروگرام شروع ہونے میں دو منٹ رہتے تھے، حمید شیخ نے کہا:

"دیکھنا بھائی، یہاں میرا اسکرپٹ ہوگا!"

ڈیوٹی افسر نے ایک خشونت بھری نگاہ حمید شیخ پر ڈالی اور سرزنش کے انداز میں بولا:

"آپ سے کہا ہے وہاں تشریف رکھیں، میں فارغ نہیں بیٹھا ہوا، ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔"

حمید شیخ مرحوم بڑا خوش شکل اور طرح دار آدمی تھا۔ اس کی شخصیت میں ظاہری اور

باطنی دونوں طرح کا رکھ رکھاؤ تھا۔ اس نے بڑی مشکلوں سے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہنا شروع کیا: "بھئی میرے پاس وقت بہت کم ہے، آپ مہربانی کر کے ......"

ڈیوٹی افسر نے بڑی رکھائی سے جواب دیا: "وقت کم ہے تو پھر کسی وقت آ جائیے گا۔"

حمید شیخ یہ سن کر وہاں سے اٹھا اور سیدھا گھر چلا آیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سٹیشن ڈائریکٹر کو فون کیا اور سارا واقعہ سنایا۔ سٹیشن ڈائریکٹر نے اسی وقت دفتر پہنچ کر ڈیوٹی افسر کو لائن حاضر کر دیا۔

ڈیوٹی افسر نے بتایا کہ حمید شیخ نامی ٹیلنٹ اپنا سکرپٹ پڑھنے ریڈیو اسٹیشن نہیں پہنچا تھا چنانچہ اس نے تبصرے کی جگہ ساز ینہ چلا کر وقت پورا کر لیا ہے اور اس کی تحریری رپورٹ بھی لکھ دی ہے۔ جواب میں اس کے ساتھ جو ہوئی اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ صرف حمید شیخ کی معافی ہی اس کی نوکری بچا سکتی ہے کیونکہ ریڈیو کو اس کی سروسز کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

دوستوں نے سمجھایا کہ فوراً جاؤ اور حمید شیخ کے پاؤں پڑ جاؤ۔ وہ شریف آدمی ہے، ضرور معاف کر دے گا۔ ان کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سٹیشن ڈائریکٹر کو حمید شیخ کا فون آیا۔ اس نے تقریباً رونے والی آواز میں کہا: "بھائی میں نے تمہارے اس افسر کو معاف کیا۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ بس تم اسے کسی طرح فوراً واپس بلا لو۔ اس سے کہو میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" سٹیشن ڈائریکٹر نے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے؟" حمید شیخ نے زچ ہوتے ہوئے کہا، "تمہارا یہ افسر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ دراصل سارا دن مختلف قسم کے میوزیشن، ریڈیو میں کام لینے کے شوقین اور میراثی لوگ آتے رہتے ہیں جن کو نہ عقل ہے نہ موت۔ سوائے ڈیوٹی روم میں بیٹھ کر بک بک کرنے کے انہیں اور کوئی کام نہیں۔ وہ سمجھا کہ میں بھی ......"

وہ صاحب عالی جی کے مغلیہ حملوں سے بچنے کے لیے بار بار پینترے بدل رہے تھے مگر بات کچھ بن نہیں رہی تھی۔ قریب تھا کہ انٹرویو اسی مباحثے کی نذر ہو جاتا کہ علی سردار جعفری

کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ہم سے دو گھنٹے پہلے والی فلائٹ سے براستہ لندن بمبئی سے یہاں پہنچے تھے اور آتے ہی سو گئے تھے۔ ان کے آنے پر ریکارڈنگ روک دی گئی اور تعارف وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی وجہ سے گفتگو کا رُخ بدل گیا اور انٹرویور صاحب کا گناہ اور عذرِ گناہ آئی گئی بات ہو گئے۔

علی سردار جعفری سے یہ میری پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ ۱۹۷۷ء میں وہ اور جگن ناتھ آزاد اقبال کانگریس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ بہت سے ریٹائرڈ اور راز کار رفتہ قسم کے ترقی پسندوں کے جلو میں وہ نئی نسل کے جوشیلے انقلابیوں سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے انداز میں ایک مخصوص خاکسارانہ سی رعونت تھی اور وہ لوگوں سے ایسے مشینی انداز میں ہاتھ ملا رہے تھے کہ ان کا جملہ کہیں ٹوٹتا نہ تھا اور نہ ہی ان کی آنکھوں یا چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی پیدا ہوتی تھی۔ مجھے ان کی یہ بات اچھی نہیں لگی چنانچہ میں دو منٹ کے بعد چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا تھا۔ ظاہر ہے انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑا ہو گا۔

پہلی ملاقات کی اس سرد مہری کی یاد شاید میرے لاشعور میں کہیں موجود تھی چنانچہ میں نے ہاتھ ملاتے وقت کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ جعفری صاحب نے مخصوص انداز میں اپنے لمبے سفید بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا: "ارے بھائی، آپ تو بہت نوجوان آدمی ہیں، میں تو سمجھا تھا آپ کوئی مولانا وغیرہ قسم کی چیز ہوں گے۔ اُوپر سے آپ نے اپنے نام کے ساتھ بھی اسلام لگا رکھا ہے۔"

میں نے کہا: "جعفری صاحب! میری عمر چالیس برس ہے، لیکن اگر اس کے باوجود میں آپ کو نوجوان نظر آرہا ہوں تو اس کا کریڈٹ مجھ سے زیادہ آپ کے حسنِ نظر کو جاتا ہے۔"

"اور عمر کو بھی۔" عالی نے مسکراتے ہوئے لقمہ دیا۔ "کیونکہ آپ کی پیدائش سے پہلے یہ دو کتابیں لکھنے کے علاوہ تین دفعہ جیل کاٹ چکے تھے۔"

معلوم ہوا کہ چند دن بعد جعفری صاحب کی بہترویں سالگرہ آرہی ہے جس کے سلسلے میں ان کے ساتھ ٹورنٹو میں ایک خصوصی شام کا اہتمام کیا جارہا ہے۔

جعفری صاحب سے یہ ملاقات اس تعلق کا ایک خوبصورت آغاز تھی جو بعد کے پانچ

ہفتوں میں مزید محکم، دیرپا اور حسین تر ہوتا چلا گیا اور جواب ایک مستقل ادبی دوستی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ آدمی کی اصلیت کا پتا اس کے ساتھ جیل کاٹ کر یا سفر کرنے سے ہی چل سکتا ہے۔ علی سردار جعفری کا نام اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ ہندوستان کی حکمران جماعت کے ساتھی سمجھے جاتے ہیں اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مرکزی تنظیم نے ان کی بنیادی رُکنیت بھی ختم کر دی ہے مگر اب بھی 'روس نواز کمیونسٹ' اور 'ترقی پسند' کے لیبل ان کے نام کا حصہ سمجھے جاتے ہیں اور ترقی پسند ادب خصوصاً تنقید کے حوالے سے وہ اس وقت زندہ لوگوں میں سب سے زیادہ بزرگ اور سینئر ہیں۔

جعفری صاحب نے آتے ہی گفتگو کا رُخ اپنی طرف موڑ لیا اور یوں ہمیں ان صاحب کے سوالات سے نجات مل گئی جو اوور سمارٹ بننے کے چکر میں نکو بن رہے تھے۔

جعفری صاحب کسی سنجیدہ ادبی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ تمام حاضرین بڑے ادب، احترام اور دلچسپی سے ان کی باتیں سُن رہے تھے لیکن یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابلاغ کا پرندہ ان کے سروں کے اُوپر سے گزرتا جا رہا ہے۔ مجھے مولانا حالی کی ایک بڑی دلچسپ اور غیر معروف نظم یاد آئی جس میں انہوں نے ایک انگریز افسر کی تقریر کا نقشہ کھینچا ہے:

اے بزمِ سفیرانِ دول کے سخن آرا،
ہر خُرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں سے
اک مُرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

قصور نہ جعفری صاحب کا تھا اور نہ ان بے چاروں کا۔ سارا فساد اس تہذیبی خلا کا تھا جسے زمانی اور مکانی فاصلوں نے دھند کی طرح چاروں طرف پھیلا دیا تھا۔ وطن سے دس سے بیس برس تک کی جُدائی اور دس ہزار میل کی دُوری میں رہنے والے یہ لوگ زیادہ تر یا تو سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے یا کاروبار کے سلسلے میں یہاں مقیم تھے۔ ادب، ادیب اور شاعری ان کا مسئلہ نہیں تھے۔ یہ چیزیں انفرادی سے زیادہ ان کی اجتماعی ذات کا تہذیبی

استعارہ تھیں اور بس۔ یہ لوگ یہاں شعر و ادب کے ماہر اور نقاد کے طور پر نہیں بلکہ صرف اپنی اور اپنے لکتوں کی زبان سُننے کے لیے آئے تھے۔ ڈالروں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر تھکے ہوئے ان مسافروں کو کسی ایسے درخت کی تلاش تھی جس کی چھاؤں ان کے دُکھوں پر مرہم رکھ دے۔ میں نے ان صاحب کی طرف دیکھا جنہوں نے انٹرویو کا آغاز کیا تھا۔ وہ بیچارے شرمندہ سے ہو کر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں ان کی معصومانہ غلطی کی اتنی زیادہ سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لوگ پہلی ملاقات میں مخاطب کو فوراً متاثر کرنے کے لیے ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن کے بارے میں انہیں خود بھی پتا نہیں ہوتا۔

احمد ندیم قاسمی صاحب سے روایت ہے کہ ایک بار انہوں نے اپنے گاؤں کے کسی شخص کے بیٹے کی ملازمت کے سلسلے میں کہیں سفارش کی۔ لڑکے کو نوکری مل گئی۔ اس کے باپ نے قاسمی صاحب کو جو شکریے کا خط لکھا اس کا پہلا جملہ کچھ یوں تھا:

"آپ کی مہربانیوں اور ریشہ دوانیوں سے برخوردار چراغ علی کو نوکری مل گئی ہے۔"

اگلے دن امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے شہر میامی میں مشاعرہ تھا۔ میامی سے اس وقت ہماری واقفیت اس کے ساحلوں تک تھی جن کا ذکر سُن سُن کر کان پک گئے تھے اور جن کے مختلف مناظر انگریزی فلموں میں دیکھ دیکھ کر کئی دوستوں نے اپنی راتوں کی نیندیں حرام کر لی تھیں۔ میامی کے ساتھ میامی بیچ کا تصور کچھ ایسے ہی لازم و ملزوم تھا جیسے محمد طفیل کے نام کے ساتھ 'نقوش'۔

میامی

روانگی صبح نو بجے تھی۔ اُصولاً ہمیں آٹھ بجے ایئر پورٹ پر ہونا چاہیے تھا مگر ہمارے میزبان ہمیں آٹھ بجے مزید ناشتے کے لیے مجبور کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ اس وقت ٹریفک کم ہوتی ہے اور ہم زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں ہوائی اڈے کے اندر ہوں گے۔ یہ پندرہ منٹ پھیل کر تین گنا ہو گئے۔ پونے نو بجے ہم ایئر کینیڈا کے کاؤنٹر پر پہنچے جو اس وقت بھائیں بھائیں کر رہا تھا مگر ہماری توقع کے برخلاف کاؤنٹر والی اجنبی چہار شیزہ کے برف آلود چہرے پر ہمارے اس قدر دیر سے آنے کا کوئی تکدر دکھائی نہ دیا۔ (شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا اور جنل چہرہ ہی ماشاءاللہ خاصا مکدّر تھا۔) اس نے بڑے مشینی انداز میں بورڈنگ کارڈ ہمارے حوالے کیے اور انگشتِ شہادت سے اشارہ کر کے بتایا کہ کسٹم کے لیے اس طرف جاؤ۔

چار مسافر، چھ بکسے اور چار ہینڈ بیگ۔ چودہ کے چودہ نگ کسٹم کے کاؤنٹر پر جس سراسیمگی اور حواس باختگی کے عالم میں پہنچے اس کا فطری ردِّ عمل وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا، یعنی کسٹم افسر نے پہلے تو مشکوک انداز میں ہم چاروں کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پھر ہمارے پاسپورٹوں کا یوں مطالعہ کرنے لگا جیسے کچھ دیر بعد اُس کا اسی میں سے امتحان ہو۔ سب سے زیادہ حیرت اسے عالی اور جعفری صاحب کے دبیز پاسپورٹوں پر تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دو الگ الگ ملکوں کے باشندے، جو خود کو شاعر کہتے ہیں، ایک ساتھ کس طرح اور کس نیت سے سفر کر رہے ہیں!

نو بجنے میں پانچ منٹ پر اس نے جان چھوڑی۔ ہم نے اپنے گیٹ نمبر کا اتا پتا معلوم کرنا چاہا۔ اس نے بڑی شستہ انگریزی میں بتایا کہ امیگریشن کی منزل سے گزر لو، باقی رستہ

وہ خود بتا دیں گے۔

"امیگریشن؟" میں نے حیرت سے کہا، "امیگریشن تو ہمارا امریکہ میں ہوگا!"

کسٹم والے نے بڑے پروفیسرانہ انداز میں بتایا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے انتہائی قریبی اور دوستانہ تعلقات کے پیشِ نظر امریکہ جانے والوں کی امیگریشن کی formality یہیں پوری کر لی جاتی ہے۔ ہم اپنا سامان کسٹم والے کے دین ایمان پر چھوڑ کر امیگریشن والے کی طرف بھاگے۔ اس نے متعلقہ فارم اس طرح ہماری طرف بڑھائے جیسے زبانِ حال سے کہہ رہا ہو:

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

دو منٹ سے بھی کم عرصے میں ہم نے فارم بھر لیے مگر اس سے قبل کہ انہیں امیگریشن والے کے حضور پیش کرتے اور جہاز کی طرف 'ڈُڑکی' لگاتے (کیونکہ میری گھڑی کے مطابق فلائٹ کے اور ہمارے درمیان ابھی ایک منٹ باقی تھا) ایک لمبے چوڑے گورے نے، جو وردی میں ملبوس تھا اور جس کے ہاتھ میں واکی ٹاکی تھا، بڑی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے ہمیں اطلاع دی کہ ہمارا جہاز پرواز کر چکا ہے!

اب کیا ہوگا! گزشتہ میزبان ہمیں چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں کو سدھار چکے تھے۔ میامی ایئرپورٹ پر آئندہ میزبان ہمارے منتظر ہوں گے۔ وہاں ہماری بجائے جب صرف ہمارا سامان پہنچے گا تو ان پر کیا بیتے گی! اگر کوئی دوسری فلائٹ نہ ملی تو ان بے چاروں کا مشاعرہ اُلٹ جائے گا۔ اس موقعے پر عالی جی کا طویل سفری تجربہ کام آیا۔ انہوں نے فوراً کمان سنبھالی اور ہمیں حکم دیا کہ اُدھر آرام سے بیٹھ جاؤ اور سب سے پہلے یہ فرض کر لو کہ جو زیادہ سے زیادہ نقصان ہو سکتا تھا وہ ہو چکا ہے، اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ اس total loss میں سے ہم کیا کچھ اور کس طرح بچا سکتے ہیں!

صلاح مشورے کے بعد ہم ایئر کینیڈا کے کاؤنٹر پر پہنچے اور اس برفانی تاثرات والی چہار شیزہ کو اپنی رُودادِ غم اس کی انگریزی میں سنائی اور درخواست کی کہ وہ ہمیں آج شام سے پہلے کسی طرح میامی پہنچا دے۔ اس نے بات سُن کر ہماری ٹکٹوں پر ایک جگہ انگلی رکھی اور بتایا کہ یہ ٹکٹ non-transferable ہے اور اس ٹکٹ کے ساتھ ہم صرف ایئر کینیڈا

پر ہی سفر کر سکتے ہیں اور ایئر کینیڈا کی اگلی فلائٹ پرسوں صبح ہے۔ عالی نے اُسے پہلے مشاعرے اور پھر شاعر کی اہمیت سے آگاہ کیا مگر اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ عالی نے کہا: "کوئی ایسا طریقہ بتا دو جس سے ہم آج شام تک میامی پہنچ سکیں۔ اتنا بڑا شہر ہے، کوئی نہ کوئی فلائٹ تو وہاں جاتی ہوگی" جس پر اس ٹارزن کی بیٹی نے بڑی بیزاری سے انٹرکام پر فرانسیسی میں کسی سے بات کی اور ہمیں مژدہ سنایا کہ اگر ہم تین سو ڈالر فی کس ادا کرنے پر تیار ہوں تو وہ ہمیں دو گھنٹے بعد کی ایک connected فلائٹ پر بھجوا سکتی ہے۔

تین سو ڈالر فی کس! ہم نے فوراً دوبئی جانے والے ہینڈ دوؤں کی طرح ڈالروں کو روپوں سے ضرب دی اور اس کے بعد حاصل ضرب کے تحیر میں گم ہو گئے۔ پروین نے رائے دی کہ موجودہ صُورتِ حال میں منتظمین مشاعرہ اپنی عزّت اور فروخت شدہ ٹکٹوں کی رقم بچانے کے لیے اس نقصان کو پُورا کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ عالی اور علی سردار جعفری نے اپنے نصف صدی کے مشاعراتی تجربوں کی روشنی میں اس امکان کو "گماں کا ممکن" قرار دیا مگر اس بات سے اتفاق کیا کہ اس چانس کو نہ لینے سے لینا بہتر ہوگا۔ اب ڈالر پُول ہونے شروع ہوئے قریب تھا کہ ہم بارہ سو ڈالر اس رابن ہڈ کی خالہ کو دے کر نئی ٹکٹیں لے لیتے، عالی صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا :

"آؤ ذرا اس ایسٹرن والی سے مذاکرات کر کے دیکھیں۔"

اب پتا نہیں یہ خیال ان کے دماغ میں ایئر لائن کا بورڈ دیکھ کر آیا تھا یا اس کے کاؤنٹر پر کھڑی براڈ مسکراہٹ والی سانولی سلونی مگر خطرناک حد تک پُرکشش لڑکی اس کا محرک بنی تھی۔ ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے جلدی سے فون اس طرح بند کیا جیسے ہمارے یہاں ریسپشنسٹ لڑکیاں افسر یا مالک کو دیکھ کر اپنی ذاتی کال ختم کرتی ہیں۔ اس نے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے اور آگے کی طرف جُھک کر کچھ اس طرح سے "ہیلو" کہا کہ یکدم بجلی سی چمک گئی۔ "Can I help you ?" اس نے دوبارہ فضا میں رس گھولا ___ عالی کی گرفت میرے کندھے پر سخت ہو گئی۔ اُس کا قد جنوب مشرقی ایشیا کی عام لڑکیوں کی طرح زیادہ لمبا نہیں تھا مگر یہ مشابہت یہیں تک محدود تھی کیونکہ اس کی باقی ڈرائنگ جین مینسفیلڈ کا ہو بہو

چہرہ بھتی۔ میں نے اس کی گردن سے اُوپر دیکھتے ہوئے اپنی دُکھ بھری کہانی سنائی اور پُوچھا کہ اس کی ایئرلائن اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کر سکتی ہے ؟

عالی نے بڑے آکسفورڈین لہجے اور وکٹورین انداز سے جُھکتے ہوئے کہا :

''As a matter of fact, we want to give you some business.''

اس نے ' بزنس ' پر چونک کر عالی جی کی طرف دیکھا اور پھر ان کے ہاتھ سے ٹکٹیں لے کر کاؤنٹر کے پیچھے بنے ہوئے کیبن میں چلی گئی۔ اس کے مڑنے اور چلنے میں کچھ ایسی بات تھی کہ بے ساختہ چچا غالب کا شعر ذہن میں کوندسا گیا :

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا

موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

مَیں نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا ، جعفری صاحب غالباً پروین کو بتا رہے تھے کہ مختلف موقعوں پر پروازیں مِس کرنے پر انہیں کس کس صورتِ حال سے گزرنا پڑا تھا کیونکہ اس کے چہرے کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد وہ نیک دل اور چالاک بدن حسینہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہماری ٹکٹیں لہراتی ہوئی کیبن سے باہر آئی اور ہمیں اطلاع دی کہ ایک فلائٹ کا انتظام ہو گیا ہے مگر پہلے ہمیں اٹلانٹا جانا ہوگا، وہاں سے ہمیں ایک اور جہاز میامی لے جائے گا اور اس سارے عمل میں آٹھ گھنٹے لگیں گے جب کہ ہماری ڈائریکٹ فلائٹ تین گھنٹے کی تھی ۔

مَیں نے سوالیہ انداز میں عالی کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے انداز میں کہا : " کوئی بات نہیں عالی جی ، انہی کے جہاز پر چلتے ہیں ۔"

عالی نے بھی اسی طرح سرگوشی میں جواب دیا :

" یہ گراؤنڈ سٹاف ہے بھئی ۔ اس نے یہیں رہنا ہے ۔

میں نے کہا : " پھر بھی عالی جی ، آخر جمالیات بھی کوئی چیز ہے ، یہ نہ سہی ، جہاز پر اس جیسی تو ہوں گی ۔"

عالی نے ایک اتفاق کرنے والا ہنکارا بھرا اور مزید وکٹورین انداز میں زیادہ سے زیادہ

جھکتے ہوئے اس سے پوچھا کہ ان ٹکٹوں کے عوض ہمیں کتنے ڈالر ادا کرنے ہوں گے۔
"No money." اس نے نسیم بہار کے سے لہجے میں کہا، "ہم نے آپ کو انہی ٹکٹوں پر اڈجسٹ کر دیا ہے۔ باقی رہا ایر لائن کا معاملہ، وہ ہمارا دفتر خود طے کر لے گا۔"
چند لمحے تو ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کم و بیش یہی حالت پروین اور جعفری صاحب کی ہوئی۔ ہم سب نے اس حسینہ کا باجماعت شکریہ ادا کیا اور اسے بتایا کہ ایسٹرن والوں کی یہ مشرق پروری ہم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس کے بعد ہم نے ایک غصہ بھری نظر ایر کینیڈا والی کنگ سائز اگلو پر ڈالی اور مشرق کے روشن مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے ایسٹرن والوں کے لاؤنج میں داخل ہو گئے جہاں جہاز ہمارا انتظار کر رہا تھا۔
عالی نے فوراً شبیر صدیقی کے دفتر فون کر کے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور تاکید کی کہ میامی والوں سے فون پر رابطہ کر کے انہیں پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دے دے۔ مجھے اور پروین کو اس معاملے کے یوں سلجھ جانے کی خوشی تو تھی مگر ہمیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ کوئی انتہائی غیر معمولی اور تقریباً ناممکن واقعہ ہو گا۔ یہ تو بعد میں عالی اور جعفری صاحب نے بتایا کہ اس نوع کے محدود اور پابند ٹکٹ پر کسی دوسری کمپنی کا ہمیں اپنے جہاز پر بٹھا لینا معجزے سے کم نہیں۔ عالی اس کا کریڈٹ یوں لے رہے تھے کہ انہوں نے ایسٹرن والی لڑکی کو جو بزنس دینے کا سبز باغ دکھایا تھا یہ ساری کرامت اس کی ہے جب کہ ہم اس کے محرکات میں تیسری دُنیا کی باہمی محبت اور اشتراک وغیرہ وغیرہ کو بھی کچھ نمبر دینے کے حق میں تھے۔

اٹلانٹا ایر پورٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ دُنیا کے چند بہت بڑے اور مصروف ترین ہوائی اڈوں میں سے ہے۔ عالی ایر کینیڈا کی فلائٹ کے مس ہونے میں شائبۂ خوبیِ تقدیر دیکھ رہے تھے کہ اسی بہانے ہمیں اٹلانٹا کا ہوائی اڈا دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔
اٹلانٹا ایر پورٹ واقعی بہت زبردست تھا لیکن اگر یہ ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی ہمیں اچھا لگتا کیونکہ پردیس میں مزید غریب الوطن ہونے سے کوئی بھی چیز بدتر نہیں ہو سکتی۔
اٹلانٹا ایر پورٹ پر جہاز بدلنے کے دوران جب میں اور عالی باتھ روم کی تلاش میں

gentlemen کے نشان والا دروازہ ڈھونڈتے ہوئے بھٹک رہے تھے تو عالی نے دو مزیدار باتیں کیں۔ ان میں سے ایک چونکہ قابلِ اشاعت نہیں ہے اس لیے دوسری سے پہلی کا قیاس کر لیجیے۔ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دنوں میں امریکی فوجی انگلستان کے مختلف شہروں میں بھی دندناتے پھرتے تھے۔ ان کی کھلی ڈلی طبیعت، بدزبانی کی حد تک بے تکلف زبان اور انداز و اطوار انگلستان کی روایتی تہذیب کے پرستاروں کے لیے بہت تکلیف دہ تھے اور وہ اپنی بیزاری کا مختلف طریقوں سے اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک لائبریری کے پُرسکون ماحول میں ایک امریکی فوجی بوٹوں کے ساتھ شور مچاتا ہوا داخل ہوا اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر لائبریرین لڑکی سے انتہائی بلند آواز میں بولا:

"ڈارلنگ، میں پیشاب کرنا چاہتا ہوں، باتھ روم کہاں ہے؟"

لڑکی نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا، پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی:

"سامنے والے دروازے سے دائیں ہاتھ مڑ جاؤ۔ کوریڈور کے آخر میں ایک دروازے پر تمہیں gentlemen لکھا ہوا نظر آئے گا، تم اس کی پرواہ نہ کرنا، سیدھے اندر چلے جانا۔"

ادبی حلقوں میں گروپ بندی کوئی نئی چیز نہیں مگر ادب پسند حلقوں میں اس کا جو رُوپ اس سفر کے دوران دکھائی دیا وہ اپنی جگہ پر ایک انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ ادیبوں اور فنکاروں پر اپنے قبضے اور اختیار کا اظہار اکثر منتظمین تقاریب کرتے رہتے ہیں اور ایک حد تک ان کا یہ رویہ قابلِ فہم بھی ہے کہ جو لوگ اپنا وقت، محنت اور پیسہ خرچ کر کے کوئی تقریب منعقد کرتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا نام نمایاں ہو اور ان کی چودھراہٹ کو تسلیم کیا جائے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ ہم لوگ کسی شہر میں مشاعرے وغیرہ پر گئے ہیں جہاں ہمارے کچھ ادیب، شاعر دوست مقیم ہیں، انہیں ہمارے آنے کی اطلاع بھی ہے اور ہماری بھی خواہش ہے کہ ان سے ضرور ملا جائے مگر سوئے اتفاق سے ان لوگوں کے منتظمین سے تعلقات کچھ 'خط کشیدہ' ہیں چنانچہ آپ لاکھ کوشش کریں منتظمین ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ وہ آپ سے

ملنے آسکتے ہیں اور نہ ہی آپ ان تک پہنچ سکتے ہیں۔

اس تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ عالی نے ہمیں اٹلانٹا سے میامی تک کی پرواز کے دوران بتایا کہ انہیں میامی سے شوکت مرزا اور حامد صدیقی کے علیحدہ علیحدہ فون ملے ہیں۔ دونوں انہیں اپنے ہاں قیام کے لیے کہہ رہے ہیں مگر دونوں کا آپس میں کچھ کاروباری تنازعہ ہے جس کی وجہ سے شوکت مرزا کے اس 'مشاعرے' میں حامد صدیقی شامل نہیں۔ عالی صاحب کا مسئلہ اس سارے جھگڑے میں وضعداری کا تھا کہ ان کے تعلقات دونوں پارٹیوں سے ہیں۔ گزشتہ بار وہ حامد صدیقی کے مہمان تھے اور اس نے اُن کی بہت آؤ بھگت کی تھی۔ اب اگر وہ شوکت مرزا کی طرف قیام کریں تو حامد صدیقی کو گلہ ہوگا اور اگر حامد کی طرف ٹھہریں تو یہ اصولی اعتبار سے غلط بات ہے کیونکہ ہمارا اصل میزبان اس بار شوکت مرزا ہے!

میں نے کہا: "عالی صاحب میزبانوں کے اس نوع کے مسائل تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ اپنے سامان کی بھی فکر کیجیے جو پتا نہیں اس وقت کہاں ہوگا! اور یہ بھی سوچیے کہ اگر وہ نہ ملا تو ہم کیا کریں گے؟"

میری اس بات سے شوکت مرزا اور حامد صدیقی سمیت اپنے اختلافات کے پسِ پردہ چلے گئے اور ہر آدمی سفر میں گمشدہ سامان کے بارے میں اپنے اپنے تجربات سنانے لگا۔ انہی اندوہناک اور ہمت شکن واقعات کے دوران جہاز نے میامی ایئرپورٹ پر اپنے پہیے لگائے۔ خودکار کاریڈور جہاز کے دروازے کے ساتھ بغل گیر ہوا اور ہم لوگ اپنے ٹورنٹو والے بھاری لباس اور کوٹوں کو سمیٹتے ہوئے باہر نکلے مگر ایئرپورٹ اور اس کے شیشوں سے باہر جتنے لوگوں پر نظر پڑی سب آدھی آستینوں اور کھلے گلوں والی قمیضیں پہنے پھر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ میامی شہر کم و بیش کراچی کے طول بلد عرض بلد وغیرہ وغیرہ پر واقع ہے اور یوں یہاں موسم بھی کراچی جیسا ہے میں نے اپنے جغرافیے اور معلوماتِ عامہ کی کمی کو چھپاتے ہوئے بڑے سرسری انداز میں میامی کے موسم پر تبصرہ کیا اور ریاست فلوریڈا کے بارے میں بھی اُس قسم کی گفتگو کی جیسی ہمارے وزیراں کی تقریریں ہوتی ہیں کہ سکاؤٹ ریلی، تعلیمِ بالغاں، ثقافتی میلے اور امورِ خارجہ پر چند لفظوں کے اُلٹ پھیر کے بعد ایک ہی تقریر ٹھوک دیتے ہیں۔

شعر ہوتے ہیں میر کے، ناصر
لفظ کچھ دائیں بائیں کرتا ہے

ایئرپورٹ پر شوکت مرزا، ان کی بیگم نگار، فرحت ظفر، حامد صدیقی اور ان کی بیگم مینا استقبال کے لیے موجود تھے۔ معانقوں، مصافحوں اور آداب تسلیمات کے بعد گمشدہ سامان کی ڈھنڈیا پڑی۔ ایئرکینیڈا کافی فاصلے پر تھی۔ خاصا لمبا چکر کاٹ کر وہاں پہنچے۔ ایک بہت موٹی تازی خاتون، جو اپنے وردی کے کوٹ سے چھلکی پڑ رہی تھی، ہمیں اپنے سٹور ہاؤس میں لے گئی جہاں ہمارے سامان کے بکسے ایک قطار میں رکھے تھے۔ اتنی آسانی سے اس مسئلے کے حل ہو جانے نے کچھ اینٹی کلائمکس کی صورت پیدا کر دی تھی چنانچہ ہم نے میزبانوں سے ان کے شہر اور موسم کے بارے میں گفتگو شروع کر دی کہ ایسے موقعوں کے لیے یہ بہترین نسخہ ہے۔ معلوم ہوا کہ کیوبا میامی سے صرف اسّی میل کے فاصلے پر ہے اور سمندری ساحل کے حوالے سے دیکھا جائے تو میامی کے عین نیچے واقع ہے اسی لیے یہاں مشہور ہے کہ آدمی اگر میامی سے جمپ مارے تو سیدھا کیوبا میں جا گرتا ہے مگر امریکی لوگ یہ حرکت محض اس لیے نہیں کرتے کہ فی الحال انہیں فیڈل کاسترو اور اس کے سوشلزم دونوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کیپ کینیڈی اور کینیڈی سپیس سنٹر وغیرہ بھی اسی کے نواح میں واقع ہیں۔ یوں دفاعی اعتبار سے میامی بڑا اہم شہر ہے۔

میں نے کہا: "عالی جی وہ میامی بیچ وغیرہ کیا محض پراپیگنڈہ تھا؟"

"وہ بھی ہے۔" عالی کے بولنے سے پہلے فرحت ظفر نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا: "آج کل موسم مناسب نہیں پھر بھی آپ کو اس کا نمونہ کل دکھائیں گے۔"

راستے میں ہمیں پروگرام سے آگاہ کیا گیا۔ عالی کا خدشہ صحیح تھا کیونکہ سارا پروگرام شوکت مرزا اور اس کے گروپ کے گرد گھومتا تھا، حامد صدیقی محض عالی اور دیگر مہمانوں سے ذاتی تعلق کی بنا پر وہاں موجود تھا۔ رات کا کھانا فرحت ظفر کے گھر تھا اور اگرچہ رات تقریباً ہو چکی تھی مگر ہم سفر کی تھکن اور لباس کی تبدیلی کے پیشِ نظر پہلے ان جگہوں پر جانا چاہتے تھے جہاں ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ پروین اور عالی تو شوکت مرزا کے گھر قیام کریں گے جب کہ

میرے اور جعفری صاحب کے لیے شوکت مرزا کے ایک پڑوسی ابراہیم الدین صاحب کے گھر بندوبست کیا گیا ہے جن کا تعلق حیدر آباد دکن سے ہے۔

ابراہیم الدین میامی کے ایک ہائی سکول میں مائیکرو بیالوجی پڑھاتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں انہوں نے کالج اور یونیورسٹی میں بھی پڑھایا ہے مگر یہاں سکول میں پڑھانا اس سے زیادہ محنت اور دقت طلب ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ابراہیم صاحب بھی حیدرآبادیوں کی طرح 'ق' کو 'خ' بولتے ہیں۔ ایک بار جو انہوں نے قید بامشقت کو خید بامشخت کہا تو پتا نہیں کیوں مجھے آمنہ ابوالحسن یاد آگئیں۔ دلّی کی ایک تقریب میں ہمارے تعارف کے دوران وہ عطاالحق قاسمی کو بار بار خاسمی صاحب کہہ کر بلاتی تھیں۔ عطا نے یہ واقعہ بڑے دلچسپ انداز میں ایک کالم میں لکھ دیا۔ پچھلے برس جب وہ پھر دلی گیا تو آمنہ بہن نے بڑے شکایتی لہجے میں کہا :

"یہ آپ نے کیا لکھ دیا خاسمی صاحب کہ میں آپ کو خاسمی صاحب کہہ کر بلاتی ہوں۔ میں نے تو آپ کو ہمیشہ خاسمی صاحب ہی کہا ہے۔"

فرحت ظفر کے ہاں کھانے پر پچیس تیس خواتین و حضرات جمع تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے نہ صرف بیٹھنے کا انتظام الگ الگ تھا بلکہ کھانے پر بھی مردوں کو پہلے کھانے کی دعوت دی گئی۔ بالکل اپنے لاہور کی شادیوں کا سا سماں تھا۔ کھانے میں اچھی نسل کے پاکستانی کھانے اچار، چٹنی اور رائتے کے روایتی دیسی لوازمات کے ساتھ افراط سے موجود تھے۔ ہم نے خاتونِ خانہ کو اتنے زیادہ تکلف اور تیاری پر داد دینا چاہی مگر انہوں نے بڑی سادگی اور سچائی سے بتا دیا کہ کسی فردِ واحد کے لیے یہاں اتنے اور ایسے کھانے تیار کرنے ممکن نہیں چنانچہ میز پر موجود بہت سی ڈشیں مہمان اپنے اپنے گھروں سے بنا کر لائے ہیں کہ یہی طریقہ رائج الوقت ہے۔

میامی کا مشاعرہ ہمارے اس مشاعراتی دورے کی پہلی باقاعدہ تقریب تھی۔ ہم چاروں کے علاوہ صرف تین شاعر اور تھے یعنی لوکل اور مہاجر ملا کر کل نفری سات تھی۔ سامعین سو اور ڈیڑھ سو کے درمیان تھے۔ تین چار ویڈیو کیمرے ان پر مستزاد تھے۔ علی سردار جعفری کو میں نے پہلی

بارسنا۔ ان کی نظمیں ترقی پسندی اور رُومانویت کے بین بین چلتی تھیں۔ اکہتر برس کی عمر میں اتنی طویل طویل نظمیں زبانی سنانا بڑے کمال کی بات تھی۔ میں ان کے حافظے سے اتنا متاثر ہوا کہ میرا دھیان ان کی نظموں کی طرف سے ہٹ گیا، یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر وہ نظمیں ہم تینوں کو بھی یاد ہوگئیں کیونکہ جعفری صاحب نے کم و بیش وہی نظمیں بعد کے ہر مشاعرے میں بھی سنائیں۔ غالباً ساتویں مشاعرے کے بعد پروین نے کسی موقعے پر کہا تھا :

"ہمیں ایک مہینے میں جعفری صاحب کا کلام یاد ہوگیا ہے، ان کی تو نصف صدی انہی کو پڑھتے گزری ہے۔"

اس میں زیادہ قصور جعفری صاحب کا بھی نہیں کیونکہ شاعروں کے پاس مشاعروں میں پڑھنے والا کلام ہمیشہ محدُود ہوتا ہے اور وہ مشاعروں میں ایک دوسرے سے بار بار کی سُنی ہوئی چیزیں سُن سُن کر واقعی تھک جاتے ہیں۔ اس تھکن پر مجھے مشہور لوک موسیقار عالم لوہار سے منسُوب ایک واقعہ یاد آرہا ہے :

کہتے ہیں کہ مرحوم عالم لوہار کئی کئی گھنٹے مسلسل گایا کرتے تھے۔ بعض اوقات رات کو شروع ہوتے اور اگر مجمع گرمجوش اور موسیقی پسند ہوتا تو صبح بھی ہو جاتی تھی۔ اچھی محفل دیکھ کر عالم صاحب کبھی کبھی فرضی فرمائشیں بھی پوری کر دیا کرتے تھے۔ مثلاً کسی گیت سے پہلے یہ اعلان کرتے کہ چک فلاں، تحصیل فلاں، موضع فلاں کے زمیندار چوہدری فلاں فلاں صاحب کی فرمائش ہے کہ میں فلاں گیت سناؤں۔ اب کس کے پاس اتنا وقت اور موقع ہوتا تھا کہ وہ اس فرمائش کی تصدیق کرے، سو یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ ایک بار بات بڑھ گئی اور عالم صاحب نے محسوس کیا کہ ان کا طبلے والا تھک کر گرنے لگا ہے اور اشاروں اشاروں میں انہیں بس کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اسے نفسیاتی داؤ مارا اور اعلان کیا کہ میں نے زندگی بھر بڑے بڑے جلسوں، میلوں اور درباروں میں گایا ہے اور بڑے بڑے چوہدریوں، جاگیرداروں اور راجوں مہاراجوں کی فرمائشیں پوری کی ہیں مگر آج میں اپنے اس پرانے ساتھی طبلے والے استاد کی فرمائش پر فلاں گیت آپ کو سناتا ہوں۔ اس پر اس طبلے والے نے طبلہ ایک طرف رکھا اور مائیکروفون پر جا کر روتی ہوئی آواز میں بولا :

"لو بھئی میری ماں مرے اگر میں نے اس کو کوئی فرمائش کی ہو۔"

سو ہم سب نے وہاں ایک دوسرے کی فرمائشوں پر اپنا اپنا کلام بلاغت نظام سنایا اور صائب کے شعر پر سر دھنتے ہوئے رات دو بجے اپنی قیام گاہوں پر واپس پہنچے۔

صبح اٹھے، معلوم ہوا بیگم ابراہیم الدین اپنی ملازمت پر جا چکی ہیں۔ ابراہیم صاحب نے ناشتہ تیار کیا۔ ان کا مکان بہت خوبصورت تھا۔ چار کنال کے رقبے پر چار بیڈ روم کا یہ سجا سجایا گھر انہوں نے قسطوں پر بیاسی ہزار ڈالر میں خریدا تھا جب کہ لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں چار کنال زمین ہی بیس لاکھ سے کم میں نہیں ملتی۔ سامنے والے مکان میں فون کیا تو پتا چلا کہ عالی ہمارا انتظار کر رہے ہیں جب کہ پروین شوکت کی بیوی نگار کے ساتھ کہیں گئی ہے۔

عالی صاحب پورے امریکہ میں collect کالوں کے ذریعے اپنی آمد اور پروگرام کی خبریں پہنچا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ collect کال کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ دو ہزار ٹیلی فون کریں اور فی ٹیلی فون دو دو گھنٹے تک long distance کال ملائے رکھیں میزبان برا نہیں مانتا کیونکہ اس کا بل اس کے بجائے کال ریسیو کرنے والے کو پڑتا ہے۔

عالی نے بتایا کہ یہاں یہ بھی سہولت ہے کہ آپ کسی بھی نمبر سے کہیں بھی فون کریں مگر آپریٹر کو یہ بتا دیں کہ اس کا بل فلاں نمبر کے اکاؤنٹ میں ڈال دیا جائے تو تیسری دنیا کا کوئی باشندہ کیسے باور کر سکتا ہے کہ اس کا فوراً انتظام ہو جاتا ہے۔ ٹیلی فون کے نظام کے بارے میں اور بہت سی باتوں کا بھی پتا چلا مگر جب ہمارا ذہن وطنِ عزیز میں فون لگوانے اسے ٹھیک اور چالو رکھوانے اور اس کے بل سے متعلقہ مسائل کی طرف گیا تو ہمیں آنکھوں دیکھی باتیں بھی جھوٹ محسوس ہونے لگیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ شکاگو سے عرفان اور افتخار نسیم ٹورنٹو فون کر کے میامی کا نمبر لیں، پھر میامی میں شوکت مرزا سے بات کر کے ابراہیم الدین کے نمبر پر مجھ سے بات کریں اور اس سارے عمل میں کل چار منٹ خرچ ہوں!

شوکت مرزا کے گھر پہنچے تو نگار اور پروین واپس آ چکی تھیں۔ نگار کچن میں تھی اور اس کا لباس اس تبدیلی کی کہانی سنا رہا تھا جس سے گزرے بغیر مشرق کے آدمی کا مغرب کے معاشرے میں گزارہ ممکن نہیں۔ معلوم ہوا کہ دو دن بعد پروین کے بیٹے مراد عرف گینٹو کی پانچویں

سالگرہ ہے اور وہ دونوں خواتین اس انتظام میں مصروف تھیں کہ کسی ایجنسی کے ذریعے اُسے بیس نومبر کو اپنی سالگرہ کے دن مبارکباد کے پھول پہنچ جائیں۔ بیس نومبر احمد ندیم قاسمی کا بھی یومِ پیدائش ہے۔ رُوحانی اور فکری باپ اور نسبی بیٹے کی سالگرہوں کا یہ اشتراک بہت دلچسپ اور غیر معمولی ہے۔ میں پروین سے اس کے بارے میں بات کر رہا تھا مگر وہ جیسے میری بات سُن ہی نہیں رہی تھی۔ ایک دم وہ اُٹھی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے حیرت سے نگار کی طرف دیکھا' اس نے بتایا کہ صبح پروین نے فون پر گیتو سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ سکول جا چکا تھا، بس اس وقت سے وہ بات بے بات روئے جا رہی ہے۔

واقعی ماں کا رُوپ عورت کا بہترین رُوپ ہے۔

عالی صاحب کے ٹیلی فونوں کا سلسلہ اس قدر زور شور سے جاری تھا کہ دخل در معقولات کا لمحہ پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اپنی طرف سے نفسیاتی داؤ مارا اور پروین کی پریشانی کا حوالہ دے کر عالی صاحب سے اپیل کی کہ وہ چونکہ بڑے ہیں اس لیے پروین کو سمجھائیں اور اسے حوصلہ دیں۔ عالی نے میری ساری تقریر بڑے غور سے سنی اور دوبارہ فون کا نمبر گھماتے ہوئے بولے :

" اسے رو لینے دو ، جی کا غبار بھی ہلکا ہو جائے گا اور باقی ماندہ سفر کے لیے اس کی ٹریننگ بھی ہو جائے گی ۔"

" کیا مطلب ؟"

" ارے بھئی مطلب یہ کہ شروع شروع میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ آج رو لے گی تو باقی کے چار ہفتے بہتر طریقے سے گزر جائیں گے ۔"

اس وقت عالی کی یہ بات اور انداز بے نیازی خاصے ظالمانہ محسوس ہوئے لیکن چند دن بعد جب خود مجھ پر 'گھر کی یاد' کا حملہ ہوا تو پتا چلا کہ عالی کچھ اتنا غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے۔

کچھ نگار کی مدد سے اور کچھ ذاتی کوشش سے پروین کو اس کے گوشۂ اشک ریزی سے نکالا۔ اس دوران میں پھول بھیجنے والی ایجنسی کا فون بھی آ گیا۔ انہوں نے اُمید ظاہر کی تھی کہ

۲۰ نومبر کو کسی وقت پھول گینتو کومل جائیں گے۔ طے یہ پایا کہ شہر کا ایک چکر لگایا جائے، پکچر کارڈ خریدے جائیں اور چھوٹی موٹی شاپنگ کے بعد مشہورِ زمانہ میامی بیچ کا نظارہ کیا جائے۔ پروگرام کے اوّل حصّے سے عالی صاحب اور دوسرے حصّے سے پروین نے عدم شمولیت کا عذر پیش کیا۔ عالی اس دوران میں مزید ٹیلی فون کرنا چاہتے تھے جب کہ پروین میامی بیچ پر مجھے اور علی سردار جعفری صاحب کو فری ٹائم دینا چاہتی تھی تاکہ ہم اس کی موجودگی کے احساس سے آزاد ہو کر بیچ کی جملہ تفصیلات سے آگاہ ہوسکیں۔ اس کی یہ بات عقل کی ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے دل کی بھی تھی لیکن اسے یک دم تسلیم کر لینے کا مطلب آئندہ کے لیے ایک مستقل جملے بازی کا محاذ کھلوانا تھا اس لیے میں نے فوراً پروین کی بات کاٹی:

"ارے نہیں بھئی، ایسی کیا بات ہے! تم بھی چلو۔ ہمیں کون سا وہاں جا کر نہانا یا سن باتھ لینا ہے۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ایک چکر لگا لیں گے، کیوں جعفری صاحب؟"

جعفری صاحب نے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا: "میرے خیال میں پروین کا مشورہ صحیح ہے۔"

میامی کی سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا۔ فرحت ظفر نے بتایا کہ آج ہفتہ ہے اور چھٹی کی صُبح کی وجہ سے ٹریفک کم ہے لیکن شام کے وقت حالات مختلف ہوں گے۔ ایک سٹور سے جعفری صاحب کے لیے نمکین بادام اور مونگ پھلی خریدی گئی جس کا استعمال تو شام کے ساتھ متعلق تھا مگر ہم لوگوں نے ان پیکٹوں پر اتنے شب خُون مارے کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ان کی حالت مفتوحہ ممالک جیسی ہو گئی۔

راستے میں ایک جگہ شوکت نے گاڑی روک کر ایک عمارت دکھائی اور ہم سے کسوٹی کسوٹی کھیلنے لگا کر بتایئے یہ کون سی عمارت ہے! اشارے یہ دیے کہ اس کا تعلق ایک ایسے کھیل سے ہے جسے وحشیانہ بھی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ اس کا تعلق ایک ایسے کھلاڑی سے ہے جو مسلمان ہونے کے باوجود عالمی شہرت کا حامل ہے اور یہ کہ اس عمارت کا تعلق اس کے شاندار کیریر کی ابتداء کے ساتھ ہے۔

امریکہ کے حوالے سے مسلمان کھلاڑی اور وحشیانہ کھیل کی نشانیاں کافی تھیں۔ شوکت نے بتایا کہ محمد علی کلے نے ۱۹۶۴ء میں سونی لسٹن سے ہیوی ویٹ باکسنگ کا عالمی اعزاز جیتنے کے لیے اسی جمنیزیم میں تیاری کی تھی اور اسی مقابلے کے بعد اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تھا۔ میں نے سوچا : ایک طرف محمدؐ علی ہے جو عظمت کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد اپنا رشتہ ایک ایسے گروہ کے ساتھ قائم کرتا ہے جو امریکی معاشرے میں سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور جس کی وجہ سے یہودی لابی، جو امریکہ کی پس پردہ حکمران ہے اس کی زندگی کو بے حد مشکل بنا سکتی ہے اور دوسری طرف ہم لوگ ہیں جنہوں نے اس مذہب کو ایک مسلمان معاشرے کی موجودگی میں مختلف مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور اس کی آڑ میں طرح طرح کے کاروبار چلا رہے ہیں۔ وہ پیغام جو پوری کائنات کے لیے باعث رحمت اور راہنمائی تھا اسے ہم نے دعاؤں اور خانقاہوں تک محدود کر کے اپاہج اور مفلوج بنا دیا ہے۔

یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
عجم کی خرافات میں کھو گئی
بُجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مُسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

حکیم الامّت نے یہ بات آج سے پچاس برس پہلے کہی تھی، ہمارا کمال یہ ہے کہ ہم نے نصف صدی میں اس صُورتِ حال کو اس طرح سنبھال کر، چمکا کے رکھا ہے جیسے یہ کوئی انعامی شیلڈ ہو۔ 'اُردو کی آخری کتاب' میں ابنِ انشا مرحوم نے جیومیٹری کی شکل 'دائرہ' کی وضاحت کرتے ہوئے کیا نوکیلی بات کی ہے :

"ایک دائرہ اسلام کا بھی ہوتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو داخل کیا جاتا تھا آج کل خارج کرتے ہیں۔"

محمد علی کلے کے حوالے سے بات کا رُخ باکسنگ سے اسلام اور دُنیا میں مُسلمانوں کی حالت اور کردار کی طرف پھر گیا۔ پتا نہیں کہاں سے ایک بھولا بھٹکا واقعہ

میرے دھیان کے اُفق پر اُبھر آیا :

لاہور کے انار کلی بازار میں میرے دوست محمود احمد قریشی المعروف چیئرمین اور اختر حسین عرف استاد کی گھڑیوں کی دکان Big Ben ہم سب دوستوں کا اڈہ ہے۔ دن میں ایک بار دوستوں کے گروپ میں سے ہر شخص وہاں کا چکر ضرور لگاتا ہے۔ ایک دن ساری چنڈال چوکڑی جمع تھی کہ دکان کے دروازے سے ایک شخص باقاعدہ ناچتا ہوا اندر آیا اور کچھ دیر بھنگڑا ڈالنے کے بعد گویا ہوا کہ کل تک اس کا نام جوزف مسیح تھا اور وہ لاء کالج میں جمعدار کا کام کرتا تھا مگر اب اس نے اسلام قبول کر کے اپنا نام محمد یوسف رکھ لیا ہے اور نوکری چھوڑ دی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہہ سکتے اس نے بڑے رقت آمیز انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا :

"برادرانِ اسلام، اب میں تم میں سے ایک ہوں سو میری مدد تمہارا فرض ہے۔ میری مدد کرو۔ یہ دیکھو میرے قبولِ اسلام کا اعلان اخبار میں بھی چھپا ہے۔"

محمود قریشی نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ سے مصافحہ کیا اور کہا :

"بہتر ہے بھائی کہ تم دوبارہ عیسائی ہو جاؤ کیونکہ کل تک تم کام کر کے حق حلال کی روزی کھا رہے تھے، ادھر مسلمان ہوئے ہو اُدھر مانگنا شروع کر دیا ہے۔ مانگنے والے تو ہمارے پاس پہلے ہی بہت ہیں۔"

اس واقعے کو سن کر بالکل داستان والا منظر رُونما ہوا یعنی پہلے تو سب لوگ ہنسے اور پھر ایک دم سوچ میں پڑ گئے۔ باقیوں کا تو مجھے علم نہیں البتہ میں آج بھی اس سوچ سے باہر نہیں آسکا!

اس کے بعد ایک تھیٹر ہال کے قریب سے گزرے۔ معلوم ہوا کہ کل سے یہاں انتھونی کوئین کا ڈراما شروع ہونے والا ہے۔ میری ذاتی رائے میں انتھونی کوئین اس وقت دُنیا کا سب سے بڑا زندہ اداکار ہے۔

میں نے اس کی پاکستان میں ریلیز ہونے والی تقریباً ہر فلم دیکھی ہے بلکہ نہ ریلیز ہو سکنے والی The Message اور Omer Mukhtar بھی وی سی آر کی مہربانی سے

دیکھ لی ہیں۔ ہر فلم میں وہ اپنی اداکاری کا ایک ایسا نقش چھوڑ جاتا ہے کہ فلم بھول جاتی ہے مگر اس کا رول، جملے اور انداز یاد رہتے ہیں خاص طور پر 25th Hour نامی فلم کے آخری سین میں اس کی وہ مسکراہٹ تو مجھے بھولتی ہی نہیں جب فوٹو گرافر ایک ایسے بچّے کو اس کی گود میں دیتا ہے جو اس کا بیٹا کہلانے کے باوجود اس کا بیٹا نہیں ہے اور ساتھ یہ بھی کہتا ہے: Smile.

اس مسکراہٹ میں انسانیت کے کیسے کیسے المیوں کا کرب اس نے سمیٹا تھا!

پردیس میں بھوک پیاس نہ بھی ہو تب بھی میزبان وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ کھانے پینے پر اصرار کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی ایک صورتِ حال میں شوکت مرزا اور فرحت ظفر ہمیں Denney's نامی ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ معلوم ہوا کہ soft drinks بھی بار والے حصے میں ہی سرو کیے جاتے ہیں۔ بار کے نام پر پروین کے کان کھڑے ہو گئے، اس نے کہا کہ یہاں بیٹھنے سے بہتر ہے کہ ہم کہیں کھڑے کھڑے کوک وغیرہ پی لیں مگر چونکہ جعفری صاحب کے کان بھی کھڑے ہو چکے تھے اس لیے انہوں نے اپنی بزرگی کا ویٹو استعمال کیا اور ہم سب کو لے کر سیدھے بار کے کاؤنٹر پر پہنچ گئے۔ ایک خُوب صورت کاؤنٹر اور اس سے بھی زیادہ خوب صورت رنگا رنگ بوتلوں کے درمیان ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی اکیلی ناچ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے ناچنے کو تھرکنے میں تبدیل کیا اور سب کو مشترکہ آنکھ مار کر بولی: "کیا پیو گے؟"

ظاہر ہے یہ 'کیا پیو گے؟' اس نے انگریزی میں پوچھا تھا جسے میں بیان کی ہمواری کے پیشِ نظر اُردو میں بیان کر رہا ہوں۔ اس وضاحت کا خیال یوں آیا کہ جب ہم کرکٹ کے کھلاڑی ہوا کرتے تھے تو ایک دفعہ ہمیں سابق ٹسٹ کرکٹر نذر محمّد (مدثر نذر کے والد) کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے ہمیں اپنی ذاتی اور کھلاڑیانہ زندگی کے بہت سے واقعات سنائے مگر ایک واقعہ ایسا تھا کہ آج تک ان کی چھیڑ بنا ہوا ہے۔ کہنے لگے:

۱۹۵۱ء میں پاکستان ایگلٹس کے ساتھ ولایت کے دورے پر تھا۔ وہاں ایک میچ کا پروگرام تبدیل ہو گیا۔ گلوسسٹر شائر کے بجائے ہم وارو ک شائر کے ساتھ میچ کھیل رہے تھے۔

میں نے کوئی سونا ٹ آؤٹ کیا ہوا تھا۔ شہاب میرے ساتھ کھیل رہا تھا۔ٹی ٹائم پر ہم پولیلین میں واپس آئے تو ٹام گریوئی وہاں آیا ہوا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ ہمارا امیچ تبدیل ہوگیا ہے چنانچہ ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگا: "ہیلو نذر ___ ہیلو شہاب! اوئے تُسی کِتھّے!"

یہ اوئے تسی کتھے ؟' اردو کا ' ارے تم کہاں! ' ہوتا ہے۔ آج تک ہم لوگ نذر صاحب سے یہ پوچھا کرتے ہیں کہ گریوئی نے ایسی اچھی پنجابی کہاں سے سیکھی تھی!

خیر ہم نے اس رقاصہ دلنواز کو اپنا مسئلہ بتایا کہ ہمیں کوئی ایسی چیز دو جس میں الکوہل نہ ہو کیونکہ ہم مُسلمان ہیں۔ اس پر اس نے تیزی سے چند مشروبات کے نام لیے اور اس دوران میں بیئر کا ایک مگ یہ کہہ کر نوشِ جان کیا کہ اس کی عقل داڑھ اُگ رہی ہے اور چونکہ بیئر سے درد میں کمی واقع ہوتی ہے اس لیے وہ صبح سے ہر دس منٹ بعد بیئر کا ایک مگ پی رہی ہے۔

جعفری صاحب کی رگِ شرارت پھڑکی، اپنے مصنوعی دانتوں کی طرف اشارہ کر کے بولے:

"میں تمہارے ساتھ ہوں کیونکہ میری بھی عقل داڑھ اُگ رہی ہے۔"

فرحت اور شوکت کے مشورے سے میرے اور پروین کے لیے Pina Clauda نامی مشروب منتخب کیا گیا جو پائن ایپل اور کوکونٹ یعنی انناس اور ناریل کا مرکب تھا۔ ہم سب ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے اور اس تتلی کی بچی کو دیکھنے لگے جس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ مشروبات کی تیاری کے دوران وہ ہماری طرف دیکھ دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹیں درجنوں کے حساب سے نچھاور کر رہی تھی اور کم و بیش اسی حساب سے آنکھیں بھی مارتی جا رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے فرحت ظفر کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا سوال سمجھتے ہوئے وضاحت کی کہ حسینانِ فرنگ کے اس نوع کے اشاروں سے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے میامی کو گمراہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تبسم اور یہ تکلم ان کی عادت بھی ہے اور ماحول کا تقاضا بھی۔ شوکت مرزا نے جیسے ڈھارس بندھانے کے لیے میرے ہاتھ پر

تھپکی دی اور کہا :

" اتنا مایوس ہونے کی ضرورت بھی نہیں ۔ یہاں زیادہ تر لڑکیاں جتنی بے تکلف نظر آتی ہیں عام طور پر اس سے زیادہ ہوتی ہیں "۔

'پینا کلاڈا' ہمارے سامنے رکھتے وقت بھی اس کا شوقِ رقص کم نہیں ہوا تھا چنانچہ کچھ حصہ چھلک کر میرے ہاتھ پر گر گیا مگر اس سے پیشتر کہ میں کسی ردِّ عمل کا اظہار کرتا اس نے پلک جھپکتے میں نیپکن سے میرا ہاتھ اور میز صاف کیے اور پھر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کچھ اس طرح سے معذرت کے کلمات کہے کہ اگر دیکھنے والی آنکھوں کا خیال نہ ہوتا تو میں خود سارا مگ اُٹھا کر اپنے اُوپر انڈیل لیتا۔

پینا کلاڈا بہت خوش ذائقہ لیکن بہت زیادہ تھا چنانچہ آدھا مگ پینے کے بعد ہماری رفتار سُست پڑ گئی ۔ اسی اثنا میں پروین میز سے مینو کارڈ اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ یک دم اس نے چیخ سی ماری ، میرے ہاتھ سے مگ چھین کر اس نے ایک طرف رکھا اور کارڈ میری طرف بڑھا کر خوف زدہ لہجے میں بولی :

" یہ ذرا دیکھیے ، امجد بھائی ! یہ کیا لکھا ہے؟ "

میں نے مینو کارڈ پر لکھے ہوئے بے شمار اجنبی لفظوں پر نظر دوڑائی ۔ پروین نے ایک سطر پر اُنگلی رکھی ، لکھا تھا :

Pina Clauda, with rum .

رُم کے ذکر پر جعفری صاحب چونکے اور مسکرا کر کہنے لگے : " گھبراؤ نہیں ، رُم میں نشہ زیادہ نہیں ہوتا ، یہ تو بیر کی طرح ہوتی ہے ، بہت کم الکوحل ہوتی ہے اس میں!" بے خیالی میں شراب پی جانے کے تصوّر نے پروین کو اس قدر حیران اور سراسیمہ کر دیا تھا کہ وہ جعفری صاحب کے لہجے کی شرارت اور میزبانوں کی پُر لطف مسکراہٹوں کو بھی نوٹ نہ کر سکی۔ میں نے اس کی پریشانی کو مزید ہوا دینے کے لیے کہا : " تم نے علامہ صاحب کا Rum (رُم) والا شعر نہیں سُنا ؟ انہوں نے تو اسے فلسفے کا حصہ بنا دیا ہے "۔

" کون سا ؟ " پروین نے حیرت سے پُوچھا۔

"ارے بھئی وہی ... ... بانگِ درا میں جو ہے ":

زندگی اِنسان کی دَم کے سوا کچھ بھی نہیں

دَم ہوا کی موج ہے، رَم کے سوا کچھ بھی نہیں

'رَم' کے اس محلِ استعمال پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے، کاؤنٹر کے پیچھے تھرکنے والی صاحبۂ عقل داڑھ نے خیر سگالی کے جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا قہقہہ بھی اس میں شامل کر دیا۔ پروین مزید پریشان ہو کر بولی :

" آپ ہنسے چلے جا رہے ہیں اور میرا دم نکل رہا ہے ... ... آپ کو اندازہ بھی ہے یہ کتنی غلط بات ہو گئی ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں ... ... اور افسوس تو مجھے امجد بھائی آپ پر ہے ... ... آپ کو پتا تھا کہ اس میں رَم ملی ہوئی ہے اس کے باوجود آپ نے ... ... ؟"

پروین کی آواز کی پریشانی اور غصہ اب گلوگیری میں تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے چنانچہ میں نے اسے بتایا کہ ہمارے میزبانوں نے اس سلسلے میں پہلے ہی احتیاطی تدبیر کر لی تھی اور یہ مشروب جو ہم نے پیا ہے اس میں رَم کی بجائے ملک شیک ڈلوایا گیا تھا۔ اب اگر یہاں کے دُودھ میں بھی نشہ ہو تو اس کی ضمانت میں نہیں دے سکتا۔ فرحت ظفر اور شوکت مرزا نے میری بات کی پُر زور تائید کی، پروین نے ہماری وضاحت بظاہر تسلیم کر لی، اس کے چہرے کی کشیدگی بھی ختم ہو گئی مگر اس کے باوجود اس نے اپنے گلاس کو دوبارہ ہاتھ نہیں لگایا جو اب بھی نصف کے قریب بھرا ہوا تھا!

جعفری صاحب نے اس بار کا موازنہ روس اور مشرقی یورپ کے کچھ ممالک کے شراب خانوں سے کیا اور کچھ ایسی شرابوں کے نام لیے جن کا ذکر ہم نے کتابوں میں بھی نہیں پڑھا تھا۔ وہ کھانے کے ساتھ پی جانے والی ایک رُوسی شراب 'کونیک' کے خاص طور پر دلدادہ تھے کہ روس کی سردی کا اس سے بہتر توڑ ان کے نزدیک اور کوئی نہ تھا۔ ان کی باتوں میں "ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال" جیسی کیفیت تھی چنانچہ بل ادا کرنے کے بعد ہم سب تقریباً لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔ میرے لڑکھڑانے کی وجہ وہ

بھاری بُوٹ تھے جو مَیں نے عالی صاحب کے لیکچروں سے متاثر ہو کر خریدے تھے اور جنہیں پہن کر میامی کی گرمی میں، مَیں خُود کو خاصا احمق محسوس کر رہا تھا۔ ہوالیوں کہ اُٹھتے وقت میرا بُوٹ میز کے پائے سے ٹکرا گیا۔ میں نے سنبھلنے کے لیے جعفری صاحب کا سہارا لینا چاہا مگر وہ پہلے سے کسی سہارے کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ہم دونوں گرتے گرتے بچے۔ ہماری اس اُفتادگی کا اثر باقی لوگوں پر بھی پڑا مگر خیریت ہوئی کہ میز پر پڑے ہوئے شیشے کے برتن زمین پر نہیں گرے۔ ہم سب تو سنبھل کر دروازے کی طرف چل پڑے مگر پروین اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔

ہم نے رُک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے شمار شبہات کی پرچھائیاں سی تیر رہی تھیں۔ بڑے جاسوسانہ لہجے میں مجھے غور سے دیکھ کر بولی :

"سچ بتایئے اس پینا کلاڈا میں رم تھی یا نہیں؟"

"ارے بابا، تمہیں بتایا تو ہے کہ فرحت ظفر نے اس میں رم کی جگہ ملک شیک ڈلوایا تھا"

"تو پھر ... ..." اس نے شرلک ہومز کی طرح سوال کیا ... ... "یہ آپ کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ کیسی ہے؟"

"ارے بھئی وہ تو میرا پاؤں ... ... اچھا تم ایسا کرو اس ٹارزن کی بچی سے خُود پُوچھ لو۔"

اس اثنا میں وہ ٹارزن کی بچی قلانچیں بھرتی ہوئی خُود ہی ہمارے قریب آ چکی تھی۔ میں نے کہا: "مہربانی کر کے اس خاتون کو یہ بتا دو کہ تم نے پینا کلاڈا میں رم کی جگہ دُودھ ملایا تھا ... ..."

"آپ نہیں بولیں۔ مجھے پوچھنے دیں!"

اب مجھے اندازہ ہوا کہ اندر سے وہ رم نوشی کے بارے میں ابھی تک کس قدر ڈانواں ڈول اور متذبذب تھی۔ خُدا خُدا کر کے اسے یقین ہوا کہ وہ نادانستگی میں بھی شراب نوشی کی مرتکب نہیں ہوئی لیکن اس ذہنی کشاکش نے غالباً اسے بہت تھکا دیا تھا کیونکہ وہ اصرار کر کے شوکت مرزا کے گھر پر اُتر گئی اور ہمیں میامی بیچ کی خوشگوار سیر کی دعا دے کر رخصت کر دیا۔

مجھے اپنے لیے ایک شولڈر بیگ خریدنا تھا۔ چنانچہ فرحت ظفر ہمیں اپنے ایک واقف کار سندھی ہندوستانی ہنس کے بہت بڑے سٹور پر لے گئے جہاں جیبی بٹوے سے لے کر سالم بندے اغوا کرنے والے سائز تک کے چمڑے اور ریکسین کے ان گنت بیگ، اٹیچی کیس اور بکسے موجود تھے۔ ہنس بڑے دکاندارانہ تپاک سے ملا اور جب اسے یہ بتایا گیا کہ ہم پاکستان اور بھارت کے مشہور کوی ہیں تو اس کی تواضع میں مزید شدت آگئی اس کے اہل کاروں نے میرے سامنے بیگوں کے ڈھیر لگا دیے۔ میں نے کنکھیوں سے اور بہانے بہانے سے قیمتیں پڑھنے کی کوشش کی۔ سب کے سب چالیس سے لے کر ستر ڈالر کی رینج میں تھے۔ میں نے فوراً ڈالروں کو روپوں سے ضرب دی، حاصل ضرب خاصی کاری ضربیں تھیں کیونکہ لاہور میں انارکلی بازار سے جو بیگ چالیس پچاس روپے میں باآسانی مل جاتا ہے اس کی قیمت وہاں چھ سات سو روپے سے کم نہ تھی۔ کوالٹی بھی کوئی ایسی مرعوب کن نہ تھی۔ اب آدمی خود کس کس کو بتائے کہ یہ امریکہ کا، امریکہ سے خریدا ہوا مال ہے؟

فرحت ظفر اس دوران میں ہنس کو یقین دلا چکے تھے کہ اس کی دکان میں آج بہت تاریخی قسم کی شخصیات نے قدم رنجہ فرمایا ہے، چنانچہ ایک طرف تو جی یہ چاہتا تھا کہ قیمتوں کی زیادتی کا اعلان کر کے اجازت لے لیں مگر دوسری طرف یہ بھی خیال تھا کہ دکاندار کیا سوچے گا، اتنی بڑی شخصیات چالیس پچاس ڈالر کا سُن کر پریشان ہو گئی ہیں؛ مجبوراً میں نے سیاستدانوں کے سے انداز میں ایک گول مول بیان داغا:

"چمڑا غالباً یہاں بہت مہنگا ہے۔ اصل میں مجھے تو کوئی ایسا بیگ چاہیے تھا جو میں سفر میں استعمال کرتا اور پھر چاہے یہیں چھوڑ جاتا ... ... میرا مطلب تھا کوئی عام سا بیگ ... ..."

"اچھا۔ اچھا۔" ہنس نے گجراتی سندھیوں کے مخصوص انداز میں کہا، "اس طرح کا بھی ایک پیس ہے میرے پاس۔" اس نے اپنے اہل کار کو گجراتی میں اپنے مجوزہ بیگ کی کچھ نشانیاں بتائیں جن کے جواب میں وہ بیر اشوٹ کا ایک نہایت

معمولی سا بیگ اُٹھا لایا۔ ہنس نے بتایا کہ یہ اس کے سٹور کا سب سے سستا مگر انتہائی مضبوط بیگ ہے اور ان تمام شرائط پر پورا اُترتا ہے جن کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا تھا۔

سو میں نے بیس ڈالر میں وہ بیگ شرمو شرمی خرید لیا جس کے شاید اپنے ملک میں اس سے دس گنا کم پیسے بھی ادا نہ کرنے پڑتے، اس کے علاوہ ہنس کی اس خصوصی توجہ پر شکریہ جدا ادا کرنا پڑا۔ پتا نہیں کیوں اس سودے سے میرا دھیان غریب اور امیر ملکوں میں ہونے والے تجارتی اور امدادی معاہدوں کی طرف چلا گیا۔ وہاں بھی تو ہم ایک کی چیز دس میں خریدتے ہیں اور ممنونِ احسان اس پر مستزاد ہوتے ہیں۔

میامی بیچ کے بارے میں یا تو ہمیں گمراہ کیا گیا تھا یا ہماری wishful thinking ضرورت سے بہت زیادہ تھی۔ معلوم ہوا ہے کہ ہم اُس سیزن سے تقریباً دو ماہ پہلے آگئے ہیں جب اس علاقے میں ہر لباس پر ننگے وجود کو ترجیح دی جاتی ہے:

یں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

بیچ کے ساتھ ساتھ ... کے بائیں طرف قطار اندر قطار بہت سے ہوٹل تھے مگر سب کے برآمدوں اور بالکنیوں میں ریٹائرڈ خواتین و حضرات ہمیں ان نظروں سے دیکھ رہے تھے جن سے ہم خود اس بیچ کا نظارا کرنے آئے تھے۔ بڑھاپا ویسے تو اپنی جگہ پر ایک لعنت ہے مگر امریکی معاشرے میں یہ بہت ہی زیادہ لعنتی ہو جاتا ہے۔ شور شرابے ہماہمی اور جوان خون کے رگ و پے میں دھومیں مچانے والے اس معاشرے میں عمر رسیدہ لوگوں کے لیے صرف تنہائی باقی بچتی ہے۔ تیس پینتیس سال کی درمیانہ اور نچلے درجے کی ملازمتیں کرنے اور ایک ایک کر کے ڈالر جوڑنے کے جدید بیبیاں اور بابے جب دُنیا کو دیکھنے کے لیے نکلتے ہیں تو خود تماشا بن جاتے ہیں۔ بڈھی میمیں رنگ برنگے کپڑے پہنے، سُرخی پاؤڈر لگائے، فیشنی عینکوں کے ساتھ سڑکوں پر نکلتی ہیں تو سوائے بیگ چھیننے والے لفنگے لڑکوں کے کوئی اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ بال بچے اور خاندان، برادری اور کنبہ داری، ساس اور دادی نانی کے رشتے کرسمس کارڈوں تک محدود رہ جاتے ہیں اور یہ لوگ بے شمار باتوں کو دلوں میں لیے شہر شہر اور ملک ملک پھرتے ہیں کہ کوئی سننے والا ملے لیکن گھنٹوں ہوٹلوں

اور ہوسٹلوں کی بے مہر لابیوں، بالکنیوں اور لانوں میں آرام کرسیوں پر لیٹے لیٹے ان کے جسموں کا رعشہ بڑھتا رہتا ہے اور کوئی سُننے والا کان نصیب نہیں ہوتا۔ رستے میں یا سستے کرائے والی ٹورسٹ بسوں میں ایک دوسرے کو ہیلو ہیلو کرنے اور یہ یقین دلانے کے علاوہ کہ "تم ابھی اپنی عمر سے بہت کم دکھائی دیتے ہو"، یہ آپس میں بھی گفتگو نہیں کر پاتے۔ اور گفتگو کریں بھی تو کیا؟ کسی کہانی میں کوئی تنوع بھی تو ہو۔

امریکہ میں لوگ پیٹ کی بھوک سے نہیں مرتے لیکن انسانی جذبوں کا وہاں شدید قحط ہے اور اس قحط کے اصل شکار اور ہدف وہاں کے بوڑھے لوگ ہیں۔ مسائل پیدا کرنے والے اس عظیم صنعتی پلانٹ میں، جس کا نام امریکی معاشرہ ہے، یہ لوگ وہ جلا ہوا ایندھن ہیں جسے اس معاشرے نے ان کی اپنی ذات کی تنہائیوں کے ڈسپوزل بیگس میں بند کر کے دروازے پر رکھ دیا ہے، اس وقت تک کے لیے جب تک موت کی گاڑی کارپوریشن کے ٹرک کی طرح انہیں اپنی آغوش میں بھر کر نہ لے جائے۔

امریکی معاشرے کے اس افادہ پرستانہ (utility oriented) نظام کا یہ پہلو ایسا ہے جو اُس کی بے مثال مادّی ترقی کے باوجود ایک بہت بڑے تہذیبی خلاء کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ہمارے جیسے پسماندہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں کے سماجی ڈھانچوں میں بھی مختلف النوع تہذیبی بحران موجود ہیں مگر شاید اپنے اجتماعی زوال کی وجہ سے وہ اتنے نمایاں نہیں ہوتے۔ پتا نہیں وہ نظام کب اور کہاں سے جنم لے گا جو خُدائی کے بجائے خلقِ خُدا کا پرچم بردار ہو گا۔ مَیں نے میامی کے ساحل کی رونق اور اس کی سیر کے لیے آئے ہوئے ان ریٹائرڈ اور از کار رفتہ بُوڑھوں اور بُوڑھیوں کی تنہائیوں پر اپنے ساتھیوں سے تبادلۂ خیال کرنے کی کوشش کی مگر شاید میری اس فضول قسم کی جذباتیت سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی۔ مَیں نے سوچا:

ٹھیک ہی تو ہے۔ اس طرح کے وقتی جذباتی اُبال چند لمحوں کے مہمان ہوتے ہیں۔ پانی کے بُلبلوں کی طرح یہ بے نام اور بے شکل خیالات نہ اب سے تھوڑی دیر پہلے میرے ذہن میں تھے اور نہ شاید کچھ دیر بعد ہوں گے۔ اگر دُنیا کے مقدر نے کبھی تبدیل

ہونا ہے تو اس کے لیے ان لمحاتی جذباتی کیفیتوں کی نہیں بلکہ ایک نئے زندہ اور انسان پرست معاشرتی نظام کی ضرورت ہے ـــــ ایک ایسا نظام جو تمام دُنیا کے ہر رنگ و نسل اور عمر کے اِنسانوں کو اپنے اندر سمیٹنے اور انہیں زندہ رکھنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

موٹر سے اُترتے وقت شوکت مرزا نے لکڑی کی وہ ٹرے مجھے دی جس کے وسط میں ریاست فلوریڈا کا نقشہ بنا ہوا تھا اور جو اس تاجر ہنس نے مجھے تحفتاً پیش کی تھی۔ میں نے بے خیالی سے اسے اُلٹا کر دیکھا تو اس کے پیچھے Made in Taiwan کی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ کمال بھی امریکی معاشرے کے صنعتی نظام کا ہے کہ اپنے تحفے بھی وہ ان علاقوں میں بناتے ہیں جہاں لیبر اور پروڈکشن کاسٹ سستی پڑتی ہے۔

شوکت مرزا کے ڈائننگ ٹیبل پر عالی جی ابھی تک ٹیلیفون سے دست و گریبان ہو رہے تھے۔ اب یہ محض اتفاق تھا یا واقعی وہ گزشتہ چھ گھنٹوں سے ٹیلیفون کیے جا رہے تھے، یہ ایک سربستہ راز ہے۔

میامی کے قیام کا ذکر اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک اس میں شہباز صاحب کا ذکرِ خیر نہ کیا جائے۔ شہباز گزشتہ کئی برسوں سے امریکہ میں مقیم تھے۔ درجنوں تعلیمی کورس شروع کر کے ادھورے چھوڑ چکے تھے۔ مہمان نوازی اور تپاک میں ضرورت سے بہت زیادہ گرمجوش تھے۔ ایک بار ہمارے رہبر بنے تو منزل مقصود سے بیس میل دُور خود بھی گھومتے رہے اور پیچھے آنے والی کاروں کو بھی گمراہ کرتے رہے۔ جب تقریباً ایک گھنٹے کی خواری کے بعد پیچھے چلنے والی ایک کار نے صحیح راستے کی نشاندہی کی تو اس کے ڈرائیور پر آیندہ کئی گھنٹے ناراض ہوتے رہے کہ اس نے معزز مہمانوں کا اتنا قیمتی وقت کیوں خراب کیا اور پہلے کیوں نہیں بتایا کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہیں!

بعد میں پتا چلا کہ معزز مہمانوں کے لیے جمع کا صیغہ انہوں نے محض از راہِ تکلف اور احتیاط استعمال کیا تھا۔ اصل میں ان کا مقصد پروین شاکر کی مہمانداری سے تھا۔ یہاں مجھے پروین کی ذہانت اور نظر شناسی کی بھی داد دینی پڑے گی کہ اس نے شہباز کو دیکھنے کے چند منٹ بعد ہی مجھے بتا دیا تھا کہ یہ آدمی اپنے آپ کو بہت بڑا فلرٹ سمجھتا ہے

اور عنقریب اس کا عملی مظاہرہ کرنے والا ہے۔

پروین نے اس کو مسلسل عدم توجہ کی بے حد مار دی مگر وہ بھی کسی سپیشل ہڈی کا بنا ہوا تھا کیونکہ میامی کے قیام کے دو دنوں میں وہ سائے کی طرح ہم لوگوں کے ساتھ لگا رہا۔ آخر میں تو ہم سب باجماعت اس کو ہُوٹ کرنے لگ گئے تھے مگر اس کے باوجود اس کے بچے نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی اداؤں کے تیر مسلسل پھینکتا رہا۔ اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آواز تھی: تیز، کرخت اور میکنیکل قسم کی آواز جس کے بارے میں واشنگٹن کے لیے روانگی کے وقت عالی نے ایک یادگار جملہ کہا۔ رُخصتی معانقہ کرتے ہوئے بولے:

"آپ کی آواز کمال کی ہے شہباز صاحب، جب آپ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ٹائپ کر رہے ہیں۔"

واشنگٹن

ہماری فلائٹ براستہ نیویارک تھی مگر نیویارک سے ہمارا تعلق صرف 'لگا رڈیا'
ایئرپورٹ پر جہاز بدلنے تک تھا سو ہوائی جہاز کی کھڑکی سے جتنا نیویارک نظر آسکا دیکھ لیا،
باقی کے بارے میں اُسی انداز میں 'انشاء اللہ' کہا جس کا مظاہرہ ایک عرب شیخ نے کیا تھا۔
تفصیل پھر کبھی سہی۔ واشنگٹن کا ہوائی اڈہ توقع کے برخلاف کچھ 'اینویں' سانکلا۔ سامان
بھی اتنی دیر سے آیا کہ اپنے کراچی کی یاد تازہ ہوگئی۔ نیشنل بنک کے یوسف چوہان اور
علی گڑھ اولڈ بوائز کے نمائندے طفیل صاحب ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔
معلوم ہوا کہ یوسف صاحب اپنی ذاتی حیثیت میں عالی صاحب کے لیے آئے تھے،
یعنی اگر وہ نہ آتے تو ہمارا سارا سامان اور چار عدد مسافر ایک ہی موٹر میں سفر کرتے جب کہ
حالت یہ تھی کہ اس سارے پھیلاؤ کے سمیٹنے میں دو موٹریں بھی کم پڑتی تھیں۔ یہ میزبانوں
کی کم سلیقگی کا پہلا مظاہرہ تھا۔

یوسف چوہان اور طفیل صاحب میں بحث جاری تھی کہ مشاعرے سے پہلے کے
تین گھنٹوں کا مصرف کیا ہونا چاہیے۔ طفیل صاحب بضد تھے کہ منتظمین کی طرف سے
اُنھیں یہ ڈیوٹی دی گئی ہے کہ وہ ہم سب کو لے کر سلمان کاظمی صاحب کے گھر پہنچیں
جہاں چائے کا انتظام کیا گیا ہے اور وہاں سے ہمیں مشاعرہ گاہ میں لے جایا جائے گا۔
معلوم ہوا کہ سلمان کاظمی صاحب کا گھر ایئرپورٹ سے چالیس میل شمال کی طرف ہے اور
مشاعرہ گاہ وہاں سے چالیس میل جنوب کی جانب واقع ہے یعنی ہمیں آئندہ تین گھنٹوں میں
ایک سو بیس میل کا مزید سفر بھی کرنا ہوگا۔ یوسف چوہان نے ہماری تھکن اور اس پروگرام
کی غیر معقولیت کے بہت واسطے دیے مگر طفیل صاحب چونکہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے

اس لیے آخری فتح انہی کی ہوئی۔

راستہ بہت خوبصورت تھا مگر سفر کی تھکن، رات کا متوقع جگراتا اور میزبانوں کی ہٹ دھرمی اور بدانتظامی کا تخلیق کردہ یہ سو سوا سو میل کا بے معنی چکر آپس میں کچھ ایسے گھُل گئے تھے کہ بقول غالب :

سایہ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

مغربی شہروں کے down towns اور مضافات میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا۔ جس طرف بھی جائیں ایک جیسے گھر اور ایک سی آبادیاں ہیں۔ سلیمان کاظمی کا گھر کولمبیا میں تھا اور مشاعرہ ورجینیا میں۔ ان دونوں کے درمیان یا ان سے سوا Annan Dale، بالٹی مور، میری لینڈ اور Falls Church کے علاقے تھے اور وہیں کہیں واشنگٹن ڈی سی بھی تھا جو ہماری منزلِ مقصود تھی۔ اسی طرح کی منازلِ مقصود پر شفیق الرحمٰن کا ایک جملہ وہاں بار بار یاد آیا کہ "حاتم دِنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتا ہوا بالآخر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا اور اس بات کا پتا اسے یوں چلا کہ شہر پناہ کے باہر ایک بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا: "مقصود منزل"۔

سلمان کاظمی کے گھر پر چائے کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ بھی موجود تھے۔ شماریات کے ماہر ہندوستانی مسلمان، معقول کھاتے پیتے اور معقول سے زیادہ اُونچے لمبے، خوش رو اور خوش لباس آدمی تھے۔ کسی حادثے کی وجہ سے ایک ٹانگ پر چوٹ کھائے بلکہ لگائے ہوئے تھے۔ اس قدر نستعلیق تھے کہ بہت دیر تک میں ان کی اس چوٹ کو ان تکلفات کا حصہ سمجھتا رہا جن کا وہ بطور میزبان مظاہرہ کر رہے تھے۔ گفتگو بہت دھیمے لہجے میں اور خاصے طویل وقفوں کے ساتھ کرتے تھے۔

عالی اور جعفری صاحب اپنی عمر، سینیارٹی اور تھکن کی آڑ لے کر بالائی منزل کے کمروں میں لیٹ چکے تھے۔ چند لمحوں بعد پروین بھی گھر کی خواتین سے کچھ سازش کرنے کے بعد غایب ہو گئی اور یُوں مجھ اکیلے کو نہ صرف تمام میزبانوں سے گفتگو کرنا پڑی بلکہ پُورے

گروپ کی طرف سے خیر سگالی کے طور پر اس قدر مسکرانا بھی پڑا کہ جبڑے دُکھنے لگے۔

معلوم ہوا کہ آج کی تقریب two in one ہے، یعنی مشاعرے سے پہلے سر سید اور علی گڑھ تحریک کے حوالے سے ایک اور نشست ہو گی جس میں علی سردار جعفری بھی تقریر کریں گے۔

جب ہم لوگ ہال میں داخل ہوئے تو وہ کھچا کھچ سے کچھ ہی کم بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف شیروانیوں کی بہار تھی اور سٹیج سے محاورے اس بے تکلفی کے ساتھ پھینکے جا رہے تھے کہ دیارِ فرنگ کا یہ گوشہ اچھا خاصا لکھنؤ سنائی دے رہا تھا۔ کوئی چھ سو سیٹوں کا انتہائی معقول ہال تھا۔ کرسیاں، پردے، سامانِ آرائش، ساؤنڈ، لائٹس غرض کہ ہر چیز انتہائی اعلیٰ معیار کی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ وہاں کے ایک عام سے سکول کا آڈیٹوریم ہے (اللہ اللہ) منتظمین نے یہ تو بتایا جلدی کی وجہ سے کوئی بہتر آڈیٹوریم نہیں مل سکا، البتہ یہ پتا نہ چل سکا کہ جلدی کس بات کی تھی؟

جعفری صاحب نے سر سید کے حوالے سے ایک طویل لیکن بڑی مؤثر تقریر کی۔ اگر اس کے بعد وہ یہی تقریر چند معمولی ترامیم کے ساتھ مختلف جلسوں میں دیگر حوالوں سے نہ کرتے تو مَیں یقیناً ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔ مشاعرہ شروع ہوا اور ہمیں سٹیج پر بیٹھ کر تمام حاضرین کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس قدر شناسا چہرے نظر آئے کہ زمان و مکان کے تصورات گڈمڈ ہونا شروع ہو گئے۔ ریڈیو پاکستان کے اظہار کاظمی اور ان کی فن کار بیگم شاہدہ کاظمی، جمیل ملک اور اسد نذیر کی مشہور ریڈیائی تکون کا تیسرا زاویہ افضل رحمان، عارف وقار کی بہن عابدہ وقار اور اس کی والدہ اور ان سب سے بڑھ کر اپنا طرحدار دوست شاعر احمد فراز۔ فراز اپنے مخصوص سرحدی تپاک کے ساتھ گلے ملا لیکن اس کے جملوں کی بے ربطی سے میں نے اندازہ کیا کہ معاملات حدودِ عقل و ہوش کے آخری سرے تک پہنچ چکے ہیں۔ مقامی شاعرہ اور ریڈیو پروگرام کی انچارج تزئین حنا نے نظامت کے فرائض سنبھالے۔ شمالی امریکہ کے مختلف شہروں سے آٹھ دس کے قریب شاعر تشریف لائے تھے۔ مشاعرے

کے دوران کاغذی گلاسوں میں ہمیں چائے اور کافی پیش کی گئی جب کہ فراز اور کچھ اور دوست مخصوص مشروبات سے شغل فرماتے رہے۔ فراز کے پاکستان سے جانے کی خبر، سیر و سیاحت اور تبادلے رکوانے کی ناکام کوشش کے مرحلوں سے گزر کر اب ان حوالوں سے ہم تک پہنچ رہی تھی جو خاصے مشکوک اور متنازعہ فیہ تھے۔

فراز کی شاعری کی بے پناہ قوت اور خوبصورتی سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کی سیاسی بصیرت اور ذاتی کردار ہمیشہ سے بحث طلب رہے ہیں۔ مغرب سے آنے والی خبروں اور دوستوں کی وساطت سے یہ تو معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی خود ساختہ جلاوطنی کو اشتہار بنا کر شہر شہر پھرتا اور حکومت کو گالیاں دے کر داد سمیٹتا اور انقلابی کہلاتا ہے مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ بھی فہمیدہ ریاض کی طرح پاکستان کی حکومت اور ریاست کے فرق کو فراموش کر چکا ہے۔

فوج اور فوجی حکومت سے اس کی بوجوہ ناراضگی بجا اور اس پر احتجاج اور تنقید کا حق بھی اسے یقیناً ملنا چاہیے لیکن ایک ایسے مجمعے کے سامنے، جس میں نوے فی صد ہندوستانی سامعین ہوں، اپنے وطن اور اہلِ وطن پر آوازے کس کر ان لوگوں سے دادِ سخن لینا جو پاکستان کی تباہی پر خوش ہوتے ہیں ہرگز کوئی مستحسن بات نہیں۔ اس نے پہلے جو نظم سنائی اس کے مخاطب پاکستان کے اہلِ قلم تھے جنہیں اس نے بُرا بھلا کہنے کے بعد اپنے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دی تھی۔ اس سارے عمل میں اس نے اپنا مقام دُنیا کے عظیم دانشوروں اور انقلابی شاعروں کی صف میں متعین کیا تھا۔ یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے سپین کا لورکا، چلی کا پابلو نرودا، ترکی کا ناظم حکمت، فلسطین کا محمود درویش، چین کا ماؤزے تنگ، ویت نام کا ہوچی منہ اور کیوبا کا فیڈل کاسترو سب کے سب اس کے انقلابی لشکر کے سپاہیوں میں شامل ہیں۔ سب شاعر مختلف انداز میں تعلّی کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر اس رات فراز سچ مچ فراز پر تھا۔

حاضرین کی بے پناہ داد اور اصرار پر اس نے دوسری نظم 'محاصرہ' سنائی۔ یوں دیکھا جائے تو اس کی دونوں نظموں میں بہت سی صحیح باتیں اور عمدہ لائنیں تھیں لیکن اپنے گھر کی

گندی لینن کو ایک تماشبین پبلک کے سامنے دھو کر اس نے سٹیج پر جو کثافت پیدا کر دی تھی اس کا لازمی تقاضا تھا کہ ہم میں سے کوئی اس کی باتوں کا جواب دیتا۔ عالی صاحب ہمارے دل کی بات پڑھ کر کھڑے ہوئے اور پاکستان کے حوالے سے اپنی غیر مشروط محبت اور وفاداری کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے اپنا مشہور گیت 'جیوے جیوے پاکستان' اپنے مخصوص ترنم میں پڑھنا شروع کیا۔ سامعین میں پاکستانیوں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے یہ گیت کورس نہ بن پایا مگر اتنا ضرور ہوا کہ فراز کی پیدا کردہ کشیدگی میں کسی حد تک کمی واقع ہو گئی۔

مشاعرے کے پہلے دَور کے خاتمے پر چائے کا وقفہ ہوا تو میں نے فراز کو پکڑ لیا اور واضح الفاظ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ وہ بار بار مجھے گلے لگا کر اُلٹی سیدھی وضاحتیں پیش کرتا رہا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بہادری یہ نہیں کہ آدمی جن عوام کی محبت کے گیت گائے خود ان کو مصائب کے دریا میں چھوڑ کر پار اُتر جائے اور آتے جاتے مسافروں کے ہاتھ حمایتی بیان اور خیر سگالی کی نیک خواہشات بھجواتا رہے۔ اگر اسے وطن اور اہلِ وطن سے اتنی ہی محبت ہے تو وہ پاکستان میں رہ کر ان کے دُکھ درد میں شامل ہو اور یوں اپنے وطن کو جگ ہنسائی کا نشانہ نہ بنائے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ تم یہی باتیں وہاں رہ کر کرو تو سارا ملک تمہاری عزت کرے جیسی کہ حبیب جالب کی ہوتی ہے لیکن ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا نہ بنو جنہیں پاکستان کی آزادی، سالمیت اور سرحدوں کے وجود سے ہی اُلجھن ہوتی ہے۔ اتنے میں کچھ لوگ ہمارے اردگرد جمع ہو گئے اور انہوں نے اس مسئلے کو علمی اور فلسفیانہ دلائل کے ساتھ عالمی تناظر میں رکھ کر فراز کے مؤقف کی حمایت کرنے کی کوشش کی لیکن شاید اس وقت تک فراز کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا کیونکہ اس نے خُود ہی ان کی بات کاٹنا شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر چند لمحوں کے اندر اندر وہ سب لوگ کھسک کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔

مشاعرہ رات کے دو بجے ختم ہوا۔ عابدہ وقار اور اس کی والدہ نے منتظمین سے بات کر کے مجھے اپنے گھر لے جانے کا انتظام کر لیا تھا چنانچہ ہم مشاعرہ گاہ سے نکل کر

ان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے جو وہاں سے صرف بیس میل دُور تھا۔ راستے میں ایک اٹالین ریسٹورنٹ میں پیٹ کی پوجا کی۔ عابدہ کی ناک فلو کے حملے کی ابتدائی علامات کا منظر نامہ بنی ہوئی تھی مگر وہ جوشِ مہمانداری میں پاسبانِ عقل کو دل سے دُور تر رکھنے پر مصر تھی چنانچہ ہم لوگ صبح تک مشترکہ دلچسپی کے موضوعات اور بھولے بسرے دوستوں کی باتیں کرتے رہے۔ عابدہ نے بتایا کہ اس نے اپنے امریکن شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور اب اپنے چار سالہ بچے اور والدہ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ سکول میں پڑھاتی ہے، تنخواہ معقول ہے، گزارہ ہو رہا ہے۔

عابدہ وقار کی ذہانت اور اُردو ادب سے متعلق اس کی قابلیت کا میں اس وقت سے معترف ہوں جب وہ اورینٹل کالج میں پڑھا کرتی تھی اور ابھی اس نے ایم اے میں پنجاب یونیورسٹی کا ریکارڈ بھی نہیں توڑا تھا۔ اس کی طلاق کا سُن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ زیادہ تفصیل اس لیے نہیں پوچھی کہ اس ذکر سے بہرحال اس کو تکلیف ہوگی۔ جاتے ہوئے وہ مجھ کو ایک چھپا ہوا اشتہار نما کاغذ یہ کہہ کر دے گئی کہ جب کبھی اس پر اُداسی وغیرہ کا دورہ پڑتا ہے وہ ان چند لائنوں کو پڑھتی ہے اور جیسے اس کے اندر روشنی کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ میں نے اس عبارت کو اُردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی مگر مزا نہیں آیا، چنانچہ اصلی حالت میں نذرِ قارئین کرتا ہوں۔ عنوان ہے:

EVERYBODY, SOMEBODY, ANYBODY, NOBODY

تحریر کچھ یوں ہے:

Once upon a time, there were four people named Everybody, Somebody, Anybody and Nobody. There was an important job to be done and Everybody was sure that Somebody would do it. Anybody could have done it but Nobody did it. Somebody got angry about that because it was Everybody's job. Everybody thought Anybody could do it, but Nobody realized that Everybody didn't do it. It ended by Everybody blaming Somebody when actually Nobody could accuse Anybody.

صبح آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر ماحول اور محلِ وقوع

کا جائزہ لینا چاہا تو ہر طرف ایک جھٹپٹے کا سا عالم تھا۔ بارش غالباً خاصی دیر سے ہو رہی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں بھیگے ہوئے خزاں زدہ درختوں کی اُداسی اور نہائے ہوئے سبزے کی طراوت خوشی اور غمی کا ایک عجیب سنگم پیش کر رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت گھر اپنے اپنے مکینوں کی اُلجھنوں، خوابوں، خوشیوں اور مجبوریوں کو چھپائے جیسے بے تعلق سے کھڑے تھے۔ منیر نیازی کا ایک شعر کہیں سے بھٹکتا ہوا دھیان میں آنکلا :

مثالِ سنگ کھڑا ہے اسی حسین کی طرح
مکاں کی شکل بھی دیکھو دلِ مکیں کی طرح

دروازہ آہستہ سے کھُلا، عابدہ کی امّی نے جھانک کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے اندر آئیں۔ کہنے لگیں : "صبح سے تیسری مرتبہ تمہارے لیے بیڈ ٹی بنائی ہے۔ جگایا اس خیال سے نہیں کہ رات بھر کے تھکے ہوئے ہو اور پتا نہیں بیڈ ٹی لیتے بھی ہو یا نہیں، خواہ مخواہ تمہیں ڈسٹرب نہ کروں۔"

میں نے کہا : "آنٹی، بیڈ ٹی کا تو میں واقعی عادی نہیں کیونکہ دانت برش کیے بغیر کچھ کھانے پینے کے تصور سے ہی مجھے اُلجھن ہوتی ہے البتہ اگر آپ مجھے جگا دیتیں تو شاید میں واشنگٹن کی اس خوبصورت صبح کو زیادہ وقت اور توجہ کے ساتھ دیکھ سکتا۔"

"اس طرح کی صبح تو یہاں سال میں آٹھ مہینے ہوتی ہے بیٹا، مگر ہائے وہ لاہور کی صبحیں ۔ ۔ ۔ ۔"

آنٹی کی آواز بھرا گئی اور میں سوچ میں پڑ گیا : کیا واقعی لاہور شہر کے نام اور آب و ہوا میں کوئی خاص بات ہے یا دُوسرے شہروں کے مکینوں کی طرح یہ بھی اپنے باشندوں کے ناسٹلجیا کا ایک روٹین استعارہ ہے؟

اتنے میں عابدہ کا چار سالہ گورا چٹا اور صحت مند بچہ سفید ململ کے کُرتے اور پاجامے میں انگریزی بولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ معلوم ہوا کہ رات اسے افضل رحمان کے گھر چھوڑ دیا گیا تھا جہاں سے صبح صبح اسے عابدہ لے کر آئی تھی۔ میں نے اس سے

فرینک ہونے کی کوشش کی مگر وہ غالباً اس بن بلائے اجنبی انکل کو فوری لفٹ دینے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے کسی اعلیٰ بزنس ایگزیکٹو کی طرح مجھ سے رسمی سا ہاتھ ملایا اور پھر اپنی نانی سے یوں باتیں کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو : "Mr. You can go."

مَیں نے اسے بچوں کی پسند کے کچھ آزمودہ ٹرک دکھا کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ شروع شروع میں تو اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی مگر پھر اسے کوئی بات پسند آگئی ، چھلانگ مار کر بستر پر آیا اور میری گود میں بیٹھ کر بولا : "can you do it again.uncle ?"

اس نے ایک دم میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور میں ایک پل میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے گھر پہنچ گیا۔ میرا تین سالہ بیٹا علی بھی صبح جاگنے کے بعد اسی طرح میرے گلے میں بانہیں ڈال دیتا ہے اور مسکرا کر کسی ایسی چیز کی فرمائش کرتا ہے جس کا ذکر گزشتہ دن یا رات میں کسی وقت ہوا تھا۔ وہ کون سی قوت ہے جو بچوں کے ذہنوں میں ان باتوں کو محفوظ اور تازہ رکھتی ہے جنہیں ہم اپنے بُوٹوں سے جھڑنے والی گرد کی طرح بھول جاتے ہیں ؟ علی ذیشان کی یاد سے یادوں کا ایک ارژنگ کُھل گیا : مجھے ایک ایک کر کے اپنے سب پیارے اور عزیز یاد آنے لگے ___ واشنگٹن کی سڑکوں اور درختوں پر پڑنے والی بارش میرے دل میں ہونے لگی، اور گھروں کی چھتوں پر ٹھہری ہوئی اُداسی جیسے رینگ کر اس اجنبی کمرے میں در آئی۔ مَیں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

عابدہ کا گھر یُوں تو چھوٹا سا تھا مگر تین افراد کے اس کُنبے کے لیے خاصا بڑا تھا۔ آنٹی نے بتایا کہ basement کے کمرے انہوں نے دو غیر ملکی طالب علموں کو کرائے پر دے رکھے ہیں جن میں سے ایک پاکستانی اور ایک چینی ہے۔ اگر میں پاکستان میں ہوتا تو کہتا کہ اس چینی کی عمر بہت لمبی ہو گی کیونکہ ادھر آنٹی نے اس کا نام لیا ادھر وہ مُسکراتا اور کورنش بجالاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

چارلی کہنے کو تو چینی تھا مگر پتا چلا کہ اس کے والدین پچیس برس پہلے فارموسا عرف تائیوان سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوے تھے۔ چارلی کی عمر بقول اس کے بتیس برس تھی لیکن اگر وہ اپنی عمر بیس یا پچاس برس بھی بتاتا تو میرے پاس نہ ماننے کے لیے کوئی دلیل

اب وہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

تینوں گھٹنوں کے بل جھک کر دعا مانگنے لگے۔ دعا کے اختتام پر غیب سے ایک آواز آئی :

"مجھے کیا سناتے ہو، میرے بچو، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ؟ میرے تو اپنے بیٹے نے میرے ساتھ یہی کیا ہے۔"

افضل رحمان کے گھر سے دیگر ہمرہانِ قافلۂ درد کا پتا کیا، معلوم ہوا پروین تزئین حنا کی طرف ٹھہری ہوئی ہے۔ عالی، یوسف چوہان کی طرف ہیں اور جعفری صاحب ڈاکٹر عبداللہ کی طرف رات رک کر صبح کی فلائٹ سے اپنے بیٹے سے ملنے شکاگو جا چکے ہیں۔ وائس آف امریکہ والے انٹرویو کرنا چاہتے تھے مگر کوئی ایسا پروگرام نہیں بن رہا تھا جس میں سب کے سب بیک وقت جمع ہو سکتے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ عالی اور میں شام چھ بجے انٹرویو ریکارڈ کروا دیں۔ گویا ہم ان کے نزدیک بھاگتے بھوت کی لنگوٹی تھے !

براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے باہر ایک مقررہ مقام پر عالی صاحب ایک شاندار مرسڈیز کے قریب چھتری تانے کھڑے تھے۔ ان کے قریب ایک لمبا تڑنگا سمارٹ سا ادھیڑ عمر گورا فوجی قسم کی وردی پہنے آدھا بارش میں اور آدھا ایک شیڈ کے سائے میں کھڑا تھا۔ جرنیلوں جیسے حلیے والے اس شخص نے بڑے تپاک سے ہمارے ساتھ ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے 'ہائے ہائے' کہا۔ عالی نے شاید اس خیال سے کہ کہیں ہم لوگ زیادہ مرعوب ہو کر اسے سلیوٹ ہی نہ مارنے لگ جائیں اُردو میں بتایا کہ یہ اس کرائے کی گاڑی کا ڈرائیور ہے جو یوسف چوہان نے ان کے لیے ہائر کی ہے۔ میں نے ایک نظر اس چمکتی ہوئی گاڑی پر ڈالی اور پھر اس جرنیل نما شوفر کی طرف دیکھا اور اپنے شہر کی ٹیکسی کاروں اور ان کے موٹے موٹے بدمعاش صورت ڈرائیوروں کو دھیان میں لایا جن کے ساتھ سفر میں ہر وقت جان اور مال کا خطرہ رہتا ہے۔ شوفر نے گاڑی کی ڈکی سے ایک اور چھتری نکالی اور اسے عابدہ کی طرف بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں افضل کو اور مجھے مخاطب کیا کہ افسوس اس وقت کوئی اور چھتری موجود نہیں ورنہ آپ کی خدمت میں بھی پیش کرتا۔"

دو چھتریوں کی آڑ میں ہم چار افراد بارش کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے وی او اے کی عمارت میں داخل ہوئے۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر نام، پتے اور آمد کی غرض و غایت لکھوانے کے بعد لفٹ کے ذریعے اُردو شعبے میں پہنچے تو پہلی بار امریکہ اپنا اپنا سا لگا۔ بالکل اپنے لاہور ریڈیو اسٹیشن کا سا ماحول تھا۔ ویسی ہی اُداسی اور بے ترتیبی، ٹیپوں کے انبار، پُرانے اخبارات اور رسالے اور دیکھی بھالی دیسی شکلیں۔ افضل رحمان نے جلدی جلدی ریکارڈنگ کے لیے ایک علیحدہ کمرے کا انتظام کیا جہاں باری باری میرا اور عالی کا رسمی قسم کا انٹرویو ہوا۔ یہ انٹرویو اسی طرح کے چھوٹے پروفیشنل کیسٹ ریکارڈر پر ریکارڈ کیا گیا جیسے ہمارے ہاں عموماً صحافی حضرات استعمال کرتے ہیں۔ وی او اے کے بڑے نام میں اُردو سروس کے چھوٹے درشن دیکھ کر دُکھ بھی ہوا۔ ندیم صاحب کا کیا اچھا شعر ہے:

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
سر پہ تاج رکھتے ہیں، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

انٹرویو کے بعد عالی کی ایک امریکن دوست کی بیٹی اور اس کے شیرف شوہر سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ یہ دونوں گزشتہ رات مشاعرے میں آئے تھے اور اُردو کا ایک لفظ نہ سمجھنے کے باوجود آخر تک بیٹھے رہے تھے۔ لڑکی کا نام سوزین تھا، عمر چوبیس پچیس برس تھی، نقش و نگار اور دیگر احوال اچھے خاصے تھے لیکن اس کے شوہر کی موجودگی میں دھیان کو زیادہ آوارہ پھرانے کی گنجائش نہ تھی۔ شوہر کا پورا نام پتا نہیں کیا تھا، مجھ سے اس کا تعارف جم کہہ کر کرایا گیا تھا۔ وہ واشنگٹن کے کسی علاقے کا شیرف تھا۔ اُونچا لمبا، ہٹا کٹا (ہٹا کم اور کٹا زیادہ)، بات بات پر ہنسنے والا امریکن۔ بیوی کے مقابلے میں شاید کم پڑھا لکھا یا اس سے زیادہ سمجھدار تھا کیونکہ جب عالی حسبِ عادت کسی پیچیدہ بین الاقوامی مسئلے پر بات کرتے وہ آنکھیں مٹکا کر میری اور عابدہ کی طرف دیکھتا اور کوئی ہلکی پھلکی بات شروع کر دیتا۔ سوزین کا کچھ تعلق ری پبلکن پارٹی کی کسی ذیلی تنظیم سے بھی تھا جس کی نوعیت واضح نہ ہو سکی لیکن اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ عالی نے بتایا کہ اس کی ماں دُنیا کی گیارہ زبانیں جانتی ہے جب کہ سوزین فی الحال صرف اٹالین، فرنچ اور سپینش پر دسترس حاصل کر چکی ہے۔ کُرۂ ارض

پر انسان کے مُستقبل اور اس کے سماجی انحطاط کی عمرانی وجوہات قسم کے کسی مسئلے پر عالی اور سوزین بڑے عالمانہ انداز میں بحث کر رہے تھے کہ پتا نہیں کیسے سوزین کے بھائی کی شادی کی بات چل نکلی۔ عالی نے سوزین سے اس کی بھابھی کے بارے میں پوچھا۔ سوزین نے ناک چڑھا کر 'دفع' کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور اپنی بھابھی کے بارے میں جو رائے دی اس کا اُردو میں مفہوم کم و بیش کچھ یُوں تھا:

"دفع کریں جی اُسے، کوئی عورت ہے وہ۔ اُلّو بنا کے رکھا ہوا ہے میرے بھائی کو۔ ٹھیک ہی کہتے تھے ہمارے بزرگ جنوب (امریکہ کا جنوبی حصّہ) کی عورتیں پھوہڑ اور بدسلیقہ ہوتی ہیں۔ نہ منہ نہ متّھا، جِنّ پہاڑوں لتّھا"

مجھے محسوس ہوا جیسے اندرون موچی دروازہ کی کوئی پروین، نسرین، خالدہ قسم کی لڑکی اپنی بھابھی کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہی ہے۔

سوزین کے اندازِ گفتگو کی اس اچانک تبدیلی سے ایک لمحے کے لیے ہم سب لوگ ہکّے بکّے سے ہو کر رہ گئے۔ نند بھاوج کی اس امریکی کہانی میں ہو بہو وہی کردار تھے جو وطنِ عزیز میں اِس رِشتے کے حوالے سے دکھائی دیتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے، انسان نے دُنیا کو برِاعظموں، نسلوں، رنگوں، نظریوں اور سرحدوں میں تقسیم کر کے ٹکڑے ٹکڑے تو کر دیا ہے لیکن جذبوں کی سطح پر (ماحول کی جزوی تبدیلیوں سے قطع نظر) وہ آج بھی ایک ہی انداز میں سوچتا اور ری ایکٹ کرتا ہے۔

سوزین شاید ہماری معنی خیز مسکراہٹوں سے کچھ کھٹک سی گئی تھی چنانچہ اس نے اپنی بھابی کے ذکر پر لعنت بھیجتے ہوئے میرے لیے ایک اور اورنج جُوس کا آرڈر دیا اور ہمیں اپنی ماں کے بارے میں بتانے لگی جو اس کے خیال میں ایک بہت غیر معمولی اور ونڈر فل عورت تھی۔

عالی چونکہ پہلے ہی سے اس رائے کے حق میں تھے اس لیے میری اور جم کی کوششوں کے باوجود اختلاف کی گنجائش بلکہ نیلام گھر والے طارق عزیز کے لفظوں میں 'امکان' پیدا نہ ہو سکا۔

'چارلیز' سے اُٹھتے اُٹھتے ساڑھے آٹھ بج گئے۔ عالی کھانے کے لیے کہیں مدعو تھے اور ہم سب کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کا اس

طرح ہمیں چھوڑ کر چلے جانا قطعاً خلافِ آداب نہیں کیونکہ یہ ملاقات اتنے ہی وقت کے لیے قرار پائی تھی۔ عالی اپنے جرنیل نما شوفر کے ساتھ اور سوزین رجم کے ساتھ رُخصت ہوئے تو میں اور عابدہ بھی بھیگتے ہوئے موٹر تک پہنچے جو چارلیز سے تقریباً ایک فرلانگ دُور پارک کی گئی تھی۔ بارش اور سردی ہڈیوں میں اُترتے جا رہے تھے اور عابدہ کا فلو اندر سے باہر آچکا تھا چنانچہ میں نے خواہش کے باوجود واشنگٹن کی سیر سے متعلق عابدہ کا پُر اصرار مشورہ ٹھکرا دیا کہ اس سے اس کی طبیعت کے مزید بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

اگلی صبح پچھلے دن کا ایکشن ری پلے تھی۔ بارش اگرچہ ہلکی اور غیر مسلسل تھی مگر سردی کی وجہ سے بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ٹیلی فون پر ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ طے پایا کہ تزئین خنا کے یہاں سب لوگ جمع ہو جائیں، وہیں کھانا کھایا جائے اور گپ کی جائے مگر اب مسئلہ یہ آپڑا کہ میں وہاں پہنچوں کیسے! عابدہ بے چاری نے گرچہ میرے لیے خاص طور پر اپنے سکول سے چھٹی لی ہوئی تھی مگر اتنے تیز بُخار میں اس سے اتنی لمبی ڈرائیونگ کرانا انتہائی غیر اخلاقی اور اَن اَشورلس عمل تھا۔ میں نے پروین کو اس صُورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے اپنی کامن سنس کو بڑی مشکلوں سے بُروئے کار لاتے ہوئے مشورہ دیا کہ اس ضمن میں ہمیں اپنے باضابطہ میزبانوں کو تکلیف دینی چاہیے کیونکہ بطورِ مہمان ہمیں تو اس کا حق بھی پہنچتا ہے!

میزبانوں میں سے ڈاکٹر عبداللہ کے علاوہ جمیل صاحب کا فون نمبر بھی ہمیں دیا گیا تھا مگر ہم نے ڈاکٹر عبداللہ کو ہی زحمت دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ نئے میزبان کے ساتھ سارے تکلفات پھر شروع سے برتنے پڑتے جب کہ ہم اس عمل سے ناکوں ناک آچکے تھے۔ یُوں جمیل صاحب کو دیکھے پرکھے بغیر ڈاکٹر عبداللہ کے حق میں فیصلہ دینے پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے:

ایک نو آموز شاعر اپنی دو غزلیں لے کر اُستاد کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ شام کے مشاعرے میں اُسے غزل سرا ہونا ہے اس لیے اُستاد صاحب دونوں میں سے بہتر غزل کی نشاندہی کر دیں۔ اُستاد نے پہلی غزل پڑھی اور کاغذ شاگرد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"برخوردار ——— دُوسری پڑھ دینا۔"

راستے میں ڈاکٹر عبداللہ سے ہندوستانی مسلمانوں، اردو شاعری، دوطرفہ تعلقات، روسی اور امریکی سامراج اور احمد فراز کے رویے کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ فراز پر آنے والا میرا غصہ اب آہستہ آہستہ افسوس میں تبدیل ہو رہا تھا کہ اتنا اچھا اور پیارا شاعر اور برسوں کا دوست یوں در بدر خوار ہو رہا ہے اور اپنی ناسمجھی کی وجہ سے ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے جو اس کے نام اور شہرت کی آڑ لے کر اپنے قد بلند کرنے کی فکر میں ہیں۔ میں نے پھر اپنے اس خیال کا اعادہ کیا کہ فراز کی بیشتر باتیں صحیح ہیں مگر اس کے اظہار کے طریقے اور پلیٹ فارم غلط ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چونکہ بنیادی طور پر ادب اور سیاست کا آدمی نہ تھا اس لیے اس نے اس مسئلے پر زیادہ گفتگو نہیں کی، صرف اتنا کہا کہ فراز صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بہت سی لمبی لمبی سڑکوں سے گزر کر جب ہم تزئین حنا کے گھر پہنچے تو تین بج رہے تھے۔ چنانچہ کھانا کھانے کے دوران ہم نے جلدی جلدی ایک دوسرے سے نوٹس ایکسچینج کیے۔ فراز کے رویے سے وہ بھی بہت کبیدہ خاطر تھی۔ کھانے کے دوران تزئین کے میاں طیب صاحب بھی آگئے۔ موصوف کا آج ایک نئی ملازمت پر پہلا دن تھا۔ معلوم ہوا کہ امریکہ میں ملازمت چھوڑنا یا نئی ملازمت حاصل کرنا عام سی بات ہے۔ طیب بڑے سمارٹ اور تیز طرّار آدمی تھے اور اپنی وضع قطع، لباس کی تراش خراش اور انداز و اطوار سے تزئین کی نسبت زیادہ جوان اور کم عمر دکھائی دیتے تھے۔ تزئین کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ طالب علمی کے دنوں میں معقول سے زیادہ حد تک اچھی مقررہ رہ چکی ہے اور سیٹلائٹ کالج، راولپنڈی میں وہ اردو کی معروف نقاد جمیلہ شاہین کی بہت چہیتی شاگرد ہوا کرتی تھی۔

طیب اور تزئین مل کر مقامی ریڈیو سٹیشن سے ہر ہفتے دو گھنٹے کا اردو پروگرام پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اس کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور اپنا چھوٹا سا گھریلو ریکارڈنگ رُوم بھی دکھایا جس میں رکھی ہوئی چند ٹیپیں ان کا کُل سرمایۂ پروگرام تھیں۔ یہ پروگرام اگرچہ کمرشل تھا لیکن پاکستانی کمیونٹی کی عدم دلچسپی اور سفارت خانے اور ریڈیو پاکستان کی بے مروتی کی وجہ سے مختلف النوع قسم کے مسائل سے دوچار تھا۔ اب یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے پاکستان

سے باہر بیہودہ آدمی دوچار ہے جس کے پیٹ میں وطن سے محبت کا مروڑ اُٹھتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ اس طرح کے کام کاروباری سطح پر ذاتی مفادات کے لیے بھی کرتے ہیں لیکن اگر اس سے پاکستان کا امیج بنتا یا اس کا تعارف ہوتا ہے تو میرے نزدیک ان کی مدد میں بھی کوئی حرج نہیں۔ ہمارے سفارت خانے قومی ذرائع ابلاغ اور طیب تزئین جیسے لوگوں کے درمیان پُل کا کردار ادا کر کے کوئی باقاعدہ اور قابلِ عمل طریق کار نہایت آسانی سے وضع کر سکتے ہیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ 'بیورو کریسی' کے بنائے ہوئے اصول و قوانین کے وہی تنہا شکار نہیں میں خود بھی اس کی نگہِ غلط انداز کا مارا ہوا ہوں۔ میرے ٹی وی سیریل "وارث" اور "سمندر" نیویارک کے چینل نمبر سینتالیس پر عرصہ ڈیڑھ سال سے مسلسل دکھائے جا رہے ہیں۔ پروگرام چلانے والوں کا بیان ہے کہ وہ ان پروگراموں کے لیے پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کو ادائیگی کرتے ہیں جب کہ ٹی وی کے متعلقہ افسران پہلے تو ان پروگراموں کے چلنے سے ہی 'باخبر' نہیں تھے اور اب یہ کہتے ہیں کہ وہ صرف ریکارڈنگ چارجز لے کر سینتالیس چینل والوں کو پروگراموں کی کاپیاں بنا دیتے ہیں اور یوں پروگراموں کے مصنفین اور فنکاروں کے حصے میں ٹھینگے اور خالی جیب کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔

طیب نے کاپی رائٹ کی بین الاقوامی حیثیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی اور اس ضمن میں مغربی ملکوں کے مصنفین کی مثالیں دیں جن کی تحریروں کی رائلٹیاں لاکھوں ڈالر سالانہ تک پہنچتی ہیں۔ مغربی جرمنی کے شاعر اور ڈراما نگار گنٹر گراس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ سال میں ایک ڈراما لکھتا ہے اور دو بار خصوصی پروگراموں میں اپنی شاعری سناتا ہے اور ان تین پروگراموں کی کمائی پر ملک کے مہنگے ترین علاقے میں اعلیٰ ترین معیار کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ ہمارے یہاں لکھنے اور شعر کہنے والے کے لیے بھوکا ننگا، کمزور اور بُرے حال بانکے دیہاڑے ہونا ضروری ہے تاکہ اہلِ تموّل اس کی سرپرستی کر سکیں اور اس کے کندھے پر شفقت کا ہاتھ رکھ کر اپنے مخیّر اور اہلِ ذوق ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ اس سلسلے میں ان کی بُنیادی دلیل یہ ہے کہ اعلیٰ ادب ہمیشہ غربت اور تنگدستی میں تخلیق پاتا ہے۔ اور تو اور ان کی دیکھا دیکھی خود لکھنے والوں

کی سوچ کا انداز بھی یہی ہو گیا ہے۔ وہ ہر وقت ایک طرح کی خود رحمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ سکھ کے لیے گیت تو بہت لکھتے ہیں لیکن اپنے کسی ساتھی کو سکھ میں دیکھ کر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں نے اُنہیں اُردو کے ایک بہت مشہور ادیب کا قصہ سنایا جنہوں نے اپنے جتنے ہی ایک نامور ادیب کے بارے میں مجھے بڑی حاسدانہ رازداری کے ساتھ بتایا تھا:

"آپ کو پتا ہے فلاں صاحب روزانہ صبح ناشتے میں پُورا ایک سیب کھاتے ہیں!"

رات کا کھانا یکے از میزبانان نسیم صاحب کے گھر پر تھا۔ نسیم صاحب پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے شاید اسی لیے مہمانوں میں زیادہ تعداد ڈاکٹروں ہی کی تھی۔ فراز آیا تو اس کے ساتھ اس کے مقامی میزبان بھی تھے۔ اس جوڑے نے آتے ہی فوجی حکومت کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور پاکستانی عوام کے حقوق اور زبوں حالی کے بارے میں یُوں بیانات جاری کرنا شروع کیے جیسے ان کے علاوہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگ فوج کے پٹھو، عوام دشمن اور سامراج کے آلۂ کار تھے۔ اُنہوں نے امریکی پریس اور مختلف عالمی اداروں کے حوالے سے مختلف طرح کے فیکٹس اور فگرز کے ڈھیر لگا دیے اور بتایا کہ پاکستان کی تباہی میں اَب بس کچھ گھنٹوں ہی کی دیر ہے۔

اجنبی جگہ اور نامانوس لوگوں کی موجودگی میں ایسی 'مفروضاتی' اور 'سوڈو انقلابی دانشوری' کی بحث میں پڑ کر میں بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جب میرے طرح دینے کے باوجود ان کے اعتراضات اور طنزیہ اشارات کی شدت کم نہ ہوئی تو میں نے فراز کی طرف دیکھا جو گزشتہ شب کی تلخی کو دُور کرنے کے لیے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اس نے شرمندہ سا ہو کر بات بدلنے کی کوشش کی مگر تیروں کی بوچھاڑ میں کمی کی بجائے مزید شدت آگئی۔ ایک خاتون نے بتایا ایک امریکی رسالے کے سروے کے مطابق دُنیا کے دس کرپٹ ترین جرنیلوں میں دو جرنیل پاکستان سے ہیں۔ ایک کا ذریعۂ آمدنی ہیروئن کی سمگلنگ ہے اور دُوسرے کا دفاعی سامان کی خریداری۔

میں نے کہا: "ممکن ہے آپ کی معلومات درست ہوں مگر یہ تو بتایئے اگر بقول آپ کے پاکستان کے تمام شاعر، ادیب، صحافی اور سیاست دان حکومت کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں اور اس کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں تو اس ملک کی تقدیر کیسے بدلے گی اور اسے کون بدلے گا؟ آپ جیسے حریت پسند دانشوروں کو توڈالر کمانے سے فرصت نہیں ملتی۔ آپ کے بال بچے امریکی

شہری ہیں' ان کا بھی آپ کی طرح پاکستان کے بغیر گزارہ ہو جائے گا مگر وہ غریب عوام، جن کے دُکھ میں روزانہ پندرہ بیس منٹ کھانا کھانے سے پہلے یا بعد آپ منہ سے جھاگ نکالتے ہیں، اُن کے لیے آپ نے کیا کیا ہے؟ وہ تو اگر چاہیں بھی تو آپ کی طرح گرین کارڈ لے کر آپ جیسی بڑی بڑی نوکریوں پر نہیں آسکتے کیونکہ ان کے پاس وہ تعلیم اور ہُنر نہیں جس کی امریکہ کو ضرورت ہے۔ امریکی نظام نے آپ کو نہیں آپ کی تعلیم کو خریدا ہے کیونکہ یہ معاشرہ بنیادی طور پر 'بکاؤ مال' کا معاشرہ ہے۔ آپ اپنے جسموں اور رُوحوں کا سودا کرنے کے بعد کس منہ سے کسی اور کو 'بکنے' کا طعنہ دے سکتے ہیں؟ پاکستانی معاشرے کی خرابیاں اپنی جگہ مگر وہاں کے لوگ حبِ وطن میں کسی سے پیچھے نہیں اور یہ ان کی حبِ وطن ہی ہے جس کی آڑ لے کر کوئی حکومت اپنے آپ کو 'ریاست' کا درجہ دے کر ان کے اس عظیم اور مقدس جذبے کا استحصال کرتی ہے۔ آپ خدارا پاکستان کا ذکر اس طرح نہ کریں جیسے یہ آپ کی مادرِ وطن نہیں بلکہ یو۔ این۔ او کا ایک ممبر ملک ہے جس کی حالت پر آپ کرکٹ میچ کی طرح تبصرہ کرتے ہیں۔"

اس گفتگو میں ایک سمارٹ سے خوش رو نوجوان نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ بحث کا طوفان تھما تو معلوم ہوا کہ وہ یہاں کا بہت مشہور اور متمول ڈینٹسٹ ہے۔ سرگودھا کا رہنے والا ہے اور نثار چوہدری اس کا نام ہے۔ کھانے کے دوران ایک کونے میں لے جا کر اس نے مجھے بہت داد دی اور کہا کہ آپ نے بہت اچھا کیا، میں بھی ان کی اس طرح کی باتیں سُن سُن کر بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ فراز نے اس گفتگو میں خلافِ توقع نہ صرف بہت کم حصہ لیا بلکہ زیادہ تر ہماری ہاں میں ہاں ملائی۔

تحریر و تقریر کی پابندیوں کا ذکر ہوا تو بات پاکستان کی صُورتِ حال سے نکلتی ہوئی پُوری دُنیا پر محیط ہو گئی۔ ڈاکٹر نثار نے بڑی خوبصورت بات کی کہ بلاشبہ پاکستان میں صُورتِ حال بہت خراب اور تشویشناک ہے اور سیاسی و سماجی حقوق مختلف حیلوں اور حوالوں سے ضبط ہونے کے قریب قریب ہیں مگر یہ المیہ تنہا پاکستان کا نہیں بلکہ تیسری دُنیا کے تقریباً سبھی ملکوں کا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو خود پہلی اور دوسری دنیا بھی اس لعنت سے پاک نہیں۔ اسے مختلف ملکوں اور خطّوں کے ساتھ ساتھ عالمی انسانی برادری کے حوالے سے بھی دیکھنا چاہیے۔ رُوس نے

جو یہ کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں ہے تو یہ بات آج بھی تقریباً ہر معاشرے پر صادق نظر آتی ہے۔ کہیں غلامی، غربت، غیر ملکی جارحیت اور فرسودہ تصورات کی زنجیریں ہیں تو کہیں نام نہاد آزادی، سرمایہ داری، نظریہ پرستی اور انسان کو کموڈیٹی میں تبدیل کر دینے والے نظام کی زنجیریں ابنِ آدم کو بے دست و پا کیے ہوئے ہیں۔ غریب اور ترقی پذیر ملک تو بے شمار اندرونی تضادات اور بیرونی دباؤ کے شکار ہوتے ہی ہیں مگر امریکہ اور رُوس کی آزادیِ تحریر و تقریر کو کس کھاتے میں ڈالیں گے! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ امریکہ میں یہودی پریس اور لابی کی مخالفت میں بول اور لکھ کر کوئی امریکی شخص یا ادارہ اقتدارِ اعلیٰ میں شریک نہیں ہو سکتا اور کیا یہ بھی ایک حقیقت نہیں کہ روس میں سچ وہی ہے جسے رُوسی کمیونسٹ پارٹی کی آشیرباد حاصل ہو۔

ڈاکٹر نثار نے ایک لطیفہ بھی سنایا جس پر اس وقت تو میں بھی سب کے ساتھ ہنسا لیکن بعد میں سوچا کہ یہ لطیفہ کم اور انسان کی عالمگیر بے بسی کا استعارہ زیادہ ہے۔

سٹالن کی موت کے بعد رُوسی وزیرِ اعظم خروشیف ایک جلسے میں اس کی پالیسیوں کے خلاف تقریر کر رہا تھا۔ کسی نے ہجوم میں سے چِٹ بھیجی کہ آپ تو خود اس کی حکومت میں شامل تھے، اس وقت کیوں اختلاف یا احتجاج نہیں کیا، آپ اس وقت کیا کر رہے تھے؟

خروشیف نے چِٹ پڑھی اور سامعین سے کہا کہ جس کسی نے یہ چِٹ بھیجی ہے وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے۔ یہ اعلان اس نے تین مرتبہ کیا مگر کوئی شخص کھڑا نہ ہوا۔ اس پر خروشیف نے وہ چِٹ پھاڑ کر پھینکی اور مسکراتے ہوئے کہا:

"میں بھی اس وقت یہی کر رہا تھا۔"

ٹورنٹو — ۱

جس ایئرپورٹ سے ہمیں اگلی صبح بلکہ علی الصبح فلائٹ لینی تھی اس کا جغرافیائی محلِ وقوع ہم تینوں مسافروں کے مسافرخانوں سے نہ صرف تیس تیس چالیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا بلکہ ہم سب کو آنا بھی مختلف سمتوں سے تھا۔ منتظمین نے پہلی بار ایک صحیح فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ ہم سب آج کی رات اپنے چوتھے میزبان یعنی ڈاکٹر نثار چوہدری کے گھر پر گزاریں کیونکہ وہ ایئرپورٹ کے راستے میں پڑتا ہے اور اس میں ہم سب کے سمانے کی گنجائش بھی ہے۔ نثار چوہدری کے اہلِ خانہ پاکستان گئے ہوئے تھے اور وہ ایک بار پھر عارضی طور پر چھڑے چھانٹ جیسی زندگی گزار رہا تھا۔

ڈاکٹر نثار کا گھر امریکہ میں ڈاکٹروں کی خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں بھی بے شمار ہسپتالوں اور طبی سہولتوں کے باوجود لوگ پرائیویٹ علاج کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں ایک دانت نکلوانے پر جو خرچ آتا ہے اس سے ہمارے یہاں ایک لڑکی بیاہی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر نثار نے ایک خالص پنجابی میزبان کی طرح مدارات کا ایک گرمجوشانہ اور طویل سلسلہ شروع کر دیا اور رات کے ایک بجے، باوجود ہمارے انکار اور احتجاج کے، میز پر کافی، چائے، جوسز، سنیکس، آملیٹ اور پتا نہیں کس کس چیز کا ڈھیر لگا دیا۔ جس پھرتی اور خوش سلیقگی سے وہ کچن میں کام کر رہا تھا اسے دیکھ کر عالی نے کہا :

"بھئی آپ جیسا سگھڑ شوہر تو نصیبوں سے ملتا ہے۔ اگر میں عورت ہوتا تو فوراً آپ سے شادی کر لیتا۔"

ڈاکٹر نثار بھی انسانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو بقول عطاء الحق قاسمی جملہ ضایع نہیں کرتے بندہ ضایع کر دیتے ہیں، فوراً بولا :

"آپ کی داد اور تعریف کا بہت بہت شکریہ! اللہ کا شکر ہے آپ عورت نہیں ہیں۔"

عالی ایک اچھے سپورٹس مین جملے باز کی طرح اس جملے پر پھڑک اُٹھے۔ اُنھوں نے فوری طور پر اپنا سونے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور میز پر پاؤں پھیلا کر بولے:

"آپ سے تو صاحب گپ ہو گی۔"

سو یہ گپ ہوئی اور خوب ہوئی۔ ڈاکٹر نثار اپنے لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں یونین لیڈر قسم کی چیز تھا اس لیے اس کے حوالے سے کئی بھولے بسرے نام اور واقعات یاد کیے گئے۔ دورانِ گفتگو عالی نے نثار کی عمدہ اُردو کی تعریف کی تو اس نے ایک بڑا مزیدار لطیفہ سنایا کہ بعض اوقات جُملے میں محاورے کا استعمال کیا کیا گُل کھلاجاتا ہے مثلاً ایک انگریزی محاورے to kill two birds with one stone کا اُردو متبادل 'ایک تیر سے دو شکار کرنا' ہے، اسے ایک ڈاکٹر صاحب نے کیسے استعمال کیا۔

ایک بہت بڑے سپیشلسٹ سے ملاقات کا وقت لینے کے لیے کئی کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا تھا لیکن ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب بغیر اپوائنٹ منٹ کے ایک مریض کے گھر پہنچ گئے۔ مریض بہت خوش ہوا اور کہنے لگا: "آپ نے بہت عنایت کی جو تشریف لائے مگر مجھے تو آپ نے غالباً آئندہ مہینے کا ٹائم دیا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر مسکرایا اور بولا: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ دراصل ہوا یہ کہ تمہارے ساتھ والے بلاک میں آج میری ایک اپوائنٹ منٹ تھی، وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ متعلقہ مریض پچھلے ہفتے فوت ہو چکا ہے، میں نے کہا کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کرتے چلیں۔"

ڈاکٹروں کے لطیفوں کی بات چلی تو مجھے ڈینٹسٹ سے متعلق لطیفہ یاد آگیا سو میں نے جوابی کارروائی کے طور پر فوراً داغ دیا:

ایک سردار جی دانت نکلوانے کے لیے دندان ساز کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ لگانا چاہا تو سردار جی اَڑ گئے کہ ٹیکہ نہیں لگواؤں گا کوئی اور ترکیب کرو۔ خاصی بحث وتمحیص کے بعد طے پایا کہ سردار جی کو وہسکی پلائی جائے تاکہ نشے کی وجہ سے دانت نکالے جانے کی تکلیف محسوس نہ ہو۔ سردار جی نے پینا شروع کی اور آہستہ آہستہ آدھی بوتل پی گئے۔ ڈاکٹر کی قوتِ برداشت جواب

دینا شروع ہوگئی ۔ اس نے کہا :

" کیا خیال ہے سردار جی ، اَب نکال لوں دانت ! "

سردار جی نے چند لمحے لہرانے کے بعد بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں اور کرپان پر ہاتھ رکھ کر کہا :

" اَب تم میرے دانت کو ہاتھ تو لگا کر دکھاؤ ! "

ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر نثار کے بچوں کی تصویریں لگی تھیں ۔ پروین کو پھر گیتو یاد آنے لگا ۔ نثار کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ فوراً فون اُٹھا کر لے آیا اور اصرار کرنے لگا کہ آپ سب لوگ ابھی اپنے اپنے گھروں میں بات کریں ۔ واشنگٹن میں رات کے دو اور پاکستان میں غالباً صبح کے گیارہ بج رہے تھے ۔ ہمارے گریز پر اس نے ہم سب کے گھروں کے نمبر لیے اور باری باری سب کو ملا کر بات کرا دی ۔ گھروں میں بات کرنے سے محفل کا رنگ بدل گیا اور گفتگو میں ایک نامعلوم سی اُداسی تیرنے لگی چنانچہ ہم سب اپنے اپنے کمروں میں کچھ دیر سونے کے لیے چلے گئے ۔

صبح چھ بجے ڈاکٹر نثار نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ ہمیں سات بجے تک گھر سے نکل جانا چاہیے ورنہ جہاز مس ہونے کا خطرہ ہے ۔ ہاتھ منہ دھو کر نیچے آیا تو ناشتہ تیار تھا اور ڈاکٹر نثار ایک ماہر باورچی کی طرح اسے آخری ٹچ دے رہا تھا ۔ سامان اور سواریوں کی تعداد اور مقدار کے پیشِ نظر نثار نے اپنے ایک پاکستانی ہمسائے کو فون کر کے بلوایا تھا تاکہ یہ قافلہ دو کاروں میں آرام کے ساتھ سفر کرے ۔

یہ پاکستانی ہمسائے ایبٹ روڈ ، لاہور کی خلیفہ فیملی کے چشم و چراغ اختر سعید جعفری تھے جو یہاں بزنس کے سلسلے میں مقیم تھے ۔ اس حُسنِ اتفاق پر زمان و مکان ایک بار پھر گڈمڈ ہونے لگے ۔

بالٹی مور کا ہوائی اڈہ چیخ چیخ کر اپنے مضافاتی ہونے کا اعلان کر رہا تھا ۔ وطنِ عزیز میں فیصل آباد ، سکھر ، نواب شاہ وغیرہ کے ہوائی اڈے بھی بالکل ایسے ہی ہیں سر تا پا بی کلاس ! ایئر لائن Piedmont تھی ۔ جہاز اگرچہ بوئنگ تھا مگر اس سارے ماحول میں اس کی شکل فوکر فرینڈ شپ جیسی ہو رہی تھی ۔ ہم چند منٹ لیٹ تھے مگر ہوائی کمپنی کے عملے نے بڑے شہروں

جیسی کنکریٹ ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ایسی خندہ پیشانی سے ہماری تاخیر کو ہنس کر ٹالا کہ باعثِ تاخیر بیان کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک امریکن لڑکا، جس کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی، کانوں پر ہیڈ فون لگائے، آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ میں بہت حیران ہوا کہ اتنی مختصر فلائٹ میں اور بی کلاس ایئرلائن ہونے کے باوجود انھوں نے مسافروں کو ہیڈ فون دے رکھے ہیں مگر اس حیرت کی عمر چند لمحوں سے زیادہ نہیں تھی کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں، ہیڈ فون اُتارا، پاؤں میں رکھے ہوئے بیگ میں سے ایک ٹرانسسٹر نکالا اور کیسٹ بدل کر دوبارہ ہیڈ فون لگا لیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت وطنِ عزیز کے وہ سائیکل والے بہت یاد آئے جو ہینڈل کے ساتھ ٹرانسسٹر باندھ کر سفر کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے ساتھ دُوسروں کو بھی موسیقی کی دعوتِ عام دیتے ہیں جب کہ یہ فرنگی برخوردار اپنے ملکی کردار کی طرح اجارہ دار دکھائی دیتا تھا۔

ایئر ہوسٹس جُوس لے کر آئی تو وہ اس وقت بھی آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ تیسری آواز پر دُوسری بار شانہ ہلانے کے بعد چونکا اور پہلی بار میری طرف متوجہ ہوا۔ یہ جان کر کہ مَیں پاکستان سے آیا ہوں اور شعبۂ تعلیم سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس نے ٹرانسسٹر بند کیا اور ہیڈ فون اُتار کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس کا نام سارے تھا اور وہ نیویارک اپنے والدین کے پاس thanks giving کی تقریبات کے سلسلے میں جا رہا تھا۔ ورجینیا یونیورسٹی کے اس میڈیکل کے طالب علم کی صُورت میں مَیں نے پہلی بار امریکی نوجوان کا وہ رُوپ دیکھا جو ان کی قومی ترقی کی بُنیاد ہے۔ سارے انیس برس کی عمر میں اپنے تعلیمی میدان میں مہارت اور اعلیٰ صلاحیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دُنیا، اہلِ دُنیا اور اپنے عصر کے بارے میں جو معلومات رکھتا تھا وہ بلاشبہ حیرت انگیز اور ہمارے کارپردازانِ تعلیم و تہذیب کے لیے لمحۂ فکریہ تھیں۔ اس نے مجھ سے پاکستان اور پاکستان سے متعلق بین الاقوامی معاملات پر بے شمار سوالات کیے۔ اس کے لہجے اور انداز میں ایک ایسی طالب علمانہ سچائی اور کشش تھی کہ مجھے اس سے باتیں کرنے میں سچ مچ مزا آنے لگا۔ اپنے ملک کے تہذیبی، تمدنی،

سائنسی، معاشی اور معاشرتی بحرانوں اور انحطاط کا ذکر کرنے اور انہیں تسلیم کرتے کرتے تھک گیا تو تنگ آکر میں نے اس پر وہی حملہ کیا جو ہم مشرق والے خصوصاً مُسلمان اہلِ مغرب کے رُوحانی خلاء کے حوالے سے کیا کرتے ہیں۔ میں نے کہا:

"یہ دُرست ہے سارے کہ ہمارا معاشرہ کئی لحاظ سے پسماندہ اور زوال پذیر ہے مگر ہمارے پاس مذہب ایک ایسی قوت ہے جس کا متبادل تم مغرب والوں کے پاس نہیں اور جس کی وجہ سے تم لوگ رُوحانی کرب اور بحران میں مبتلا ہو۔ نیویارک کی سڑکوں پر آج بھی انسان، انسان کے شر سے محفُوظ نہیں۔"

اس نے میری بات بہت غور سے سنی اور کہنے لگا: "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ واقعی نیویارک میں ایسے علاقے ہیں جہاں آپ باحفاظت آجا نہیں سکتے کیونکہ بدمعاش لوگ ذراسی رقم کے لیے گولی مار دیتے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ ایسے علاقوں میں جانا پڑ جائے تو ہم تھوڑی بہت رقم ضرور ساتھ رکھتے ہیں تاکہ کہیں رقم نہ ملنے پر ناراض ہو کر کوئی بدمعاش گولی نہ مار دے۔ اس مسئلے نے ہمیں واقعی بہت پریشان کر رکھا ہے۔"

مَیں شاید نفسیاتی طور پر اس کی طرف سے بحث اور دفاع اور جوابی الزام کی توقع کر رہا تھا لیکن اس کے اس اقرار اور لہجے کی سادگی نے مجھے لاجواب سا کر دیا۔ میرے ذہن میں اپنے اخبارات کی وہ سُرخیاں گھُوم گئیں جن میں روزانہ قتل، ڈاکے، اغوا، چوری، آبرو ریزی اور ظلم و شقاوت کی ایسی ایسی داستانیں سُنائی جاتی ہیں کہ انسانیت کے وجود پر سے اعتبار اُٹھنے لگتا ہے۔ کاش مجھ میں بھی اتنی اخلاقی جرأت ہوتی کہ مَیں اس کے سامنے اپنے رُوحانی اقدار اور تقدّس کے نام لیوا معاشرے کی ان گھناؤنی حقیقتوں کو تسلیم کر سکتا۔ امریکی معاشرے کی تمام تر نام نہاد بے راہرویوں میں پلتا ہوا یہ نوجوان، جو ایک نیم مذہبی اور سماجی تقریب میں شرکت کے لیے اپنے گھر جا رہا تھا اور جس کی گفتگو میں اعتماد، سچائی اور بے ساختگی تھی، میرے سامنے ایک سوال بن کر کھڑا ہو گیا۔ کیا ہمارے معاشرے میں اس عمر کے لڑکے بھی اسی طرح سے سوچتے، پڑھتے اور بی ہیو کرتے ہیں؟

سارے تو نیویارک کے لگارڈیا ایئرپورٹ پر ہاتھ ملا کر اور ان معلومات کا شکریہ ادا کر کے،

جو مَیں نے اسے پاکستان کے بارے میں دی تھیں، چلا گیا مگر میں بہت دیر تک اس مخمصے میں مبتلا رہا کہ جو علم اس نے مجھے عطا کیا ہے وہ اس کے ایک غیر معمولی ذہین اور ذمہ دار طالب علم ہونے کی وجہ سے تھا یا یہ اس معاشرے کا اجتماعی عکس ہے جس نے امریکہ کو سپر پاور بنا رکھا ہے۔

ٹورنٹو کے ہوائی اڈے پر یہ ہمارا دُوسرا پھیرا تھا اس لیے اس بار ہم لوگ نسبتاً زیادہ اعتماد کے ساتھ امیگریشن کے مرحلے سے گزرے۔ گزشتہ بار کسٹم ہال میں ہمیں کسی نے چیک نہیں کیا تھا چنانچہ اب کے بھی ہم سیدھے باہر کے دروازے کی طرف بڑھے جہاں میزبان ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ سامان کی ٹرالی میں پروین کا وہ بکس سب سے اُوپر رکھا تھا جس کے تالے واشنگٹن میں جواب دے گئے تھے اور جسے باندھنے کے لیے نائیلون کی مضبوط رسّی گزوں کے حساب سے استعمال کی گئی تھی۔ ایک شرارتی سی شکل والے کسٹم آفیسر نے غور سے اس کا جائزہ لیا اور پھر بالکل ایسے انداز میں روک کر، جیسے ہمارے ٹریفک کے سپاہی موٹر سائیکل والوں سے کاغذ طلب کرتے ہیں، سامان کھولنے کے لیے کہا۔ میں نے اسے باقی بکسے کھول کر دکھانے کی پیش کش کی مگر اس کی سُوئی غالباً رسّیوں والے بکس پر اٹک گئی تھی۔ اَب پتا نہیں یہ ہماری گھبراہٹ تھی یا گرہوں کی مشکل پسندی کہ رسّی ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے مَیں نے کھینچ کھانچ کر رسیاں اُتاریں اور بکس کھولا۔ اس ستم ظریف نے ایک سرسری سی نظر بکسے میں ڈالی اور مسکرا کر کہا: "ٹھیک ہے، جاؤ۔" اَب دوسرا امتحان شروع ہوا۔ بے ترتیبی سے اُتارنے کی وجہ سے نائیلون کی رسّی اُلجھ چکی تھی اور بکس بند نہیں ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یُوں لگا جیسے پُورا کسٹم ہاؤس میری ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ عالی اس دوران میں کسٹم افسر کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پروین خود بھی اپنے ملک میں کسٹمز کی افسر ہے لیکن غالباً ان کی بات پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ پروین کے چہرے پر اس وقت جو پریشانی تھی وہ اسے اس کہانی کا کوئی اور ہی کردار ثابت کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے کسٹم کا پُل صراط ختم ہوا، لیکن ابھی حواس برقرار بھی نہیں ہو پائے تھے کہ

لاؤنج میں انتظار کرنے والے منتظمین کے سوالات کا سلسلہ شروع ہوگیا :

"کیا ہوا؟" "کیا بات تھی؟" "کیوں روکا؟" "کیا کہہ رہے تھے؟" بڑی مشکل سے سب پر واضح ہوا کہ یہ سارا فساد اس ولایتی صندوق کے اُن درآمد شدہ تالوں کا تھا جو اپنے علاقے میں آتے ہی دغابازی پر اُتر آئے تھے اور گزشتہ دو تین فلائٹوں کے دوران تیسری دُنیا کے بیشتر غلام ممالک کی طرح حقِ خود اختیاری مانگنا شروع ہوگئے تھے۔

اس پر کسٹم سے متعلق تجربات اور واقعات کا بیان شروع ہوا جن کا محور و مرکز انگریزی زبان تھی۔ انگریزی تسلط میں رہنے والوں اور امریکی اثر کے علاقوں کے علاوہ دُنیا کے بیشتر علاقوں میں انگریزی زبان جاننا کسی کام نہیں آتا۔ مہذب، ترقی یافتہ اور بڑی قومیں انگریزی کو وہ لفٹ نہیں دیتیں جس کے ہم عادی ہوچکے ہیں۔ روس، چین، جاپان، مشرقی یورپ، لاطینی امریکہ، سپین اور فرانس وغیرہ میں انگریزی سے زیادہ اشاروں کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ خود امریکہ والے بھی اس اس انداز کی انگریزی بولتے ہیں کہ جان بن یان اور اس کے پلگرم فادرز کی ہجرت کے اسباب خلط ملط ہونے لگتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں مذہبی عصبیت، فرقہ واریت اور تنگ نظری سے زیادہ 'اہلِ زبان' انگریزوں نے ان کی غلط انگریزی کی وجہ سے ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ امریکہ یوں بھی مہاجروں کا ملک ہے کیونکہ اس کی اصل آبادی تو اب چند reserves تک محدود ہے یا ریڈ انڈینز کی فلموں میں نظر آتی ہے، باقی سب کے سب یورپ کے مختلف ملکوں کے مہاجرین ہیں جو رزق، آزادی اور بہتر زندگی کی تلاش میں یہاں آبسے ہیں۔ اِس رنگا رنگی کا مظاہرہ ان کی انگریزی میں بھی نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی جب دونوں پارٹیوں کی انگریزیاں آپس میں لڑ جائیں یعنی کسٹم آفیسر اور مسافر دونوں 'صاحبِ اسلوب' ہوں تو بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

علی سردار جعفری نے اِس ضمن میں اپنے ایک گزشتہ دورہ کینیڈا کا واقعہ سنایا جس میں ان کے ساتھ اُردو کی ایک بہت مشہور اور نامور خاتون افسانہ نگار (جو کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتی ہیں) بطور شاعرہ سفر کر رہی تھیں۔ میں ان خاتون کا نام حذف کر رہا ہوں کیونکہ ایک تو وہ خاتون ہیں اور دوسرے اس لیے کہ میں خود ان کے افسانوں کا زبردست مداح ہوں سو میں ان کے نام کی

جگہ 'خاتون' کا لفظ استعمال کروں گا۔

جعفری صاحب نے بتایا کہ خاتون کی رنگت خاصی مغربی انداز کی سُرخ و سفید ہے، فرانسیسی انداز کی لمبی ناک ہے' اس پر انھوں نے فیشن ایبل دھوپ کی عینک اور فروالا اُونی کوٹ پہن رکھے تھے اور بالوں کو بھی ڈائی کر کے سُرخی مائل کیا ہوا تھا۔ اب یہ حلیہ عام طور پر یورپ کی اُن خواتین کا ہوتا ہے جو دُنیا کے قدیم ترین پیشے سے منسلک ہوتی ہیں' اس پر اُن کی انگریزی بھی خاصی متنازعہ فیہ تھی چنانچہ جب امیگریشن کاؤنٹر پر متعلقہ افسر نے سوال کیا کہ اگر آپ کینیڈا میں رشتہ داروں کے پاس بھی نہیں جا رہیں، وہاں آپ کا کاروبار بھی نہیں، ڈالر بھی آپ کے پاس نہیں ہیں تو پھر وہاں آپ کا گزارہ کیسے ہو گا؟ اس پر خاتون نے بڑے اعتماد سے کہا:

"That will be arranged, you know, I am a professional."

(اس کا انتظام ہو جائے گا، تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں ایک پیشہ ور ـــ ہوں۔)

امیگریشن والے نے چونک کر خاتون کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور پھر بڑے مشکوک انداز میں بولا:

"Sorry, madam, will you please explain your profession?"

اب خاتون کی انگریزی ختم ہو گئی، اُنھوں نے بہت اٹک اٹک کر کہا:

"Well you know, in my country, I mean, back home, I charge one hundred dollars per night but here I will take more."

(بات یہ ہے کہ میں اپنے ملک میں تو ایک رات کے سو ڈالر لیتی ہوں مگر یہاں زیادہ لوں گی۔)

اس پر اُس امیگریشن والے نے خاتون کے کاغذات اپنے قبضے میں کیے' اُنہیں ایک طرف ہو کر بیٹھنے کے لیے کہا اور بتایا کہ یہ معاملہ وہ فلائیٹ نمٹانے کے بعد طے کرے گا۔

جعفری صاحب کا بیان ہے کہ ہم سب باہر کھڑے خاتون کا انتظار کر رہے تھے۔

بہت دیر تک وہ نہیں آئیں تو میزبانوں کی وساطت سے ان کی اندر تلاش کرائی گئی۔ خاتون ایک کیبن میں بیٹھی زار و قطار رو رہی تھیں اور امیگریشن والا انہیں بتا رہا تھا کہ اس کے ملک میں یہ دھندہ نہیں چلے گا کیونکہ وہاں پہلے ہی 'رسد' کی زیادتی ہے۔ بڑی مشکلوں سے اسے سمجھایا گیا کہ خاتون اصل میں شاعرہ ہیں اور ان کا 'اُس' پیشے سے کوئی تعلق نہیں۔ امیگریشن والے نے سوال کیا: "تو پھر یہ ایک رات کے سو ڈالر کا کیا چکر ہے؟"

اب ہر آدمی نے اسے سمجھایا کہ یہ سو ڈالر شعر پڑھنے کا معاوضہ ہے اور ہمارے معاشرے میں یہ ایک روایت ہے مگر اس کی سمجھ میں آخر تک یہ نہ آسکا کہ 'مشاعرہ' کیا اور کیوں ہوتا ہے تقریباً دو گھنٹے کی بک بک جھک جھک کے بعد لوکل میزبانوں کی ذاتی ضمانت پر خاتون کو کلیرنس مل سکی۔

ٹورنٹو چونکہ اس مشاعراتی دَورے کا ہیڈ کوارٹر تھا اس لیے یہاں پر ہمارا قیام نہ صرف طویل ترین تھا بلکہ کئی قسطوں میں بٹا ہوا تھا۔ طے یہ پایا کہ ہم اپنا اپنا میزبان وصول پا لیں تا کہ آئندہ رابطے اور سفر میں آسانی رہے۔ میرے حصے میں جمال زبیری آئے۔ پروین اشفاق کے گھر ٹھہری جس کی بیوی نرجس اُسے لینے آئی ہوئی تھی۔ جعفری صاحب کو بیدار بخت لے گئے اور عالی جی دو میزبانوں کے درمیان حلال ہو گئے کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی رضاکارانہ دستبرداری پر تیار نہ تھا۔ تھوڑی دیر ہم اپنے میزبانوں کو اور میزبان ہمیں دیکھتے رہے اور پھر دونوں پارٹیاں اپنی اپنی قسمت پر صبر شکر کر کے گھروں کو روانہ ہو گئیں۔

جمال زبیری ریڈیو پاکستان کے جمیل زبیری کے برادرِ خورد ہیں جن سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ جمیل افسانے لکھتے ہیں اور جمال شاعری کرتے ہیں۔ عابد جعفری کی موٹر میں اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ پہلے وہ سنجیدہ شاعری کرتے تھے مگر اس میدان میں حالات حوصلہ افزا نہیں تھے چنانچہ اب چند برسوں سے وہ مزاحیہ شاعری کی طرف مایل ہوئے ہیں اور چونکہ لوگ اس پر ہنستے ہیں اس لیے اُن کی ہمت دن بدن بلکہ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ٹورنٹو میں وہ گزشتہ چودہ سال سے مقیم ہیں اور اللہ کا دیا سب کچھ ہے لیکن موٹر خود نہیں چلاتے

ایک بیٹا ہے جو پوسٹ آفس میں کام کرتا ہے جب کہ بیٹی ایک سٹور پر کام کرتی ہے
اس کے ساتھ ساتھ دونوں پڑھائی بھی کر رہے ہیں۔ جمال صاحب بڑے خوش پوش خوش وضع
آدمی ہیں اور مجھ جیسے بلند آواز میں بولنے والے کو بھی احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے ہیں کیونکہ
ان کی سرگوشی کی پچ بھی عام طور پر نعرے سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ میں موٹر کی پچھلی سیٹ
پر تھا اور وہ اگلی سیٹ پر مگر جس وسعتِ گلو سے وہ مجھے مخاطب کرتے تھے یقین کامل ہے
کہ اگر میں عالی صاحب والی گاڑی میں ہوتا تو بھی ان کی بات سُن سکتا تھا۔ آواز کی اس
کڑک اور گونج سے قطع نظر جمال ایک بہت پیارے، ہمدرد اور ملنسار انسان تھے اور ان
کی محبت اور مہمان نوازی ادائے فرض سے زیادہ ان کی ذاتی محبت کی آئینہ دار تھی۔

موٹر میں ہم دونوں کے علاوہ عابد جعفری اور اختر آصف بھی تھے جو شمالی امریکہ کے بہترین
نوجوان اُردو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ عابد دُبلا پتلا، سانولا سلونا اور کھلی ڈُلی طبیعت
والا ہے جب کہ اختر آصف خوش رو، گورا چٹا اور دھیمے مزاج والا ہے مگر محبت کرنے میں
دونوں ایک جیسے تھے جس کا بھرپور احساس مجھے آنے والے دنوں میں ہوا۔ جمال زبیری صاحب
کے دیے ہوئے وقفوں کے دوران اُن سے بھی ابتدائی بات چیت ہوئی۔

آج کی شام 'علی سردار جعفری' کے نام تھی یعنی ٹورنٹو والوں نے جعفری صاحب کی
سترویں سالگرہ کے حوالے سے ایک خصوصی نشست کا انتظام کیا تھا۔ ہوٹل ہالیڈے ان
کے ایک خوبصورت ہال میں دیواروں پہ کپڑے کے بینر لگے ہوئے تھے جن پر جعفری صاحب
کی مختلف ادبی خدمات کا اندراج تھا اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی
باتیں خُود میرے لیے بھی نئی تھیں۔ ہندوستان میں ہونے والی ادبی کارروائیوں کی خبر
پاکستان میں کم کم پہنچتی ہے، کتابیں اس سے بھی کم آپاتی ہیں اور شخصیات کی محدود سی آمد و
رفت تو ابھی چند سال سے شروع ہوئی ہے سو جعفری صاحب کے بارے میں میری ساری
معلومات معقول حد تک ناقص اور آوٹ ڈیٹڈ تھیں۔ مجھے پتا ہی نہ تھا کہ ترقی پسند تحریک کے
دیگر نظریہ ساز رہنماؤں سجاد ظہیر اور سبطِ حسن وغیرہ کی طرح علی سردار جعفری آزادی کے بعد کن
کن منزلوں سے گزرے ہیں اور آج کل اُن کے نظریات کیا ہیں! ہندوستانی ترقی پسندوں کے

حوالے سے کیفی اعظمی، ڈاکٹر محمد حسن، ل احمد، ظ انصاری، قمر رئیس، جذبی، ساحر کچھ اور لوگوں کے نام بھی کان میں پڑتے رہتے ہیں مگر ان کی اور اُن کے ادب کی صحیح صُورتِ حال کا ہم عام پاکستانی ادیبوں کو کچھ ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے البتہ ہمارے کچھ 'مقامی دوست' اپنے اِن سرحد پار دوستوں' ہم خیالوں یا دَف بازوں کا تذکرہ مختلف حوالوں سے کرتے رہتے ہیں سو اس ضمن میں ہم اُس بے مثل قول کا سہارا لیتے ہیں کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔

جعفری صاحب کی سالگرہ کی یہ تقریب ہمارے یہاں کے ادبی جلسوں سے خاصی مختلف تھی کیونکہ ہوٹل والوں نے اس تقریب کی ریزرویشن ادبی جلسے کے بجائے ایک ڈنر کے طور پر کی تھی اور تقریریں وغیرہ گویا ڈنر کے مختلف کورسز کا حصہ تھیں۔ شرکائے تقریب ہال میں لگی ہوئی مختلف ڈنر ٹیبلوں کے گرد بیٹھے تھے اور سٹیج پر علی سردار جعفری کے ساتھ ہم سب مہمانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ سٹیج سیکرٹری کرنل انور احمد تھے جو پاکستانی فوج کے ریٹائرڈ انجینئر ہیں۔ ان کی باتوں میں فوجیوں کی مخصوص بے تکلفی بھی تھی اور یہ احساس بھی کہ یہ جلسہ بہرطور ایک ادبی محفل ہے چنانچہ ہم نے ایک ٹکٹ میں دو دو مزے لیے۔ صدارت کے لیے ہمارے عزیز دوست اور مشہور نقاد محمد علی صدیقی کا نام پکارا گیا جو مختلف یونیورسٹیوں میں پاکستان کی ادبی اور ثقافتی صُورتِ حال پر لیکچر دینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ محمد علی صدیقی آواز کے اعتبار سے جمال زبیری کی کامل ضد ہیں یعنی نعرہ بھی ماریں تو یُوں لگتا ہے جیسے سرگوشی کر رہے ہیں۔ تقریب سے انور احمد، عابد جعفری، اشفاق حسین اور جمیل الدین عالی نے خطاب کیا۔ سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ اُردو سے محبت کرنے والے برصغیر سے ہزاروں میل کی دُوری کے باوجود اپنی ادبی روایت کی نہ صرف حفاظت اور نشوونما کر رہے ہیں بلکہ اس تعلق کو مزید گہرا اور استوار کرنے کے لیے اس طرح کی تقریبات کا اہتمام بھی کرتے رہتے ہیں۔

جعفری صاحب نے اس موقعے پر جو گفتگو کی وہ ترقی پسند تحریک کے ایک اچھے وکیل صفائی کی مدلل بحث تھی۔ جعفری صاحب تقریر کا فن جانتے ہیں اور وقت کے گزرنے اور بدلنے کے متعلقات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں سے کیا گیا

غلطیاں ہوئیں، خصوصاً علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری کو غیر ترقی پسند قرار دے کر انھوں نے اُردو شعری روایت کے ایک بہت طاقتور حصّے کو شعری تناظر سے خارج کرنے کی جو غلطی کی اس کے بہت بُرے اثرات اس تحریک کے مستقبل پر پڑے۔ کھانا تقریروں کے دوران سرو کیا گیا اور اس کی واحد خوبی یہ تھی کہ اس کی وجہ سے ہمیں ایک محاورے "اُونچی دُکان پھیکا پکوان" کا صحیح مطلب معلوم ہو گیا!

جعفری صاحب کی وضاحتی اور محمّد علی صدیقی کی معلوماتی تقاریر سے ماحول ایک غیر فطری قسم کی سنجیدگی کا شکار ہو گیا اور اچھے بھلے معقول آدمی بھی سفارت کاروں کی طرح سنجیدگی سے ہر بات پر سر ہلانے لگے۔ جلسے کے اختتام پر مقامی ٹیلی وژن اور ریڈیو پروگرام والے احباب آ گئے اور ہمارے انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد تصویریں اُترنا شروع ہوئیں اور یوں علی سردار جعفری کی سترویں سالگرہ کا یہ جشن اپنے اختتام کو پہنچا۔ جب سب لوگ جعفری صاحب کو مبارک باد دے چکے تو میں نے ایک طرف لے جا کر انہیں اپنے پیارے احمد ندیم قاسمی صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کا ایک واقعہ سنایا اور کہا کہ شکر کریں آپ کو کم از کم صدر تو ایسا ملا جو برسی اور سالگرہ کا فرق جانتا ہے۔

اِسلام آباد میں قاسمی صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب میں منتظمین نے ایک مرکزی وزیر کو صدارت کے لیے بُلایا۔ وزیر موصوف نے اپنی فی البدیہہ صدارتی تقریر میں قاسمی صاحب کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا:

"مجھے آج ندیم صاحب کی ساٹھویں برسی کی تقریب میں شامل ہو کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آپ لوگ ہر سال جناب احمد ندیم قاسمی کی برسی اسی دھوم دھام اور شان و شوکت سے مناتے رہیں گے۔"

علی سردار جعفری کی سترویں سالگرہ پر جعفری صاحب سمیت جتنے لوگوں نے اظہارِ خیال کیا سب نے کسی نہ کسی حوالے سے فیض صاحب کا ذکر ضرور کیا۔ اُس وقت کسی کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اُردو اَدب کا یہ روشن ستارہ اُنہی لمحوں میں ٹوٹ کر وقت کے اُس

مدار سے رُخصت ہو رہا ہے جہاں زندگی کا اعتبار سانسوں کی گنتی سے ہوتا ہے۔

صبح کے نو بجے تھے، جمال زبیری کی بیگم میری فرمائش پر ادرک والا آملیٹ بنا رہی تھیں اور میں خوش ذائقہ آرنج جُوس پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اِن کافروں نے کھانے پینے کی چیزوں کو کس قدر ارزاں، سہل الحصول، خالص، مصفّٰی اور جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔ جو لوگ اِن اشیائے خُورد و نوش کا کاروبار کرتے ہیں کیا ان کو بھی محض اِس لیے جہنّم میں ڈال دیا جائے گا کہ وہ مُسلمان نہیں تھے اور ہم، جو ان اشیا میں ملاوٹ کر کے بنی نوعِ انسان کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں، اپنے گھروں اور ماتھوں پر "ھٰذا من فضلِ ربی" لکھوا کر سیدھے جنّت کی اے کلاس میں اس لیے پہنچ جائیں گے کہ ہم مُسلمان کہلاتے ہیں؟ شاید میرا ذہن مزید مائل بہ الحاد ہوتا مگر اچانک فون کی گھنٹی بجی، جمال زبیری نے فون اُٹھایا اور اپنی مخصوص دُور مار آواز میں اس طرح ہیلو کہا کہ میز پر رکھی ہوئی پلیٹوں پر لرزہ طاری ہو گیا مگر دُوسرے ہی لمحے اُن کے منہ سے ایک چیخ نما 'نہیں' نکلی۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ فون سُننے لگے۔ کچھ دیر بعد اُنھوں نے فون میری طرف بڑھایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے:

"عالی جی سے بات کیجیے —— فیض صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔"

عالی نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے ان کی لندن بی سی سی آئی میں برنی صاحب سے بات ہوئی ہے ان سے پتا چلا ہے کہ فیض صاحب کل لاہور میں وفات پا گئے ہیں۔ عالی کی آواز سے وہ دُکھ اور پریشانی ہویدا تھی جس میں ہم سب برابر کے شریک تھے۔ فیض صاحب سے میری بہت زیادہ قربت یا ملاقات نہیں تھی۔ ادبی دُنیا میں ہماری نسل کی عمر گزشتہ پندرہ سال پر محیط ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جس کا بیشتر حصہ فیض نے ملک سے باہر گزارا ہے، بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ فیض اُردو ادب کا ایک بڑا نام تھے اور رہیں اور اُن کی شاعری گزشتہ چالیس برس میں اُردو شاعری کی وقیع ترین آواز رہی ہے۔ اُن کو دیکھا، سُنا اور پڑھا تو پہلے بھی تھا لیکن میری اُن سے پہلی باقاعدہ ملاقات اُس وقت ہوئی جب میں ایم اے کر کے لیکچرر ہو چکا تھا۔ غالباً فیصل آباد کا کوئی مشاعرہ تھا۔ ایک بڑے سے کمرے میں ہم سب شعرا جمع تھے۔ چائے اور فقرے بازی کا دَور چل رہا تھا کہ فیض صاحب اندر داخل ہوئے۔ معانقے اور مصافحے ہوئے اور چند ہی لمحوں

میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے فیض سے ہماری برسوں کی شناسائی ہے۔ دھیما، کچھ کچھ ٹوٹتا ہوا میٹھا اور خوشگوار لہجہ، چہرے پر پھیلی ہوئی ایک نرم رو مسکراہٹ اور انگلیوں میں دبا ہوا ایک طلسمی سگرٹ جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ہمیں تو اُن کی شاعری کا قاری ہونا ہی تھا مگر یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ بھی ہم نوجوان شعرا کے نہ صرف ناموں سے آشنا تھے بلکہ انہیں مسلسل اور بغور پڑھتے بھی تھے۔ میری شاعری کے بارے میں اُنھوں نے جو محبت بھرے اور تحسین آمیز الفاظ کہے وہ آج تک میرے دل پر نقش اور میری حسین یادوں کا سرمایہ ہیں۔

۱۹۷۶ء میں وہ لاہور کے ایک دفتر میں، جو وزارتِ ثقافت سے متعلق تھا، اُس طرح کی نوکری کر رہے تھے جسے پنجابی محاورے میں 'نکرے لگنا' کہتے ہیں۔ میرا دوسرا مجموعہ "ساتواں دَر" شائع ہونے والا تھا۔ ایک دن میں بغیر پیشگی اطلاع کے مسودہ لے کر اُن کے پاس پہنچ گیا اور عرض کی کہ فلیپ کے لیے کچھ سطریں لکھ دیں۔ کہنے لگے:

"بھئی لکھیں گے، ضرور لکھیں گے، کیونکہ ہم تو آپ کے قرض دار بھی ہیں..... بھئی آپ نے وہ جو فلسطینی نظموں کے ترجمے کیے ہیں وہ تو بڑے معرکے کی چیز ہے اور یہ محمد کاظم بھی کوئی بہت باکمال آدمی ہیں، کہاں ہوتے ہیں یہ!!"

اس کے بعد وہ دیر تک اِن نظموں کے پس منظر اور تناظر پر ایسی گہری اور معلومات افزا باتیں کرتے رہے کہ میرے دھیان کے دریچے کھلتے چلے گئے اور مجھے صحیح معنوں میں پہلی بار پتا چلا کہ فیض صاحب کس قدر وسیع المطالعہ اور کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔

اگلے دن صبح اُن کا فون آیا کہ رات نہ صرف اُنھوں نے "ساتواں دَر" کا مکمل مسودہ پڑھ لیا ہے بلکہ فلیپ بھی لکھ دیا ہے۔ میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ عام تاثر یہ تھا کہ فیض صاحب سے کوئی کام کرانے کے لیے ہفتوں بلکہ مہینوں چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اُن کی محبت اور شفقت کا یہ سلسلہ بعد کے برسوں میں بھی مسلسل جاری رہا۔ وہ جب اور جہاں بھی ملے میں نے کبھی اُن کی توجہ میں کمی نہیں پائی۔

اُن کی وفات کی خبر سُن کر بے شمار منظر میرے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ چند ماہ پہلے اُن کے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں اشفاق صاحب، شبنم شکیل، عطاالحق قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر

اور میں نے اُن کا ایک بہت طویل انٹرویو لیا تھا۔ اُس دن وہ بڑے اچھے موڈ میں تھے اور اُنہوں نے اپنی زندگی اور شاعری کے بہت سے ایسے پہلوؤں پر بھی کُھل کے گفتگو کی جو ابھی تک تشنہ یا اَن چھوئے تھے ۔ وہ سگریٹ اور شراب چھوڑ چکے تھے ۔ اُنہوں نے بتایا کہ اب وہ روزانہ دُودھ پیتے ہیں اور پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ پھر ایک دوست کا واقعہ سُنایا جس نے جب پہلی بار انہیں جام میں دُودھ ڈال کر پیتے دیکھا تو باقاعدہ سر پیٹ کر کہنے لگا تھا :

"لعنت ہو فیض صاحب ہماری زندگی پر — یہ دن بھی اِن آنکھوں نے دیکھنا تھا کہ بوتلیں کُھلی پڑی ہیں اور آپ دُودھ پیے جا رہے ہیں ۔"

پتا نہیں کیوں مجھے اُس وقت اُن کی دو مختلف نظموں کی دو لائنیں بہت یاد آئیں :

کہیں تو ہو گا شبِ سُست موج کا ساحل !
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل !

دَر کھلا پایا تو شاید اُسے پھر دیکھ سکیں
بند ہو گا تو صدا دے کے چلے آئیں گے

یُوں لگا جیسے اِن دو شعروں میں فیض کی شخصیت کی ساری کو ملتا سمٹ آئی ہو ۔

تھوڑی دیر بعد اشفاق حسین کا فون آیا اور پروین سے بات ہوئی ۔ وہ دونوں بھی ابھی تک صدمے کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل نہیں پائے تھے ۔ تفصیلات کا کسی کو علم نہ تھا ، بس ایک دُکھ کی رَو تھی جس میں سب لوگ فیض کی باتیں کیے جا رہے تھے ۔ اشفاق کے گھر دوپہر کی دعوت تھی، وہ کینسل کی گئی اور طے پایا کہ فوری طور پر ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا جائے ۔ میرا خیال ہے کہ دُنیا بھر میں فیض کے سلسلے میں ہونے والے بے شمار تعزیتی جلسوں میں زمانی اعتبار سے ٹورنٹو کا یہ اجلاس پہلے نمبر پر تھا ۔ نوٹس گو شارٹ تھا پھر بھی ٹورنٹو کے تقریباً تمام اہم ادیب اور شاعر جلسے میں موجود تھے ۔ ہم سب نے تقریریں کیں ۔ تقریریں کیا تھیں یادوں کا ایک جلوس تھا جو دھیان کی وادیوں سے اُمڈا چلا آ رہا تھا ۔

جلسے کے اختتام پر میں ، اشفاق ، عابد ، اختر آصف اور انور خلیل شیخ بے مقصد

سڑکوں پر گھومنے لگے۔ گھر جانے کو کسی کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ فیض صاحب کے نامکمل شہر آشوب کا ایک شعر پھر یاد آگیا:

گھر رہیے تو ویرانیِ دل کھانے کو آئے
بازار میں ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

تھک گئے تو کاروں تک پہنچنے کے لیے میٹرو (زیرِ زمین ریل) میں سوار ہوگئے۔ میٹرو سٹیشن گویا شہر کے نیچے ایک اور شہر تھا۔ سطحِ زمین سے ساٹھ ستر فٹ نیچے ہوا، پانی، گیس، بجلی، ریستوراں، ٹکٹ گھر، آتی جاتی ریلیں، رنگ رنگ کے مسافر اور روشنی ایسی کہ "شب کو بھی وہاں دن کے اُجالے کا سماں تھا۔"

عورت اور مرد کی صنفی تفریق کے احساس سے بے نیاز 'انسانوں' کے اس ہجوم میں بہتے ہوئے ہم بھی اپنی میٹرو تک پہنچ گئے۔ دو لڑکیاں ایک مسافر کی جگہ چھوڑ کر بیٹھی تھیں۔ میں اپنے دیسی آداب کا مارا اُن کے قریب جاکر اس انداز میں کھڑا ہوگیا کہ وہ دونوں سمٹ کر ایک ساتھ ہو جائیں تو میں کونے میں ٹک جاؤں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ میں نے بڑے وکٹورین انداز میں انگریزی کا شین قاف درست کرتے ہوئے پُوچھا: "کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

اس پر ایک بی بی نے ایک لمحے کے لیے پلکیں اُٹھائیں اور انتہائی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ Oh, sure کہتے ہوئے دُوسری طرف سمٹ گئی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جنہوں نے غالباً میری عزت رکھنے کے خیال سے نظریں نہیں ملائیں۔ میں 'مہرجہ بادا باد' کے انداز میں اُن دونوں کے درمیان بیٹھ گیا مگر یوں کہ ہندو مُسلم پانی والا فرق برقرار رہے۔ کنکھیوں سے دیکھا تو دائیں طرف والی بے نیاز حسینہ ایک ایسا باتصویر رسالہ چوڑ چوپٹ کھولے پڑھ رہی تھی جس کی تصویریں خالص مردانہ دلچسپی کی تھیں اور جن کی ہمارے ملک میں کسی کے پاس موجودگی قابلِ دست اندازیِ پولیس جرائم کے زمرے میں آتی ہے۔ سامنے دیکھا تو عابد کی ایک معقول صورت ہم سفر غنودگی کے عالم میں تقریباً اُس کی گود میں گرنے کے بعد ایسی اپنائیت سے مسکرا رہی تھی جیسے دونوں کے برسوں پُرانے تعلقات ہوں۔ اِدھر میرے ساتھ والی بی بی نے غیر متزلزل

تصویر والا ایک اور صفحہ پلٹا اور اُدھر سامنے والی کے بال پھر عابد کے چسٹر پر بکھرنے لگے۔ اُس وقت اپنا پیارا دوست اور خوبصورت لکھاری مستنصر حسین تارڑ بہت یاد آیا۔ اُس کے سفر ناموں میں اگرچہ اکثر لڑکیاں نہ صرف ری کنڈیشنڈ ہوتی ہیں اور کئی کئی ملاقاتوں کے بعد جاکر کہیں وصل پر مائل ہوتی ہیں لیکن اِس کے باوجود ہم جیسے حاسد لوگ یقین نہیں کرتے تھے جب کہ یہاں بغیر تعارف کے معاملات کچھ سے کچھ ہوئے جا رہے تھے!

مستنصر کے ذکر پر عزیزی یعقوب ناسک کا سنایا ہوا ایک واقعہ بھی یاد آگیا جو میں نے وہیں بزبانِ اُردو اپنے ساتھیوں کو سُنا ڈالا۔ سب لوگ ہنس پڑے جس کا نقصان یہ ہوا کہ عابد کی ہم سفر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور میری دائیں والی نے رسالہ بند کر کے بیگ میں ڈال دیا اور حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔ یعقوب ناسک کا یہ واقعہ بھی اصل میں اُسی "حسد" کے جذبے کا مظہر ہے جو مستنصر کے غیر ملکی معاشقوں کی افراط کی وجہ سے ادبی حلقوں میں فلُو کی طرح پھیلا ہوا ہے۔

ناسک کہتا ہے کہ اپنے دل کے آپریشن کے سلسلے میں جب وہ لندن میں تھا تو ایک بار ٹیوب (لندن کی زیرِ زمین ریل) میں ایک لڑکی اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد اُس نے اپنا سر ناسک کے کندھے پر رکھ دیا اور خراٹے لینے لگی۔ ناسک کا بیان ہے کہ وہ سرک کر پیچھے ہٹ گیا مگر چند لمحوں بعد سر پھر اُس کے کندھے پر تھا۔ جب سرکتے سرکتے سیٹ ختم ہو گئی تو ناسک نے اُس لڑکی کو ہلا کر جگایا اور کہا :

"بی بی، تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے، میرا نام یعقوب ناسک ہے، مستنصر حسین تارڑ نہیں۔"

میٹرو سے اُتر کر میں نے ساتھیوں کو اپنی ہم سفر کے زیرِ مشاہدہ رسالے کے بارے میں بتایا۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس شہر میں جگہ جگہ ایسے رسالے فلمیں اور میوزک کے کیسٹ کُھلے عام بکتے ہیں یہی نہیں بلکہ خواتین و حضرات کی تفریحِ طبع کا اور بہت سا سامان بھی شو کیسوں میں سجا کر رکھا جاتا ہے۔ اپنے بیان کی تصدیق کے لیے وہ مجھے قریب ہی واقع ایک لمبی سی دُکان میں لے گئے جہاں واقعی وہ سب چیزیں بے تحاشا افراط کے ساتھ موجود تھیں۔ عابد نے مشورہ دیا کہ کچھ دیر کسی نائٹ کلب میں بیٹھا جائے تاکہ

مجھ تازہ واردِ بساطِ ہوائے ٹورنٹو کی معلومات میں مزید اضافہ کیا جا سکے۔

نائٹ کلب کا ماحول اپنے لاہور کے مرحوم سٹوڈنٹس اون چوائس ریستوران جیسا تھا، بس اتنا فرق تھا کہ وہاں پُرانی ہندوستانی فلموں کے گِھسے ہوئے ریکارڈ چلتے تھے اور یہاں نواں نکور زندہ ناچ گانا ہو رہا تھا۔ سٹیج پر ناچنے والیاں تو خیر جو تھیں سو تھیں سَرو کرنے والی لڑکیاں بھی ٹیکسٹائل انڈسٹری کی خاصی مخالف نظر آتی تھیں۔ ایک خاتون، جس کے جسم پر کُل کپڑا عاشق کے گریبان یعنی چار گرہ سے بھی کم تھا، ہماری میز کے قریب آکر رُکی اور اِس سے پہلے کہ میرے حواس جمع ہوتے اپنے آتشیں وجود سمیت میرے اُوپر سے ہوتی ہوئی میز پر چڑھ گئی۔ میوزک کا ڈرم میری کنپٹیوں میں بجنے لگا اور وہ ایک ایسا ناچ ناچنے لگی جس کے لیے رقص سے آگاہ ہونا شرط نہیں ہوتا۔ یہ عابد کی شرارت تھی۔ معلوم ہوا کہ تین منٹ کے اِس رقص کی قیمت پانچ کینیڈین ڈالر یعنی تقریباً ساٹھ پاکستانی روپے ہے۔ جو ڈانسر پسند آئے پانچ ڈالر دے کر اُسے اپنی میز پر بُلا لیجیے۔ اپنی مرضی سے وہ جو چاہے کرے البتہ اگر آپ اس کی مرضی یا رضامندی کے بغیر اُسے چھُونے کی کوشش کریں گے تو کلب کے ملازم 'ڈشکرے' آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مانٹریال (کیوبک) کی نسبت ٹورنٹو (انٹاریو) والے ذرا قدامت پرست واقع ہوئے ہیں اس لیے قانوناً یہاں ڈانسر کو مکمل برہنگی کی اجازت نہیں، جانگیہ نما ایک چیز اُسے بہرحال پہننا پڑتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان ڈانسر لڑکیوں میں سے کئی یونیورسٹی کی طالبات بھی ہیں جو فارغ وقت میں 'محنت' کر کے ذاتی خرچ کے لیے رقم کما رہی ہیں۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور یکدم جیسے نائٹ کلب اور اس کا ماحول ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ میں نے سوچا: "کیا مغرب میں عورت آزادی اور حقوق کی طویل جنگ جیتنے کے بعد بھی اُسی حالت میں ہے جس میں ہمارے یہاں کی طوائف نہ جانے کتنی صدیوں سے سانس لے رہی ہے؟"

آزادی، نمائش اور تشہیر کے پردے میں مغرب نے اپنی عورت کے لیے جو ذلت اور تحقیر کا نظام بنایا ہے یہ نائٹ کلب اُس کی ایک بھرپور تمثال تھا۔ پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ

معاشروں میں عورتوں کے بڑے مسائل ہیں۔ آزادیٔ نسواں، تعلیم، مردوں سے برابری، شادی بیاہ، رسم و رواج، ذہنی، معاشی، سماجی استحصال، مردوں کے مقابلے میں آدھی گواہی، مولانا حضرات وغیرہ وغیرہ اور اس میں شک نہیں کہ اِن میں سے بیشتر مسائل بڑے اہم، حقیقی اور فوری توجہ کے طالب ہیں لیکن اگر ان کے حل کا طریقہ وہی ہے جو مغرب کی عورت نے اختیار کیا ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ بد سے بدتر کی طرف کا سفر ہے۔ میری اس بات پر ہو سکتا ہے کچھ خواتین مجھے رجعت پسند یا مردانہ شاونزم کا مریض وغیرہ تصور کریں لیکن مغرب میں عورت کے مختلف رُوپ دیکھنے کے بعد یہ میری پُرخلوص اور ایماندارانہ رائے ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے یہاں کی عورت کو اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ جانا چاہیے اور اپنے ہمہ جہت استحصال کو سر جھکا کر تسلیم کر لینا چاہیے بلکہ میری رائے یہ ہے کہ اپنے سفر کی سمت خُود متعین کی جائے اور اُن راستوں سے گریز کیا جائے جن پر چل کر مغرب کی عورت ایک نئے عذاب سے گزُر رہی ہے۔

ہمارے معاشرے اور سماجی نظام میں عورت کے حقوق بے شک خطرے میں ہیں۔ لڑکیوں کی پیدائش، اُن کی تعلیم، رشتے، جہیز، طلاق، بیوگی، ملازمت غرضیکہ زندگی کی ہر سٹیج اور شعبے میں ہمارے یہاں کی عام عورت کو کانٹوں بھری راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ زنا، آبرو ریزی اور نفسیاتی دہشت گردی کا بھی معقول انتظام ہے لیکن ان سب مسائل اور مصائب کا حل اُس طرح کی آزادی یقیناً نہیں ہے جس نے مغرب کی عورت کو بیک وقت پیاز اور جوتے کھانے پر مجبور کر دیا ہے۔

میں نے ایک نظر تیز روشنیوں میں مچلتے ہوئے پارے کے اس ٹکڑے پر ڈالی جو لہو گرما دینے والی موسیقی کو دو آتشہ کرنے کی لگاتار اور دُھواں دھار کوشش میں مصروف تھا اور پھر اِردگرد بیٹھے ہوئے تماشائیوں کے ہجوم کو دیکھا تو ایک لمحے کو تاریخ کے فاصلے سمٹ سے گئے۔ فراعنہ مصر کے دربار میں ناچتی ہوئی رقاصائیں، قیصر و کسریٰ کے نشاط کدے، شیخوں کے خیمے، مغلوں کے حرم، راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے ایوان، جاگیرداروں کے عشرت کدے، ہیرا منڈی کے کوٹھے اور ٹورنٹو کی یہ نائٹ کلب ـــــ سب کے سب

ایک دوسرے میں گڈمڈ سے ہو گئے۔ میرا اپنا ایک شعر ہے :

فرق ہے کچھ کرداروں میں
باقی کھیل پرانا ہے!

مگر یہاں تو یوں لگتا تھا جیسے تماشا اور تماشائی، کھیل اور کردار ازل سے وہی چلے آرہے ہیں!

اگلی صبح Calgary جانا تھا۔ بتایا گیا کہ کینیڈا کی سردی اور برف سے ہمارا اصل تعارف اب شروع ہونے والا ہے کیونکہ کیلگری شمال میں خاصی بلندی پر واقع ہے۔ آج کل وہاں موسم نسبتاً اچھا ہے یعنی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے صرف پانچ چھ ڈگری سنٹی گریڈ نیچے جا رہا ہے۔ میں نے اپنے گرم کپڑوں کا جائزہ لیا اور کیلگری کے لیے سب سے زیادہ گرم کپڑے علیحدہ کر لیے۔ جمال زبیری نے ایک نظر ان کپڑوں کا اور پھر میرے جسم پر چربی کی مقدار کا جائزہ لیا اور مشورہ دیا کہ یہ کپڑے نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ یہاں کے اعتبار سے ناموزوں بھی ہیں۔ اتنے کھُلے کھُلے اور پارٹیوں میں پہننے والے گرم سُوٹ تو وہاں کی سردی کا ایک جھٹکا عرف blizzard بھی نہیں سہہ پائیں گے۔ ایک بار پھر عالی جی کی وہ سب warnings یاد آئیں جو اُنھوں نے ہمیں پاکستان میں بار بار دی تھیں اور جن کا ہم نے سیاسی بیانات کی طرح کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ میں نے پروین کو فون کیا کہ چلو شاپنگ سنٹر سے کیلگری کے لیے کچھ دفاعی نوعیت کا اسلحہ خریدیں۔ پروین نے جواب دیا کہ وہ ضرور چلے گی مگر کپڑے اُسے نہیں خریدنے کیونکہ ان کا انتظام وہ گھر سے کر کے چلی تھی اور اُس کے بکس نمبر تین میں زیادہ تر وہی سامان بند ہے جسے اسکیمو لوگ استعمال کرتے ہیں۔

اختر آصف اور جمال زبیری کے ہمراہ ہم لوگ ایک بہت بڑے شاپنگ مال میں گئے جہاں کپڑے، سبزی، پالتو پرندوں اور آئس کریم کی دُکانیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں مست جُوں ہاتھ گردن میں ڈال

کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ گروسری سٹور ایسا خوشنما اور سبزیاں اس قدر خوبصورت، دُھلی دُھلی اور دلکش تھیں کہ وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پروین سے پوچھا :

"کیوں بھئی خانہ دار خاتون، وطنِ عزیز میں کبھی ایسی سبزیاں دیکھی ہیں ؟"

"ایمان سے امجد بھائی، انہیں تو کچا کھا جانے کو جی چاہتا ہے !"

قریب ہی ایک پالتو پرندوں کا سٹور تھا۔ چڑیاں، طوطے، رنگدار مچھلیاں، کتّے کے خوشنما پلّے یا اچھی نسل کے بلونگڑے دیکھ کر پروین کو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ وہ ایسے بچگانہ اشتیاق اور thrill کے ساتھ ان کو دیکھتی ہے کہ بے چارے جانور پریشان ہونے لگتے ہیں۔ خصوصاً چڑیوں میں تو جیسے اس کی جان ہے۔ چڑیوں کے ساتھ اُسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کی نظموں میں کوئلیں اور چڑیاں اتنا زیادہ کیوں کوکتی اور چہچہاتی ہیں !

اُسے حسبِ فرمائش سبزیوں اور پرندوں کی صحبت میں چھوڑ کر اور وہیں رہنے کی تاکید کر کے ہم لوگ ریڈی میڈ کپڑوں کے ایک ایسے سٹور میں داخل ہوئے جہاں ٪ ۵۰ sale کا دل کش بورڈ لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح کی سیل یہاں سارا سال لگی رہتی ہے اور یہ صرف گاہکوں کو متوجہ کرنے کا ایک نفسیاتی حربہ ہے حالانکہ گاہک اس سیل کی حقیقت کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔

میں نے پوچھا : " پھر یہ حربہ کیسے ہوا ؟"

زبیری بولے : " بھائی یہی تو اس معاشرے کا کمال ہے۔ یہ خود فریبی کی وہ منزل ہے جس سے آگے شاید اور کچھ بھی نہیں۔ گاہک کو پتا ہے کہ سارا سال رہنے والی یہ سیل صرف ایک دھوکا ہے۔ چیزوں کی قیمت مصنوعی طور پر بڑھانے کے بعد اُسی اضافے کو discount کی شکل میں چھوڑ دیتے ہیں تاکہ گاہک اشیا کو خوشدلی اور احساسِ فتح مندی کے ساتھ خریدے۔"

میں نے کہا : " لیکن یہ کیسا راز ہے جس سے ہر شخص آشنا ہے۔ اس پر تو مجھے سکھوں کا وہ اشتہار یاد آ رہا ہے جو اُنھوں نے اخبار میں چھپوایا تھا، جس کا مضمون کچھ

یُوں تھا کہ :

" فلاں فلاں خالصہ جماعت کا خفیہ اجلاس فلاں مقام پر کل رات آٹھ بجے منعقد ہوگا۔ تمام ممبران کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وقتِ مقرر پر پہنچ جائیں ۔ رازداری شرط ہے۔"

گفتگو مغربی معاشرے کی دانستہ اور باقاعدہ قسم کی خود فریبی سے چلتی ہوئی 'رازداری' کے موضوع سے ٹکرائی تو ایک سدا روشن رہنے والا لطیفہ درمیان میں آگیا :

رُوسی سراغرساں ایجنسی کے جی بی کے ایک بہت نامور اور سینیئر ایجنٹ کو برازیل میں حکم ملا کہ وہ پولینڈ کے فلاں فلاں گاؤں میں پہنچے اور وہاں کے مقامی ایجنٹ سمتھ سے کچھ ضروری کاغذات حاصل کرے۔ شناخت کا کوڈ اُسے یہ بتایا گیا کہ تم اس سے پوچھو گے کہ آج کا دن بہت روشن ہے اور وہ کہے گا کہ ہاں یہ سارا ہفتہ ہی بہت اچھا رہا ہے۔

ایجنٹ ہوائی جہاز، ٹرینیں، سواریاں اور حُلیے بدلتا ہوا متعلقہ گاؤں تک پہنچ گیا۔ دل میں حیران بھی تھا کہ اُس سے اتنا لمبا سفر کروانے کی بجائے یہ کام کسی قریبی ایجنٹ سے کیوں نہیں کروایا گیا لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ شاید یہ معاملہ بہت اہم ہو۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ ایک بار میں داخل ہوا اور تھکے ہوئے مسافر کے انداز میں شراب طلب کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بار مین سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا اور اپنے آپ کو ایک سفری سیلز مین ظاہر کرتے ہوئے پوچھنے لگا کہ یہاں کوئی سمتھ نام کا آدمی رہتا ہے؟

بار مین نے بڑی لاپروائی سے بتایا کہ سمتھ نام کے تو اس گاؤں میں کئی آدمی ہیں ۔ یہاں کے شیرف کا نام سمتھ ہے، ایک سمتھ جنرل سٹور والا ہے، ایک پوسٹ آفس میں کام کرتا ہے، ایک بلیک سمتھ بھی سمتھ نام کا ہے اور تو اور خود بار مین کا اپنا نام بھی سمتھ ہے۔

اس پر ایجنٹ نے بڑے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھا اور کہا :

" آج کا دن بہت روشن ہے۔ "

بار مین نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور بڑی بے تکلفی سے ہنستے ہوئے کہا :

" اچھا ــــ اچھا ــــ تم سمتھ جاسوس کا پوچھ رہے ہو ! "

ایک سمارٹ سے نیگرو لڑکے نے میری کمر کا ماپ لیا۔ نتیجہ ۳۸" نکلا۔ میں نے بڑی حسرت سے چند برس پہلے تک کے اُن دنوں کو یاد کیا جب میری کمر ۳۲" ہوا کرتی تھی اور ایک بار پھر وزن گھٹانے کے اُس عہد کا اعادہ کیا جسے سُن کر ہمیشہ میری بیوی ہنس دیا کرتی ہے۔ ایک پتلون پسند کی گئی۔ معلوم ہوا کہ لمبائی وغیرہ adjust کرنے کے لیے پندرہ منٹ درکار ہوں گے۔ اختر آصف نے مشورہ دیا کہ امریکن پتلونوں کی سلائی اور fitting وغیرہ اس حساب سے کی جاتی ہے کہ پہننے والا اس کے ساتھ بیلٹ ضرور استعمال کرے سو ایک عدد بیلٹ بھی لے لیجیے۔ بیلٹیں دیکھی گئیں۔ نہایت عام اور معمولی قسم کی تھیں۔ میں نے یونہی ۳۸" والی ایک بیلٹ پر ہاتھ رکھا اور قیمت کی سلپ پڑھی: ۳۲ ڈالر۔ فوراً اپنا دیسی حساب لگایا: سولہ ضرب بتیس، حاصل ضرب نکلا ۵۱۲ روپے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اس بیلٹ کی خصوصیت کیا ہے۔ کوئی بادشاہ یا جرنیل اسے استعمال کرتا رہا ہے یا کسی انعام یافتہ بُل کی چمڑی اس میں استعمال ہوئی ہے؟ اِس کے ساتھ کوئی تاریخ، روایت یا متھ وابستہ ہے؟ پانچ سو بارہ روپے تو ہمارے یہاں بیلٹ باندھنے والے سپاہی یا چوکیدار کی ماہانہ تنخواہ ہوتی ہے۔ زبیری صاحب نے بتایا کہ چمڑے کی مصنوعات ان علاقوں میں بہت مہنگی ہیں کیونکہ یہ امپورٹ کیا جاتا ہے۔ مَیں نے غور سے دیکھا، تمام بیلٹیں سیاہ اور براؤن چمڑے کی تھیں۔

بیلٹ نہ خریدنے کے بارے میں مَیں نے فی البدیہہ کچھ دلائل دینے کی کوشش کی جو اگرچہ وزنی نہیں تھے مگر کام کر گئے۔ پتلون ملنے میں ابھی کچھ دیر تھی، سوچا پروین کو ساتھ لے لیں کیونکہ فلائٹ میں زیادہ ٹائم نہیں رہا تھا۔ اب جو پرندوں والی دکان پہنچے ہیں تو پروین بیگم کا دُور دُور تک پتا نہیں۔ سبزیوں والی دُکان دیکھی۔ چند قوی ہیکل سبزیوں کو اُٹھا اور ہلا جلا کر دیکھا۔ ایکوریم کے اندر اور آس پاس ڈھونڈا، بیوقوفوں کی طرح دکانوں کے درمیان کُھلی جگہ پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر پروین سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ بہت پریشانی ہوئی۔ اجنبی ملک، غیر جگہ اور تنہا لڑکی، اُوپر سے شاعرہ۔ جمال زبیری نے مشورہ دیا کہ سٹور کے اندر اس نوع کی گمشدگی پر خصوصی اعلان

کرایا جاتا ہے تاکہ گمشدہ ، مرد عورت یا بچّہ سٹور کی انتظامیہ سے رابطہ قایم کرے اور یوں بچھڑے ہوئے مل جائیں مگر اس سے پہلے کہ اعلان on air ہوتا پروین نظر آگئی۔ معلوم ہوا کہ موصوفہ جیولری والے حصّے کی طرف چلی گئی تھیں اور وہاں مختلف چیزوں سے اسقدر fascinate ہوئیں کہ اُنھیں وقت اور ہماری تشویش کا اندازہ ہی نہیں رہا۔

مارا مار کرتے اشفاق کے گھر پہنچے۔ ہماری تاخیر کی وجہ سے وہاں بھی tension بڑھتے بڑھتے panic کی حدوں کو چھُونے والی تھی۔ ہمیں دیکھ کر سب نے اُسی طرح کی مصنوعی خندہ پیشانی کا مظاہرہ کیا جو میزبان مہمانوں کے سامنے اُس وقت کرتے ہیں جب مہمانوں کے بچّے اُن کے برتن اور قیمتی چیزیں توڑ پھوڑ رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے جُملوں سے اگر 'کوئی بات نہیں'، 'ایسا ہو جاتا ہے'، 'ابھی خاصا وقت ہے'، 'بس اب آپ جلدی سے تیار ہو جائیں' نکال دیا جائے تو باقی وہی کچھ بچتا ہے جس کی رپورٹ ایک انشورنس ایجنٹ نے اپنے افسر کو دی تھی۔ وہ قصّہ کچھ یوں ہے :

ایک انشورنس ایجنٹ سے اُس کے باس نے پوچھا : "کہو بھئی ، آج تم نے بارہ گاہکوں سے ملنا تھا — ملے ؟"

"جی ہاں ، سب سے ملا۔" ایجنٹ نے جواب دیا۔

"کیا نتیجہ رہا ؟ یعنی کیا کہا اُن لوگوں نے !"

"جو گالیاں اُنہوں نے دیں اُن کے سمیت کہوں یا گالیاں حذف کر کے بیان کروں ؟"

"گالیاں والیاں نکال کر بتاؤ بھئی۔" باس نے کہا۔

"پھر اُنہوں نے کچھ نہیں کہا ، جناب۔" جواب ملا۔

تمام اندازوں کے خلاف ہم وقت پر ایئرپورٹ پہنچ گئے اور بورڈنگ کارڈ وغیرہ لے لیے گئے تو عالی کا مُوڈ کچھ بحال ہوا۔ ابھی تک وہ ہماری تاخیر کے ردِّعمل کے طور پر ایک 'خاموش احتجاجی' کا رویّہ اپنائے ہوئے تھے۔ اس تبدیلی میں کچھ نہ کچھ ہاتھ یقیناً ٹرانزٹ لاؤنج میں اُن کی اُس 'ہم صوفہ' میم کا بھی تھا جو ہنستی تو اپنے ساتھی کی باتوں پر تھی لیکن گرتی بار بار عالی کے کندھے پر تھی۔ جی چاہا کہ ایسے کسی لمحے کی تصویر اُتار لوں۔ کیمرہ

بھی ہاتھ میں تھا مگر پھر خیال آیا کہ کراچی ایئرپورٹ پر مسز عالی یعنی طیبہ بھابھی نے کس اعتماد کے ساتھ کہا تھا: "لو میاں، میرا میاں تمہارے حوالے ہے۔" یہ تصویر اُنہوں نے دیکھ لی تو عالی کے ساتھ ساتھ ہمارا بھرم بھی جاتا رہے گا۔

جہاز میں مَیں نے عالی کو اپنی اس "ناکردہ" شرارت کے بارے میں بتایا تو اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے کہا:

"آپ نے بالکل مناسب فیصلہ کیا برخوردار میری بیوی تو چالیس برس سے میرے ساتھ رہ رہی ہے اور اسے میری بدمعاشیوں سے نباہ کرنے کا بھی کم و بیش اتنا ہی طویل تجربہ ہے، البتہ آپ کی بیگم کو جو رپورٹ میں دوں گا اُن کے نتائج ... ..."

عالی جملہ ادھورا چھوڑ کر مسکرائے۔ میں نے جلدی سے کہا:

"OK, Ok, You no tell, I no tell."

بولے: "میاں، یہ کہاں کی انگریزی ہے؟"

مَیں نے کہا: "پیر و مرشد، اِس اجمال کی تفصیل سے ایک عدد لطیفہ نتھی ہے، طبیعت ہو تو عرض کروں؟"

افریقہ کے ایک بہت دُور دراز کے قبیلے میں ایک سفید فام بچہ پیدا ہو گیا۔ سردار نے نیزہ پکڑا اور سیدھا مقامی مشنری کے گھر پہنچ گیا۔ پادری صاحب نے بہتیرے ہاتھ پاؤں جوڑے، خدا کی قدرت کے حوالے اور اپنے نردوش ہونے کی دہائی دی مگر سردار نے ایک نہ سُنی۔ اُس کی ایک ہی دلیل تھی: "اِس علاقے میں کئی کئی سو میل کے دائرے میں تمہارے علاوہ کوئی سفید فام آدمی نہیں، لہٰذا اور کوئی اس بچے کا باپ نہیں ہو سکتا۔"

اچانک پادری کی نظر بھیڑوں کے ایک ریوڑ پر پڑی۔ اُس نے سردار کو نیزہ چلانے سے روکتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو۔ وہ سامنے بھیڑوں کا ریوڑ ہے۔ ساری بھیڑیں سفید رنگ کی ہیں، صرف ایک کالی ہے ۔ آخر یہ کیسے پیدا ہو گئی؟"

سردار نے گھبرا کر پادری کی طرف دیکھا، پھر بڑے رازدارانہ انداز میں، بولا:

"OK, Ok, You no tell, I no tell."

پروین نے جو ہمیں بے طرح ہنستے دیکھا تو سر ہو گئی کہ مجھے بھی بتایئے کہ کس بات پر اتنا ہنسا جا رہا ہے۔ میں نے مختلف حیلوں بہانوں سے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر بات نہیں بنی۔ میں نے امداد طلب نظروں سے عالی کی طرف دیکھا، مسوڑھوں پر انگلی پھیر کر بولے:

"You no tell, I no tell."

اَب تو پروین سچ مچ ناراض ہو گئی۔ میں نے حسبِ معمول سامان رکھنے میں اس کی مدد کرنا چاہی مگر اُس نے احتجاجاً اس شولری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عالی کچھ دیر یہ منظر دلچسپی سے دیکھتے رہے، پھر بولے: "بھئی عزیزہ، بات اصل میں یہ ہے کہ لطیفے کا content کچھ مردانہ نوعیت کا ہے، یہ بیچارہ تمہیں سناتے ہوئے جھینپ رہا ہے۔ سُنا میں بھی نہیں پاؤں گا، کہو تو لکھ کر دے دوں!"

بات پروین کی سمجھ میں آگئی، اس لیے وہیں ختم ہو گئی۔ دو تین ایئر ہوسٹسیں چیلوں کی طرح ہماری طرف لپکیں اور اطلاع دی کہ ہمارے لیے کوشیر میٹ کا انتظام ہو چکا ہے۔ جعفری صاحب نے ہم سب کی ترجمانی کرتے ہوئے نعرۂ احتجاج بلند کیا اور نسبتاً زیادہ معمر چیل کو بتایا کہ ایئر کینیڈا کی ہر فلائٹ میں انتہائی بدمزہ ذبیحہ دیا جاتا ہے، اس لیے یا تو اپنا ریگولر کھانا دو یا بالکل نہ دو۔

چیل نمبر دو، جو نمبر ایک سے بدصورتی میں کچھ زیادہ اور عمر میں کچھ کم تھی، لہرا کر بولی: "مگر آپ لوگوں نے تو اس کے لیے خاص انسٹرکشن لکھوائی ہوئی ہے۔"

عالی بولے: "یار یہ انسٹرکشن تو اپنے تھانوں کی ایف آئی آر سے بھی بڑھ گئی ہے سالی کو لاکھ واپس لیتے ہیں مگر کارروائی ختم ہی نہیں ہوتی۔"

بڑی مشکلوں سے چیلوں کے اُس ہراول دستے کو سمجھایا گیا کہ ریگولر خوراک میں جتنی پورک فری چیزیں ہیں وہ ہمیں لا دیں کیونکہ کوشیر ہم بہرحال نہیں کھائیں گے۔ چیلیں کچھ نارضامندی کے عالم میں "او کے سر" کہہ کے آگے بڑھ گئیں تو جعفری صاحب نے میرے کان میں کہا:

"یہ تو خود بھی کوشیر سے کم نہیں۔"

اس پر مجھے پھر عطاء الحق قاسمی یاد آیا جس نے ایک ڈومیسٹک فلائٹ میں ایئر ہوسٹس

کو دیکھ کر کہا تھا : " اصل اسلام تو یہاں آیا ہے۔ کیا چُن چُن کے خواتین بھرتی کی ہیں۔
انہیں دیکھ کر تو واقعی دل میں بُرا خیال نہیں آتا۔"

وہ بات تو محض ایک پُر لطف جُملہ تھی، اپنی پی آئی اے والیاں ان ایئرکنیڈا والیوں
کے مقابلے میں اب بھی حُوروں سے کم نہیں۔

کیلگری

اب پتا نہیں یہ موسم کا اثر تھا یا ہوائی جہاز بھی ہماری طرح باذوق تھا کیونکہ پہلی بار فلائٹ منزلِ مقصود پر پندرہ منٹ کی تاخیر سے پہنچی۔ کینیڈا کی وسعت کا اندازہ اِس سے کیجیے کہ چار گھنٹے کی کل فلائٹ میں دو گھنٹے time difference تھا یعنی ہماری گھڑیوں پر تین بجے تھے اور کیلگری میں پانچ بج رہے تھے۔ ایئرپورٹ پر اقبال حیدر اور حسن ظہیر کے ساتھ ساتھ حدِّ نظر تک پھیلی ہوئی برف ہماری منتظر تھی۔ مَیں نے زندگی میں اتنی برف پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

کیلگری کا علاقہ تیل کی پیداوار کے لیے بے حد مشہور ہے۔ وہاں کی معیشت کا دارومدار بھی تیل، اس کی مصنوعات اور ریفائنریوں پر ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آئی کہ انٹرمیڈیٹ کی کتاب میں آفتاب حسن کا جو مضمون ' پٹرولیم ' عرصہ دس برس سے لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں اُس میں تو تیل کے لیے مسام دار چٹانوں اور ریتلی سطحِ زمین کو لازمی بتایا گیا ہے یہ برف میں ' کالا سونا ' کہاں سے آگیا ؟

ایئرپورٹ سے شہر جاتے وقت بے آباد سڑک کے دونوں طرف حدِّ نظر تک برف ہی برف تھی۔ ہمارے میزبان حسن ظہیر، جو خُود بھی آئل کمپنی میں انجنیئر تھے، ہمیں اس علاقے کے بارے میں بتا رہے تھے مگر میرا ذہن ابھی تک برف میں تیل کی پُراسرار گتھی میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی کم علمی بلکہ لاعلمی چھپانے کے لیے خُوب چکر دے کر باتوں باتوں میں حسن ظہیر سے یہی سوال کیا تو اُس مردِ شریف نے زمین کی جیالوجیکل حالتوں کے بارے میں ایک ایسا لیکچر شروع کر دیا کہ میں تو خیر سائنس میں تھا ہی کورا عالی بھی جو عام حالات میں کسی موضوع میں بند نہیں ہوتے، 'ہاں، ہُوں' سے آگے نہ بڑھ سکے۔

حسن ظہیر کو شاید اس امر کا احساس ہوگیا تھا کہ اس کی گفتگو ضرورت سے کچھ زیادہ ٹیکنیکل ہو رہی ہے چنانچہ اُس نے لیکچر ادھورا چھوڑ کر ہم سے ہمارے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ مگر پتا نہیں کیسے بات ہم سے چلتی ہوئی شاعری اور پھر صحرائے نجد کا چکر کاٹتی ہوئی دوبارہ پیٹرول تک پہنچ گئی۔ اب مجھ سے نہیں رہا گیا، میں نے فوراً صوفی تبسم مرحوم سے متعلق ایک مشہور واقعہ داغ دیا کہ اس میں پیٹرول کا ذکر جس ڈھب سے آیا ہے شاید اور کہیں نہ آیا ہو:

صوفی صاحب عالمِ سرُور میں تانگے پر سوار ریڈیو سٹیشن جا رہے تھے۔ واقعی لیٹ تھے یا انہیں اس کا وہم ہوگیا تھا۔ بہر حال سنت نگر سے لکشمی چوک تک پہنچتے پہنچتے اُنہوں نے کوئی بیس مرتبہ تانگے والے کو تیز چلانے کے لیے کہا۔ تانگے والا بھی یکے از زندہ دلانِ لاہور تھا، تانگے کو سیدھا ایبٹ روڈ کے چوک میں واقع پیٹرول پمپ پر لے گیا اور گھوڑے کی دُم اُٹھا کر ششدر کھڑے پیٹرول پمپ والے سے طنزاً کہا: "ایدے وِچ دو گیلن پیٹرول پا دے، ایس بابے نوں بڑی جلدی اے۔" (اِس میں دو گیلن پیٹرول ڈال دو، اس بزرگ کو بہت جلدی ہے۔)

حسن ظہیر کے گھر پر ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ خاتونِ خانہ بیگم حسن ظہیر اور پروین پہلے تو چند لمحے ایک دوسرے کو اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں جیسے اُن کی ہتھ جوڑی ہونے والی ہو اور پھر ایک نعرۂ مستانہ بلند کر کے ایک دوسرے پر جھپٹ (معاف کیجیے) لپٹ پڑیں۔ حسن ظہیر اپنی مونچھوں کے سائے سائے مسکرا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اُن کی بیگم نرجس اور پروین کراچی میں پندرہ برس ایک دوسرے کی ہمسائی اور سہیلی رہی ہیں اور یہ گویا پروین کو pleasant surprise دینے کا ایک منصوبہ تھا۔ تھوڑی دیر میں یہ خوشگوار حیرت، اُن دو خواتین تک محدود ہو کر رہ گئی کیونکہ اُنہوں نے اِس شدّت سے اپنے مشترکہ بچپن اور لڑکپن (لڑکیوں کے لیے شاید 'لڑکی پن' لکھتے ہیں) کی حماقتوں وغیرہ کو یاد کرنا شروع کیا کہ آدھ گھنٹے تک اُن کی گفتگو میں کہیں کاما یا فل سٹاپ نہیں آیا، تنگ آ کر حسن ظہیر نے چلتی گفتگو میں ایک استفہامیہ (!) لڑھکا دیا: "کچھ چائے وغیرہ

کا انتظام ہے بیگم!"

"آپ بنا دیجیے نا حسن، پلیز! دیکھیے ہم کتنے برسوں بعد ملی ہیں۔"

میں نے کہا: "بھائی، دوبارا نہ ٹوکنا، ورنہ کھانا بھی پکانا پڑ جائے گا۔"

فون کی گھنٹی بجی، حسن نے فون اُٹھایا اور کسی صاحب کو بتایا کہ عالی صاحب اقبال حیدر کی طرف ٹھہرے ہیں۔ معلوم ہوا کہ عالی کے کوئی دُور کے عزیز ہیں اور کئی دنوں سے منتظمین سے اصرار کر رہے ہیں کہ عالی کو اُن کی طرف ٹھہرایا جائے جب کہ منتظمین اپنے حقِ میزبانی سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ میں نے سوچا یہ 'مشاعرہ' بھی عجیب انسٹی ٹیوشن ہے جہاں جاتا ہے اپنی ساری اچھی بُری روایتیں ساتھ لے کر جاتا ہے۔

رات کے کھانے پر اقبال حیدر کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ عالی کے مذکورہ عزیز سعید کمال نہ صرف سامان سمیت اُنہیں اپنی طرف لے جا چکے ہیں بلکہ اب مسلسل ٹیلی فونوں کے باوجود اُنہیں نیند سے جگانے میں لیت و لعل کر رہے ہیں کیونکہ اُنہیں اپنے مہمانِ عزیز کا آرام سب سے مقدّم ہے۔

کسی نے آواز لگائی: "بھئی اُنہیں کہو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے!"

میں نے خالی ڈائننگ ٹیبل اور کھڑکی سے باہر مسلسل ہونے والی برف باری کی طرف دیکھا اور سوچا اتنے برس یہاں کے موسموں میں رہنے کے باوجود بھی یہ لوگ ابھی اپنی چھوڑی ہوئی تہذیب کے سکہ بند expressions سے باہر نہیں آسکے۔ اقبال حیدر اس کڑکڑاتی ہوئی سردی میں نہ صرف محض ایک قمیص پتلون پہنے پھر رہے تھے بلکہ ازراہِ احتیاط قمیص کے تین چار بٹن بھی کھول رکھے تھے۔ میں نے پوچھا: "بھائی آپ پاکستان میں ٹی وی سٹار تو نہیں ہوتے تھے؟"

بولے: "نہیں۔"

"کوئی خاندانی تعلق لکھنؤ کے بانکوں وغیرہ سے؟"

اِس بار اُن کے نفی میں سر ہلانے میں ایک پُر زور احتجاج بھی شامل تھا۔ میں نے کہا: "بھائی اگر یہ دونوں باتیں نہیں تو اس عبرت ناک سردی میں یہ مظاہرۂ تن سازی یا

'بانکپن' کی نمائش کیوں کر رہے ہو؟ تمہیں دیکھ دیکھ کر خواہ مخواہ ہماری رُوح کانپ رہی ہے۔"
اقبال حیدر نے اس کے جواب میں 'عادی' اور 'مانوس' ہو جانے کے بعد چیزوں کی شدت میں ظہور پذیر ہونے والی محسوساتی اور نفسیاتی کمی کا حوالہ دیا مگر اُن کے دلائل سے مہمانوں نے تو کیا خود اُن کے گھر والوں نے بھی اتفاق نہیں کیا۔ جب اُنہیں حاضرین کی طرف سے اپنی دلیل کی متفقہ مخالفت کا احساس ہوا تو اُنہوں نے ایک اچھے سپورٹس مین کی طرح اپنی شکست کا اعتراف کیا اور قمیص کا ایک بٹن بند کر لیا۔

ہمارے بچپن میں بعض رسالوں میں ایک موٹے اور ایک پتلے آدمی کی تصویریں ساتھ ساتھ چھپا کرتی تھیں جن کے ساتھ کسی ٹانک کا اشتہار ہوتا تھا کہ "استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد"۔ آج کل یہی تصویریں "سلمنگ پارلرز" کے حوالوں سے دوبارہ دکھائی دے رہی ہیں لیکن اس صورتِ حال کا جو رُوپ ہم نے کیلگری کی یخ بستہ رات میں دیکھا وہ سب سے انوکھا اور دلچسپ تھا۔ کمرے میں پہلے عالی داخل ہوئے۔ بہت سے کپڑوں کے اُوپر اُنہوں نے اپنا مشہور رُوسی اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور اُن کا مجموعی پھیلاؤ دروازے کی وسعت سے وہی شکوہ کر رہا تھا جو غالب کو 'ظرفِ تنگنائے غزل' سے تھا اور اُن سے دو قدم پیچھے سعید کمال تھے: خوش لباس، خوش نما، نفیس، شستہ اور نستعلیق مگر جسامت ایسی کہ پھُونک مارو تو لرز جائیں۔ میں نے عالی کے کان میں اپنے اس تقابلی جائزے کے بارے میں سرگوشی کی تو اُنہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا:

"مغل سلطنت کے زوال کے بہت سے اسباب ابھی تاریخ دانوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ جسمانی صحت کی کمی بھی ان میں سے ایک ہے۔"

اس پر میں نے اُنہیں ایک مشہور سیاسی لیڈر کی ایک تصویر یاد دلائی جس میں اُنہیں کسی الیکشن کے لیے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرنے کے لیے جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ تصویر میں دو شخص اُن کی کمر اور بازوؤں میں ہاتھ ڈال کر اُنہیں کار سے اُترنے میں سہارا دے رہے تھے۔ میں نے کہا: "یہ تصویر دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا عروج و زوال مجسّم ہو گیا ہو۔"

عالی نے پُوچھا : "وہ کیسے ؟"

میں نے کہا : "ظہیر الدین بابر جب ہندوستان کا بادشاہ بنا تو وہ قلعے کی دیوار پر دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر دوڑ لگایا کرتا تھا اور ایک ہمارے آج کے رہنما ہیں جنہیں دو آدمی بغلوں میں ہاتھ دے کر اُٹھاتے بٹھاتے ہیں۔"

اگلے روز اُردو کانفرنس تھی۔ کینیڈا کے مختلف علاقوں سے دانشور اور پروفیسر حضرات آرہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہم چاروں کو بھی اظہارِ خیال کرنا ہوگا۔ مقررین کی فہرست دیکھی تو وہ دوسری دہائی کے نصف سے آگے کی طرف رواں تھی۔ میں نے مشورہ دیا کہ اتنے زیادہ لوگ بولیں گے تو بوریت ہو جائے گی، لوگ تھک کر جمائیاں لینے لگیں گے اور بار بار کی تکرار سے کانفرنس کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ مزید رُعب ڈالنے کے لیے میں نے اپنی آرٹ کونسل کی ملازمت کے تجربے کا حوالہ دیا اور بتایا کہ مقررین کی تعداد میں انقلابی نوعیت کی تخفیف انتہائی ضروری ہے۔ میری اس ساری فاضلانہ (فاضل کا ایک مطلب فالتو بھی تو ہوتا ہے !) بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں تقریر سے بچ گیا۔

واپسی پر پروین نے کہا : "آپ نے اپنا نام کیوں کٹوایا، رہنے دیتے، جہاں انیس لوگ بولیں گے وہاں 'بیسویں' سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

میں نے کہا : "یہی اُنیس بیس کا فرق ہی تو اصل بات ہے ــ بابا۔ تم سب لوگ وہاں 'انگریزیاں' جھاڑو گے اور میری انگریزی ذرا مست ملنگ قسم کی ہے۔ تلفظ تو ان علاقوں میں ہر طرح کا چل جاتا ہے مگر یہ جو انگریزی گرائمر سے میرے ذاتی اور نظریاتی اختلافات ہیں اُن کو میں 'پبلک' نہیں کرنا چاہتا۔"

بولی : "چلیں ٹھیک ہے مگر آپ چونکہ اُردو کے اُستاد اور نقّاد وغیرہ وغیرہ ہیں اس لیے میری مدد کریں کیونکہ مجھے تاریخی اعتبار سے اُردو شاعروں، شعری رویّوں اور تحریکوں وغیرہ کا مکمل علم نہیں۔"

میں نے پُوچھا : "مثلاً !"

"مثلاً یہ کہ ن۔م۔ راشد ترقی پسند تحریک سے متعلق تھے یا حلقہ اربابِ ذوق سے ؟

انتظار حسین علامت پسند ہیں یا ملامت پسند؟ آستانۂ انشائیہ کی سجادہ نشینی پر جھگڑا کیوں اور کب شروع ہوا؟ اور یہ کہ اگر اس کے 'بانی' یا 'موجد' کا فیصلہ ہو بھی گیا تو اس سے متعلقہ اصحاب کو کیا فایدہ ہوگا کیونکہ ایسی باتیں تو بتانے کی بجائے چھپانے کی ہوتی ہیں؟"

مَیں نے کہا: "راشد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ 'اُردو شاعری کے جدید رویّے' جو تمہارا موضوع ہے، راشد کے ذکر کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا مگر یہ انتظار حسین اور انشائیہ بیچ میں کہاں سے آگئے؟"

"دراصل میرا خیال تھا کہ ابتدا میں پورے ادبی منظر کا ایک مختصر سا تعارف کراؤں اور اس کے بعد......"

"ہتھ ہولا رکھو بی بی۔ تم سول سروس میں تو آگئی ہو مگر ابھی تک تمہارے دماغ سے وہ 'بوئے شاہ جہانی' نہیں گئی، موقع ملتے ہی لیکچر کی تیاری شروع کر دیتی ہو...... چھ سات منٹ کا ایک مختصر سا تعارفی مضمون گھسیٹو ــــ اللہ ــــ اللہ ــــ خیر سلا۔"

"مختصر لکھنا ہی تو زیادہ مشکل ہے۔"

"اب تم زیادہ مولانا محمّد علی جوہر بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم اس عہد کی سب سے ممتاز، منفرد اور مشہور شاعرہ ہو ــــ ڈبل ڈبل ایم اے ہو ــــ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کے ادب پر تمہاری گہری نظر ہے ــــ تمہیں کون سی ڈاکٹر سیّد عبداللہ یا جمیل جالبی صاحب کے سامنے تقریر کرنی ہے جو اتنی تفصیلات میں جا رہی ہو!"

"آپ کا یہ داؤ مجھ پر نہیں چلے گا۔ اقبال حیدر وغیرہ کو تو آپ نے چکر دے کر اپنی گردن چھڑا لی ہے مگر مَیں اس ڈرامے کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ آپ سیدھی طرح بیٹھ جائیں اور جو سوالات میں پوچھوں اُن کے جواب دیتے جائیں۔"

جس تفصیل سے اس نے سوالات کیے اور نوٹس لیے اور پھر اگلا سارا دن بیٹھ کر مضمون لکھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ تعلیمی میدان میں اس کی کامیابی کا اصل راز اس کی یہی محنت اور لگن ہے۔ اُس نے اپنے اندر کے طالب علم میں 'علم کی طلب' کو ہمیشہ زندہ اور مستعد رکھا ہے۔

سعید کمال اور عالی دوپہر کے کھانے کے لیے ہمیں لینے آئے، پروین کا مضمون ابھی جاری تھا۔ عالی بولے: "فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے: دل یا شکم؟"

پروین بولی: "میرا ووٹ دل کی طرف ہے۔"

"سوچ لو اس علاقے کی ٹراوٹ مچھلی پوری دنیا میں مشہور ہے۔" عالی نے لالچ دیا۔

پروین نے چند لمحے متذبذب نظروں سے اردگرد بکھرے ہوئے کاغذات کی طرف دیکھا اور پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا: "آج تو یہ مضمون ہی چلے گا۔"

ہم اُسے اس کے حال پر چھوڑ کر نکلے۔ ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ پتا چلا کہ یہ بارش ڈرائیونگ کے لیے بہت خطرناک ہے کیونکہ اس سے پیدا ہونے والے برفانی کیچڑ پر، جو 'بلیک آئس' کہلاتا ہے، اگر گاڑی سکڈ کر جائے تو معاملہ دست و پا شکستن تک پہنچنے میں زیادہ تکلف نہیں کرتا۔

میں مچھلی بالکل نہیں کھاتا اس لیے میں نے مینو کارڈ میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے لیے بیف اسٹیک منگوالی کہ اس سے کم مشکوک اور قابلِ قبول اور کوئی چیز اُس ہوٹل میں موجود نہیں تھی اور اگر تھی تو بہرحال مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد عالی اور سعید کمال کی ٹراوٹ بھی آگئی۔ مچھلیوں کی اقسام سے ناواقفیت کے باوجود اتنا آئیڈیا مجھے تھا کہ ٹراوٹ وہیل اور شارک سے بہرحال مختلف ہوتی ہوگی۔ اپنی دیسی 'رہو' اور 'ملی' سے اس کا مختلف ہونا بھی سمجھ میں آتا تھا کہ اگر یہ ایسی ہی گری پڑی اور عام سی مچھلی ہوتی تو لوگ اس کا ذکر اتنے اہتمام سے اپنی گفتگو اور سفرناموں میں کیوں کرتے (جیسا کہ میں اس وقت کر رہا ہوں)؟ لیکن یہ بھی خیال نہیں تھا کہ یہ سات آٹھ انچ کی ایک چپٹی سی چیز ہوگی جسے دیکھ کر وہ سکے یاد آتے ہیں جو بچپن میں ہم ریل کی پٹری پر رکھ دیتے تھے اور ریل کا بوجھ اُنہیں پھیلا کر چپٹا کر دیتا تھا۔ عالی اور سعید کمال ٹراوٹ کی ہسٹری اور فضائل بیان کر رہے تھے اور میں آرنج جوس کے ساتھ اُس بے مزہ اور اَدھ پکی اسٹیک کو نگلنے کی تگ و دو میں تھا جو یقیناً کسی ایسے لڑاکا بیل کے باقیات میں سے تھی جسے اس کی مرضی کے خلاف وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا تھا۔

کانفرنس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر شہر کیلگری کی ممبر پارلیمنٹ اور اقلیتوں کے مسائل سے متعلق قومی کمیٹی کی رُکن ایک خاتون کو مدعو کیا گیا تھا جس کا نام تو مجھے بھول گیا ہے مگر اس کی تقریر کا ایک جُملہ میرے دل پر نقش ہے۔ اُس نے کہا: "یہ میرے وطن اور قوم کے لیے انتہائی عزت کا مقام ہے کہ آپ نے مجھے اپنی اس کانفرنس میں شرکت کا موقع دیا"۔ اس طرح کے جُملے بولنا اوّل تو ہمارے ہاں کے وزیر اور افسرانِ بالا ویسے ہی کسرِ شان سمجھتے ہیں لیکن اگر کسی وجہ سے اُنہیں ایسی کوئی بات کہنی پڑ جائے تو کچھ اس ادا سے کہتے ہیں کہ نظام رامپوری کا مشہور شعر ذہن میں کوند جاتا ہے:

دینا کسی کا ساغرِ مے یاد ہے نظام
مُنہ پھیر کے اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

اُس بی بی نے جس سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کیں، جس صبر اور دلچسپی کے ساتھ چار گھنٹے تقریریں سُنیں اور جس مسکراہٹ اور شدت کے ساتھ ہر مقرر کو زور زور سے تالیاں بجا کر داد دی اُسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ محض اپنی سرکاری ڈیوٹی کے طور پر اقلیتوں کا ایک فنکشن 'بھگتانے' نہیں آئی بلکہ اس اعتماد کی امین اور نمائندہ ہے جو عوام نے اپنے ووٹوں کی شکل میں اُسے دیا تھا۔ تقریب کے بعد اُس سے گفتگو ہوئی تو اس یقین کو مزید تقویت ملی کہ جمہوریت ایک ایسی رنگا رنگ جیلی ہے جو جس طرح کے معاشرے کے برتن میں ڈالی جائے اُسی طرح کی شکل اختیار کر لیتی ہے ــــ اور تو اور یہ تو مارشل لاء کے ساتھ مل کر مکسڈ ڈبلز کھیلنے پر بھی تیار ہو جاتی ہے۔

تقریریں تو اس محفل میں بہت سی ہوئیں لیکن پاکستان کے ایک سابق سفیر محمد یونس اور ہمارے بزرگ ہمسفر علی سردار جعفری صاحب کی تقریریں خاص طور سے سُننے کی چیز تھیں۔ جعفری کا کمال یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی موضوع ہو وہ گھما پھرا کر انڈیا، نہرو اور رُوس براستہ ازبکستان و سمرقند کا ذکر ضرور لے آتے ہیں۔ سو یہاں بھی اُنہوں نے اُردو کے حوالے سے اپنے تینوں محبوب حوالے دیے اور خوب دیے۔

محمد یونس صاحب سوئٹزرلینڈ اور چین میں پاکستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔ بڑے چست و

چالاک، گلے میں سکارف، میل جول میں گرمجوشی اور تقریر میں ایک اچھے سفارت کار کی جملہ خوبیاں کہ ہر جملہ بڑا نپا تلا، پُر تپاک اور نک سک سے درست مگر آخر تک پتا نہیں چل پاتا کہ موصوف اصل میں کہنا کیا چاہتے تھے؟

تقریب کے دوران چائے کا وقفہ ہوا جس میں اپنی مدد آپ کے تحت سب نے کاغذی گلاسوں میں چائے پی۔ ایک خاتون نے، جو بلاشبہ lady of the night تھیں، اپنی صُورت سے بھی زیادہ حسین مسکراہٹ کے ساتھ جب تھرمس سے اپنے لیے بھرا ہوا چائے کا کپ میری طرف بڑھا دیا تو میں نے بھی اخلاقاً اُن کا مزاج وغیرہ پوچھ لیا۔ خلافِ توقع اُس جدید انداز کی زنانہ شرٹ پتلون، فیشنی بالوں اور خطرناک حد تک حسین چہرے کے پیچھے سے لاہور کی ایک اصلی تے وڈی پنجابن نکل آئی۔ اب مسئلہ چونکہ اخلاقیات اور جمالیات کی حدوں سے نکل کر شہرداری کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا اِس لیے ہم دونوں ایک طرف ہو کر باتیں کرنے لگے۔ ابھی چند ہی باتیں کی تھیں کہ پروین کسی طرف سے نمودار ہوئی اور اس نے بتایا کہ چائے کا وقفہ ختم ہونے کے بعد جلسے کو دوبارہ شروع ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ میں نے حیرت سے کبھی اِس کو اور کبھی "اُس" کو دیکھا جس کے بارے میں غالب نے تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے کہا تھا:

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

تقریب کے بعد واپسی پر پروین نے مختلف اشاروں کنایوں سے مجھے کارنر کرنے کی کوشش کی مگر جب میں نے پیروں پر پانی نہیں پڑنے دیا تو تنگ آ کر اُس نے براہِ راست حملہ کر دیا:

"امجد بھائی ___ وہ خاتون کون تھی؟"

"کون؟"

"وہ جسے آپ اپنا فون نمبر دے رہے تھے!"

" وہ — وہ تو — بقول منیر نیازی — یکے از مداحین۔۔۔۔۔"

" کس کا کون مداح ؟ میں سمجھی نہیں۔"

" ارے بھئی کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بس وہ کچھ میری کتابوں وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی — بڑی خوش ذوق بی بی تھی۔"

" صورت بھی اچھی تھی ! "

" ہاں — وہ۔۔۔۔۔ میں نے دراصل غور سے دیکھا نہیں۔۔۔۔۔"

" اچھا — ابھی غور سے نہیں دیکھا ؟ "

" تم کہنا کیا چاہتی ہو ؟ "

" کچھ نہیں — ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔۔۔۔۔ اچھا یہ بتائیں کہ وہ اپنے راولپنڈی کے شاعر۔۔۔۔۔ وہ جو بڑی مزیدار پنجابی نظمیں بھی لکھتے ہیں — کیا نام ہے اُن کا ؟ "

" انور مسعود۔"

" ہاں — وہ کیا قطعہ پڑھا کرتے ہیں اکثر مشاعروں میں ! آپ کو بھی بہت پسند ہے ! وہ جس میں کچھ یوں ہے کہ دیکھیے کچھ محتاط ہی رہیے اس جاسوس زمانے سے۔"

" وہ "، میں نے کہا، " یاد ہے مجھ کو، سناؤں ؟

لوگ تو رہتے ہیں اکثر ٹوہ میں ایسی باتوں کی
پیار محبت کے ہیں دشمن، دل کے ایسے کالے ہیں
دیکھیے کچھ محتاط ہی رہیے اس جاسوس زمانے سے
میں بھی بچوں والی ہوں اور آپ بھی بچوں والے ہیں۔"

اگرچہ قطعہ شروع کرتے ہی مجھے اس کی شرارت کا احساس ہو گیا تھا پھر بھی میں ڈھیٹ بن کر 'انجان بننے' کی ایکٹنگ کرتا رہا مگر وہ کب بخشنے والی تھی، کہنے لگی :

" باقی باتیں تو میں پاکستان پہنچ کر بھابی سے کروں گی، آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اُس بی بی کا بڑا بچہ سولہ برس کا ہے۔"

" نہیں ! " میں نے حیرت سے کہا، " کیا اس کی شادی چھ برس کی عمر میں ہوئی تھی ؟ "

چوری تو پکڑی جا ہی چکی تھی اس لیے میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے : " بھئی سچی بات یہ ہے کہ مجھے وہ واقعی بہت اچھی لگی تھی لیکن یقین نہیں آتا کہ ...... یعنی سولہ برس کا بچّہ ...... گویا ...... بھئی بہت maintain کیا ہے اس بی بی نے خود کو۔"

وہ بات تو آئی گئی ہو گئی مگر میں اب بھی سوچتا ہوں کہ ہمارے یہاں عورتیں چہروں پر تو میک اپ کے کوٹ در کوٹ کیے رکھتی ہیں لیکن جسمانی صحت اور فٹ نس کا شعور بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔

جب سے ہم نے کیلگری کی زمین (برف) پر قدم رکھا تھا ایک لفظ بار بار سن رہے تھے Banff (بینف) ۔ لکھنے میں تو اس کے درمیان این اُردو کے نون کی طرح آتا ہے مگر بولنے میں نہ صرف یہ نون غنہ ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ہلکی سی میم کی ملاوٹ بھی ہو جاتی ہے یعنی اسے 'بے نف' کی بجائے " بیمنف " تلفظ کیا جاتا ہے۔ ہمارے میزبانوں کے نزدیک کیلگری آ کر بیمنف نہ دیکھنا ایسے ہی تھا جیسے کوئی شخص آگرہ جائے اور تاج محل نہ دیکھے۔ معلوم ہُوا کہ یہ کیلگری سے کوئی ستر میل دُور ایک پُر فضا پہاڑی تفریحی مقام ہے جہاں دُنیا بھر سے سیاح سال کے ہر حصّے میں آتے رہتے ہیں۔ میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی برف پر نظر ڈالی اور اقبال حیدر سے پوچھا کہ پہاڑ پر تو لوگ گرمیوں میں جاتے ہیں، ہماری تو یہاں قلفی یا شاید قلفی جم رہی ہے، وہاں جا کر ہم کیا کریں گے؟ اُس مرد گریباں چاک نے بڑی مشکلوں سے بند کروایا ہوا قمیص کا پانچواں بٹن دوبارہ کھولتے ہوئے بتایا کہ یہاں موسموں کا وہ تصوّر نہیں جو ہمارے یہاں ہے۔ یہاں موسم کا اندازہ برف کی مقدار میں کمی بیشی سے ہوتا ہے۔

اُردو کانفرنس سے واپسی پر رات ڈھائی بجے کھانا کھاتے ہوئے یہ طے پایا کہ صبح بینف کا چکر لگایا جائے گا اور دس بجے یہ قافلہ روانہ ہو گا۔ کوئی ساڑھے دس بجے حسن ظہیر نے مجھے جگایا اور جمائیاں لیتے ہوئے بتایا کہ عالی صاحب بینف کے پروگرام سے بیک آؤٹ کر گئے ہیں اور اقبال حیدر اب صرف جعفری صاحب کو لے کر ہماری طرف آ رہا ہے۔ اتنے میں مسز نرجس حسن ظہیر نے آ کر اطلاع دی کہ پروین بیگم تین کمبل اوڑھ کر لیٹی ہوئی ہیں اور

اُن کا کوئی ارادہ کہیں جانے کا نہیں ہے۔ میں نے عالی جی کو فون پر اور پروین کو بالمشافہ حوصلہ دینے کی بہت کوشش کی مگر وہ دونوں تصوّف کی اس منزل میں تھے جہاں دُنیا کی بڑی بڑی چیزیں بہت چھوٹی چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔

بالآخر کوئی ساڑھے بارہ بجے اقبال حیدر، اُن کے بہنوئی (جن کا نام غالباً شفیق تھا)، ڈاکٹر خالد سہیل، علی سردار جعفری، حسن ظہیر اور مجھ پر مشتمل یہ چھ رُکنی قافلہ دو موٹروں پر عازم بینف ہوا۔ میں اور ڈاکٹر خالد سہیل، اقبال حیدر کی گاڑی میں تھے۔ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی مگر بے حد ہموار اور عُمدہ حالت میں تھی۔ دُور دُور تک آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ مجھے یہاں دوبئی سے ابوظہبی تک براستہ سڑک سفر بہت یاد آیا، فرق صرف اتنا تھا کہ وہاں سڑک کے دونوں طرف حدِ نگاہ تک جلی ہوئی زرد اور بھربھری زمین تھی اور یہاں برف ہی برف۔

بینف سے دو تین میل ادھر ایک بہت بڑی جھیل تھی جس کا سبزی مائل پانی چاروں طرف پھیلی ہوئی برف میں کسی اور ہی دُنیا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں موٹریں روک کر فوٹو گرافی کی گئی۔ پتا نہیں کس طرح بات اُردو شاعری میں 'برف' کے ذکر تک پہنچ گئی، بہت سے شعر سنائے گئے مگر اتفاقِ رائے سے مصحفی کے اس شعر کو بہترین قرار دیا گیا:

سُوئے نجد جی کا یہ قافلہ، عجب اس کا کیا جو چلا نہیں
کہ ہولائے شدّتِ برف ہے، ابھی قافلے کی ہوا نہیں

ڈاکٹر خالد سہیل اپنے عارف عبدالمتین صاحب کا بھتیجا نکلا۔ اس کم عمری میں اُس نے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کرنے کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی نام اور مقام پیدا کیا ہے۔ اگرچہ پروین کو اس کی داڑھی اور سپورٹس گاڑی میں کئی نفسیاتی تضادات نظر آتے تھے مگر مجھے وہ ایک تخلیقی ذہن کا، اپنوں کی محبّت کو ترسا ہوا ایسا نوجوان لگا جو مشرق و مغرب کے تہذیبی بُعد میں اپنی شناخت ڈھونڈ رہا ہے:

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

اقبال حیدر نے گزشتہ رات مشاعرے میں بھی اچھی نظم سنائی تھی اور اس سفر کے دوران بھی اُس نے چند بہت اچھے شعر سنائے۔ خالد سہیل کو میں اِس سے پہلے بھی سن چکا تھا لیکن یہ شاید اس پکنک کے موڈ کا اثر تھا کہ اس نے بھی غیر معمولی طور پر اچھی غزل سنائی۔

بنیف ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے۔ یہاں بھی سوات، نتھیا گلی، کالام وغیرہ کی طرح ایک مرکزی بازار ہر مرض کی دوا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ بازار اور اُس کی ملحقہ چند چھوٹی سڑکوں پر جدید زندگی کی ہر سہولت اور تفریح موجود تھی۔ طے پایا کہ وقت کی کمی کے پیشِ نظر سیدھا گنڈولا لفٹ کی طرف پیش قدمی کی جائے کیونکہ بارش کی وجہ سے روشنی مسلسل کم ہو رہی ہے اور ایسا نہ ہو کہ ہم بنیف کی سیر کے بہترین حصے سے محروم رہ جائیں۔

گنڈولا لفٹ سے ملتی جلتی چیز وطنِ عزیز میں 'ایوبیہ' کے مقام پر کئی برسوں سے کام کر رہی ہے مگر بنیف کی اِس لفٹ اور ایوبیہ کی لفٹ میں کم و بیش وہی فرق ہے جو ایک بادبانی کشتی اور آبدوز میں ہوتا ہے۔ یہ گنڈولا لفٹ آٹھ منٹ میں آپ کو ۷۵۰۰ فٹ بلند (۲۲۸۵ میٹر) چوٹی پر پہنچا دیتی ہے جہاں ایک تین منزلہ وسیع و عریض عمارت میں ریسٹوران، مناظر دیکھنے کے لیے خوبصورت ٹریسیس، دُوربینیں، ایک سو ساٹھ افراد کے لیے بیٹھ کر کھانے کی جگہ اور بڑی بڑی بالکونیاں بنی ہیں۔ اُس عمارت کے اندر پھرتے ہوئے یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ آپ ایک برفستان میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر بیٹھے ہیں۔ عمارت کو جنگلی جانوروں سے محفوظ کرنے کے لیے مختلف حفاظتی اقدامات کیے گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے قطب شمالی تک پھیلے ہوئے وسیع برفستان میں ریچھ، لومڑ، بھیڑیے، بکرے اور دیگر کئی اقسام کے جانور غول در غول اور تنہا تنہا بھٹکتے رہتے ہیں۔ اِس برف زار کے ہزار ہا میل پھیلے ہوئے لق و دق میں وہ کس طرح زندہ رہتے ہیں! اقبال پھر یاد آ رہے ہیں: پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون!

اکہتر برس کی عمر میں علی سردار جعفری صاحب کی ذہنی اور جسمانی چستی ہم سب 'نوجوانوں' کے لیے باعثِ عبرت بھی تھی اور لمحۂ فکریہ بھی۔ اپنے بھاری اوورکوٹ اور برف کی پھسلن کے باوجود وہ نہ صرف گفتگو میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے

بلکہ اُن کی رفتار بھی ہم سے زیادہ تیز اور ہموار تھی۔ اُردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ اُن کا بہت اچھا ہے اور اُن کا حافظہ بھی قابلِ رشک ہے مگر ان کی سب سے زیادہ اچھی بات مجھے یہ لگی کہ وہ اپنے آپ کو مجلس کے مطابق adjust کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن سے اختلاف رکھنے والے اُن کی اس صلاحیت کو زندگی کے دوسرے شعبوں خصوصاً ان کی ترقی پسندی پر بھی منطبق کرتے ہیں لیکن یہ اس وقت میرا موضوع نہیں

کچھ تو ہم گھر سے لیٹ چلے تھے اور کچھ گنڈولا کی سیر میں زیادہ وقت لگ گیا، طے یہ پایا کہ بینف قصبے کی سیر ملتوی کر دی جائے کیونکہ مشاعرے کے دونوں بنیادی منتظم یعنی اقبال حیدر اور حسن ظہیر ہمارے ساتھ تھے اور اگرچہ وہ منہ سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے لیکن وقت کی تنگی کا احساس اُن کی ہر ہر بات سے ظاہر ہو رہا تھا۔ گنڈولا لفٹ سے واپسی کے سفر میں ہم نے دیکھا تو بلندی سے پارکنگ پلیس کی برفانی سطح پر کھڑی موٹریں کھلونوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ ہم نے بچوں کی طرح شرطیں لگا کر اپنی موٹریں پہچانیں۔ موٹر ہی کے حوالے سے کسی نے ایک بڑا مزیدار لطیفہ سنایا :

ایک خاتون نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ وہ اپنے شوہر کو قابو میں رکھے کیونکہ ان دنوں وہ ایک اور عورت کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ خلافِ توقع سہیلی نے اس اطلاع کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بات ہنس کر ٹال دی۔ کچھ دن بعد اُس عورت نے پھر سہیلی کو اطلاع دی کہ اب اُس کا شوہر ایک اور عورت کے ساتھ پینگیں بڑھا رہا ہے۔ سہیلی نے اس اطلاع کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ جب تیسری مرتبہ خاتون نے اِسی نوع کی اطلاع دی اور سہیلی نے پروا نہیں کی تو خاتون کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، اس نے کہا :

"تم کمال کی عورت ہو، تمہیں اپنے خاوند کی بے راہروی کی پرواہی نہیں۔ میرا شوہر اس طرح کی حرکت کرے تو میں اس کا جینا حرام کر دوں۔"

سہیلی مسکرائی اور بولی : "میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں، تم فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہوگا!"

خاتون تلملائی : "ہمارا کیا ہے بہن، خود ہی پچھتاؤ گی!"

سہیلی نے کہا : "تم نے کبھی چلتی موٹر کے پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کو دیکھا ہے؟"

خاتون نے کہا : "کئی بار ــــ کیوں ؟"

سہیلی نے کہا : "اگر موٹر روک دی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ موٹر کے مڈ گارڈ سونگھ کر چلے جاتے ہیں !"

جعفری صاحب نے کہا : "بھئی ایسی خراب ریپوٹیشن رکھنے والا شوہر ہونے سے تو بہتر ہے آدمی خودکشی کرلے ۔ یعنی ایک تو کتا بنایا اُس پر خصوصیت بھی کیسی چن کر نکالی ہے ۔"

لطیفے اور جعفری صاحب کے برجستہ ریمارک پر ہنستے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ اقبال حیدر بہت دیر سے اپنی موٹر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں، معلوم ہوا کہ چابی نہیں لگ رہی ۔ موٹر بالکل نئی تھی ۔ چابی کے سوراخ میں برف جمنے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا؟ ڈکی کھولنے کی کوشش کی گئی مگر کسی بھی طرح تالے میں حرکت کے آثار دکھائی نہ دیے ۔ حسن ظہیر وغیرہ بھی اس بر سرِ عام قفل شکنی میں شامل ہوگئے مگر تالا ٹس سے مس نہ ہوا اچانک میری نظر موٹر کی پچھلی سیٹ پر پڑی، وہاں کچھ زنانہ کپڑے پڑے تھے جو یقیناً اس سے پہلے وہاں نہیں تھے ۔ میں نے اقبال حیدر کی توجہ اِس طرف دلائی تو وہ پہلے تو ایک دم خاموش ہوگیا پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا ۔ سبب پوچھا گیا تو کہنے لگا :

"خدا کا شکر کریں ہمیں اس کار کے مالک نے نہیں دیکھا ورنہ ہم سب مصیبت میں پڑ سکتے تھے ......"

معلوم ہوا کہ موصوف اپنی موٹر کی بجائے اُسی رنگ اور ماڈل کی کسی اور موٹر پر طبع آزمائی فرما رہے تھے ۔

ہمیں اس حماقت پر دیوانہ وار ہنستے دیکھ کر قریب سے گزرتی ہوئی ایک فیملی پہلے تو حیرت سے دیکھتی رہی پھر اُنھوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا ۔ اُن کے اس طرح خواہ مخواہ ہنسنے پر مجھے منیر نیازی کا ایک واقعہ بہت یاد آیا ۔ منیر نیازی جب کسی مشاعرے میں شعر پڑھنے کے لیے آتے ہیں تو چند لمحے مائیکروفون کے سامنے خاموش بیٹھے پلکیں جھپکتے رہتے ہیں ۔ اُن کی مقبولیت کی وجہ سے لوگ اس ادا کو بھی پسند کرتے ہیں اور ہوٹنگ نہیں کرتے

مگر ایک دفعہ ایسا ہوا کہ پچھلی صفوں میں کچھ شرارتی لڑکے بیٹھے تھے، وہ اِس وقفۂ خاموشی کو برداشت نہ کر سکے اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ منیر نے چند لمحے اُن کی ہنسی سنی پھر مائیکروفون پر جھک کر کہا: "اوئے بدشکلو ــ تم کس بات پر ہنس رہے ہو؟"

ہنسی کی بات چلی ہے تو اُس رات کے مشاعرے میں مارے ہوئے کشور قریشی کے قہقہے کا ذکر بھی لازمی ہے۔ کشور قریشی جو پندرہ بیس برس پہلے کشور غنی کے نام سے کراچی یونیورسٹی کی بہترین مقررہ ہوا کرتی تھی۔ ایڈمنٹن سے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ مشاعرے کے شروع میں ایک مقامی شاعر نے ایک مزاحیہ نما قطعہ پڑھا جس پر بمشکل مسکرانے کی گنجائش نکل سکتی تھی مگر کشور نے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے ایک ایسا بے ساختہ قہقہہ مارا کہ سب لوگ گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگے کہ کہیں خدانخواستہ......

کیلگری کے اس مشاعرے میں کشور کے اس قہقہے کے علاوہ یاد رہ جانے والی چیز دوسری صف میں بیٹھی ہوئی مشہور ہندوستانی اداکارہ، دلیپ کمار کی بیوی اور پری چہرہ نسیم کی بیٹی، سائرہ بانو تھی جو اگرچہ مشاعرے کے اختتام پر پشاور کے ایک معزز خاندان کی بیٹی اور لاہور کی مشہور تاجر فیملی کی بہو نکلی مگر مجھے اب بھی شبہ ہے کہ ... بہرحال ایسی غضب کی مشابہت فلموں کے ڈبل رول کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھی۔

مشاعرے کے بعد اقبال کے بہنوئی شفیق صاحب کی طرف نہاری کی دعوت تھی اور کیا صحیح دعوت تھی۔ مرچ مصالحے کا استعمال کچھ تو خواتینِ خانہ کی کشادہ قلبی کا مظہر تھا، کچھ یار لوگوں نے نہاری کے چٹپٹا ہونے کی رعایت سے ستزاد کر لیا تھا۔ سُوں سُوں کرتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے جعفری صاحب نے ایک بے ضرر سی نظر آنے والی چٹنی اپنی پلیٹ میں ڈالی اور پھر اس کے بعد اُنہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ کہاں تو وہ اُس سائرہ بانو والے معمے پر جھینک رہے تھے اور کہاں یہ حال ہوا کہ سویٹ ڈش کی پوری پلیٹ کھانے کے باوجود اُن کی سُوں سُوں ختم نہیں ہوئی۔ اب پتا چلا کہ قحط سالی کے بغیر "یاراں فراموش کردند عشق"، کیسے ممکن ہے!

کیلگری کے قیام کا ذکر اُس بے بی سِٹر کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا جسے حسن اور نرجس نے مشاعرے کی رات ڈیڑھ ڈالر فی گھنٹہ معاوضے پر اپنے بچوں کے پاس چھوڑا تھا۔

یہ بے بی سسٹر اُن کے ہمسائے کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی جس کی عمر تو بارہ تیرہ برس تھی لیکن گزرنے والا ہر دن اُس کے جسم سے مہینوں کی طرح گزر رہا تھا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کے انداز میں ایک ایسا الھڑ پن اور اعتماد تھا جیسے اُس کا اپنا گھر ہو۔ آتے ہی اُس نے پھرکی کی طرح گھوم کر پورے کمرے کا جائزہ لیا، کتابوں، رسالوں اور وڈیو کیسٹوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر بڑے مطمئن انداز میں سر کی جنبش سے واضح کیا کہ "او کے ــــ گزارا ہو جائے گا۔" اس کا چیونگ گم سے بھرا ہوا منہ مسلسل چل رہا تھا اور اس کا وجود بھی پارے کی طرح مسلسل مضطرب اور بے قرار تھا مگر سب سے زیادہ توجہ طلب اس کے ہاتھوں کا انداز تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کو کچھ اس طرح سے پکڑ رکھا تھا جیسے وہ کوئی بہت قیمتی اور نازک چیز ہو اور بار بار بڑے اشتیاق سے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف کچھ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس پر قربان ہونے کا ارادہ ہو۔ معلوم ہوا کہ آج صبح کسی تقریب میں ایک پاپولر مقامی گلوکار نے اس کے مذکورہ ہاتھ پر بوسہ دیا تھا اور اب وہ اس خوشگوار تحفے کو محفوظ رکھنے کے لیے اِس ہاتھ سے کسی دوسری چیز کو چھونے نہیں دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ وفورِ مسرت سے تمتما رہا تھا اور وہ بار بار کچھ اِس فخر اور اشتیاق سے اس واقعے کو دہرا رہی تھی جیسے اُسے کوئی بہت بڑا خزانہ مِل گیا ہو۔ فنکار اور معاشرے کے اِس گہرے اور پُرجوش رشتے کی حدّت کو محسوس کر کے میرا دل پگھل سا گیا، حسن نے پوچھا:

"پاکستان میں آج کل کیا صورتِ حال ہے، کیا موسیقی کے اُستادوں کو اب بھی میراثی اور اہلِ علم و فن کو 'اربابِ نشاط' کہہ کر پکارا جاتا ہے؟"

مَیں نے اُس کا سوال باتوں میں ٹالنے کی کوشش کی کیونکہ پیاز کے اِن چھلکوں کو اُتارنے کی بے سُود کوشش میں سوائے آنکھوں سے بہنے والے پانی کے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا اور اس لیے بھی کہ اس طرح کی بحثوں اور آنسوؤں سے مسئلے سلجھا نہیں کرتے بلکہ اور اُلجھ جاتے ہیں۔ میں نے بات کا رُخ اُس بے بی سسٹر بچی کے ذوق و شوق کی طرف موڑنے کی کوشش کی تو زجس ظہیر نے پاکستان میں کسی پرانے دیکھے ہوئے ٹی وی پروگرام

کا حوالہ دیا جس میں اداکار کمال نے اپنا اور ایلوس پریسلے کا موازنہ کیا تھا۔

واقعہ کچھ یوں ہے ـــ اداکار کمال نے بتایا۔ ایک بار کسی شاپنگ سنٹر کے باہر ایلوس پریسلے اپنی سفید رنگ کی سپورٹس کار کھڑی کر کے گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کی مدّاح لڑکیوں نے چُوم چُوم کر پوری کار پر اتنے بوسے ثبت کر دیے تھے کہ اس کا رنگ سُرخ نظر آرہا تھا۔ ایک بار میں نے اپنی سُرخ رنگ کی سپورٹس کار کراچی کی ایک سڑک زیب النساء سٹریٹ عرف ایلفی پر کھڑی کی۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو میرے مدّاحین نے کھُرچ کھُرچ کر اُس کا رنگ سفید کر دیا تھا۔

اس پر میں نے منیر نیازی کی ایک نظم کا مصرعہ سُنایا کہ :

میں جس سے پیار کرتا ہوں اُسی کو مار دیتا ہوں

اُس وقت تو بات بن گئی یعنی بدل گئی مگر آج بھی یہ سوال کبھی کبھی مجھے بہت پریشان کرتا ہے۔

وِنی پیگ

ہماری اگلی منزل Winnepeg تھی ۔ وِنی پیگ کے بارے میں کم از کم صَوت (sound) کے حوالے سے یہ خیال کرنا کہ یہ کسی شہر کا نام ہو گا بہت مشکل بات ہے ۔ پہلی دفعہ سُننے پر یہ گِنی پیگ قسم کی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے ۔ قریشی پور پاکستان ٹیلی وژن کے بہت پُرانے کمپیئر ہیں ۔ شروع شروع میں جب اُن کا نام ٹی وی پر آتا تھا تو اکثر لوگ مخمصے میں پڑ جاتے تھے کہ یہ کیا چیز ہے ! ایک صاحب تو بہت پریشان ہو کر کہہ بھی بیٹھے تھے : "کیسی عجیب بات ہے ، بہاول پور شہر کا نام ہے اور قریشی پور آدمی کا !"

سو وِنی پیگ کے بارے میں ہمارا فوری ردِّ عمل کچھ رَلا مِلا سا تھا ۔ جہاز میں حسبِ معمول کوشیر میٹ ہمارا منتظر تھا ۔ پروین نے کہا : " یہ کوشیر تو ہمارے ہاں کے بجلی اور فون کے بلوں جیسا ہو گیا ہے کہ ایک بار کوئی غلط اندراج ہو جائے تو پھر چل سو چل — جتنی بار مرضی ٹھیک کرا لو اگلے مہینے پھر اُسی طرح موجود ہو گا ۔"

میں نے کہا : " اشیاء کی غلامی میں تو یہی کچھ ہو گا ۔ کمپیوٹر بنایا ہے تو اب اسے بھگتو بھی ۔"
کہنے لگی : " زندگی میں پہلی بار اشفاق احمد کے ڈراموں کی سائنس دُشمنی کی وجہ سمجھ میں آئی ہے ۔"
ہم دونوں نے عالی کی طرف دیکھا جو کسی قیمت پر بھی سائنس ، ٹکنالوجی ، اعداد و شمار اور علمی تحقیق کے موضوعات میں کم علمی یا مخالفت کو پسند نہیں کرتے مگر یہ کوشیر کھلانے کی مستقل بدمزگی کا کمال تھا کہ وہ کچھ بولے نہیں ۔ ایک غیر جانبدار سی 'ہُوں' کر کے طرح دے گئے ۔

اس سفر کے دوران یہ پہلا ہوائی اڈہ تھا جہاں استقبال کے لیے آنے والوں سے عالی اور جعفری صاحب بھی نا آشنا تھے ۔ جہاں یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی کہ اُن جیسے جہاں گردوں کے لیے ایک پورا شہر کیسے اجنبی ہو سکتا ہے وہاں یہ بھی احساس ہُوا کہ

اُردو زبان اور اِس کی شاعری دنیا کے کِس کِس کونے میں کیسے کیسے جلوے دکھا رہی ہے۔

کلثوم اعجاز محمدی اور اُن کے میاں سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا اگرچہ موصوف بڑے پائے کے پروفیسر ہیں مگر بیگم صاحبہ کے جلو میں کچھ ایسی مسکینی اور تابعداری سے رہتے ہیں کہ اُن کی پٹیپنی محسوس ہوتے ہیں۔ زندگی میں ہم نے بڑے بڑے فنا فی البیگم دیکھے ہیں لیکن پروفیسر صاحب کا اِس فیلڈ میں ایک اپنا ہی مقام تھا۔ بیگم کی ہر بات پر وہ شہید ہوتے ہوتے بچتے تھے اور کچھ ایسی گھایل نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے تھے جن سے کوئی نارمل انسان اپنی تو کیا کسی دوسرے کی بیوی کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔

حسبِ معمول مہمانوں کی تقسیم اُن کی آمد سے قبل طے پا چکی تھی۔ میرا قرعہ شاہد نامی ایک نوجوان کے نام نکلا تھا۔ اُس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہو گیا کہ شاعری اور ادب وغیرہ سے اُسے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہے اور وہ محض پاکستانی ہونے کے ناطے سے اس پروگرام میں حصہ لے رہا ہے چنانچہ میں نے بھی ونی پیگ شہر، وہاں کے حالات، پاکستانیوں کی تعداد اور اُن کے حالات وغیرہ پر گفتگو شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ یہ کینیڈا کا فیصل آباد ٹائپ شہر ہے اور یہاں زیادہ تر پاکستانی فیکٹری ورکر ہیں۔ خود شاہد جھنگ کا رہنے والا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی محمود کے ساتھ رہتا تھا۔ دونوں بھائی "ایف اے" پاس تھے اور کم و بیش ویسی ہی نوکریاں کر رہے تھے جیسے پاکستان کے ایف اے پاس کیا کرتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ کینیڈین ڈالر دس روپے کا ہوتا ہے جب کہ پاکستانی روپیہ پُورے ایک روپے کا بھی نہیں ہوتا۔

شاہد اور اس کے بھائی کے رُوپ میں مجھے پہلی بار کینیڈا میں اصلی پاکستانی محنت کش نظر آئے: سیدھے سادے محنتی لوگ جو آجر اور مزدُور کے اُلجھے ہوئے رشتوں کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے اپنے وطن سے بارہ ہزار میل دُور نکل آئے تھے مگر یہ گتھیاں اُلجھی ہوئی ڈور کی طرح اُن کے بُوٹوں کے تسموں اور چپلیوں کے بکلوں کے ساتھ اٹکی ہوئی اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ دونوں بھائی اپنی جھنگ کی بیک گراؤنڈ، شاہد کی شادی اور طلاق اور اپنے مستقبل کے عزائم کی وضاحت کچھ ایسے لہجے میں کر رہے تھے جیسے وہ میری بجائے یہ باتیں خود اپنے

آپ کو سنا رہے ہوں۔

دونوں بھائی کھانا پکانے کے فن میں اپنی اپنی دسترس کا عملی ثبوت دینے کے لیے مجھ سے وقت مانگ رہے تھے اور چونکہ اس دوران وہ مجھے باقاعدہ طور پر "بھائی جان" ڈیکلیئر کر چکے تھے اس لیے مجھے انہیں یہ سمجھانے میں مزید دقت پیش آئی کہ جب تک مجھے "اصل منتظمین" سے پورے پروگرام کا پتا نہیں چلتا میرے لیے کسی قسم کا وعدہ کرنا ممکن نہیں۔ محمود نے بڑے جوش سے کہا: "بھائی جان آپ بس ہمیں ٹائم دے دیں، پروگرام کو چھوڑیں، وہ بنتا رہے گا۔"

اُس کی اس معصوم حماقت پر مجھے یہ واقعہ یاد آگیا:

ایک دفعہ فوج میں نئے بھرتی ہونے والے جوانوں کو فٹ بال کی مشق کرائی جارہی تھی۔ پہلا دن تھا، انسٹرکٹر نے کھلاڑیوں کو دو ٹیموں میں بانٹ کر گراؤنڈ کے وسط میں کھڑا کیا اور سمجھایا کہ تمہارا کام مخالف ٹیم کو کاٹتے اور اپنا رستہ بناتے ہوئے گول تک پہنچنا ہے کہ یہ اس کھیل کا بنیادی مقصد ہے۔ "سمجھ گئے!" سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک جوان بولا: "شروع کرائیں سر۔" انسٹرکٹر نے کہا: "بھئی فٹ بال میں ہوا بھری جا رہی ہے، وہ آلے تو شروع کراتے ہیں۔" جوان بولا: "فٹ بال کو چھوڑیں جی، وہ آتا رہے گا، آپ شروع کرائیں۔"

مشاعرہ ہوٹل Fort Garry کی ساتویں منزل پر تھا۔ تقریباً چار سو سیٹوں کا ہال تھا اور کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سکھ داڑھیوں اور ہندو ساڑھیوں کی بھی ایک معقول تعداد موجود تھی۔ ٹورنٹو سے اشفاق حسین اور ڈاکٹر خالد سہیل بھی آئے ہوئے تھے۔ شاعروں کو سٹیج پر بلایا گیا تو کلثوم اعجاز محمدی کے ساتھ ایک خوش پوش اور معقول رُو خاتون بھی تشریف لے آئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوفہ لوکل شاعرہ ہیں اور اُن کا نام پروین شیر ہے۔ جب تک وہ کلثوم اعجاز کے ساتھ کھڑی رہیں خاصی کم عمر اور خوش شکل تھیں، پروین کے ساتھ آکر بیٹھیں تو معاملہ اُلٹ ہوگیا۔ اُنھوں نے ترنم سے اپنا کلام سُنایا۔ جہاں مصرعہ وزن سے گرتا تھا تان کے

ساتھ اُٹھالیتی تھیں۔ یُوں اُن کی غزل گِر گِر کے اُٹھنے اور اُٹھ اُٹھ کر گرنے کا ایک دلچسپ منظر نامہ بن گئی مگر اِس کے باوجود Lady of the evening کا خطاب بیگم کلثوم اعجاز محمدی ہی کے پاس رہا۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے :

مشاعرے کے آغاز میں بزمِ ادب ونی پیگ کے صدر خالد صاحب نے کچھ ابتدائی جُملے کہے اور پھر اعلان کیا کہ اب مشاعرے کی کارروائی کو بیگم کلثوم آگے چلائیں گی۔ کلثوم بیگم نے پہلے ایک مختصر سا مضمون پڑھا جس میں اس مشاعرے کی غرض و غایت وغیرہ وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی تھی، پھر کچھ شعر (جو غالباً جوش کے تھے) سنائے۔ حاضرین نے داد دی۔ اس کے بعد اُنہوں نے اپنی ایک غزل سنائی۔ اُس پر بھی داد دی گئی۔ اس کے بعد اُنہوں نے ایک نظم شروع کر دی۔ اسے مشاعرے کے ابتدائی حصّے کی بے پروائی کہیے یا ہم لوگوں کی میزبان نوازی کہ اُن کے ہر طرح کے شعروں پر داد دی گئی۔ ہماری دیکھا دیکھی حاضرین نے بھی بادلِ نخواستہ کچھ تالیاں بجائیں۔ اِس کے بعد ایک مقامی شاعر آئے۔ اُن کے جانے کے بعد کلثوم صاحبہ نے پھر اپنے کلام بلاغت نظام سے نوازا اور پھر یہ سلسلہ روایتی زلفِ یار کی طرح دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ شاعروں کو بلانے کے درمیانی وقفوں کے دوران جب کلثوم اعجاز محمدی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاپی نما ڈائری تقریباً نصف کے قریب سنا چکی تھیں تو سامعین میں سے کسی دل جلے نے پُکار کر کہا :

"سنائیے، سنائیے، بی بی ، آپ سناتی جائیے ، اِن مہمانوں سے تو ہم روز سُنتے ہی رہتے ہیں!"

اِس ایک جُملے میں چونکہ ہال میں بیٹھے ہوئے تقریباً تمام افراد کے (بیگم اور میاں کلثوم اعجاز کو نکال کر) جذبات شامل تھے چنانچہ ایسا زوردار قہقہہ پڑا کہ ہوٹل کے در و دیوار ہل گئے اور اردگرد کے کمروں سے بہت سے لوگ یہ دیکھنے کے لیے نکل آئے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے!

اِس مشاعرے کا اسی قبیل کا دُوسرا یادگار جملہ اشفاق حسین کا تھا۔ اشفاق بیگم کلثوم کے بالکل نزدیک بیٹھا تھا۔ اُس نے غالباً ترتیب میں اپنا نام پڑھ لیا تھا چنانچہ جونہی اُس سے پہلے شاعر نے اپنا کلام ختم کیا وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر مائک کے سامنے آ بیٹھا۔ کلثوم اعجاز نے مسکرا کر کہا: "صبر کیجیے اشفاق صاحب ، ابھی تو میں نے آپ کا نام بھی نہیں پُکارا" اس پر اشفاق نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "میں اس لیے آ گیا ہوں کہ کہیں آپ پھر اپنا کلام نہ شروع

کر دیں۔"

یہ جملہ، جملہ کم اور حملہ زیادہ تھا مگر اس کی سختی اور تلخی قہقہوں کے شور میں کہیں گم ہوگئی، یہاں تک کہ کلثوم اعجاز صاحبہ کو بھی مجبور ہو کے مسکرانا پڑا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو سامعین میں سے ایسے ایسے لوگ برآمد ہونا شروع ہوئے کہ زمان و مکان کے تصورات پھر آپس میں خلط ملط ہونے لگے: کرکٹ کے پُرانے ساتھی جیلانی اور نیشنل بنک والے ارشد محمود کے بھائی سے (جس کا نام ذہن سے اُتر گیا ہے) ملاقات ہوئی۔ حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور میں جن دنوں میں سیکرٹری ہوا کرتا تھا حسن جعفر زیدی جائنٹ سیکرٹری تھا، اُس کا چھوٹا بھائی عقیل جعفر زیدی ملا جس کو میں نے بہت چھوٹا سا دیکھا تھا۔ امرتسر والے کلدیپ سنگھ کے ایک دوست خاص طور سے ملنے آئے۔ کلدیپ سے میری آج تک ملاقات نہیں ہوئی صرف خط و کتابت ہے مگر اُس کے دوست نے اس حوالے سے جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا وہ کلدیپ کی محبت کا ایک اور انداز تھا جو بہت اچھا لگا۔

سب سے دلچسپ ملاقات عامر محمود اور شاہینہ سے ہوئی۔ دونوں یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اِس خوبصورت جوڑے کو میں نے چند برس پہلے اسلام آباد یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ اُس وقت بھی وہ دونوں پڑھ رہے تھے لیکن تب اور اب میں فرق یہ تھا کہ اب اُن کی محبت ازدواجی رشتے کے مضبوط اور خوبصورت بندھن میں بندھ چکی تھی۔ بہت خلوص اور محبت سے ملے۔ عامر برادرم طارق محمود کا چھوٹا بھائی ہے۔ طارق آج کل ملتان میں ڈپٹی کمشنر ہے مگر اب سول سروس سے زیادہ اس کی پہچان اس کے افسانوں کا مجموعہ "سہ حدہ" ہے جس کی وجہ سے اب وہ باقاعدہ ہماری صف کا آدمی بن چکا ہے۔

طارق کی طرح عامر بھی بہت خوشگوار طبیعت کا حامل ہے۔ دونوں بھائی اگرچہ کم بولتے ہیں مگر اُن کے چہروں پر ایک ایسی دوستانہ، پُر خلوص، جاندار اور متوجہ قسم کی مسکراہٹ رہتی ہے کہ آپ اُن سے مل کر کبھی بوریت محسوس نہیں کرتے۔ اب پتا نہیں یہ 'جمالِ ہم نشیں' تھا یا کچھ اور کہ شاہینہ اور عامر کی ہر ہر بات اور انداز میں یک رنگی غالب تھی۔ اُنھوں نے ہمیں اگلے روز اپنے یونیورسٹی اپارٹمنٹ میں کھانے کی دعوت دی اور اپنی مسکراہٹوں کے زور پر منوا

بھی لی۔

ریڈ انڈینز کے بارے میں فلمیں دیکھ دیکھ کر دل میں یہ اشتیاق تو تھا کہ کبھی اِن لوگوں اور اِن کی زندگی کو بالمشافہ دیکھا جائے چنانچہ جب معلوم ہوا کہ یہاں سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر اُن کی ایک reserve (ریڈ انڈینز کی مخصوص کالونی) موجود ہے تو عوام نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ باقی سب باتیں بعد میں، اُس "نواح" کی سیر سب سے پہلے۔ ریڈ انڈینز کے بارے میں یہاں کی سفید فام اور حاکم آبادی کے نظریات کم وبیش وہی تھے جو اُنیسویں صدی میں انگریز کے ہمارے علاقے کے بارے میں تھے۔

ہم کالے لوگ بھی native تھے، پسماندہ، جاہل، سائنس کے کارناموں سے بے خبر، آپس میں لڑنے جھگڑنے والے، مذہبی تعصبات اور fanaticism سے لبالب بھرے ہوئے، عیش پسند، کاہل، کام چور، انگریز بہادر کے تلوے چاٹنے والے وغیرہ وغیرہ اور اِن لوگوں پر بھی کچھ اسی نوع کے الزامات تھے کہ شراب بہت پیتے ہیں، بچے بہت پیدا کرتے ہیں، جاہل، کم تعلیم یافتہ اور فرسودہ روایات والے ہیں، معاشرے کی main stream میں چلنے کے قابل نہیں اس لیے حکومت انہیں علیحدہ اور الگ تھلگ کالونیوں میں رکھتی ہے اور اس کے لیے اسے بھاری اخراجات ادا کرنے پڑتے ہیں یعنی وہی white man's burden- آج بھی کوئی پوچھنے والا نہیں کہ آپ کے سب الزامات بجا سہی لیکن آپ کو ان کی زمینوں، جائداد اور گھر بار پر قبضے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ اُن کی پسماندگی آپ کے غاصبانہ قبضے کا جواز کس اصول کے تحت بنی ہے؟ میر جعفر اور میر صادق کی غداری اپنی جگہ، پٹے پر ریاستوں کا انتظام اور حفاظت اپنی جگہ۔ دیسی راجاؤں، نوابوں اور حکمرانوں کی عیش کوشی اپنی جگہ، ریڈ انڈین لوگوں کی کوتاہیاں اپنی جگہ، پچیس ڈالر کے عوض مین ہٹن، (نیویارک) اور دو بوتل شراب کے عوض سینکڑوں ایکڑ اراضی کا احمقانہ سودا اپنی جگہ لیکن کیا کوئی یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ بیچنے والوں کے تو سب عیب آپ نے گنوا دیے کبھی خریدنے والوں کے ضمیر، دیانت، اخلاق اور اصولوں پر بھی نظر ڈالی ہے؟ دنیا کو تہذیب سکھانے والوں سے کوئی یہ بھی تو پوچھے کہ اس کی قیمت اُنہوں نے کیا کیا اور کس کس طرح وصول کی ہے

اور آج بھی ' امداد ' کے نام پر وہ کیا کچھ نہیں کر رہے ہے - لیکن یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں،
اقبال نے کیا گہری بات کی تھی :

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم گر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

سو محکوم کہیں کا بھی ہو حکومت کرنے والے اُس کے گرد غفلت کا خیمہ اس طرح سے
تانتے ہیں کہ اُسے نہ تو سورج کے نکلنے کی خبر ملتی ہے اور نہ چاند کے ڈھلنے کی۔

معلوم ہوا کہ اصلی ریڈ انڈین تو اپنے روایتی رہن سہن کے ساتھ یہاں سے پانچ چھ سو میل
اُوپر ملیں گے البتہ ' نمونے ' کے طور پر یہ reserve بھی گزارے لائق کام دے سکتی ہے۔
بارش کی وجہ سے سردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمارے میزبان خالد، طارق اور قاسم ایک
ایسی ویگن لے کر آئے تھے جس کا باطن اُس کے ظاہر سے اچھا تھا۔ سیٹیں بڑی کھلی اور
آرام دہ تھیں اور heating کا بھی معقول انتظام تھا مگر بارش، دھند اور برف کی وجہ سے
طبیعت پر ایک بے نام سا بوجھ پڑتا چلا جا رہا تھا۔ ویگن کے اندر کی بوجھل خاموشی اور اُس
کے شیشوں سے نظر آنے والے خارج کے ملگجی سناٹے میں سے اگر ویگن کے انجن کی آواز نکال
دی جاتی تو باقی تقریباً اُتنی ہی آواز بچتی جتنی پروں کے بغیر بُلبل۔ بقول شفیق الرحمٰن :
"بُلبل پروں سمیت محض چند انچ لمبی ہوتی ہے یعنی اگر پَر نکال دیے جائیں تو کچھ زیادہ
بلبل باقی نہیں بچتی۔"

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر اور دو دفعہ راستہ بھولنے کے بعد ویگن ایک بڑے سے کیچڑ یلے
(کیچڑ سے بھرے ہوئے) میدان میں داخل ہوئی جس کے وسط میں سُرخ اینٹوں کی ایک چھوٹی
سی عمارت کے باہر تین چار ٹوٹی پھوٹی موٹریں اور ایک سٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ
apache art کا شو رُوم ہے جہاں ریڈ انڈینز کی بنائی ہوئی تصویریں، مجسمے، زیورات اور مختلف
قسم کا الا بلا فروخت کیا جاتا ہے۔ شو رُوم کے ایک حصے میں باقاعدہ آرٹ کی کلاس ہو رہی تھی۔
ایک ریڈ انڈین لڑکا ہمیں خوش آمدید کی سمائلیں (smiles) دے رہا تھا اور پانچ چھ کینیڈین
لڑکیاں بڑی مہارت اور چابکدستی سے وہ paintings بنا رہی تھیں جنہیں ریڈ انڈین آرٹ

کہہ کر ہم سے زیادہ بے وقوف سیاحوں کے ہاتھ فروخت کیا جانا تھا۔ ہمیں شوروم میں رکھی ہوئی مختلف اشیاء کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت سے آگاہ کیا گیا تو یُوں معلوم ہوا جیسے یہ نوادرات وہاں ہمارے انتظار ہی میں رکھے گئے تھے۔ قریب تھا کہ ہم میں سے کچھ لوگ خریداری کے جال میں پھنس جاتے مگر خالد کی 'اندر خانے' کی معلومات آڑے آگئیں اور ہم سب بخیر و عافیت اُس عمارت سے باہر نکل آئے۔

باہر نکلے تو سٹیشن ویگن کے قریب جان وین ٹائپ ایک بزرگ 'کاؤ بوائے' کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ لوکل چیف ہے۔ مسلسل مے نوشی کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں مستی اور خمار نے ایک مستقل جگہ بنالی تھی اور 'چہرہ فروغِ مے سے گلستان' بنتے بنتے جنگل کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اُس نے ایک مخمور نظر ہم سب پر ڈالی۔ خالد نے اُس کے مقابلے کی انگریزی میں بات چیت شروع کی اور ہمارا تعارف کرایا جس پر اُس 'نوجوان بابے' نے ہمارے ساتھ ایسے پُرزور مصافحے شروع کیے جیسے ہم اس کے برسوں کے بچھڑے ہوئے عزیز رشتے دار تھے۔ پروین اُس کے متوقع مصافحے سے خوفزدہ ہو کر ایک طرف ہونے کی کوشش کر رہی تھی مگر چیف نے اُسے موقع نہیں دیا البتہ اُس کے انداز میں فوری تبدیلی آگئی، اس نے سر سے ہیٹ اُتارا، تھوڑا سا جُھکا اور پھر ایسے انداز میں پروین سے ہاتھ ملایا کہ بڑے بڑے خاندانی لارڈ بھی اُس پر رشک کریں۔

اس کے بعد اس نے ہمارے ساتھ تصویریں کھنچوائیں اور بہت سی باتیں کیں مگر احتیاط یہ رکھی کہ چہرے کا زاویہ اور رُوئے سُخن دونوں پروین کی طرف رہیں۔ معلوم ہوا کہ سرکار اِس طرح کی reserves میں پیدا ہونے والے ہر بچّے کو وظیفہ دیتی ہے چنانچہ یہاں کی عورتیں بچّے پیدا کر کر کے تباہ ہو جاتی ہیں اور چونکہ شادی بیاہ کا بھی کوئی ایسا رواج نہیں ہے کہ بچّہ ذمّہ داری بن جائے لہٰذا چل سو چل۔

خالد کے چھوٹے بھائی قاسم نے واپسی میں ریڈ انڈین لوگوں کی کثرتِ شراب نوشی پر گفتگو کے دوران ایک بہت مزیدار لطیفہ سنایا:

کسی پارٹی میں ایک صاحب بہت پی گئے۔ جھومتے جھامتے ایک میز پہ پہنچے جہاں

اُن کی بیگم بڑی سوبر حالت میں اپنے سامنے رکھے جام سے چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے رہی تھی۔ آپ نے جاتے ہی اُس کے گلاس پر ہاتھ رکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولے :

"بس کرو بیگم ، اور مت پیو — تمہارا چہرہ پہلے ہی دھندلا ہو رہا ہے۔"

رات کا کھانا بیگم کلثوم اعجاز محمدی کی طرف تھا۔ اشفاق اور سہیل شام کی فلائٹ سے ٹورنٹو جا چکے تھے۔ میرا سامان شاہد کے گھر سے عقیل جعفر زیدی زبردستی اُٹھا لایا تھا کہ اِدھر بھی ایک رات بستا جا۔ بارش کئی گھنٹوں سے ہو رہی تھی اور جُوں جُوں اندھیرا بڑھ رہا تھا سڑکوں پر گاڑی کے skid کرنے کے امکانات روشن سے روشن تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے عقیل نے بتایا کہ یہ علاقہ ونی پیگ کا سوہو ہے، چند گھنٹے بعد ان فٹ پاتھوں اور سڑکوں کے کونوں پر ہر طرف وہ خواتین ہوں گی جن کا تعلق دُنیا کے قدیم ترین پیشے سے ہے اور پھر صبح تک کاروں کے دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہیں گے۔

میں نے حیرت سے پوچھا : " اتنی آزادی اور فراوانی کے بعد بھی ؟ "

بولا : " اس میں حیرت کی کیا بات ہے ؟ آپ نے عرب شیخوں کے حرم نہیں دیکھے ! "

میں نے کہا : " دیکھے تو نہیں البتہ سُنا اُن کے بارے میں بہت کچھ ہے مگر یہاں تو معاملہ مختلف ہے۔ دیکھو نا ——— قیمتاً تو آدمی وہی چیز خریدتا ہے جو مُفت نہیں ملتی ! "

اس پر وہ نوجوان مسکرایا اور کہنے لگا : " یہاں کا سسٹم بڑا عجیب ہے، اسے سمجھنے کے لیے یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔"

"اور یہ بھی مت بھولیے کہ اس شہر میں میرے اور آپ جیسے گھروں سے دُور لوگ بھی دُنیا کے ہر کونے سے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔"

اس برہانِ قاطع کو سُن کر میں خاموش ہو گیا کیونکہ اس کے بعد گفتگو کو ایک ایسے میدان میں داخل ہونا تھا جہاں فی الوقت میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن میری خاموشی بھی کسی کام نہیں آئی کیونکہ اس دوران میں ہم راستہ بھول چکے تھے اور عقیل بار بار شہر کا روڈ میپ نکال کر کسی ایسی سڑک کو تلاش کر رہا تھا جسے یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہ یہیں تھی اور

نہ کہیں۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کی تگ و دو کے بعد کلثوم کا گھر ہمیں اُسی طرح مل گیا جیسے کولمبس کو امریکہ مل گیا تھا۔

وہاں چند لوگ اور بہت سے کھانے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کلثوم اعجاز بہت اچھی میزبان ثابت ہوئیں۔ اُنہوں نے مشاعرے میں ہونے والی چھیڑ چھاڑ کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا اور سارا وقت اپنی اور اپنے میاں کی باتیں کرتی رہیں۔ دونوں کی شادی غالباً قدرے تاخیر سے ہوئی تھی کیونکہ اُن کے بچّے ابھی بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ پتا نہیں کیوں اُنہیں دیکھ کر مجھے شفیق الرحمٰن کا ایک لاجواب جملہ بہت یاد آیا۔ اپنے کسی مضمون میں اُنہوں نے لکھا ہے: "جنّتی خاندان کے بچّے بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر پھر بڑے ہو جاتے ہیں۔"

بعد میں پروین کے بیان سے اِس خیال کی مزید توثیق ہوئی۔ اس نے بتایا کہ دونوں میاں بیوی انتہائی متشدد قسم کے مذہبی جنونی ہیں اور اُنہوں نے گھر میں بھی ایک ایسی فضا پیدا کر رکھی ہے کہ بچّے ابھی سے اُن کے سانچوں میں ڈھلنا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اِس گھر کے اندر اور اس کے باہر کی دنیا میں جو عظیم سماجی اور فکری تضاد ہے اُس کے دباؤ میں اِن بچّوں کا کیا بنے گا؟

پروین کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا محترمہ رونے کا ایک سیشن لگا چکی ہیں کیونکہ کراچی میں گیتو سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ سو رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اُس کا موڈ بحال کیا گیا اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اس مہم میں سب سے زیادہ کام کلثوم اعجاز نے دکھایا، یہ اور بات ہے کہ وہ شعوری طور پر اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔

کھانے کے دوران ہی عقیل، عالی اور جعفری صاحبان کو اپنے فلیٹ پر مدعو کر چکا تھا اور یہ غالباً اسی دعوت کا اثر تھا کہ کھانا اتنا اچھا ہونے کے باوجود دونوں نے بہت کم کھایا۔

گیارہ بجے کے قریب ہم پروین کو اللہ حافظ کہہ کر عقیل کے فلیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں سنتھال نامی ایک 'بلائے آسمانی' سے ملاقات ہوئی جس کا باپ ڈچ اور ماں اطالین تھی اور زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ دو آتشہ کسے کہتے ہیں!

اگلی دوپہر عامر اور شاہینہ کے ساتھ اور شام اُس ایسوسی ایشن کے ڈنر میں گزری جس کے ہم مہمان تھے۔ رسمی اور روایتی تقریروں اور اصلی گرمجوشی کی ملی جُلی فضا میں کھانے اور تصویروں کے دوران جو سب سے دلچسپ منظر دیکھنے کو ملا وہ علی سردار جعفری صاحب کی مقامی شاعرہ پروین شیر پر خصوصی توجہ تھی۔ پروین کے بارے میں پتا چلا کہ وہ اصل میں مصورہ ہیں اور بڑی ٹھیک ٹھاک آرٹسٹ ہیں۔ ہمارے لیے وہ اپنی پینٹنگز کی کچھ کیمرہ تصویریں بھی لائی تھیں جو اُنہوں نے ہمیں تحفۃً پیش کیں۔ جعفری صاحب نے اُن کے فن کی تعریف شروع کی جو اخلاق کا تقاضا تھی اور شاید جائز بھی لیکن آہستہ آہستہ تعریف مبالغے سے غلو اور پھر غلو سے بھی آگے رواں ہوگئی۔ ایک جُملہ جو میں نے اور پروین (شاکر) نے بالکل واضح طور پر سنا کچھ یُوں تھا:

"یہ جو آپ کی پینٹنگ ہے اس کا سٹائل اور perfection وان گوگ کے بعد میں نے صرف آپ کے یہاں پائی ہے۔"

اس جُملے اور اس کی ادائیگی کے پیچھے جعفری صاحب کا نصف صدی کا تجربہ شامل تھا، چنانچہ اس کا ردِ عمل وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا: خاتون کا چہرہ روشن، آنکھیں خمیدہ اور آواز مدھم ہوگئی اور جعفری صاحب کے علاوہ پوری محفل اُن کے لیے آؤٹ آف فوکس ہوگئی۔ اُن کی یہ کیفیت شاید مزید رنگ پکڑتی مگر ہماری شرارت پسندی نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ بعد میں ہمیں افسوس بھی ہوا کہ ہم نے ایسی غیر کھلاڑیانہ حرکت کیوں کی۔

پروین شیر اور اُن کے میاں صاحب نے ہمیں بتایا کہ وہ بھارت کے ساتھ مل کر مشترکہ فلم سازی بھی کرتے ہیں۔ ہماری آمد سے چند دن پہلے مشہور ہدایت کار رشی کیش مُکرجی اور اداکاران راج ببر، شتو پوری اور زینت امان وغیرہ اُن کے گھر ایک فلم "ناممکن" کی شوٹنگ کے سلسلے میں رہ کر گئے ہیں۔

اس دعوت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ایسوسی ایشن کے مختلف ممبران اپنے اپنے گھروں سے مختلف ڈشیں پکا کر لائے تھے اور چونکہ سب خواتین کی یہ خواہش تھی کہ اُن کی پکائی ہوئی ڈش مہمان ضرور کھائیں، چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ جونہی کوئی میزبان خاتون کسی ڈش کی طرف اشارہ کرتی ہم فوراً مصنوعی چٹخارہ لے کر کہتے: "جی جی ــــ کھائی ہے ــــ

بہت مزیدار ہے ۔" اور عالی صاحب تو ایک بار رَو میں یہ جُملہ ایک ایسی خاتون کو بھی کہہ گئے جو اُن سے آٹو گراف مانگ رہی تھی !

کھانے کے بعد دونوں بزرگ اور پروین تو اپنے اپنے میزبانوں کے ساتھ چلے گئے اور مجھے عقیل اور خالد وغیرہ نے گھیر لیا کہ چلیے آپ کو نائٹ کلب دکھائیں۔ میں نے ہاں تو کر دی مگر اِس کے بعد اُنھوں نے مختلف طرح کے نائٹ کلبوں کی جو نوعیت بیان کی تو معلوم ہوا کہ ہر ایک پر حدُود آرڈیننس لاگو ہوتا تھا۔ میں نے کہا : " یار کوئی شریفانہ سا..... میرا مطلب ہے کم مخربِ اخلاق نائٹ کلب نہیں ہے ..... یہاں ؟"

بولے : " ہے تو سہی مگر ذرا زیادہ دُور ہے ۔"

میں نے کہا : " مولانا روم کا قول ہے : ' راہِ راست برو گرچہ دُور است '۔"

عقیل نے گرہ لگائی : " او کے ___ او کے ___ منظور است ۔"

اب جو ہم اُس ' صالح ' قسم کے نائٹ کلب میں داخل ہوئے ہیں تو فلور پر دو کالے اور ایک گوری کوئی گانا نما چیز گا رہے تھے۔ اِردگرد تماشبینوں کی بھیڑ تھی جن میں سے اکثر جوڑے ایک جان دو قالب کی پوزیشن میں جھوم رہے تھے اور جو نہیں جھوم رہے تھے اُن کے پاس غالباً اِس کے لیے بھی ٹائم نہیں تھا۔ غالب نے تو عاشق کے گریبان کے چار گرہ کپڑے کی قسمت کا ماتم کیا تھا لیکن یہاں کی ویٹرس لڑکیاں تو سرے سے لباس کے حق ہی میں نہیں تھیں۔ بہت تلاش کے بعد پتا چلتا تھا کہ اپنے جسم کی رنگت کی ایک آدھ دھجّی اُنھوں نے پہن ضرور رکھی ہے مگر یوں کہ ' ہر چند کہیں کہ ہے ، نہیں ہے '۔

مصطفٰے زیدی مرحوم کا ایک شعر ہے :

آنکھ جُھک جاتی ہے جب بندِ قبا کُھلتے ہیں
تجُھ میں اُٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے

مگر اس کو کیا کہیں کہ یہاں تو قبا اور بندِ قبا دونوں ہی غائب ہیں !

اتفاق سے ہمیں ڈانسنگ فلور کے بالکل کنارے پر ایک خالی میز مل گئی۔ فوراً ہی وینس کا ایک مجسمہ ہماری طرف لپکا۔ خالد نے اُس کے ہاتھ سے ایک کارڈ لے کر میرے

آگے رکھ دیا۔

"کون سی چلے گی؟" اس نے بڑے رسمی انداز میں پوچھا۔

"چلے گی نہیں — چلے گا — آرنج جُوس!"

"آرنج جُوس اور یہاں؟" خالد نے ایک نعرۂ احتجاج بلند کیا۔ "آپ کیسے شاعر ہیں!"

"شاعر تو میں ٹھیک ٹھاک ہوں"، میں نے مسکراتے ہوئے کہا، "مگر یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ شاعروں کے لیے شراب کمپلسری ہے!"

"ہم نے تو آج تک یہی دیکھا اور سُنا ہے ...... مگر اب آپ کہتے ہیں تو خیر...... ویسے لِٹل لِٹل میں تو کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا: "آپ اپنی شام خراب نہ کریں، ہم تو بقولِ غالب وہ لوگ ہیں کہ

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال۔"

وینس کا مجسمہ ہمیں اس بحث میں دیکھ کر اگلی میز کی طرف بڑھ گیا جہاں چند نوجوان سنگر پارٹی کو انتہائی فحش اشاروں کے ذریعے غالباً داد دے رہے تھے۔ میں نے خالد سے کہا: "دیکھو بھائی میں 'خشک' ضرور ہوں مگر زاہدِ خشک نہیں کہ زندگی کی کئی راتیں ایسی صحبتوں میں گزری ہیں جہاں 'پلائے جا — پلائے جا — ساقیا پلائے جا' کا ہنگامہ برپا تھا اور میں نے اِن محفلوں کو بہت انجوائے بھی کیا ہے؛ تماشے کا لطف اپنی جگہ مگر کبھی کبھی تماشائی ہونا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ چچا غالب تو اس کے لیے فقیروں کا بھیس تک بنا لیا کرتے تھے۔"

وینس کا مجسمہ آرڈر لے کر آنکھوں سمیت پُورے وجود کے ساتھ to whom it may concern قسم کی گفتگو کرتا ہوا چلا گیا تو یک لخت ساز بھی خاموش ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ اب وہ رقص ہو گا جسے 'صلائے عام' کہا جاتا ہے۔ چند ہی لمحوں میں پورا فلور انسانی جسموں سے بھر گیا اور موسیقی کے تیز شور میں رنگ برنگی روشنیاں لہرانے لگیں۔ اعضائے کے اِس مشاعرے میں اچانک دو ایسے جسم دکھائی دیے جن پر انتہائی غیر معمولی حسین چہرے نصب تھے، اتنے حسین کہ اُنہیں دیکھ کر ایک بار تو ہمارے ہمسائے میں بیٹھے ہوئے فحش گو

نوجوانوں کی ٹولی کو بھی چُپ لگ گئی۔ یگانہ کا کیا باکمال مصرعہ ہے: حُسن وہ حُسن جسے دیکھو تو چُپ لگ جائے۔

وہ دیوانہ وار ناچ رہی تھیں اور اُن کے ماتھوں پر آیا ہوا ہلکا ہلکا پسینہ اُن کے جمال کی دوشیزگی کو مزید نکھار رہا تھا۔ مغربی سازوں میں ڈرم کی بیٹ ایسی ہوتی ہے کہ اِس کا ردِھم لہو میں سرسرانے لگتا ہے اور جس طرح ہمارے دیسی ڈھول کی تال پر سر بے اختیار ہل جاتا ہے اس طرح اِس کی بیٹ پر پاؤں قابو میں نہیں رہتے۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ اُٹھ کر اس انبوہ میں شامل ہو جاؤں مگر پھر اُسی بے نام جھجک نے پاؤں پکڑ لیے جو بچپن میں بھی عیدِ میلاد النبیؐ کے جلوس میں ڈھول کی تال پر رقص کرنے کی زبردست خواہش کے پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی تھی۔ کہیں ہم نے رقص کی اِس جبلّی خواہش کو دباکر کتھارسس کے ایک فطری اظہار کو کھو تو نہیں دیا؟

اگلے دن ہمیں آٹوا (Ottwa) روانہ ہونا تھا جسے ہم اب تک 'اٹاوہ' پڑھتے اور سمجھتے تھے لیکن ہمارے محبّت کرنے والے میزبانوں نے آخری چند گھنٹوں کو بھی بے کار نہیں جانے دیا۔ صبح ہم مقامی میوزیم دیکھنے گئے جہاں کی care taker نے ہمیں اپنے صُوبے مینی ٹوبہ کے بارے میں کتابیں، نقشے اور سیاحتی لٹریچر کے علاوہ بہت خوبصورت بیج بھی دیے۔ امریکہ کی طرح کینیڈا کی تاریخ بھی (ریڈ انڈینز کے بغیر) بہت مختصر اور بے کشش ہے لیکن یہاں کے لوگ امریکیوں کی طرح اپنے اس کامپلکس کو دُور کرنے کے لیے دوسری قوموں کی تاریخ کے دَرپے نہیں ہیں (یا شاید انہیں اس کا موقع نہیں ملا)۔ ونی پیگ کا شہر کینیڈا کے برِّستان میں اُس جگہ واقع ہے جو صدیوں سے ریڈ انڈین قبائل کی گزرگاہ رہی ہے چنانچہ اس میوزیم میں اس دَور کی بہت سی یادگاریں محفوظ کر دی گئی ہیں۔

صُوبہ مینی ٹوبہ کا اسمبلی ہال دیکھنے کے بعد ہم نے اس عورت کا گھر دیکھا جس سے شادی کی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد خالد کو یہاں کی شہریت حاصل ہوئی تھی۔ یہ قیمت جسمانی طور پر بھی اتنی بھاری تھی کہ اُسے بلا تکلف عورتوں کی ڈاکٹر وحید قریشی قرار دیا جاسکتا تھا۔ وہاں ہم نے چائے کے ساتھ پیزا کھایا جو اگرچہ لذیذ تھا مگر اُس کھانے کا پاسنگ بھی نہ تھا جو ہمیں خالد کے بھائی طارق نے گزشتہ روز اپنے ہاتھوں سے پکا کر کھلایا تھا۔

آٹوا

ونی پیگ سے کینیڈا کے دارالحکومت آٹوا تک کی فلائٹ رستے میں دو جگہ
پر رُکی۔ عالی نے دونوں ہوائی اڈوں کا تفصیلی جائزہ لیا Thunder Bay اور Sidbury
اور پھر مسوڑھوں پر اُنگلی پھیر کر اپنے مخصوص ہنکارے کے ساتھ بولے: "بھائی یہ تو کچھ کچھ
اپنے نواب شاہ اور میرپور خاص ٹائپ کے ہوائی اڈے ہیں۔" سڈبری کے ہوائی اڈے
پر جہاز کو رُکے پندرہ منٹ ہو گئے تو عالی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور سیٹ
سے اُٹھنے کے لیے ابتدائی کارروائیاں شروع کیں۔ میں سمجھ تو گیا کہ ان کا ارادہ جہاز سے باہر
جانے کا ہے لیکن تھکن اور بے آرامی کی وجہ سے طرح دے گیا۔ پروین اور جعفری صاحب
سے اُنہیں پہلے ہی کوئی توقع نہیں تھی چنانچہ مجھ پر ایک ناراض سی شکایتی نظر ڈال کر وہ کچھ
یُوں اُٹھے جیسے غالب کے مصرعوں میں وقتِ آرائش قیامت قد اُٹھا کرتے ہیں اور کڑی
کمان کے تیر ایسی چال کے ساتھ اپنے بھاری اوورکوٹ کو اُٹھائے جہاز سے باہر نکل گئے۔
ابھی اُن کے جاتے ہوئے قدموں کی دھمک فضا میں موجود تھی کہ وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس
لوٹ آئے۔

"لاحول ولا قوۃ! کیا چیپڑ قنات ہوائی اڈہ ہے۔ سالوں نے ویلو کارڈ تک نہیں رکھے ہوئے۔
بہرحال ایک بات طے ہو گئی ہے کہ مضافات ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔"

اس پر مجھے اپنا اختر امان بہت یاد آیا کیونکہ اس کے خیال میں بڑے شہروں کے ادبی
استحصال کی وجہ سے مضافات کے لکھنے والوں کو آگے آنے کا موقع نہیں ملتا اور جب ہم
اُسے بتاتے ہیں کہ اُردو کے بیشتر بڑے لکھاری مضافات ہی سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ
اسے بھی بڑے شہروں کی استحصالی دلیل قرار دیتا ہے۔

آٹوا تک کے سفر کی دوسری خاص بات وہی کوسٹر کھانا تھا جواب کم وبیش ہماری چڑ بن چکا تھا۔ پروین نے کہا : " یہ کوسٹر تو آپ کے ڈرامے "یا نصیب کلینک" والی ہری چادر ہی بن گیا ہے۔"

میں نے کہا : " اُس پر کم از کم ہنسی تو آتی تھی ، اس کوسٹر نے تو ہمارا پنجابی محاورے کے مطابق 'ہاسا' نکال دیا ہے۔"

ایئرپورٹ پر حمیرا اور سعید صاحبان کی صورت میں ایک اور جوڑا ہمارا منتظر تھا۔ ہماری آنکھوں میں وَنی پیگ ایئرپورٹ کا منظر کوند سا گیا لیکن چند ہی لمحوں میں پتا چل گیا کہ یہ میاں بیوی کلثوم اعجاز محمدی اور اُن کے میاں سے مختلف برانڈ کے ہیں ؛ دوسری خوشگوار تبدیلی یہ معلوم ہوئی کہ یہاں ہمیں مختلف گھروں کے بجائے ایک موٹل میں ٹھیرایا۔

Montery Motel اِس خوبصورت ، سرسبز ، چھوٹے اور compact شہر کی ایک نہایت پُرفضا سڑک کے کنارے واقع تھا۔ آٹوا بیوروکریٹس کا شہر ہے اور گویا ایک طرح سے اپنا اسلام آباد ہے اور اِس کی فضا میں ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ ہے جس کا پرتو موٹل کے ماحول میں بھی نمایاں نظر آرہا تھا۔

ہم چاروں کے کمرے ایک ہی بلاک میں ساتھ ساتھ واقع تھے اور اِن کی اندرونی ترتیب' آرائش ، کلر سکیم اور فرنیچر وغیرہ میں اس قدر یکسانیت تھی کہ اگر دروازوں سے نمبر ہٹا دیے جاتے تو اپنے کمرے کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ جعفری صاحب کا کمرہ مطبخ اور سٹور روم قرار پایا۔ حمیرا اور انصاری نے ناشتے ، چائے اور کافی وغیرہ کا تمام سامان بمقدارِ وافر وہاں رکھ دیا تھا تاکہ ہمیں موٹل والوں کو تکلیف نہ دینی پڑے۔ رات کا کھانا فقیر سہگل صاحب کی طرف تھا۔ ہم انہیں اپنے یہاں کے سہگلوں کا بھائی بند سمجھے تھے لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ موصوف ہندو ہیں اور اپنی فیملی سمیت یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ الیکٹرانکس کے کام میں مہارت رکھتے ہیں اور خاصے سُوکھے (خوش حال) ہیں جس کا اندازہ اُن کے گھر کی آرائش سے بھی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا : "چلیے ایک بات تو آپ میں اور ہمارے ہاں کے سہگلوں میں مشترک نکلی۔"

سہگل صاحب بڑے محبت کرنے والے اور کچھ مست ملنگ سے آدمی تھے۔ اُن کی

بیوی پرکاش اور بیٹی آشا بھی اُن کی طرح سادی اور ہمدرد طبیعت والی تھیں۔ آشا پہلی نظر میں اگرچہ بہت 'ولایتی' نظر آتی تھی مگر جب اُس نے ٹھیٹھ پنجابی میں گفتگو شروع کی تو اُس کے اندر سے ایک خالص پنجابن نکل آئی جس کا دل ابھی تک ماہیے کے بولوں اور مکھنی کی روٹی میں اٹکا ہوا تھا۔ وہاں اشرف صاحب سے ملاقات ہوئی جو شائستہ اکرام اللہ کے بڑے داماد ہیں۔ اُن کی بیگم ناز کے بارے میں معلوم ہوا کہ آرٹسٹ ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ جب بیگم شائستہ کی بیٹی ثروت کی شادی اُردن کے ولی عہد شہزادہ حسن سے ہونے والی تھی تو ہمارے اخبارات نے اس خبر کو اس قدر اُچھالا تھا کہ قرونِ وسطیٰ کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ ولی عہد صاحب کے ہم زلف صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو مجلسی گفتگو کا فن جانتے ہیں اور اپنی آواز سُننے کا بے حد شوق رکھتے ہیں۔ موصوف پاکستان کے سابق اور کینیڈا کے حالیہ بیوروکریٹ تھے۔ صاحبزادی کو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں تعلیم دلوا رہے تھے اور اُن کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کی ہندوستانی شہریت کا حق بھی بوجوہ محفوظ ہے۔ عالی اور جعفری صاحب سے اُن کی پرانی ملاقات تھی چنانچہ وہ تینوں ایسی باتوں میں لگ گئے جن کا کم از کم تعلق تیس برس پیچھے کے واقعات سے تھا چنانچہ ہم لوگ سہگل فیملی کے ساتھ رسمی باتیں کرنے میں مصروف ہوگئے۔ یہ گروہ بندی محفل کے اختتام تک قائم رہی۔ اشرف صاحب نے چلتے چلتے جعفری صاحب کو اگلی صُبح ناشتے پر اس طرح سے مدعو کیا جس میں ہم سب 'ہمنوا' کے طور پر مدعو تھے۔ میں نے اور پروین نے بغیر کسی منصوبے کے ایک ساتھ معذرت چاہی جس پر اشرف صاحب تو بالکل آزردہ نہ ہوئے لیکن ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔

اگلی صبح میری آنکھ فون کی گھنٹی سے کُھلی۔ سردار جعفری صاحب نے بتایا کہ اُن کے کمرے میں چائے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ رات ہم نے اُنھیں جس عالم میں چھوڑا تھا اُس کے بعد اُن کا اتنی صبح اُٹھنا، چائے بنانا اور پھر ایسی بشاش آواز میں بولنا اکہتر برس کی عمر کے کسی شخص کے لیے واقعی قابلِ فخر اور غیر معمولی بات تھی۔ پی کر بہکتے تو فیض صاحب بھی نہیں تھے مگر اُن میں یہ جوانوں کی سی چُستی اور مستعدی شاید جوانی میں بھی نہیں تھی۔ جعفری صاحب کے کمرے میں اشفاق کا بھیجا ہوا اُن کی سالگرہ کا کیک اور ڈاکٹر انور نسیم کی طرف سے بھجوائے

ہوے پھول ہم سب کے لیے ایک خوشگوار مسرت کا باعث تھے کہ ان میں ادیب برادری کے تعلق کی مٹھاس اور محبت کی خوشبو لہریں لے رہی تھی۔

فون کی گھنٹی بجی، جعفری صاحب نے فون اُٹھایا، کسی سے کچھ دیر باتیں کیں اور پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا کہ لیجیے بات کریں، آپ کے ایک چاہنے والے ہیں۔" میں نے کچھ پریشان سا ہوکر "ہیلو" کہا کیونکہ اس شہر میں چاہنے والے تو دُور کی بات ہے مجھے کسی جاننے والے کی بھی خبر نہیں تھی۔ دوسری طرف سے خالص پنجابی لہجے کا سلام آیا: "سلاما لیکم! میں انور نسیم بول ریاں۔"

اشفاق اور دوسرے بہت سے لوگوں سے ڈاکٹر انور نسیم کا نام سُنا تھا اور یہ بھی پتا تھا کہ وہ کینیڈا میں پاکستانیوں کی مختلف انجمنوں کی فیڈریشن کے صدر ہیں اور genetics کے سلسلے میں کوئی بڑی توپ شے ہیں جنہیں گزشتہ برس حکومتِ پاکستان نے خاص طور پر بلوا کر کسی اہم سائنسی کمیشن کا سربراہ بھی مقرر کیا تھا مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ موصوف نہ صرف اپنے علاقے کے ہیں بلکہ مزاجاً بھی اپنے قبیلے کے ہیں۔ ٹیلی فون پر سلام دُعا کے بعد طے ہوا کہ وہ گیارہ بجے ہمیں لینے کے لیے آئیں گے اور آٹوا گھمائیں اور دکھائیں گے۔ ملاقات ہوئی تو پتا چلا کہ موصوف اتنے نامور، ذہین اور تخلیقی سائنسدان ہونے کے باوجود ابھی پچاس برس کے بھی نہیں ہوے، ماضی میں افسانہ نگاری کا شوق کرتے رہے ہیں اور آج کل بھی شاعری پڑھنے اور موسیقی سُننے میں وافر وقت ضایع کرتے ہیں۔ اپنی کھُلی ڈُلی طبیعت اور پُر خلوص مسکراہٹ والے چہرے کی وجہ سے وہ پہلی نظر میں ہی ہمارے دوست بن گئے۔

اُن کے لمبے قد کی مناسبت سے ملاقات کے پانچویں منٹ کے اختتام سے پہلے میں نے اُنھیں ایک لطیفہ سنایا جسے ہماری بزرگ نسل واقعے کے طور پر سنایا کرتی ہے:

کنہیا لال کپور کا قد لمبا اور جسم چھریرا تھا۔ ایم اے انگریزی میں داخلہ لینے کے لیے وہ گورنمنٹ کالج لاہور آئے۔ پطرس انٹرویو بورڈ کے سربراہ تھے۔ اُنھوں نے ایک نظر کپور کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر بے اختیار بولے: "مسٹر کپور، آپ سچ مچ اتنے لمبے ہیں یا آج انٹرویو کے لیے خاص اہتمام کرکے آئے ہیں؟"

انور نسیم نے ایک پُرزور قہقہہ مارا اور پھر میرے نیم فارغ البال سر کی طرف دیکھ کر شرارت آمیز انداز میں بولے : " کنہیا لال کپور کا تو میں صرف ہم قد ہوں ۔ آپ سے تو میرا ہم زلف کا رشتہ ہے ۔"

پروین، جو ہمیشہ مجھ پر فقرہ کہنے کی تاک میں رہتی ہے ، خوش ہو کر بولی : " اب بولیں!

میں نے کہا : " بھئی یہ ہم پنجابیوں کی آپس کی باتیں ہیں تم پٹنے اور بہار والے ان کو کیا سمجھو گے ۔"

بولی : " کیوں ! مینوں پنجابی آندی اے ۔"

مَیں نے کہا : " یہ بات ہے تو چلو ' چورنالوں پنڈ کاہلی ' کا مطلب بتاؤ ۔"

کہنے لگی : " یہ کالی کیا ہوتا ہے ؟"

میں نے کہا : " اوّل تو یہ ساؤنڈ اُردو کی کالی اور کاہلی کے درمیان کی ہے اور دوسرے یہ کہ یہ ہوتا نہیں ہوتی ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے شتابی ، جلدی ، عجلت پسندی وغیرہ وغیرہ ... ..."

بولی : " یہ ذرا مشکل ہے کوئی اور بتائیں ۔"

میں نے کہا : " چلو یہ بتادو کہ ' جٹ بیپا جانے یا بجّو بیپا جانے ' کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟"

بولی : " اس کا مطلب ہوتا ہے اپنے کام سے کام رکھو یعنی Mind Your own business ۔" میں نے کہا : " بالکل ٹھیک ۔ تم اس کا مطلب یہی سمجھو اور اپنے کام سے کام رکھو ۔ ہمارے مذاق تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے کیونکہ یہ بعض اوقات خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتے ۔"

پروین میں یہ بڑی خوبی ہے کہ وہ جُملہ کہنے کے ساتھ ساتھ جُملہ سہنے کا فن بھی جانتی ہے چنانچہ اُس نے ایک خوش دلانہ قہقہے کے ساتھ ایک اچھے شطرنج کے کھلاڑی کی طرح مات تسلیم کرلی ۔ انور نسیم اس گفتگو کے دوران ایک غیر جانبدارانہ مسکراہٹ کے ساتھ خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے رہے جو آئندہ چند دنوں میں اُنہیں کئی بار دہرانا پڑا ۔

انور نسیم نے بتایا کہ وہ گزشتہ برس پاکستان آئے تھے اور اُنھوں نے کشور ناہید سے کہا بھی تھا کہ مجھے امجد اسلام سے ملوا دو مگر آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ میں نے شرارتاً کہا: "یہ بات نہیں۔ اصل میں کشور کا طریقہ ہے کہ وہ دساور سے آئے ہوئے اچھے اچھے دانے اپنے مخصوص حلقے کے لیے رکھ لیتی ہے اور رہند کھوند (بچا کھچا) ہماری طرف بھیج دیتی ہے۔" میری اس بات سے گفتگو کا رُخ کشور کے کمالات کی طرف مڑ گیا۔ ہم تینوں نے اپنے اپنے نوٹس ایکس چینج کیے تو اُن میں حیرت انگیز حد تک مماثلت نکلی۔ ایک بات کا اعتراف البتہ ہم تینوں کو کرنا پڑا کہ سرکاری پبلسٹی کے ادارے اور انقلابی نعرے کو جس طرح کشور نے شیر و شکر کیا ہے یہ اُسی کا کام ہے۔

دوپہر کے کھانے پر پاکستانی سفارت خانے کے کونسلر مسیح اللہ صاحب نے مدعو کر رکھا تھا۔ موصوف پولیس سروس کے آدمی ہیں اور اپنے موسیقی والے رشید ملک صاحب کے یارِ عزیز۔ رشید ملک کے مضامین 'فنون' اور 'معاصر' میں چھپتے رہتے ہیں اور وہ "امیر خسرو کا علمِ موسیقی" جیسی اہم اور منفرد کتاب کے مصنف ہیں۔ مسیح اللہ صاحب نے رشید ملک کے بارے میں پہلا سوال کچھ یوں کیا: "آج کل وہ کس کے پیچھے ہے؟"

میں نے وضاحت کی کہ میرا ملک صاحب سے تعارف صرف پانچ چھ برس پرانا ہے، اور میں نے اُنھیں جس عمر میں دیکھا ہے اُس میں کسی کے پیچھے تو کیا آگے لگنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

مسیح اللہ نے جوابی وضاحت کی کہ ان کی مراد ملک صاحب کے علمی و تحقیقی مشاغل سے تھی کیونکہ وہ جب بھی لکھتے ہیں کسی نہ کسی بُت کو گرانے کے لیے لکھتے ہیں۔

میں نے کہا: "آج کل وہ 'طلائی تثلیث' کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ لکھ رہے ہیں جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی علمی اور حوالہ جاتی غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔"

بولے: "امیر خسرو سے ایک دم ڈاکٹر وزیر آغا تک! کیا ہو گیا ہے رشید ملک کو!"

میں نے کہا: "شکر کیجیے ڈاکٹر انور سدید یہاں نہیں تھا ورنہ اگلے دو مہینے میں پندرہ مختلف ناموں سے آپ کی ہجو چھپتی (جس کی گونج بقول مصنف کے ادب کے ایوانوں میں زور زور سے سنائی دیتی اور پورے ملک میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ جاتی) اور اسی چکر میں

یہ بھی طے ہو جاتا کہ وزیر آغا صاحب کے مقابلے میں امیر خسرو کی حیثیت طفلِ مکتب سے زیادہ نہیں ہے۔"

مسیح اور حیران ہو کر بولے: "بھئی ڈاکٹر وزیر آغا کا نام تو مَیں نے سُنا ہے، اُن کے مضامین بھی دیکھے ہیں مگر یہ انور سدید کون ہیں اور کیوں وزیر آغا کے مختارِ خاص بنے ہوئے ہیں!"

"انور سدید ایک نقاد تھے۔ (اب محقق، شاعر اور انشائیہ نگار بھی ہیں۔) ایم اے اُردو میں فرسٹ آئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے نہروں کے محکمے میں انجینیر ہیں۔ ادب کے وسیع المطالعہ طالب علم ہیں لیکن اُن کے سارے علم اور مطالعے کا واحد مقصد ڈاکٹر وزیر آغا کو مشہور کرنا اور اُن کے خلاف یا بارے میں لکھی جانے والی ہر تحریر کے جواب میں 'ردِ عمل' لکھنا ہے جو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سردار جی نے more over کا نعرہ لگایا تھا۔"

مسیح اللہ نے ششدر ہو کر پوچھا: "مگر کیوں، اس شریف آدمی کو اور کوئی کام نہیں؟"

میں نے کہا: "اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ ڈاکٹر وزیر آغا جیسے عُمدہ نقاد، اچھے ادیب اور نہایت نفیس اور ادب پرور شخص کو کیا ہو گیا ہے! اُن کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ انور سدید کے چلائے 'توپ کے گولے' پورس کے ہاتھیوں کی طرح اُنھی کی صفوں کو روندتے رہتے ہیں اور ان خوامخواہ کے جھگڑوں کی وجہ سے اُن کا ادبی مقام بڑھنے کی بجائے گھٹ رہا ہے۔"

پروین نے لقمہ دیا: "وہ کیا مصرعہ ہے منیر نیازی کا: میں جس سے پیار کرتا ہوں اُسی کو مار دیتا ہوں۔"

یہ گفتگو جاری تھی کہ کینیڈا میں ہمارے سفیر الطاف صاحب آ گئے۔ اچھے خوشگوار سے آدمی تھے اس لیے فوراً ہی گھُل مِل گئے۔ علی سردار جعفری نئے بھارتی وزیر اعظم راجیو گاندھی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ کہنے لگے: "راجیو تجربہ کار پائلٹ ہے، میں سمجھتا ہوں 'جہاز' چلا لے گا۔"

"شرط یہ ہے کہ راڈار ٹھیک کام کرے۔" الطاف صاحب نے مسکرا کر کہا۔

اس جملے کے مزاح ، معنی آفرینی ، رعایتِ لفظی اور سفارتی رکھ رکھاؤ کا لطف دیر تک محفل میں خوشبو کی طرح پھیلا رہا۔

لاہور میں 'ٹرکش گرل' میرے پسندیدہ ہوٹلوں میں سے ہے مگر کسی 'ترکی ہوٹل' میں کھانا کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ ہوٹلوں کے مینو کارڈ پڑھنا اپنی جگہ پر ایک مرحلہ ہے کیونکہ کھانوں کے ناموں سے اُن کی کیفیت، کوالٹی، ذائقے بلکہ اصلیت تک کا پتا کم کم ہی چلتا ہے۔ لنچ کے لیے تین کمبی نیشن درج تھے۔ میں نے دو نمبر لکھوا دیا کیونکہ اس کے اجزائے ترکیبی کچھ کچھ مانوس نظر آ رہے تھے۔ پروین نے ایک نمبر والا کمبی نیشن منگوایا۔ عالی جی نے ہم دونوں پر ایک رحم انگیز نگاہ ڈالی اور مسوڑھوں پر اُنگلی پھیر کر مخصوص انداز میں دانت کٹکٹا کر بولے : " بھئی ترکوں کی اصل ڈش تو ان کے شیش کباب ہیں، جس نے یہ نہیں کھائے سمجھو بھئی کچھ نہیں کھایا۔"

تھوڑی دیر بعد کھانا آیا۔ عالی صاحب کی پلیٹ میں چار تکے کے بیس آئے جب کہ ہماری پلیٹوں میں انواع و اقسام کا مال مسالہ تھا جو کچھ کچھ لاہور ہلٹن کے 'سات رنگ پلیٹر' سے ملتا جلتا تھا۔ ہم نے عالی جی کو چھیڑنے کے لیے سچ مچ کے مزیدار کھانے کی اس قدر مبالغے کے ساتھ تعریف کی کہ عالی تو عالی سرو کرنے والی ویٹرس تک اس قدر متاثر ہو گئی کہ جا کر مینجر کو پکڑ لائی اور اُس مردِ شریف کے متاثر ہونے کا اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ کھانے کے بعد اُس نے باقاعدہ ہمارے ساتھ گروپ فوٹو کھنچوائی اور شکریہ ادا کرتے کرتے تقریباً مشکور حسین یاد ہو گیا۔

طے پایا کہ قہوہ یا کافی سفیر صاحب کے دفتر میں پی جائے جو ہوٹل سے صرف دو بلاک دُور تھا۔ وہاں ہم سب نے سفارت خانے کی کتاب پر دستخط کیے اور اپنے اپنے تاثرات لکھے۔ الطاف صاحب کینیڈا کے پاکستانیوں کے مختلف گروپوں کی باہمی چپقلش سے خاصے نالاں تھے۔ مَیں نے بتایا کہ جن جن پاکستانیوں سے ہم ملے ہیں اُن کے تاثرات بھی آپ کے سفارت خانے کے طرزِ عمل کے بارے میں کوئی ایسے اچھے نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اُنہیں مقامی پاکستانیوں کی کچھ نمایاں شکایات سے آگاہ کیا۔ معلوم ہوا کہ دونوں طرف کی بدگمانیوں میں زیادہ قصور

رابطے کی کمی کا تھا۔ میں نے کہا: ”شاعر نے جو 'قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا' کہا تھا تو اُس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ سرے سے ایک دوسرے کی شکل ہی نہ دیکھی جائے۔“

یہاں سے بات کا رُخ پاکستانی سفارت خانوں کی عمومی کارکردگی اور بیرونِ ملک مقیم اور مسافر پاکستانیوں کی شکایتوں کی طرف ہو گیا۔ الطاف صاحب نے اپنا مؤقف اور مسائل بیان کیے جن کا آخری نتیجہ وہی نکلا جو ہمیشہ اس طرح کی باتوں کا نکلا کرتا ہے!

انور نسیم نے کہا: ”چلیے آپ کو آٹوا کی سیر کرائیں!“ سردار جعفری کو بھارتی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری عترتی صاحب کی طرف جانا تھا اور عالی جی کے سونے کا وقت ہو گیا تھا چنانچہ آخر میں اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے مَیں اور پروین ہی رہ گئے۔

اِسلام آباد کو کسی نے 'کنکریٹ آئی لینڈ' کا نام دیا تھا کہ وہاں سنگ و خشت کے مختلف ڈھانچوں میں انسانوں کے بھیس میں اُن کے گریڈ رہتے ہیں۔ آٹوا بھی بیوروکریٹوں کا شہر ہے لیکن اس کی فضا میں بیوروکریسی کی خوشبو تو ہے سانس روک دینے والی گھٹن نہیں۔ اسلام آباد سے آٹوا کی ایک اور مماثلت اس کا جڑواں شہر ہِل (Hill) بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پنڈی، اسلام آباد کے درمیان سڑک ہے جب کہ آٹوا اور ہل کے درمیان دریائے آٹوا بہتا ہے جس کے کنارے پر سٹی ہال کی آٹھ منزلہ خوبصورت عمارت ہے جس کے مختلف پُل دونوں شہروں کے درمیان نقطہ ہائے وصال کی طرح گزرنے والوں کو مشتاق نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔

راستے میں وزیرِ اعظم اور گورنر جنرل کے بنگلے دیکھے۔ گورنر جنرل کی رہائش گاہ کے ایک محدُود حصّے کو چھوڑ کر سارا گھر عوام کی آمد و رفت کے لیے چوبیس گھنٹے کھُلا رہتا ہے۔ یہ دیکھ کر ہمیں پہلے اپنا گورنر ہاؤس اور پھر مسجدِ نبویؐ کا وہ صحن یاد آیا جہاں اس کائنات کی سب سے محترم اور قیمتی ہستی بغیر کسی محافظ اور نوبت کے بوریے پر بیٹھ کر پورے ملک کا نظام چلایا کرتی تھی۔

سابق وزیرِ اعظم ٹروڈو کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ اس وقت بھی کینیڈا کی مقبول ترین شخصیت ہے۔ فرنچ اور انگریزی بولنے والے صوبوں میں اگرچہ شدید لسانی اور سماجی تعصب ہے

اور وہ کسی بھی مسئلے پر ایک دوسرے سے متفق ہونا پسند نہیں کرتے لیکن ٹروڈو کی سیاسی بصیرت، پسندیدگی اور حمایت پر اُن میں مکمل اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے۔ اپنے طویل دورِ اقتدار میں اس نے کینیڈا کے اندرونی اور بیرونی تضادات اور مسائل کو جس ہوشمندی سے حل کر کے ملک کو ترقی اور استحکام کی راہ پر ڈالا ہے ملک کا ہر طبقہ اس کا معترف اور ثنا خوان نظر آیا۔ اِس دوران میں اُس کے اپنی ایکٹرس بیوی سے اختلافات پیدا ہوئے جو اس نوع کی ذاتیات تک اُتر آئے کہ کوئی اور ہوتا تو ہمیشہ کے لیے اپنی اور معاشرے کی نظروں سے گر جاتا مگر ٹروڈو نے اسے اپنا 'ذاتی مسئلہ' کہہ کر سب کے منہ بند کر دیے اور یوں یہ بحران اُس کے سیاسی کیریر کو چھوئے بغیر اپنی موت آپ مر گیا۔

جمہوری نظام میں حزبِ اختلاف کی جو توقیر کینیڈا میں ہے وہ اپنی جگہ پر ایک روایت بننے کی حقدار ہے۔ قومی پارلیمنٹ ہاؤس کی بلند و بالا، خوبصورت اور پُروقار عمارتوں میں حکومتی پارٹی اور حزبِ اختلاف کو اپنے دفاتر اور دیگر ضروریات کے لیے علٰحدہ علٰحدہ عمارتیں دی گئی ہیں لیکن اس امر کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر وہ سہولت جو حکومتی پارٹی کی عمارت کو حاصل ہے دوسری عمارت میں بھی بالکل اُسی معیار اور مقدار کے ساتھ موجود ہو۔ میرے دل میں رشک سے زیادہ ایک دُکھ کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے سوچا: کیا کبھی میرے ملک کو بھی اس طرح کا ماحول نصیب ہوگا یا ہمیشہ حزبِ اختلاف تھانوں، کچہریوں، جیلوں، نظر بندیوں اور شاہی قلعے کی کوٹھڑیوں میں ہی اپنی حیات کرتی رہے گی؟ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر نظام کو، چاہے وہ اسلامی ہو، جمہوری ہو یا اشتراکی، اُس کی خارجی حیثیت یا ظاہری رُوپ کی سطح پر نافذ کرنا چاہتے ہیں، زندگی کا وہ فلسفہ اور نقطۂ نظر، جو اس کی رُوح رواں ہوتا ہے، اُس سے ہم ہمیشہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ اُس کے نفاذ سے ہمیں اپنے فکر و عمل کے ڈھانچوں کو بدلنا پڑتا ہے اور یہ وہ بھاری پتھر ہے جسے ہم صدیوں سے چُوم کر چھوڑتے چلے آ رہے ہیں:

خُود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

پارلیمنٹ کی عمارت کی سیر کے دوران میں نے پروین کی طرف جب بھی دیکھا وہ مجھے کسی

گہری سوچ میں ڈوبی نظر آئی۔ شاید اُس کے ذہن میں بھی وہی سوال مچل رہے تھے جن کی آتشِ خاموش کے شعلے میری آنکھوں میں بے محابا جل رہے تھے۔

رات کو ٹی وی پر خبروں میں بتایا گیا کہ لاس اینجلس اولمپکس میں حصہ لینے والے کینیڈین کھلاڑیوں کے اعزاز میں جو سرکاری دعوت ہو رہی تھی وہ کینسل کر دی گئی ہے۔ وجہ یہ معلوم ہوئی کہ بیشتر کھلاڑی طالب علم تھے جو دُور دراز کے شہروں سے ذاتی خرچے پر نہیں آ سکتے تھے اور کیونکہ اُن کی مقامی ایسوسی ایشنوں اور مرکزی حکومت نے سفر خرچ وغیرہ کا انتظام نہیں کیا تھا اس لیے اُن لوگوں نے شمولیت سے معذرت کا اظہار کر دیا ہے۔ دھیان فوراً اپنے قومی کھلاڑیوں کی طرف گیا۔ گزشتہ چند برسوں سے کرکٹ، ہاکی اور سکواش وغیرہ کے کچھ نمایاں کھلاڑیوں کو تو گزارے لائق نوکری مل جاتی ہے مگر باقی کھیلوں میں اب بھی وہ عالم ہے کہ انٹرنیشنل کھلاڑیوں کو زندہ رہنے کے لیے ٹھیلے اور چھابڑیاں لگانا پڑتی ہیں۔ مجھے اپنا سکول کا دوست محمد غزنوی بھی یاد آیا جو آج کل باکسنگ کا بین الاقوامی ریفری ہے اور جس نے ایشین اور اولمپک مقابلوں میں ایک کامیاب باکسر کی حیثیت سے دس سال تک ملک کی نمائندگی کی ہے، اُس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ " تربیت کے دوران ہمیں روزانہ بیس میل دوڑایا جاتا تھا اور پھر فی کس آدھ سیر گنڈیریاں بطور 'ڈائٹ' کھانے کو دی جاتی تھیں کہ ان سے جبڑے اور دانت مضبوط ہوتے ہیں۔"

ایک طرف کھلاڑیوں کے وقار اور حقوق کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک اعلیٰ سرکاری اعزاز کا بائیکاٹ کر سکتے ہیں اور دوسری طرف ... ...

اگلی صبح حمیرا اور انور سعید انصاری کے گھر ناشتے کی دعوت تھی۔ اُن کا گھر ہمارے موٹل سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ دونوں میاں بیوی بڑے مہذب اور محبت والے ہیں اور انسانوں کی اُس 'اقلیت' سے تعلق رکھتے ہیں جو مہمان کی خدمت میں سچ مچ کی 'اصلی والی' خوشی محسوس کرتے ہیں اور جن کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ میز پر رکھا ہوا خور و نوش کا سارا سامان گھر کے فرج کے بجائے مہمانوں کے معدوں میں منتقل ہو جائے۔ سو اور تو اور ہمیں وہ عجیب و غریب پھل بھی کھانا پڑا جس کا نام کیوی (وہی بُوٹ پالش والا آسٹریلین نژاد)

تھا اور جس کا ذائقہ ایسا تھا کہ ایک بار کھانے کے بعد زندگی بھر دوبارہ اس کی طلب نہیں ہوتی۔
گزشتہ روز پاکستانی سفارت خانے کی دعوت میں علی سردار جعفری بھی ہمارے ساتھ تھے غالباً اسی لیے بھارتی سفارت خانے والوں کی طرف سے ہم سب کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا گیا مگر مسئلہ یہ آپڑا کہ عین اُسی وقت کے لیے آٹوا میں مقیم پاکستانیوں کے ایک گروپ کی طرف سے دی گئی لنچ کی دعوت نہ صرف ہمارے میزبان پروگرام میں شامل کر چکے تھے بلکہ ہماری طرف سے اُنہیں کنفرم بھی کر چکے تھے۔ جعفری صاحب کے اصرار کی وجہ سے مجبوراً ہمیں درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑا یعنی عالی جی ہماری نمائندگی کے لیے بھارتی سفارت خانے کی دعوت میں چلے گئے اور میں اور پروین ہوٹل شاہ زان پہنچے جہاں بہت سے احباب ہمارے منتظر تھے۔

ایک ہی خاندان کے لوگوں یا بھائیوں میں بعض اوقات نقش و نگار کی خاصی مماثلت ہوتی ہے لیکن اپنے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب اور اُن کے بھائیوں کی مشابہت کچھ عجیب طرح کی ہے کہ اگرچہ اُن کے علٰحدہ علٰحدہ نقش اور cuts ایک دوسرے سے زیادہ نہیں ملتے لیکن مجموعی تاثر کچھ ایسا بنتا ہے کہ آپ فوراً پوچھ بیٹھتے ہیں: "آپ ... ... ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے ... ..."

"جی ہاں، میں اُن کا چھوٹا بھائی ہوں — میرا نام نصرت یار خاں ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ آج سے دو تین برس پہلے میں نے ایک اور صاحب کو دیکھ کر یہی سوال کیا تھا اور اُنہوں نے بھی میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے کہا تھا: "جی ہاں، میں اُن کا چھوٹا بھائی ہوں — میرا نام نزہت یار خاں ہے۔"

عبادت صاحب کے ذکر پر مجھے ہمیشہ ایم اے اُردو کی پہلی کلاس میں سنایا ہوا اُن کا وہ شعر یاد آجاتا ہے جو وہ تقریباً ہر دوسرے لیکچر میں اپنی گول گول آنکھیں گھما گھما کر سنایا کرتے تھے اور جسے سُن کر کلاس میں بیٹھے ہوئے لڑکے لڑکیوں میں سے بیشتر کی نظریں اُلجھ اُلجھ جایا کرتی تھیں۔ شعر یہ تھا:

تنہا تجھے بٹھا کے کہیں آج رات بھر
جی چاہتا ہے کہیے: 'مری جان!' پر نہیں

یہ شعر، وہ کلاس، عبادت صاحب اور وہ لوگ اب کبھی یکجا نہیں ہوں گے کہ اسی کا نام زندگی ہے اور کبھی اتفاق سے ایسا ہو گیا تو مجھے یقین ہے بیشتر لوگ ایک دوسرے کو پہچان بھی نہیں سکیں گے۔

اُف — خُدایا — یہ 'وقت'، کِس قدر خوفناک چیز ہے!

سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں
اُس کی جبیں کیسی تھی!
ہونٹ کیسے تھے! بدن کیسا تھا! آنکھیں کیا تھیں!
بس یہی یاد ہے: وہ جیسی نظر آتی تھی
اُس سے کہیں اچھی تھی۔
(یہ مہ و سال کا طوفان بہت ظالم ہے
وہ اگر پاس بھی ہوتی تو کِسے علم ہے کیسی ہوتی!)

یہ نظم مَیں نے اُس کلاس سے جُدا ہونے کے پانچ برس بعد لکھی تھی اور اب تو اس بات کو اٹھارہ برس سے زیادہ عرصہ ہو چلا ہے ...... اللہ — اللہ!

ہوٹل شاہ زان کے نیم تاریک اور اُداس سے ڈائننگ ہال میں بار بار کنکھیوں سے گھڑیاں دیکھتے ہوئے میزبانوں کے ساتھ ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور اجازت طلب کی جو ذرا سے رسمی انکار کے بعد مل گئی کہ یہ ایک ورکنگ ڈے تھا اور تقریباً سب کے سب میزبانوں کو واپس اپنے دفتروں کو جانا تھا۔

ہمیں لندن کے لیے ویزا لینا تھا۔ آٹوا میں چونکہ برطانوی سفارت خانہ بھی تھا اور ڈاکٹر انور نسیم بھی (جو پاکستانی تنظیموں کی فیڈریشن کے صدر ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے مانے ہوئے سائنسدان بھی تھے) اِس لیے فیصلہ ہوا کہ یہ کارِ خیر وہیں انجام دیا جائے۔ متعلقہ عمارت کے گرد دو چکر لگائے مگر پارکنگ کے لیے جگہ نہ مل سکی۔ تیسرے چکر پر انور نسیم نے گھڑی دیکھی اور ہرچہ باداباد کے انداز میں سڑک کے کنارے ہی گاڑی کھڑی کر کے اُس کے بلنکرز آن کر دیے۔

"آپ لوگ اپنے پاسپورٹ مجھے دیجیے اور یہیں بیٹھیے۔ اگر کوئی پولیس والا پُوچھے تو اُس سے زیادہ بات نہ کیجیے گا بس یہی بتائیے کہ آپ یہاں اجنبی ہیں اور آپ کے میزبان گاڑی یہاں روک کر سفارت خانے کی عمارت میں گئے ہیں۔"

"مگر کیوں ۔۔۔ !" پروین نے حیرانی اور گھبراہٹ کے مِلے جُلے لہجے میں کہا۔

"وہ اِس لیے خاتون کہ ساڑھے تین بج چکے ہیں، غالباً چار بجے ویزا آفس بند ہو جائے گا۔ آج جمعہ ہے۔ آئندہ دو دن یہاں چھٹی ہوگی اور سوموار کی صبح آپ کی روانگی ہے، اور کوئی سوال!"

"مگر، یہ پولیس والا ۔۔۔۔۔ وغیرہ ۔۔۔۔"

"میں نے مجبوراً گاڑی غلط جگہ پارک کی ہے۔ اِن بلنکرز کا مطلب یہ ہے کہ مجھے کسی ایمرجینسی کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا ہے جو قابلِ معافی جُرم ہے لیکن اگر وضاحت آپ نے کی تو مجھے یقین ہے کہ کافی معقول جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔"

انور نسیم کی اِس بات کو ہضم کرنا پروین کے لیے بہت مشکل تھا کیونکہ اِس طرح اُس کی انگریزی دانی اور کامن سنس دونوں پر حملہ ہوتا تھا مگر وہ موقعے کی نزاکت کو دیکھ کر ایسے بھولی بن گئی جیسے اُس نے یہ جُملہ سُنا ہی نہ ہو۔

جس پھُرتی، مستعدی، آسانی اور منظم طریقے سے پندرہ منٹ کے اندر اندر ہمارے پاسپورٹوں پر ویزے لگائے گئے وہ ہمارے لیے ایک بہت خوشگوار تجربہ تھا۔ مغرب کی ترقی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں ہر شخص کے وقت کی قدر کی جاتی ہے اور بغیر کسی ٹھوس وجہ کے کسی کے کسی بھی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی۔

ویزا لگوانے کے بعد بنک آف مونٹریال پہنچے۔ تین سو ڈالر کے ٹریولر چیک متعلقہ کاؤنٹر پر دیے۔ ایک منٹ کے اندر اندر ایک بہت میٹھی مسکراہٹ میں لپیٹتے ہوئے تین سو چورانوے کینیڈین ڈالر میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا: "دو ڈالر ہم نے بنک کے سروس چارجز کے طور پر کاٹ لیے ہیں۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور دل میں کہا: بی بی، تم یہ سارے کے سارے رکھ لیتیں تو بھی جائز تھا کیونکہ ہم تو اُن کے مریدوں میں سے ہیں جو

ایک تِل کے بدلے دو دو شہر بخش دیا کرتے تھے۔"

مشاعرہ 'ہالیڈے اِن' میں تھا اور بڑا ارسٹو کریٹک قسم کا تھا۔ سٹیج پر کسی کانفرنس کے انداز میں میز کُرسیاں اور گلدان وغیرہ سجے تھے۔ شاعروں کے ناموں کی خوشنما تختیاں، مائیکروفون، پانی کے گلاس، چائے کے کپ، ایش ٹرے اور الائچیاں اِن کے علاوہ تھے۔

سعودی عرب سے آئے ہوئے 'قافلے' کے نئے شریک تسلیم الٰہی زلفی سے ملاقات ہوئی۔ دُبلے پتلے، لمبے اور پانوں بھری پُرخلوص مسکراہٹ والے زلفی کا نام ہر سالوں میں نظر سے گزرتا رہتا تھا، معلوم ہوا کہ موصوف سعودی ایئر لائنز میں ملازم ہیں، خاندان والے تقسیم پاک و ہند سے پہلے کے سعودی عرب میں مقیم ہیں گویا اب تقریباً وہاں کے 'لوکل' بن چکے ہیں؛ کراچی میں تعلیم حاصل کی اور ایوب خاور کے گہرے دوست ہیں۔ میں نے کہا: "یار، تم رنگ، قد، خلوص اور محبت وغیرہ وغیرہ میں تو ایوب خاور پر گئے ہو، یہ بتاؤ کہ شاعری میں کوئی جُدا راہ نکالی ہے یا وہاں بھی ...... ؟"

مشترکہ دوست کا یہ حوالہ ہماری instant بے تکلفی کا ذریعہ بن گیا اور مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے پہلے ہم آپس میں کچھ اتنے گھُل مِل گئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ زلفی کی نشست میرے ساتھ تھی مگر وہ اپنی سیٹ پر بہت کم وقت بیٹھا اور زیادہ عرصہ شاعروں اور سامعین کی تصویریں اُتارتا رہا۔ اس کے کیمرے کے رُخ سے مجھے اندازہ ہوا کہ نوجوان خاصا خوش ذوق واقع ہوا ہے۔

آٹوا کے سامعین یا تو ضرورت سے زیادہ سمجھدار تھے یا اپنی 'افسریوں' کی وجہ سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کر رہے تھے۔ حقیقت کچھ بھی ہو اُنہوں نے یہ مشاعرہ کچھ اس طرح سے سُنا جیسے فٹ بال کے ایک میچ میں ایک گھنٹہ دیر سے پہنچنے والے تماشائی نے سکور پُوچھا تھا:

"کتنے گول ہوئے ؟"

"کوئی نہیں۔ ابھی تک مقابلہ صفر صفر سے برابر جا رہا ہے۔"

"چلو اچھا ہے ـــــ اس کا مطلب ہے میں نے کچھ مِس نہیں کیا!"

اس کے باوجود یہ ہمارے یہاں کے اُن 'افسر' سامعین سے بہتر تھے جو داد کے لیے یا تو بڑی خسروانہ ادا کے ساتھ سر ہلا کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہیں یا اچھا شعر سُن کر زور سے ہنس پڑتے ہیں۔ ایک ایسے ہی ہیوی ویٹ اور افسر قسم کے صاحبِ صدر کو ہم نے ایک مشاعرے میں دیکھا کہ موصوف داد دینے کے لیے فضا میں ایک زوردار قہقہہ چھوڑتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ شاعر کی کمر یا ران پر زور زور سے ہاتھ بھی مارتے جاتے تھے۔ اُن کی اِس کارروائی کے نتیجے میں مشاعرے کے اختتام پر گیارہ شاعر نیم بیہوش اور دو مکمل بیہوش پائے گئے۔

ہمارے سفیر الطاف صاحب اور ہندوستانی سفارت خانے کے فرسٹ سیکرٹری عتری صاحب بھی شاعروں کے ساتھ سٹیج پر بٹھائے گئے تھے۔ مشاعرے کے اختتام ہر دو حضرات نے مختصر تقریریں بھی کیں جنہیں سامعین نے ایسے ضبط و تحمل سے سُنا جیسے یہ بھی مشاعرے ہی کا حصہ تھیں۔

اِس مشاعرے کی ایک خاص بات ہال کے باہر کوٹ وغیرہ رکھنے والی وہ خاتون بھی تھی جو بار بار حیرت بھری آنکھوں سے ہال میں جھانکتی تھی اور پھر کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں کندھے جھٹک کر واپس چلی جاتی تھی مگر عالی کے دوہوں کی تان اور اُٹھان سُن کر وہ ایسی متاثر ہوئی کہ جب اُنھوں نے آخر میں 'جیوے جیوے پاکستان' سنایا تو وہ بھی سب کے ساتھ ساتھ اس میں آواز ملا کر نہ صرف گانے لگی بلکہ کوٹ واپس کرتے وقت اُس نے عالی سے خاص طور پر ہاتھ بھی ملایا۔ اس پر مجھے بڑے قاسمی صاحب کا سنایا ہوا ایک واقعہ بہت یاد آیا:

احمد ندیم قاسمی راوی ہیں کہ ایک مضافاتی مشاعرے میں علاقے کے اسسٹنٹ کمشنر اور تحصیل دار وغیرہ نے پٹواریوں کے ذریعے بہت سے کسانوں کو زبردستی مشاعرہ گاہ میں لا جمع کیا تاکہ سامعین کی تعداد معقول ہو جائے۔ بے چارے سیدھے سادے اَن پڑھ دیہاتی حیران پریشان بیٹھے مشاعرہ دیکھ رہے تھے اور اپنے 'افسروں' کے ڈر سے ٹکٹکی 'دیدم دم نہ کشیدم' کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں منور سلطانہ لکھنوی کا نام پکارا گیا۔

اُنھوں نے آکر اپنے مخصوص انداز میں ایک تان لگائی تو پہلی بار ان 'سامعین' کی صفوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ ایک دیہاتی نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور زور سے پکارا :

"بی بی، اللہ تیکوں حج کرائے۔"

میں نے عالی کو یہ واقعہ سنایا تو اُنھوں نے ایک مصنوعی خفگی کی نظر مجھ پر ڈالی اور بولے : "آپ لوگوں نے اس فدوی کی گلے بازی اوائلِ جوانی میں مشاہدہ نہیں کی ورنہ یقینِ کامل ہے کہ آپ لطافتِ ترنم کو یوں نشانہ تضحیک و باعثِ الزام نہ بناتے۔"

میرامن کی زبان میں گفتگو کا یہ سلسلہ کئی روز سے ہم نے جاری کر رکھا تھا چنانچہ میں نے بھی اُسی انداز میں کلاسیکی نثر کا نمونہ پیش کیا : "درآنحالانکہ اِس ناچیز کا مقصد دشنہ ہائے الزام چلانا یا طنزِ خفی سے نشتر زنی کرنا نہ تھا لیکن اِس کے باوجود اگر خاطرِ نازک پر یہ استباح بدیہی اثراتِ ناگواری چھوڑ رہا ہے تو میں اپنے الفاظِ ادا کردہ بہ حسرت و یاس واپس لیتا ہوں۔"

پروین کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا اور کوٹ پہنانے والی ہم تینوں کو چند لمحے حیرت بھری نظروں سے دیکھنے کے بعد کندھے جھٹک کر چلی گئی۔

رات کا کھانا، جو اَب اگلی صبح کا کھانا ہو چکا تھا، تقریباً دو بجے شاہین کے گھر کھایا گیا۔ شاہین اُردو کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ کسی زمانے میں شاہین غازی پُوری کے نام سے لکھتے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ اُن کا پُورا نام ولی الرحمٰن شاہین ہے۔ برسوں سے آٹوا میں مقیم ہیں۔ کلام کا دوسرا مجموعہ 'بے نشان' دو برس قبل شایع ہوا تھا اور ان دنوں اپنے کاروبار میں سیٹ ہونے کے بعد انگریزی زبان میں اُردو شعر و ادب کے تراجم پر مشتمل ایک سہ ماہی مجلہ شایع کرنے کا اِرادہ باندھ رہے ہیں۔ شاہین ایک سیدھے سادے، کم گو، شریف الطبع اور محبت کرنے والے صُلح کل انسان ہیں مگر یہ خبر ہمارے لیے بہت حیرت اور مسرت کا باعث تھی کہ اُن کا بیٹا کینیڈا کی ریسلنگ ٹیم میں اپنے مخصوص وزن میں چمپین کا درجہ رکھتا ہے اور بے شمار نیشنل اور انٹرنیشنل مقابلوں میں اعزازات حاصل کر چکا ہے۔ اُن کی بچیوں اور بیگم نے ہمارے لیے طرح طرح کے کھانے تیار کر رکھے تھے مگر رات بہت زیادہ ہو جانے اور تھکن اور نیند کی وجہ سے کسی کی طبیعت راغب نہیں تھی سو اِس وعدے

پر بات ٹھہری کہ صُبح مونٹریال جاتے ہوئے ناشتہ ان کی طرف کیا جائے گا۔ یہ ناشتہ بریک فاسٹ اور لنچ کے مکسچر کی صُورت میں بطور "برنچ" کیا گیا اور خُوب ڈٹ کر کیا گیا۔ زلفی نے پیٹ میں گرانی کا عذر کر کے ہاتھ کھینچ لیا تھا لیکن جب شاہین کے پہلوان بیٹے نے پلیٹ اُس کی طرف بڑھائی تو اس نے کچھ سوچ کر چُپ چاپ دوبارہ کھانا شروع کر دیا۔

مونٹریال — ۲

کینیڈا کے فاصلوں اور موسم کے پیشِ نظر اشفاق نے سارا سفر ہوائی جہازوں پر رکھا تھا
لیکن جس طرح فراوانی اور یکسانیت من و سلویٰ سے منہ پھرا دیتی ہے اسی طرح ہم بھی
لاہور سے آٹوا تک جہازوں اور ایئر پورٹوں کی ایک سی شکلیں دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکے تھے۔
طے یہ پایا کہ آٹوا سے مونٹریال تک بائی روڈ سفر کُل دو گھنٹے کا ہے چنانچہ کم از کم اتنا کینیڈا
تو قریب سے دیکھ لیا جائے۔ انور نسیم، شاہین اور شاہین کے بیٹے کی موٹروں میں لدکر یہ
قافلہ سوئے مونٹریال روانہ ہُوا تو ہم سفری کے لیے بارش بھی ساتھ ہو لی۔ سردی، کہر اور
بارش نے مل جُل کر کچھ ایسا سماں باندھا کہ باہر کے مناظر 'ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے'
کی زندہ تصویر بن کر رہ گئے۔ بارش کے دوران ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنا بڑا تکلیف دہ
تجربہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اُس طرف کا وائپر شیشے کو پُوری طرح صاف نہیں کرتا اور دل کو ہمہ
وقت یہ وہم لگا رہتا ہے کہ ڈرائیور کو بھی سڑک اُسی طرح نظر آ رہی ہے (یا نہیں آ رہی) جس
طرح کہ ہمیں۔

آنکھ دھندلائی ہوئی تھی، شہر دُھندلایا نہ تھا

بیس دن کے بعد مونٹریال واپس پہنچے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو تھی البتہ سڑکوں کے کناروں
پر برف کے ڈھیر کی تہہ کچھ اور اُونچی ہو چکی تھی۔ میں نے اس تبدیلی کی طرف اشارہ کیا تو کسی
نے خود میرا شعر (جو میں نے گزشتہ رات کے مشاعرے میں پڑھا تھا) سُنا کر مجھے چُپ
کرا دیا:

کچھ ایسی برف تھی اُس کی نظر میں
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا!

آفاق حیدر کا گھر اُس سُست موج دن کا ساحل تھا چنانچہ یہ قافلہ وہیں جا کر رُکا۔ آفاق حیدر کی بیگم ہندوستان سے آ چکی تھیں۔ اُن لوگوں نے بڑی پُر تکلف چائے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ میں نے کیک کے دوسرے ٹکڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ پروین معنی خیز انداز میں کھانسی۔ میرا ہاتھ وہیں رُک گیا لیکن اُس کی زبان چونکہ سٹارٹ لے چکی تھی لہٰذا جب تک میری خوش خوراکی کا ڈھنڈورا اچھی طرح نہیں پِٹ گیا اُسے چین نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد افتخار عارف بھی پہنچ گیا۔ وہ لندن سے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ اُس کے آنے سے بیرونی مہمانوں کی تعداد چھ ہو گئی۔

افتخار عارف ٹی وی کے ذہنی آزمائش کے مشہور پروگرام 'کسوٹی' کے حوالے سے پورے پاکستان میں ایک جانا پہچانا نام اور چہرہ تو تھا لیکن گزشتہ چند برسوں میں اس نے بطور شاعر اپنے لیے جو مقام پیدا کیا ہے اُس کے حوالے سے اب وہ جدید نسل کے شعراء کی پہلی صف میں شامل ہو چکا ہے۔ شعر پڑھنے کا اس کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جس کی وجہ سے مشاعروں میں اُسے بہت پسند کیا جاتا ہے لیکن ان سب اوصافِ شاعری سے الگ بطور انسان وہ ایک انتہائی نفیس، ملنسار اور پسندیدہ شخصیت کا حامل ہے۔ اُس کی پی آر کا دائرہ اب کراچی اور لاہور کی تنگنائے سے نکل کر تین برِّاعظموں کے پھیلاؤ پر محیط ہے اور اگرچہ اتنے زیادہ 'دوست' رکھنے والوں کی دوستی مشکوک ٹھہرتی ہے پھر بھی ذاتی طور پر گزشتہ دس برس میں مَیں نے اُسے ایک اچھا دوست پایا ہے۔ وہ حسبِ معمول بہت جوش اور تپاک سے مِلا لیکن اُس کی آنکھوں کی اُلجھن اور بے چینی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اس کی وجہ وہاں پروین کی موجودگی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پروین جب شاعری کے میدان میں نووارد تھی اور ایف اے کی طالبہ کی حیثیت میں بین الکلیاتی مشاعروں میں حصّہ لیا کرتی تھی تو اُس وقت افتخار ایک بڑے بھائی اور سینیئر کی طرح اُس کے دوستوں میں پیش پیش تھا۔ پھر پروین کی 'خوشبو' آئی اور آتے ہی پھیل گئی تو پتا نہیں کس رَو میں افتخار نے مختلف احباب کو ایک خط لکھ مارا جس میں 'خوشبو' کے چار پانچ مصرعوں پر اپنا حق جتایا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مختلف رسائل میں انٹرویو دیتے ہوئے بھی اس نے اس مسئلے کو خاص طور پر اُچھالا۔ پروین کا دُکھ اور غصّہ تو اپنی

جگہ مگر اُس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورتحال دونوں کے مشترکہ دوستوں کے لیے پیدا ہو گئی اور پھر ہوتی ہی چلی گئی۔ معاملہ کچھ ایسا نازک اور جذباتی تھا کہ اگر شروع میں سنبھل جاتا تو سنبھل جاتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلوں میں پڑی ہوئی گرہیں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں اور اگرچہ ایک وقت میں افتخار نے کچھ احباب کو بیچ میں ڈال کر وضاحت اور صلح صفائی کی کوشش بھی کی مگر اُس وقت پروین نے مذاکرات سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ اس مسئلے پر کسی قسم کی بات کرنا اور سُننا نہیں چاہتی اور نہ ہی وہ افتخار سے آئندہ بات چیت کی روادار ہے۔ سو اُس شام فریقین کے درمیان جتنی برف موجود تھی اُتنی شاید مونٹریال کی سڑکوں پر بھی نہیں تھی۔

افتخار کے بار بار کہنے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اس جھگڑے سے باہر رکھا اور افتخار کو بھی مشورہ دیا کہ اتنی بگڑی ہوئی بات ایک دم نہیں بن سکتی۔ اگر وہ سچ مچ اس مسئلے کو ختم کرنا چاہتا ہے اور اس جھگڑے کی بنیاد کچھ غلط فہمیوں کو قرار دیتا ہے تو اُسے بالکل خاموش ہو جانا چاہیے اور اس کا نتارا وقت پر چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ وقت بہترین منصف بھی ہے اور مرہم بھی۔

ایک بات کا البتہ دونوں نے خیال رکھا اور وہ یہ کہ اس کشیدگی کا پتا کسی اور کو نہیں چلنے دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی اس عقل مندی نے بہت سی ممکنہ ناخوشگواریوں کا راستہ روک دیا ورنہ بصورتِ دیگر بہت زیادہ بدمزگی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ بات البتہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عارف جیسے ذہین، صلح کل، ذمہ دار اور محتاط شخص نے ایسا غیر محتاط بیان کیسے اور کیوں دیا تھا؟ آسکر وائلڈ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے خلاف لگائے گئے ایک الزام کو عدالت میں چیلنج کیا تھا اور اس کے بعد کیس ہار کر خود اندر ہو گیا تھا!

میرا قیام اس بار بھی شبیر صدیقی کی طرف تھا۔ فائزہ فرانسیسن صدیقی نے ایسی نستعلیق اُردو میں مجھے خوش آمدید کہا کہ اگر مجھے اُس کے کینیڈین نژاد ہونے کا علم نہ ہوتا تو میں اُس کے کتھئی بالوں، نیلی آنکھوں اور چٹی چمڑی کے باوجود اُسے فائزہ صدیقی لکھنوی ہی سمجھتا۔

مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو یوں لگا جیسے 'نیلام گھر' میں آ گئے ہیں۔ چاروں طرف مختلف دکانوں اور سٹورز کے بینر اور پوسٹر نما اشتہار لگے تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جمِ غفیر رکھی

تقریبات کے لباسوں اور پکنک موڈ کے ساتھ مشاعرے کے آغاز کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُن کے اس انتظار میں ہم بھی شامل ہو گئے کیونکہ تمام کے تمام منتظمین ایک کونے میں جمع ہو کر کسی نامعلوم مسئلے پر مسلسل بحث کیے جا رہے تھے۔ دوسرے کونے میں ماکولات و مشروبات کا ایک سٹال لگا ہوا تھا جس کے گرد ایک ایسی بھیڑ تھی جو مشاعرے کے اختتام تک کم نہیں ہوئی۔ اب یہ اُن لوگوں کی 'سخن فہمی' تھی یا محض اتفاق لیکن ہوا یوں کہ جب بھی کوئی شاعر کلام سُنانا شروع کرتا مختلف سیٹوں سے کچھ عورتیں، مرد اور بچے اُٹھتے اور سٹال پر جا کر خورد و نوش میں مصروف ہو جاتے اور آپس میں باتیں کرنے لگتے۔ سٹیج پر بیٹھے ہوؤں کے لیے یہ صورتحال بہت تکلیف دہ اور ناگوار تھی مگر منتظمین کے مسلسل اعلانات اور درخواستوں کے باوجود یہ سلسلہ نہ تو ختم ہوا اور نہ اس میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ چائے کے وقفے کے دوران میں نے سب ساتھیوں کو ایک لطیفہ سُنایا جس سے اُن کے چہروں کے تکدّر میں خاصی حد تک کمی ہو گئی:

دِلّی کے ایک سینما گھر کی کنٹین پر مشہور ہندوستانی موسیقار آر ڈی برمن (جو ایس ڈی برمن کے بیٹے ہیں اور اپنی پاپ اور پُر شور ماڈرن دھنوں کے لیے مشہور ہیں) کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس پر کنٹین کا مالک روزانہ نیا ہار ڈالتا تھا اور کنٹین کھولتے اور بند کرتے وقت اُسے پرنام کرتا تھا۔ ایک دن کسی نے پوچھا کہ بھئی آخر برمن صاحب سے تمہیں اتنی عقیدت کیوں ہے؟ ملک میں ان سے بہت بڑے اور بہتر موسیقار بھی موجود ہیں!

کنٹین والے نے جواب دیا: "وہ اپنے گھر ہوں گے جی، ہمارے اَن داتا اور بھگوان تو یہی اپنے آر ڈی برمن ہیں۔"

"مگر کیوں؟" اس شخص نے حیران ہو کر پُوچھا۔ "ایسی کیا خاص بات ہے ان میں؟"

"خاص بات یہ ہے جناب کہ سینما میں تو فلمیں لگتی اُترتی رہتی ہیں۔ عام فلم میں صرف انٹرول کے دوران لوگ میری کنٹین پر آتے اور کھاتے پیتے ہیں مگر جب آر ڈی برمن کے میوزک والی کوئی فلم لگتی ہے تو گانا شروع ہوتے ہی لوگ اُٹھ اُٹھ کر باہر آنا شروع کر دیتے ہیں اور میرا کاروبار چمک اُٹھتا ہے۔ تو میرے تو یہ بھگوان ہوئے نا جی۔"

جب سے مشاعروں کا یہ سلسلہ شروع ہوا تھا ایک بات بغیر کہے طے ہو گئی تھی کہ صدارت علی سردار جعفری کیا کریں گے کیونکہ وہ عُمر میں ہم سب سے بزرگ ہیں مگر مونٹریال میں یہ روایت یوں ٹوٹ گئی کہ وہاں کے منتظمین صدارت کے لیے عالی کے نام کا نہ صرف اعلان کر چکے تھے بلکہ مشاعرہ گاہ میں بھی اُنہوں نے اس مضمون کا ایک بینر لگا رکھا تھا۔ ہم نے اُنہیں جعفری صاحب کی سینیارٹی کا حوالہ دے کر سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانے۔ ہم نے بھی اس خیال سے زیادہ زور نہیں دیا کہ اب مشرق کی رسمیں دیارِ مغرب میں کہاں تک نبھاتے جائیں۔ یہاں کس کے پاس ان باتوں کے لیے فالتو وقت ہے! مشاعرہ شروع ہُوا۔ ابھی دو تین مقامی شاعروں نے پڑھا تھا کہ سردار جعفری نے طبیعت میں گھبراہٹ کا اعلان کیا، کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر سٹیج کے عقبی حصّے میں نیم دراز ہو گئے اور دس منٹ بعد انہوں نے بتایا کہ وہ مشاعرہ چھوڑ کر جا رہے ہیں تاکہ ڈاکٹر سے مشورہ اور آرام کیا جا سکے۔ ہم سب اور منتظمین نے بہت زور لگایا کہ وہ تبرکاً ہی دو تین شعر سُنا دیں مگر نجانے کیوں انہوں نے کسی کی بات بھی نہ سُنی اور اُٹھ کر چلے گئے۔ اگرچہ میرا دماغ میرے دل کے ساتھ ہم آواز نہیں مگر دل یہی کہتا ہے کہ جعفری صاحب کی طبیعت واقعی خراب تھی اور اُن کے لیے وہاں بیٹھنا ممکن نہیں تھا اور یہ کہ اس کا کوئی بھی تعلق صدارت کے مسئلے سے نہیں۔ کلاسیکی ادیب ایسے موقعوں پر اپنی بات کی وضاحت کے لیے کوئی حکایت بیان کیا کرتے تھے چنانچہ میں بھی اُن کی تقلید کی کوشش کرتا ہوں:

ایک شرابی اوور کوٹ کی اندرونی جیب میں سُرخ شراب کی بوتل رکھے جھومتا جھامتا جا رہا تھا کہ ایک بس نے اُس کو پیچھے سے زوردار ٹکر ماری۔ شرابی اُلٹ کر گرا۔ چند لمحوں بعد جب اُس کے حواس ذرا قابو میں آئے تو اُس نے دیکھا کہ عین بوتل والی جیب کے قریب سے کوئی سُرخ رنگ کی سیّال شے بہہ رہی ہے۔ شرابی نے ہاتھ سے اُس سیّال کو چھُوا اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر دُعائیہ لہجے میں بولا: "اللہ کرے —— یہ میرا خون ہو۔"

مشاعرہ گاہ سے نکلے تو سردی پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ میرے پاس نہ آؤ۔ تیز ہوا کے جھکڑوں، برفانی کیچڑ اور سنسان سڑک پر کھڑے ہم لوگ اپنی اپنی سواریوں کا انتظار کر رہے تھے جو غالباً خاصے فاصلے پر پارک کی گئی تھیں۔ عین ممکن ہے کہ فاصلہ زیادہ نہ ہو صرف ہمیں ایسا لگ

رہا ہو۔ گھر پہنچ کر فائزہ نے محاورے والی لپک جھپک کے ساتھ کھانا گرم کیا اور آواز لگائی "آجائیے میاں صاحب ___ کھانا تیار ہے۔"

عالی فائزہ سے زیادہ اس کی اُردو سے متاثر تھے اور مسکرا مسکرا کر اُسے نہ صرف داد دیتے تھے بلکہ یہ بھی بتاتے تھے کہ اہلِ زبان کی داد کا مطلب سند ہوتا ہے اور یہ سند وہ ہما شما کو نہیں دیا کرتے، مثلاً پنجاب والوں کو اب تک نہیں ملی۔

میں عام طور پر خاصی بلند آواز میں بولتا ہوں، محفل بے تکلف ہو تو والیوم مزید بلند ہو جاتا ہے۔ اگلی صبح ناشتے کی میز پر (جو کچن ہی کے ایک کونے میں واقع تھی) عالی، شبیر اور میں کسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ کسی بات پر ہم تینوں زور سے ہنسے (میرا قہقہہ بلند تر تھا)۔ فائزہ نے انڈوں کی ڈش میز پر رکھی اور مسکرا کر کہا "آج ناشتہ انہی برتنوں میں ملے گا کیونکہ میں اس ماحول میں اپنے چینی کے برتن نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔"

اس پر جو قہقہہ پڑا اس کی گونج اگلے دو دن تک فضا میں رہی کیونکہ یہ جملہ ہر نئے آنے والے کو سنایا جاتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ایم اے اُردو کی کلاس میں ڈاکٹر وحید قریشی (جو اب مقتدرہ قومی زبان کو پیارے ہو چکے ہیں) اس قدر بلند آواز میں لیکچر دیا کرتے تھے کہ بلا مبالغہ اُن کی آواز تیسرے کمرے تک جاتی تھی۔ ایک دن جب اُن کا لیکچر پنچم سُر میں جاری تھا اور اُن کی آواز کمرے کے در و دیوار سے ٹکرا کر چاروں طرف گونج رہی تھی۔ سب سے اگلی لائن میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پُوچھا: "کیا ہوا؟" لڑکی نے عجیب بے بسی کے ساتھ جواب دیا: "سر، آواز نہیں آرہی۔"

لیکن اس سے بھی اچھا تبصرہ شاید میرے قہقہے پر گلزار وفا چوہدری کا ہے۔ میں اُن دنوں پنجاب آرٹ کونسل میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہوا کرتا تھا (جو شاہراہِ قائدِ اعظم پر واقع تھی) اور قاسمی صاحب کے "فنون" کا دفتر انارکلی میں ہوا کرتا تھا۔ قاسمی صاحب راوی ہیں کہ وہ اور گلزار دفتر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ گلزار نے کہا کہ یہ امجد کے ہنسنے کی آواز ہے۔ اوپر پہنچے تو میں وہاں نہیں تھا۔ گلزار نے فوراً کہا: "آواز اُسی کی تھی، ہو سکتا ہے وہ اپنے دفتر میں ہنسا ہو!"

اُس دن ہم نے مونٹریال کا سٹیڈیم دیکھا جہاں ۱۹۷۶ء کے اولمپکس ہوئے تھے۔ اولمپک ویلج دیکھا اور اُس پہاڑی پر گئے جہاں سے پُورا مونٹریال شہر دکھائی دیتا ہے اور بے شمار تصویریں اُتاریں۔ موسم میں اگرچہ بہت خنکی تھی مگر اس کے باوجود ہوا میں ایک عجیب طرح کی مستی اور کیف انگیزی تھی۔ غالباً ایسی ہی مصفّیٰ، مفرّح اور گدگدانے والی ہوا میں غالب نے یہ شعر کہا تھا:

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی!

گھاس کے میدان کے دوسرے سرے پر دو ستارے روشن ہوئے۔ جُوں جُوں درمیانی فاصلہ کم ہوتا گیا اُن کے رنگوں میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا: سُنہرے بال، نیلی آنکھیں، کڑی کمان کے تیروں جیسے تنے ہُوئے جسم جن کی گلابی رنگت ملبوس کے شوخ رنگوں کی گرفت میں آنے سے انکاری ہو رہی تھی اور قد ایسے کہ بے ساختہ دھیان 'دیوانِ غالب' کی سیر کرنے لگے:

"اسد اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش۔"

دونوں ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے چند لمحے رکیں اور انتہائی خوشگوار اور پُرلطف مُسکراہٹ میں لپیٹ کر ایک خوبصورت 'ہائے' ہمارے درمیان اس طرح لڑھکا دی کہ تو سُنبھا:

"To whom it may concern."

میں اُس وقت خالص پاکستانی انداز کی لمبی شلوار قمیض میں شبّیر کی تصویر کے لیے پوز بنائے کھڑا تھا جب کہ عالی پروین کو مونٹریال کی تاریخ پر فرانسیسی اثرات کے متعلق ایک ایسا معلومات آمیز لیکچر دے رہے تھے جس کی اُسے ہرگز کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تھوڑی دُور جا کر وہ دونوں پھر رُک گئیں اور مُڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگیں، عالی نے اپنا لیکچر اُدھورا چھوڑا، اُن کی طرف دیکھا، مسوڑھوں پر اُنگلی پھیری، مخصُوص انداز میں دانت کنکنائے، دو تین ہنکارے بھرے اور پھر میرے قریب آکر بڑے معنی خیز انداز میں پُوچھنے لگے، "کیوں میاں، وہ دوسرا مصرع کیا ہے اس کا کہ۔۔۔ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا؟"

میں نے کہا، "یہ غالب کے اُن چند شعروں میں سے ہے جو ایک ہی مصرعے میں مکمل ہو جاتے

ہیں۔ مثلاً اس وقت ایک اور غزل کا ایسا ہی ایک شعر گیر" مصرع مجھے بھی یاد آرہا ہے"۔

بولے: "کیا؟"

عرض کیا: "مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس"۔

کہنے لگے: "مگر اس میں تو زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشان کیے بغیر بات نہیں بنتی، آپ اس کی بجائے "اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ" سے کام چلا لیجیے"۔

ہماری یہ ذومعنی گفتگو شاید کچھ دیر اور جاری رہتی لیکن فلیش کے ایک ہلکے سے جھماکے نے توجہ اپنی طرف کرلی۔ معلوم ہُوا کہ ستارے فوٹو گرافی بھی کرتے ہیں!

رات کا کھانا اگرچہ شبّیر ہی کے گھر پر تھا مگر اُس نے ہمارے اعزاز میں بہت سے احباب کو بھی بلوا لیا تھا۔ فائزہ اور اس کی مصری شاہ، لاہور کی دیسی بھابی نے بہت مزیدار کھانے تیار کیے تھے جن سے اس قدر انصاف کیا گیا کہ چند ہی لمحوں میں ڈائننگ ٹیبل پانی پت کی تیسری لڑائی کا منظر پیش کرنے لگی اور خاتونِ خانہ کو مفرور مرہٹوں کی تلاش میں بار بار کچن کے چکر لگانے پڑے۔

مہمانوں میں ن م۔ راشد کے داماد راجہ فاروق حسن اور ان کی بیگم یاسمین راشد بھی شریک تھیں۔ فاروق حسن کو میں نے تقریباً اٹھارہ برس کے بعد دیکھا تھا۔ میرے اورینٹل کالج کے زمانۂ طالب علمی میں وہ غالباً گورنمنٹ کالج، لاہور میں پڑھایا کرتے تھے اور جیلانی کامران کے ساتھ مل کر آزاد نظموں کی ایک کتاب مرتّب کر رہے تھے۔ یہ تعارف یہیں تک محدود تھا اس لیے اُن کے مزاج، عادات اور شخصیت کے بارے میں میری معلومات بھی کم بیش اُتنی ہی تھیں جتنا وہ میرے بارے میں جانتے تھے مگر یہ ادب کا راستہ ایسا طلسم ہے کہ ایک پل میں زمان و مکان کی حد بندیوں کو تہس نہس کرتا ہُوا منظروں پہ شامیانے کی طرح تن جاتا ہے۔

سو اس کیس میں بھی یہی ہُوا اور چند لمحوں میں ہم اس طرح گھل مل کر باتیں کرنے لگے جیسے برسوں کی دوستی ہو۔ اُن کی بیگم میں راشد صاحب کی شباہت کے ساتھ ساتھ اُن کی مخصوص خودپسندی اور arrogance بھی نظر آئی۔ ممکن ہے وہ طبعاً کم آمیز اور کم گو ہوں۔

فاروق حسن نے بتایا کہ وہ یہاں کے ایک کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں اور بال بچے

پالتے ہیں۔ شاعری سے 'چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے' قسم کا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں کہ یہ کافر بھی مُنہ سے لگ جائے تو پھر جیتے جی چھُٹتی نہیں۔ انہوں نے اپنا مجموعۂ کلام مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ بعض بہت اچھی نظمیں تھیں۔ کئی اچھی نظمیں جیلانی کامران کے ہاں بھی ملتی ہیں لیکن دونوں احباب نامعلوم کیوں ادب میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جو اُن سے کہیں کمتر درجے کے شاعروں کو حاصل ہو گیا ہے۔ فاروق کتابوں اور رسائل کے ذریعے اُردو شعر و ادب میں ہونے والی تمام تبدیلیوں اور کارروائیوں سے باخبر تھے۔ انہوں نے مُنہ سے تو نہیں کہا مگر پتا نہیں کیوں مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ اندر سے بہت تنہا ہیں اور اُس مخصوص ثقافتی بُعد کے شکار ہیں جو مغرب میں ہر سوچنے والے مشرقی ذہن پر یلغار کیا کرتا ہے۔

فاروق حسن سے ملاقات کے علاوہ اُس رات کی تین اور باتیں قابلِ ذکر ہیں: ایک تو شبیر کے مہمان بھٹّی صاحب کا گانا جس میں اُن کا شوقِ شعر کے وزن اور موسیقی کی لَے سے بار بار باہر کو چھلک رہا تھا مگر مجال ہے جو اُن کے ماتھے پر کوئی شکن آئی ہو یا اُنہوں نے حاضرین کی مسکراہٹوں کا کوئی نوٹس لیا ہو۔ اُن کے اس بے محابا شوق پر مجھے حالی کا ایک شعر یاد آ گیا جو میں نے اُن کے کان میں سُنا دیا۔ حالی کو شعر کے برموقع اور برمحل ہونے سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ مجھے اُن کا شعر یاد تھا چنانچہ اس ایک شعر نے آئندہ کئی روز تک مجھے اُن کی 'بہت اچھی کتابوں' میں رکھا۔ شعر یہ تھا:

ہائے نومشق ادیبوں کا وہ اندازِ کلام!
اپنے مکتوب، ترے نام، کئی یاد آئے

بھٹّی صاحب نے مہدی حسن کی ایک غزل شروع کی۔ آواز اور طرز کی حد تک تو نقل کچھ میں آتی ہے مگر انہوں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے بھی مہدی حسن کی یاد اس طرح تازہ کی کہ ایک صاحب بے اختیار ہو کر بول اُٹھے: "سُبحان اللہ! اتنی تکلیف تو مہدی حسن کے چہرے پر نہیں ہوتی جتنی ماشاء اللہ بھٹّی صاحب کے مُنہ پر نظر آ رہی ہے۔"

آخر میں 'لٹھے دی چادر' کورس کی شکل میں گایا گیا اور ایسی ایسی بے سُری آواز کان میں پڑی کہ بھٹّی صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے اُستاد بڑے غلام علی خاں نظر آنے لگے۔

دوسری بات ایک صاحب کی بدحواسیاں تھیں جو اپنی فوٹوگرافی کے کمالات سے جملہ حاضرین کو آگاہ فرمانا چاہ رہے تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کمرے کے سارے فرنیچر کی کم از کم بیس مرتبہ تبدیلی کرانے کے بعد انہوں نے کل چار تصویریں اُتاریں اور اس دوران میں کوئی چھ مرتبہ کمرے کی ساری لائٹیں آف کروائیں کر روشنی اور سایے کے ذریعے کچھ خصوصی تاثرات پیدا کرنا چاہ رہے تھے۔ تنگ آکر میں نے ایک پُرانا لطیفہ قدرے تبدیل کر کے سُنایا جس سے اُٹھنے والے قہقہوں کے شور سے خدا خدا کر کے اُنہوں نے ہماری جان چھوڑی — میں نے کہا:

انہی صاحب (فوٹوگرافر) جیسے ایک فوٹوگرافر نے مردے کی تصویر اُتارنے کے لیے اُسے اتنی بار ہلایا جُلایا کہ جب تصویر کھینچتے وقت حسبِ عادت 'ذرا مُسکرائیے' کہا تو وہ مردہ سچ مُچ مُسکرانے لگا۔"

تیسری بات پروین کے پرس کی گمشدگی تھی جس میں اس کے سارے پیسوں کے ساتھ ساتھ پاسپورٹ، شمالی امریکہ کا اندرون ملک مکمل ٹکٹ اور ایئر فرانس کا واپسی ٹکٹ بھی تھا۔ ہوا یوں کہ رات ساڑھے بارہ بجے محفل کے اختتام پر پروین کرامت مرزا اور اُن کی فیملی کے ساتھ آفاق حیدر کی طرف چلی گئی کہ اُس کے قیام کا انتظام وہیں کیا گیا تھا۔ اس وقت پرس اس کے ہاتھ میں تھا۔ باہر برف بھی تھی اور برف باری بھی چنانچہ جب وہ مُنہ سر لپیٹ کر موٹر سے نکلی تو گھر کے اندر پہنچ کر اُسے پرس کی غیر موجودگی کا احساس ہُوا۔ باہر آدمی دوڑایا گیا۔ کرامت ابھی موٹر موڑ ہی رہے تھے چنانچہ وہیں روک کر تلاشی کا عمل شروع کیا گیا۔ ہر ممکنہ جگہ کو دو دو، تین تین مرتبہ چیک کیا گیا مگر وہاں پرس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کے بعد گاڑی کے باہر، اس کے رُکنے کی جگہ پر، آفاق حیدر کے دروازے تک کے سارے رستے پر، غرضیکہ ہر اُس جگہ بھی تلاش کیا گیا جہاں پرس کا ہونا ناممکن تھا۔ پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ موٹروں کی ہیڈ لائٹس اور ٹارچیں جلا کر برف کے طوفان میں سب لوگ "پرس، پرس" کرتے پھر رہے تھے۔ ٹکٹوں اور پاسپورٹ کی گمشدگی سے پیش آنے والے متوقع مسائل پر ایسی روح فرسا گفتگو کی گئی کہ پروین دہشت اور پریشانی کے سبب آبدیدہ ہو گئی۔ رات ڈھائی بجے پولیس کو فون کیا گیا کہ ٹکٹ کا غذات کی تیاری کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ دس منٹ کے اندر اندر پولیس کے متعلقہ لوگ پہنچ گئے۔ رپورٹ لکھی گئی۔ اس دوران میں تقریباً ہر آدمی نے ایک بار پھر موٹر کی تلاشی

لی۔ وہاں سے سارا قافلہ کوئی چار بجے کے قریب شبیّر کے گھر پہنچا کہ کہیں پرس وہیں نہ رہ گیا ہو۔ اُن تمام جگہوں کی جانچ پڑتال کی گئی جہاں اُس شام پروین بیٹھی، رکی، اُٹھی یا کھڑی ہوئی تھی۔ مہمانوں کی فہرست پر نظر دوڑائی گئی، اُن کے ماضی کے کارناموں اور چوری کرنے کی صلاحیت اور امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ مختلف مہمانوں کے نیچے اور اُن کی حرکات و سکنات زیرِ بحث آئیں مگر اس سارے عمل میں پروین کے پرس کا کوئی سُراغ نہ مل سکا۔ ہم نے اُسے بہت حوصلہ دیا کہ تم دُنیا میں پہلی مسافر نہیں ہو جس کا سامان گُم ہوا ہے اور یہ کہ مسئلے اسی لیے ہوتے ہیں کہ اُنہیں حل کیا جائے مگر اُس کے چہرے کی پریشانی اور آواز کی لرزش صاف کہے دے رہی تھی کہ ہماری باتیں وہ سُن تو شاید رہی ہے سمجھ بالکل نہیں رہی۔

بڑی مشکلوں سے اُسے حوصلہ وغیرہ دے کر واپس آفاق حیدر کے گھر بھیجا گیا کہ اب سو جاؤ، صبح دیکھی جائے گی مگر سچی بات یہ ہے کہ اندر سے ہم لوگ بھی بہت پریشان تھے کیونکہ پاسپورٹ کی گمشدگی کا تعلق نہ صرف پورے پروگرام میں بدنظمی سے بلکہ پروین کی شدید پریشانی سے بھی تھا جس نے اُسے حواس باختہ کر رکھا تھا۔

صُبح سوا سات بجے کے قریب فائزہ نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ کرامت مرزا کا فون آیا ہے، پروین کا پرس مل گیا ہے اور لُطف کی بات یہ ہے کہ اُسی گاڑی میں سے مِلا ہے جس کی اُن سمیت کم از کم بیس آدمی تلاشی لے چُکے تھے۔ پتا نہیں کیسے وہ سیٹ کے استر سے ہوتا ہوا اُس کے نچلے حِصّے میں ایسی جگہ چلا گیا تھا جہاں کسی کی نظر نہیں پڑ سکی۔ اب پروین کو اطلاع دینے کے لیے آفاق حیدر کی طرف فون کیا گیا۔ نمبر انگیج تھا۔ دوبارہ کوشش کی گئی جو اس کے بعد آئندہ ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ بستروں سے چونکہ ہم نکل ہی چُکے تھے اس لیے وہیں بیٹھے بیٹھے ناشتہ بھی فرمایا گیا اور یہ پُورے سفر کا غالباً پہلا ناشتہ تھا جو ناشتے کے صحیح اور شریفانہ وقت پر کیا گیا۔ نو بجے آفاق حیدر کے گھر سے کسی نے فون اُٹھایا۔ معلوم ہوا کہ پروین کے پرس کے بارے میں انکوائریوں سے تنگ آ کر ریسیور فون سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس دوران میں کرامت مرزا بمعہ پرس وہاں پہنچ چُکے تھے کیونکہ پروین کے ہنسنے کی آواز (جو عام حالات میں اُس کے قریب کھڑے ہونے پر بھی نہیں آتی) صاف سُنائی دے رہی تھی۔

گزشتہ دنوں میں کئی بار منتظمین کے، ہجوم میں ایک چھوٹے قد کے چست و چالاک اور گورے چٹے نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ موصوف کا نام رزاق ہے، آزاد کشمیر کے علاقے 'باغ' سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ کئی برس سے پڑھنے کے شوق میں مبتلا ہیں۔ آج کل میک گل یونیورسٹی میں سیاسیات پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں آج اُن کے ساتھ میک گل یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات جانے کا پروگرام تھا جس کے لیے عالی چار پانچ بہت وزنی قاموسیں پاکستان سے لے کر چلے ہوئے تھے۔

باہر نکلے تو برف بڑے زوروں سے پڑ رہی تھی۔ ہلکی ملگجی سی روشنی میں پورا شہر برف کا گولا بنا ہوا تھا۔ یونیورسٹی کیمپس پہنچے تو معاملہ اور زیادہ خراب ہو گیا کیونکہ اب برف کی جگہ تیز بارش نے لے لی تھی۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے پلٹے اور چمٹے ہوئے تیز تیز قدموں سے آ جا رہے تھے اور جگہ جگہ موٹریں دو دو فٹ گہری برف میں دھنسی کھڑی تھیں۔ رزاق نے گاڑی پارک کرنے کے لیے شعبہ اسلامیات کی عمارت کے گرد پورا چکر لگایا اور بالآخر ایک ایسی جگہ ڈھونڈ ہی نکالی جہاں برف دو فٹ سے ایک آدھ انچ کم تھی۔ لیکن اس 'عظیم دریافت' کا نقصان یہ ہوا کہ ہمیں تقریباً سو گز کھلے میں سے بھاگ کر جانا پڑا اور اس دوڑ کے دوران اندازہ ہوا کہ جسے ہم 'بے حیائی' سمجھ رہے تھے وہ اُسی طرح کے 'نظریہ ضرورت' کا نمونہ تھی جس کے تحت ہمارے یہاں ہر دوسرے چوتھے سال مارشل لا لگایا جاتا ہے۔

شعبہ اسلامیات کے سربراہ ڈاکٹر لٹل کا کمرہ کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا اس طرح کے پروفیسروں کا ہوا کرتا ہے۔ کتابوں سے بھری ہوئی کچھ الماریاں، ایک میز، چار پانچ کرسیاں اور ایک سفید بالوں والا سر۔ عالی اور ڈاکٹر لٹل میں چند منٹ لسانیات کے حوالے سے رسمی قسم کی نیم علمی گفتگو ہوئی جس کے بعد عالی نے اُسے انجمن ترقی اُردو کے کارناموں سے آگاہ کیا اور اُس مردِ شریف نے کتابوں کے تحفے کے لیے ہم سب کا شکریہ ادا کیا۔ یہ ساری کارروائی کوئی بیس منٹ میں ختم ہو گئی۔ ہم نے شیشوں والی بڑی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش نے دوبارہ برف سے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ ہم نے سو گز کی 'برف قدمی' کے بارے میں سوچا اور فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر لٹل سے مزید بات چیت کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ پتا نہیں عربوں کا کوئی ذکر تھا یا عربی زبان کا، میں نے محض گفتگو کی غرض سے فلسطینی مزاحمتی تحریک

اور اس کے عربی اور بین الاقوامی ادب پر اثرات کے بارے میں بات شروع کر دی۔ چونکہ میرے پاس اس گفتگو کے لیے زیادہ تر مواد اپنی ترجموں کی ایک کتاب "عکس" کا تھا اس لیے میں نے سید محمد کاظم صاحب کے لکھے ہوئے اس کتاب کے مقدمے کے حوالے سے صیہونیت اور اس کی تاریخ پر بڑی زور دار اور پُراعتماد گفتگو شروع کر دی۔ ڈاکٹر ٹل ایک دم ہمہ تن گوش ہو گیا اور بڑے دوستانہ اور مرعوبیت کے انداز میں مُسکرایا۔ مُجھے اور شہ مل گئی چنانچہ میں نے یہودی ذہن اور امریکی یہودی لابی کے حوالے سے اپنے بین المِلّی اسلامی جذبات کا بھی بھرپور مظاہرہ شروع کر دیا۔ اس دوران میں عالی نے کئی بار دانت کٹکٹائے اور ہنکارے بھرے مگر روانیِ تقریر میں مَیں نے اُن کی طرف توجّہ نہیں دی۔ اب جو دیکھتا ہُوں تو ڈاکٹر ٹل کی کشادہ مسکراہٹ سمٹ کر اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے میں پریشان سی کھڑی ہے۔ وہ بار بار کبھی بالوں میں ہاتھ پھیرتا اور کبھی اپنے کان کی لَو ملتا اور اُس کی گردن "یس، یس" کی نیم مردہ آوازوں کے ساتھ بہت آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ میں نے اپنی اینٹی یہودی تقریر ختم کرنے اور اپنے غم و غصّے کے بھرپُور اظہار کے لیے گفتگو کا آخری جُملہ تشکیل دینا شروع کیا:

"So you see, Dr. Little, these Jews... they are real...":

اس سے پہلے کہ میں کوئی "اسم صفت" استعمال کرتا عالی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا اور کھڑکی سے باہر پُر زور برف باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میرے خیال میں اب اجازت لیں۔ برف کا زور کچھ کم ہُوا ہے۔" ڈاکٹر ٹل کو یہ آئیڈیا اتنا پسند آیا کہ وہ ہم سے پہلے ہمیں الوداع کہنے کے لیے دروازے کی طرف چل پڑا۔

کمرے سے باہر آتے ہی عالی اور پروین نے میری کھچائی شروع کر دی اور مجھے پہلی بار پتا چلا کہ میں ایک اصلی اور نسلی یہودی کے سامنے اُس کی قوم کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں واقعی بہت شرمندہ ہوا لیکن جب عالی اور پروین کی ہوٹنگ زیادہ ہی بڑھنے لگی تو میں نے دفاعی پینترا بدلا اور ہنستے ہوئے کہا: "آپ کا کیا خیال ہے مجھے اس بات کا پتا نہیں کہ ڈاکٹر ٹل یہودی ہے! بھئی یہ نام تو ہونا ہی یہودیوں کا ہے۔ میں تو اصل میں بہانے بہانے سے اپنا غصّہ نکال رہا تھا —— ذرا ان کم بختوں کو بھی تو پتا چلے کہ ہم ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں ——"

اس کے بعد ایک ایسے بنگالی ہوٹل میں ایسی جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا گیا جہاں سے برف باری کا

منظر بہت دُور تک نظر آتا تھا یہاں سے پاکستانی قونصلیٹ گئے جہاں رزاق کے سسر اکنامک منسٹر تھے۔ واپسی پر ہم نے پروین کو آفر دی کہ ہم آفاق حیدر کے گھر سے اُس کا سامان اُٹھا لیتے ہیں کیونکہ اس طرح ہم تینوں ایک ساتھ ایئرپورٹ پہنچ سکیں گے مگر پروین بیگم کی پٹنے والی رگ پھڑک اُٹھی، بولی: "نہیں بھئی — اُن لوگوں نے انتظام کر رکھا ہے۔ آپ چلیں، ہم پہنچ جائیں گے!"

جہاز کے ٹیک آف میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے اور حالی کا پارہ ایک سو پندرہ ڈگری سے اُوپر کی طرف جا رہا تھا جب پروین دوڑتی، بھاگتی، ہانپتی، کانپتی، اُفتاں وخیزاں ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اُس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی بچّہ رونے کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہا ہو۔ ہم میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ جہاز میں سوار ہونے اور حفاظتی بیلٹ باندھنے کے بعد پروین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا چنانچہ اُس نے خود ہی بتانا شروع کیا کہ اُس کی تاخیر کی وجہ بلکہ وجوہات کیا تھیں۔

معلوم ہوا کہ کرامت مرزا صاحب نے (جن کے ذمے پروین کو ایئرپورٹ پہنچانا تھا) عین وقت پر فون کر دیا کہ اُن کی موٹر میں سٹوٹار نہیں ہیں اس لیے وہ یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکیں گے۔ کوئی اور موٹر موجود نہیں تھی — ہم لوگ بھی ایئرپورٹ کے لیے نکل چکے تھے — کسی اور منتظم سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا — وغیرہ وغیرہ وغیرہ .....

یوں مونٹریال کا قیام کم از کم پروین کی حد تک قطعاً خوشگوار نہیں تھا۔

ٹورنٹو-۲

ٹورنٹو ایئرپورٹ پر انصار اپنے اپنے مہاجرین کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میرے میزبان جمال زبیری چونکہ خود ڈرائیونگ نہیں کرتے اس لیے وہ عابد جعفری کو ساتھ لائے تھے۔ راستے بھر جمال صاحب نے پہلے تو اپنی مزاحیہ شاعری کی غرض و غایت، تاریخ اور پس منظر پر روشنی ڈالی اور اس کے بعد مشتے از خروارے کے طور پر کچھ کلام بھی سُنایا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اُس وقت مولانا چراغ حسن حسرت سے منسوب ایک واقعہ بہت یاد آیا:

مولانا حسرت کے پاس "امروز" کی ایڈیٹری کے دنوں میں سٹاف کا ایک آدمی کوئی مضمون بغرضِ اشاعت لکھ کر لایا۔ حسرت صاحب نے سارا مضمون پڑھا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں بولے:

"یہ کیا ہے ـــــ ؟ ـــــ مولانا!"

"مزاحیہ مضمون ہے جناب۔" مصنّف نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"تو اس کے ساتھ اُوپر لکھ دیجیے نا ـــــ تاکہ لوگوں کو پتا تو چل جائے۔"

جمال صاحب بڑے مزے کے آدمی ہیں، اُن میں سوائے اس کے کوئی خرابی نظر نہیں آئی کہ وہ اپنی "مزاحیہ" شاعری کو بہت سنجیدہ لیتے تھے۔

صُبح ناشتے کے دوران شکاگو سے افتخار نسیم کا فون آیا۔ معلوم ہُوا وہ اور عرفان صوفی بڑی شدّت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اس فون کا ایک فائدہ یہ ہُوا کہ لاس اینجلس سے لندن تک کے درمیان جو تین چار دن ابھی تک مسئلہ زیرِ بحث بنے ہُوئے تھے اُن کا فیصلہ ہو گیا۔ طے پایا کہ میں اور پروین شکاگو جائیں گے، عالی جی کچھ پُرانے دوستوں سے ملنے کے لیے پٹس برگ روانہ ہوں گے اور جعفری صاحب براہِ راست بمبئی کی فلائٹ پکڑیں گے۔ میں نے افتخار نسیم کو

اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور اس کے ساتھ ہی عرفان کو بھی فون پر اطلاع دے دی کیونکہ شکاگو اس سفر کے دوران میں پہلا شہر تھا جہاں قیام و طعام اور سیر و تفریح کا انتظام ہمیں خود کرنا تھا۔

ناشتے کے بعد جمال زبیری کے ساتھ اُن کے گھر کے قریب واقع ایک مقامی سٹور پر گئے جو اپنے طول و عرض، کشادگی اور اشیاء کی فراوانی کے اعتبار سے ہمارے یہاں کی بڑی بڑی مارکیٹوں کو شرماتا تھا۔ اگرچہ ہم برف میں سے چل کر آئے تھے مگر اندر درجہ حرارت ایسا خوشگوار تھا کہ ہم نے دو دو بار آئس کریم کھائی۔

دوپہر کو اختر آصف کے ساتھ ٹورنٹو کا سٹی ہال دیکھا جو بلا شبہ فنِ تعمیر کا ایک انوکھا شاہکار ہے۔ یہ عمارت ایک قوس کی شکل میں بنائی گئی ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہی مسجد، لاہور کے صحن کی طرح اس کے سامنے بھی ایک وسیع و عریض سنگی پلیٹ فارم نما میدان تھا جس کے ایک کونے میں سکیٹنگ کورٹ بنا ہُوا تھا جہاں کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں پاؤں میں سکیٹنگ شوز پہنے جیسے برف کے فرش پر اُڑتے پھر رہے تھے۔ اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز ان حسن کے نمونوں (models) میں کچھ تو ایسے تھے کہ ـــــ ارے رے رے ـــــ ارے رے رے رے ـــ ارے رے رے۔

سٹی ہال کے اردگرد کا علاقہ بہت گنجان آباد تھا لیکن ٹریفک میں سہولت کے لیے زیرِ زمین رستوں اور پارکنگ لاٹس کا بے حد معقول انتظام تھا چنانچہ شہر کی سڑکوں کے نیچے بھی اُتنا ہی ہجوم تھا جتنا ان کی سطح پر تھا۔ اُردو شاعری میں موت کے ساتھ زیرِ زمین ہونے کے جتنے مضامین ہیں سب کے سب وہاں انگشت بدنداں نظر آتے ہیں کیونکہ یہاں "صورتیں" خاک میں پنہاں ہونے کے بجائے وہاں سے نمایاں ہو رہی تھیں اور اس ضمن میں وہ "لالہ و گل" کا بھیس بدلنے کا تکلف بھی نہیں کرتی تھیں۔

ایسے ہی ایک مقام پر، جہاں زیرِ زمین راستے سے لوگ نکل کر سڑک پر آ رہے تھے، آتش کا ایک شعر بہت یاد آیا:

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف
قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا!

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے قارون اپنے خزانوں سمیت زیرِ زمین سفر کرتا ہُوا کولمبس سے پہلے یہاں پہنچ چُکا تھا۔

ایک بہت بڑے شاپنگ مال میں ایک طرف آٹھ دس سینما ہال بنے ہوئے تھے جنہیں عرفِ عام میں منی تھیٹر کہا جاتا ہے۔ ہر تھیٹر میں تقریباً دو سو سیٹیں ہوتی ہیں۔ ایک ٹکٹ خرید لیں اور اپنی پسند کی فلم والے تھیٹر میں بیٹھ کر مزے سے جب تک جی چاہے فلم دیکھیں کیونکہ فلم مسلسل چلتی رہتی ہے۔ اگر آپ فلم کے وسط میں آئے ہیں تو اس کے ختم ہونے پر وہیں بیٹھے رہیے، ذرا سے وقفے کے بعد فلم دوبارہ شروع ہوگی اور یوں آپ فلم کا نادیدہ حصہ اُسی ٹکٹ میں دیکھ سکیں گے۔ یہاں ہم نے ایک سائنس فکشن دیکھا، نام تھا : Terminator- اس میں بتایا گیا تھا کہ ۲۰۲۹ء میں ہماری دنیا کس حال میں ہوگی! مستقبل سے سفر کر کے خیر و شر کی قوتیں ایک روبوٹ نما مشینی اور ایک گوشت پوست کے انسان کی شکل میں آج کے زمانے میں آتی ہیں۔ روبوٹ، جو کہ ہر لحاظ سے ایک ناقابلِ تسخیر مشینی مخلوق ہے، اپنی ساخت کے اعتبار سے حقیقی انسانوں جیسا ہے جس کے پاس دماغ بھی ہے اور جس کا مشن یہ ہے کہ وہ انسانوں کے اس عظیم انبوہ میں سے اُس لڑکی کو تلاش کر کے ختم کر دے جس کے پیٹ سے وہ بچہ پیدا ہونے والا ہے جو کرہ ارض کو تباہی سے بچانے کا باعث ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بچہ، جو مستقبل میں ایک جوان آدمی بن چُکا ہے، زمین پر آتا ہے اور اس کے بعد قتل و غارت اور فلم کی لیبارٹری تکنیک کا ایک ایسا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے جو جدید ایکشن فلموں کا مخصوص انداز ہے۔ فلم کی کہانی میں fantasy کا استعمال الف لیلوی کہانیوں سے کم نہیں تھا۔ وہاں جادوگروں کی جان طوطوں میں ہوا کرتی تھی جس پر سوائے ہیرو کے تیر کے اور کوئی تیر نہیں لگتا تھا اور یہاں وِلن کمپیوٹر کے بھیس میں تھا جس کی زد سے کہانی کی ہیروئن اور ہیرو کے سوا پُوری دُنیا غیر محفوظ تھی۔

خیر و شر کی اس ازلی اور ابدی کشمکش میں خیر کی فتح یوں ہُوئی کہ متعلقہ خاتون روبوٹ کی تمام تر کوششوں کے باوجود حاملہ ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ کہانی کا انجام البتہ بہت خوبصورت اور معنی خیز

تھا: مستقبل سے آئے ہوئے دونوں کرداروں کی ہلاکت کے بعد لڑکی اپنے بہت واضح پیٹ کے ساتھ ایک دُور دراز ریگستانی علاقے کے پٹرول پمپ پر دکھائی جاتی ہے جہاں پٹرول بھرنے والا میکسیکن لڑکا گرد آلود آسمان کی طرف دیکھ کر اُس سے کہتا ہے کہ طُوفان آنے والا ہے ـــــ اور جواب میں لڑکی پہلے اپنی طرف اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی ہے: "ہاں ـــــ مجھے پتا ہے"۔

میں نے سوچا جب یہ فلم پاکستان میں ریلیز ہوگی تو لاہور کے زندہ دل تماشائیوں کے مخصوص گروہ میں سے یقیناً کوئی یہ مشہور فقرہ دُہرائے گا: "بس کہانی ہی کہانی ہے ـــــ سٹوری کوئی خاص نہیں اس فلم کی"۔

اگلے روز اختر آصف اور عابد جعفری نے ہمیں لینے آنا تھا۔ معلُوم ہوا عابد کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اس لیے وہ ہسپتال چلا گیا ہے۔ طے یہ پایا کہ پہلے اُس کی تیمارداری کی جائے۔ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ موصُوف راستے ہی میں مل گئے۔ عابد کو پیٹ میں السر کی شکایت تھی جس کی وجہ سے اکثر اُسے گیس کی تکلیف رہتی تھی۔ میری زوجہ بھی اس مرض کے پُرانے مدّاحین میں سے ہے چنانچہ اس موضُوع پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ کھُلا یہ کہ کم از کم اس میدان میں میڈیکل سائنس ہمارے حکیموں کی "تبخیری گولیوں"، "پھچورنوں"، "کاسوری" اور "کارمینا" وغیرہ وغیرہ کے قدم بقدم چل رہی ہے۔ ایک اسی طرح کی دیسی دوائی کے نام گیس گو (Gas Go) پر ہم بہت دیر تک ہنستے رہے کہ انگریزی کے ان دو لفظوں سے یہ ترکیب شاید صرف ہمارے یہاں ہی بن سکتی تھی میڈیکل سائنس کا تذکرہ چلا تو کسی نے ایک بہت دلچسپ واقعہ سُنایا:

چند برس قبل "ہارٹ اٹیک" کے موضوع پر ایک ریسرچ شایع ہوئی جس میں اس کے ہر پہلو پر بہت تفصیل سے بحث کی گئی تھی۔ ایک صاحب سے اس پر رائے مانگی گئی تو انہوں نے بہت سوچ سوچ کر جواب دیا: "اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فِنِٹس کے زیادہ استعمال سے ہارٹ اٹیک ہوتا ہے اور کم استعمال سے کینسر"۔

عابد کی طبیعت ابھی تک مکمل بحال نہیں ہوئی تھی مگر اس نے بستر میں پڑنے کی بجائے ہمارے ساتھ گھومنے کو ترجیح دی۔ میری فرمائش پر اس نے اپنی کچھ غزلیں سنائیں جس سے دو فائدے ہوئے یعنی ہم نے کچھ اچھے شعر سُنے اور عابد کے پیٹ کا اُپھار ختم ہوگیا۔

جمال زبیری حسبِ معمول اپنی بلند، بھاری اور گونجیلی آواز کے ساتھ اختر آصف کو ایسے شارٹ کٹ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے جن کے بارے میں اُن کی اپنی معلومات ہر لحاظ سے بے حد ناکافی اور مشکوک تھیں اور لُطف کی بات یہ ہے کہ راستے کے غلط ہو جانے کے احساس کے بعد بھی اُن کی آواز اور لہجے میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی تھی۔ ایک غلط موڑ کٹوانے کے بعد وہ تقریباً دو میل تک اس شُبہے کا اظہار کرتے رہے کہ اُن کا فیصلہ صحیح تھا یہ سڑک کے اردگرد کی عمارتیں کسی غلط فہمی کی وجہ سے وہاں آگئی ہیں! اس ساری کو ملبیشنٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایٹن سٹور کے جس حصّے میں ہم نے افتخار عارف اور اشفاق کو سہ پہر تین بجے ملاقات کا وقت دیا تھا وہاں ہم شام کے ساڑھے پانچ بجے پہنچے۔ جائے مقررہ پر آئس کریم کھانے کے دوران جمال صاحب بڑی سنجیدگی سے اشفاق اور افتخار پر غائبانہ تنقید کرتے رہے کہ اُن لوگوں کو وہیں رُک کر ہمارا انتظار کرنا چاہیے تھا، کومٹمنٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے!

اختر آصف اُس روز بہت خوش تھا۔ معلوم ہُوا کہ اُس کی بیوی کا لاٹری میں انعام نکل آیا ہے جس کی مالیت چار پانچ ہزار ڈالر کے لگ بھگ ہو سکتی ہے۔ دو دن پہلے مانٹریال جاتے ہوئے اُسے ڈیڑھ سو ڈالر جُرمانے کے ٹکٹ ملے تھے اور اس کے ساتھ ہی اُس کے بارہ ڈرائیونگ پوائنٹس میں سے دس پوائنٹ کٹ گئے تھے جو ایک انتہائی خطرناک بات تھی۔ آئندہ تین برس تک اُسے صرف دو پوائنٹس پر چلنا تھا کیونکہ اُس کے بعد تین سال کے لیے ڈرائیونگ لائسنس معطل کر دیا جاتا ہے جس کا کم از کم امریکہ اور کینیڈا کی زندگی میں صریحاً مطلب مفلوج ہو جانا ہے۔ اختر آصف نے بتایا کہ سات برس میں یہ اُس کا پہلا چالان اور پہلا ہی انعام ہے اور اتفاق کی بات ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ دو ہی دن میں یکے بعد دیگرے سامنے آئے ہیں۔

اسی گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ بیگم اختر آصف کی چند ماہ پہلے open heart surgery ہوئی ہے اور انعام کی یہ خبر اُن کے اُس ڈیپریشن کو کم کرنے کا باعث ہوئی ہے جو ٹریفک چالان کے نتیجے میں اُن پر طاری تھا۔

امریکہ اور کینیڈا میں کبھی کبھار کے سلسلہ وار حادثوں (chain accidents) کو چھوڑ کر، جن میں کسی ایک تیز رفتار کار کے اچانک رُکنے کی وجہ سے پیچھے آتی ہوئی کاریں ایک

دوسرے سے ٹکراتی چلی جاتی ہیں، ٹریفک کے حادثوں کی اوسط ہمارے یہاں کی سڑکوں سے بہت کم ہے اس کی وجوہات اچھی کشادہ اور ہموار سڑکیں، ٹریفک سگنل، بہتر گاڑیاں اور سست رفتار ٹریفک کی عدم موجودگی بتائی جاتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سب سے زیادہ ہاتھ اُن بارہ ڈرائیونگ پوائنٹس کا ہے جو ہر لائسنس یافتہ ڈرائیور کو دیے جاتے ہیں۔ ٹریفک قانون کی ہر خلاف ورزی پر جرم کے مطابق نقد جرمانے کے ساتھ ساتھ ان میں سے کچھ پوائنٹس بھی کاٹے جاتے ہیں اور اگر یہ ختم ہو جائیں تو تین سال تک ڈرائیونگ لائسنس معطّل ہو جاتا ہے۔ اب اُس تیز رفتار زندگی میں موٹر ایک ایسی مجبوری نما ضرورت بن چکی ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تمام کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے سو ہر کوئی اِن پوائنٹس کو بچائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور یوں حادثات کی شرح پر ایک خود کار قسم کا کنٹرول قائم رہتا ہے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ قانون بنانے والوں سے قانون توڑنے والے زیادہ عقل منداور تخلیقی ذہن کے مالک ہوتے ہیں تو یہ کچھ غلط نہیں کہا جاتا۔ وہاں کے لوگوں نے اس صُورتِ حال سے بچنے کے لیے طرح طرح کے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ مثلاً اختر آصف کے کیس میں اُس کے وکیل نے اُسے یہ مشورہ دیا کہ تم اپنا کیس مونٹریال کے بجائے ٹورنٹو کی عدالت میں منتقل کروالو اور جواز یہ بناؤ کہ تمہاری بیوی کی اتنی خطرناک سرجری ہوئی ہے اور تم اُسے اِس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ عدالت نے یہ درخواست مان لی تو تمہارے سارے کٹے ہوئے ڈرائیونگ پوائنٹس بحال ہو جائیں گے کیونکہ زیادہ تر کیسوں میں دوسرے علاقے کا متعلقہ پولیس آفیسر عدالت میں پیش نہیں ہوتا اور چونکہ اس کیس میں دوسری تاریخ نہیں پڑتی اس لیے عدالت اپیل کنندہ کے حق میں یک طرفہ فیصلہ دے دیتی ہے۔

واپسی پر کچھ دیر اختر آصف کے اپارٹمنٹ میں رُکے۔ مزیدار چائے پی اور ٹورنٹو ٹیلی وژن کے اُس پروگرام کی ریکارڈنگ دیکھی جس میں ہم سب مہمانوں کے انٹرویوز دکھائے گئے تھے۔ اختر آصف کا گھر بھی اُسی کی طرح خوبصورت اور دھیمے سُروں والا تھا۔

رات کا کھانا ٹورنٹو کے معروف اُردو ہفت روزے "پاکیزہ انٹرنیشنل" کے ایڈیٹر صبیح الدین منصور کی طرف سے تھا۔ اس تقریب کا اہتمام اُنہوں نے کشمیر ہوٹل میں کیا تھا۔ وطن سے بارہ ہزار میل دُور

یہ نام دیکھ کر مجھے اپنا چوک. برف خانے والا کشمیر ہوٹل بہت یاد آیا. جو فلیمنگ روڈ اور ریلوے روڈ کے سنگھم پر واقع تھا اور جس کی ایک پہچان مُبارک پینٹر کا نام ہوتا تھا جس کے بڑے بڑے بورڈ مختلف جگہوں پر آویزاں تھے اور جو خود پتا نہیں کب سے اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔

اب نہ وہاں وہ ہوٹل ہے نہ وہ بورڈ اور نہ مُبارک پینٹر ـــ اللہ۔ اللہ۔ اللہ!

ہوٹل کا سٹاف دو تین پاکستانی نوجوانوں پر مشتمل تھا جو آقا اور ملازم کی تمیز سے بے نیاز مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اُن میں سے ایک خوش پوش سے نوجوان نے بار بار میری طرف کچھ بہت مانوس مسکراہٹیں ارسال کیں جن کی طرف لوگوں کے ہجوم اور میل ملاقات کے شور کی وجہ سے میں توجہ نہ دے سکا۔ تقریروں اور جوابی تقریروں کے بعد جب کھانا شروع ہُوا اور لوگ ایک دوسرے سے زیادہ اپنی اپنی پلیٹوں کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ میرے پاس آیا اور اُسی مانوس مسکراہٹ کے ساتھ بولا: "آپ نے مجھے پہچانا نہیں ؟ میں آپ کا پُرانا محلّے دار ہوں۔"

میں نے دوبارہ غور سے اس کی طرف دیکھا، ذہن اور یادداشت پر زور دیا مگر اُس سے ملتی جُلتی صُورت کہیں نظر نہ آئی۔ اُس نے غالباً میرے تاثر کو بھانپ لیا تھا، بولا "یہ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ میں فلاں صاحب کا داماد ہوں اور میری بیوی آپ سے پڑھتی بھی رہی ہے۔"

"فلاں صاحب" کے حوالے سے مجھے یاد آیا کہ بی اے کے دنوں میں مَیں اپنے کزن کے ایک دوست کی دو بیٹیوں کو کچھ دن پڑھاتا رہا تھا مگر یہ بات پورے بیس برس پُرانی تھی۔ اُس وقت وہ بچیاں دس دس گیارہ گیارہ برس کی تھیں اور اُس کے بعد سے میں نے اُنہیں آج تک دیکھا بھی نہیں تھا چنانچہ اُن کے شوہروں کو تو کیا اگر وہ خود میرے سامنے آجائیں تو شاید میں انہیں بھی پہچان نہ پاتا۔ اس کے بعد وہ اپنے بارے میں بتانے لگا کہ وہ یہاں کب سے ہے، کیسے آیا اور اب اُسے کیا مسائل درپیش ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے محلّے سے متعلق دکانوں، لوگوں، مکانوں اور دوسری مختلف چیزوں کو یاد کرنے لگے۔ اس دوران میں نہ معلوم کب پروین ہمارے قریب آ کھڑی ہوئی اور ہماری باتیں سُننے لگی۔ اچانک میری نظر اس پر پڑی، میں نے کہا:

"نہیں ہماری باتیں سمجھ نہیں آئیں گی۔ یہ ٹھیٹھ لاہوری پنجابی ہے، اصل والی" بولی: "میں وی چھ مہینے لاہور رہی آں۔"

میں نے کہا: "جس طرح میرا من کو اُردو دلی کا روڑا بن کر آئی تھی اسی طرح پنجابی بھی غیروں سے بے تکلف ہونے میں وقت لیتی ہے۔"

بولی: "پنجابی زبان کا تو مجھے پتا نہیں البتہ پنجابی لوگ تو اس اُصول پر عمل نہیں کرتے۔"

جملہ برجستہ بھی تھا اور زوردار بھی اس لیے میں نے کھسک جانے میں اپنی عافیت سمجھی اور ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ریجس سیموئل سے گفتگو کرنے لگا جو ۱۹۵۰ء میں پاکستان سے یہاں آئے تھے اور اُس وقت کے لوگوں کے بارے میں مُجھ سے اس طرح پوچھ رہے تھے جیسے ہم سب اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔

اس شام کی سب سے دلچسپ بات عالی کے گُردے کی پتھری کا اخراج تھا جس کے بارے میں وہ کئی برسوں سے پریشان تھے اور حالیہ چیک اپ سے پہلے تک بلکہ آج صُبح تک اس سے ہونے والی تکلیف بلکہ تکالیف کا ذکر بڑے پُرسوز لہجے میں کر رہے تھے۔ اب معلوم ہُوا کہ اس پتھری کو ٹوٹ کر خارج ہوئے کئی مہینے ہو چُکے ہیں۔ عالی نے کہا: "اس خوشی میں مَیں دو سو ڈالر تک خرچ کرنے کو تیار ہوں مگر یہ آفر آج رات بارہ بجے تک ہے۔" ہم نے کہا:

"یہ تو فاؤل ہے عالی جی کیونکہ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے ہیں اور باہر برف پڑ رہی ہے۔ کھانا ہم پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں۔ آپ اس مدت میں توسیع کیجیے۔" بڑی مشکلوں سے عالی نے اس مدت میں ایک دن کا اضافہ کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کل رات تک اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو پھر جُرمانے میں ہماری طرف ڈالر نکلنے شروع ہو جائیں گے۔ سو طے یہ پایا کہ اس رقم کا مصرف کل نیاگرہ آبشار کی سیر کے دوران سوچا اور عمل میں لایا جائے گا۔

آٹوا سے چلتے وقت ڈاکٹر انور نسیم نے دو عدد خالی ٹیپ مُجھے اور پروین کو دیتے ہوئے فرمائش کی تھی کہ ہم اس پر اُن کے لیے اپنا "کلام بلاغت نظام" ریکارڈ کر دیں تاکہ وہ بعد میں اسے سُنتے اور سر دُھنتے رہیں۔ اگلی صُبح میں نے اپنی کتابیں کھولیں اور نظمیں غزلیں ریکارڈ کرانا شروع کیں۔ ایک گھنٹے کی اس مشقت کے بعد جب میں نیچے ڈرائنگ رُوم میں آیا تو بیگم زبیری کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار پائے۔ کہنے لگیں:

"میں دو تین بار آپ کو ناشتے کے لیے کہنے گئی تھی مگر آپ کے کمرے سے عجیب عجیب آوازیں

آرہی تھیں سو میں پلٹ آئی۔ خیریت تو تھی ؟" میں نے انور نسیم کی فرمائش کا احوال سُنایا تو جمال بے طرح ہنسنے لگے، بولے :

"بھئی ہماری بیگم صاحبہ تو بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ بار بار مجھ سے کہتی تھیں :

لے میاں — ذرا پتا تو کرو، کہیں ہمارے مہمان کا دماغ تو نہیں چل گیا !"" بیگم جمال ذرا جھینپ گئیں مگر میں نے انہیں حوصلہ دیا کہ اس میں آپ کا قصور نہیں۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتا۔ اب پتا چلا کہ غالب نے 'کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے' کیوں کہا تھا۔"

نیاگرا کی سیر کے لیے پروگرام بننا شروع ہوا تو یکے بعد دیگرے بہت سی پارٹیاں میدان سے بھاگ گئیں۔ سردار جعفری اور عالی نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا، عابد جعفری، اختر آصف، جمال زبیری اور خالد سہیل بھی کسی نہ کسی وجہ سے تیار نہ ہو سکے۔ لے دے کے پروین، میں، اشفاق اور بزمی صاحب رہ گئے۔ پروین نے اشفاق کی بیگم نرجس کو ساتھ چلنے کے لیے تیار کر لیا چنانچہ بزمی صاحب بھی غائب شدگان کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

مجھے اشفاق کے ٹریول ایجنسی والے دفتر پہنچنا تھا اور جمال صاحب میرے گائڈ تھے۔ اُنہوں نے مشورہ دیا کہ بس اور زیرِ زمین چلنے والی سب وے ٹرین کے ذریعے سفر کیا جائے۔ چنانچہ پہلے مرحلے میں اُن کے گھر سے نزدیک واقع بس سٹاپ سے بس پکڑی گئی۔ آرام دہ اور خوبصورت بس کے داخلی دروازے کے ساتھ ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے ایک خودکار قسم کا ٹکٹ کاؤنٹر سا بنایا گیا تھا جس میں مطلوبہ کرایہ ڈالنے پر ٹکٹ مل جاتا تھا۔ اس ٹکٹ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ ایک ہی ٹکٹ سے بس چھوڑ کر سب وے میں بیٹھ سکتے تھے اور پھر جہاں سے جی چاہے دوبارہ بس میں سوار ہو سکتے تھے۔ یہ سہولت غالباً اس لیے رکھی گئی تھی کہ بس اور سب وے کے رُوٹس میں جو فرق ہے اُس کی وجہ سے مسافروں کو تکلیف نہ ہو۔ اس پر مجھے وطن عزیز کی دھواں اُڑاتی، شور مچاتی، کھانستی اور لڑکھڑاتی ہوئی ٹینک شکن بسیں بہت یاد آئیں جن میں سوار ہونا اور سفر کرنا زندگی میں جہنم کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ بس میں ہمارے قریب ایک سردار جی بھی بیٹھے تھے جو بار بار ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے بات کرنے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے ہوں مگر آفرین ہے جمال صاحب پر کہ اُنہوں نے اپنی گفتگو کے درمیان وقفہ نام کی کوئی چیز آنے ہی نہیں دی۔

ایک بار وہ سانس لینے کے لیے ذرا سا رُکے تو میں نے سردار جی کی طرف اشارہ کر کے ایک بہت مزیدار لطیفہ جڑ دیا۔ لطیفے کے اختتام پر انہوں نے کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر کیے بغیر اپنا جملہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے میں نے کاٹا تھا۔ لطیفہ البتہ یوں تھا:

ایک سردار صاحب ہانپتے کانپتے، پسینے میں شرابور گھر میں داخل ہوئے۔ بیوی نے پوچھا: "خیر تو ہے، آج آپ دفتر سے دو گھنٹے لیٹ آئے ہیں؟"

سردار جی نے ناراضگی سے کہا: "یہ سب تمہاری مہربانیاں ہیں۔ میں نے صبح تمہیں کہا بھی تھا کہ میری شلوار کا نالہ (ازار بند) گندا ہو رہا ہے، اسے بدل دو۔"

بیوی نے کہا: "میں بھول گئی تھی مگر اُس نالے کا تمہاری تاخیر اور حالت سے کیا تعلق ہے؟"

سردار جی نے سر جھٹک کر کہا: "تعلق یہ ہے کہ میں دفتر سے نکل کر بس میں بیٹھا، تھوڑی دُور بس چلی پھر رک گئی اور کلینر میرے قریب آ کر بلند آواز میں بولا: 'گندے نالے کی سواریاں اُتر جائیں۔' اب تمہی بتاؤ میں کیا کرتا؟ مجبوراً وہاں سے پیدل آنا پڑا۔"

اشفاق جس ٹریول ایجنسی میں کام کرتا تھا اُس کا نام Big Ben تھا۔ اس سے میرا دھیان فوراً اپنے لاہور کے عزیز دوستوں محمود قریشی اور اُستاد اختر کی طرف گیا جو انارکلی میں بگ بین واچ کمپنی کے نام سے گھڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں اور پنجابی محاورے کے مطابق اپنے 'جگر جان' ہیں۔ ایجنسی کی مالکہ زمبابوے کی رہنے والی ایک ہندو خاتون تھی جس کے بارے میں اشفاق نے بتایا کہ وہ کاروباری معاملات میں بہت تیز اور ہوشیار ہے۔ میں نے خاتون کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے کہا: "یہ تو خود چلتی پھرتی 'معاملہ بندی' ہے۔"

اشفاق نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی کی: "ذرا احتیاط سے۔ اس کی اُردو کمزور ہے لیکن نظر بہت تیز ہے۔"

پروین کو گیتو کے لیے کچھ شاپنگ کرنا تھی، ہمیں بھی صبح فون پر بیوی بچوں سے بات کرنے کی وجہ سے خاصا 'گھریلو' ہو رہا تھا سو ہم نے بزمی صاحب کی موٹر مختلف پیکٹوں اور بنڈلوں سے اس طرح بھر دی جیسے پاکستان پہنچتے ہی جنرل سٹور کھولنے کا پروگرام ہو۔ اس سارے عمل میں وقت تیزی سے گزرتا گیا اور شام کے چار بجے ہم نے نیاگرہ کا رُخ کیا جو اگرچہ وہاں جانے کے لیے انتہائی

احمقانہ وقت تھا مگر چونکہ اس کے بعد کوئی اور وقت نکلنے کا امکان نہیں تھا اس لیے ہم نے اس حماقت کو یہ سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کر لیا کہ اگر دوستوں کو یہ پتا چلا کہ ہم نیاگرہ سے پچاس میل کے فاصلے پر آٹھ دس دن رہ کر آئے ہیں اور ہم نے آبشار نہیں دیکھی تو وہ ہمیں بہت ذلیل و خوار کریں گے۔

حسبِ توقع آبشار تک پہنچتے پہنچتے شام رات میں گڈمڈ ہو چکی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے درختوں کی شاخوں پر جمی ہوئی برف اُڑ اُڑ کر سوئیوں کی طرح چہروں پر لگ رہی تھی۔ باقی جسم اور ہاتھ اگرچہ ڈھیر سارے گرم کپڑوں کی پناہ میں تھے لیکن سردی کچھ اس طرح سے مزاج پوچھ رہی تھی کہ پروردگار کا شکر ادا کرنے کے لیے بھی مُنہ کھولنا محال ہو رہا تھا:

کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا!

نیاگرا آبشار کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس میں کسی قسم کا اضافہ بہت مشکل ہے اور پھر جس وقت اور موسم میں ہم نے اس کی زیارت کی وہ ہر لحاظ سے اس قدر نامعقول تھے کہ اصولاً آبشار کو ہم سے پردہ کر لینا چاہیے تھا لیکن فطرت کے حسنِ بے پروا کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ اپنی موج میں مست رہتا ہے، اُسے نہ چشمِ بینا کی پروا ہوتی ہے اور نہ چشمِ تماشائی کی بلکہ وہ تو نظرانداز کرنے والوں سے بھی کوئی گلہ نہیں کرتا۔ اشفاق نے بتایا کہ یہ آبشار انسان اور فطرت کی مشترکہ کاوش ہے یعنی ایک نیم قدرتی قسم کا معجزہ ہے۔ اس قدر بلندی سے یکدم پانی کا اس نشیب میں گرنا ایک قدرتی عمل ہے لیکن انجینئرز نے اس کے کناروں کو ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رکھنے، اس کے حُسن میں اضافہ کرنے اور اسے سیاحوں کے لیے زیادہ دلچسپ بنانے کی خاطر یہاں کچھ تبدیلیاں کی ہیں جس سے آبشار کے مقام، محلِ وقوع اور شکل و صُورت میں خاصا فرق پڑ گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا ایک حصّہ امریکی ریاست بفیلو میں واقع ہے۔ ایک پُل کے ذریعے دونوں ملکوں کو ملا دیا گیا ہے۔ گویا اس وقت ہم امریکہ سے walking distance پر کھڑے تھے۔ اشفاق نے بتایا کہ نیاگرا کا زیادہ خوبصورت حصّہ چونکہ کینیڈا کی طرف واقع ہے اس لیے امریکہ کی طرف سے آنے والے سیّاح بھی عام طور پر پُل پار کر کے اِدھر آ جاتے ہیں۔

آبشار سے کافی فاصلے پر ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہو کر کم روشنی میں ہم نے اس کے حُسن کو

دیکھنے کی کوشش کی۔ دُور کہیں سے کچھ روشنیاں پانی کی اُس عظیم جھالر پر ڈالی جا رہی تھیں جو ایک پُرشور اور قدرے وحشت انگیز آواز کے ساتھ کئی سو فٹ گہرے نشیب میں گر رہی تھی۔ پانی کی اس دیوار کے پس منظر میں چکراتی ہوئی روشنیوں کے درمیان بے شمار آبی پرندے پتا نہیں کسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ شاید اُنہیں بھی اُسی حسنِ ازل کی تلاش تھی جس کے اس سحر انگیز رُوپ نے میرے دل کو ایک ایسے عجیب و غریب احساسِ ممنونیت، بے بسی اور روشنی سے بھر دیا تھا جس کے اظہار کے لیے میرے پاس کوئی لفظ اور استعارہ نہیں ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں وہیں کہیں برف کے کسی ڈھیر پر بیٹھ جاؤں اور اپنے اس گمشدہ وجود سے کلام کروں جو سازِ ازل سے ایک نغمے کی طرح پھوٹا تھا اور جس کی گونج میرے باطن سے لے کر نیاگرا آبشار کے اس شور تک پھیلی ہوئی ہے۔ میں گُم سُم سا وہاں کھڑا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد کسی نے مجھے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو جیسے سارا طلسم ایک لمحے میں ٹوٹ گیا۔ ہوا سے لہراتی ہوئی ایک برف پوش شاخ میرے چہرے سے ٹکرائی اور میں نے دیکھا کہ اشفاق کا چار سالہ بیٹا صفی ہم سب اور سردی سے بے نیاز پوز بنا کر تصویر اُتروا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر نیاگرا آبشار اور اُسے بنانے والے کے درمیان کی کئی گمشدہ کڑیاں جیسے جُڑتی چلی جا رہی تھیں۔

رات کا کھانا بیدار بخت کے ہاں تھا۔ جمیل الدین عالی نے (جن کا اپنا تعلق غالب کے سسرالی خاندان لوہارو سے ہے اور جو دہلی اور دہلی والوں کے مستند محقق ہیں) بتایا کہ بیدار بخت مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کی اولاد سے ہیں اور اس حوالے سے 'شہزادے' ہوتے ہیں۔ بیدار بخت پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں اور بھارتی مسلمانوں کے اس محدود گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں باقاعدہ خوش حال کہا جا سکتا ہے۔ اُن کی بیگم اینتا ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہیں۔ بیٹی کا نام نتاشا ہے۔ اس کم عمری میں ہی کتھک اور کلاسیکل رقص میں خاصی مہارت رکھتی ہے۔ خوش رُو، خوش مزاج اور ذہین بیدار بخت نے ایک اچھے اور مہذب میزبان کی طرح ہمارے دیر سے پہنچنے کو اس طرح درگزر کیا جیسے ہم وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گئے ہوں۔ کمرے کے ایک کونے میں فرش پر کچھ گاؤ تکیے لگے تھے اور بہت سی روشنیوں کے درمیان علی سردار جعفری پر ایک وڈیو فلم بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے اور پروین کو بھی گفتگو کرنے والے پینل میں بٹھا دیا گیا۔ مختلف ادبی

نظریات کے حوالے سے ترقی پسند ادب اور پھر اس حوالے سے علی سردار جعفری کے خیالات، نظریات، عمل اور کومٹ منٹ کے حوالے سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ ایک سوال یہ پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں لمحۂ موجود کی شاعری سے کیا مراد ہے؟ ترقی پسند ادیب کے حوالے سے آپ لوگ، جو مستقبل کے نقیب ہیں، اس مسئلے کو کس طرح سے دیکھتے ہیں؟"

جعفری صاحب گفتار کے مردِ میدان ہیں اور دلیل دینے اور کاٹنے کا ہنر جانتے ہیں چنانچہ اُنہوں نے بڑی مہارت سے پہلے تو اس سوال کو خوب اُلجھایا اور پھر اپنی مرضی کے موڑ پر لا کر ایک ایسا گول مول بیان دیا جس میں سوال کے جواب کے علاوہ ہر چیز موجود تھی۔

اُنہوں نے میرا بائی کے بھجنوں کے اپنے کچھ تراجم بھی سُنائے جو بہت اچھے تھے۔ ریکارڈنگ کے خاتمے پر میں نے ایک مترجم کا واقعہ سُنایا جس نے حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور کی ایک مجلس میں ہیر وارث شاہ کے انگریزی ترجمے کے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ ترجمہ بے حد ناقص، غیر تخلیقی اور گمراہ کُن تھا چنانچہ حاضرین نے اُن کے بہت لتّے لیے۔ مترجم صاحب نے ساری تنقید سُننے کے بعد اپنے قریب بیٹھے ہوئے کسی صاحب سے کہا:

"بھئی اب اگر وارث شاہ انگریزی میں آکر expose ہو گیا ہے تو میں اس میں کیا کر سکتا ہوں؟"

جعفری صاحب نے ہنس کر کہا: "یہ گویا آپ مجھ پر چوٹ کر رہے ہیں"۔ میں نے کہا: "نہیں، آپ کے ترجمے واقعی بہت اچھے ہیں۔ البتہ ان میں میرا بائی کتنی ہے؟ یہ ہندی اور میرا بائی کو جاننے والے ہی بتا سکتے ہیں!"

ترجموں سے بات چلتے چلتے پتا نہیں کیسے عبدالعزیز خالد تک پہنچ گئی۔ خالد صاحب نے گزشتہ چند برسوں میں ہوچی مِنہ، ماؤزے تنگ، سیفو، ٹیگور اور پتا نہیں کس کس کے منظوم اُردو ترجمے کیے ہیں۔ اُن کی اپنی نظموں میں مختلف زبانوں پر عبور کا جو مظاہرہ ہوتا ہے اُس سے بھی اہلِ ادب بخوبی واقف ہیں۔ ایک بار ایک محفل میں، جو خالد صاحب کے ترجموں کی کسی کتاب کے بارے میں تھی، سیّد ضمیر جعفری نے ایک بہت مزیدار جملہ اپنے مضمون میں لکھا:

"خالد صاحب کے اِن خوبصورت ترجموں کو دیکھ کر ہمارا جی چاہتا ہے کہ انہیں یہ مشورہ دیں کہ

اب کچھ وقت نکال کر وہ اپنی نظموں کا بھی اُردو میں ترجمہ کر ہی ڈالیں"

کھانے کے بعد جعفری صاحب نے تمام حاضرین کو کاغذ قلم تھماتے ہُوئے کہا کہ ہر آدمی غالب کے پانچ ایسے شعر لکھے جو اُسے سب سے زیادہ پسند ہوں۔ غالب جیسے شاعر کے حوالے سے صرف پانچ شعروں کا انتخاب بہت مشکل تھا لیکن جعفری صاحب نے ہمارے اصرار کے باوجود تعداد میں اضافہ نہیں کیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے یہ پانچ شعر لکھے تھے :

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا!
واماندگیِ شوق، تراشے ہے پناہیں

پوچھو ہو کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے

پُھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں!
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ہر نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں!
حیف ہے اُن پر جو کہویں: "زندگانی مفت ہے"

پتا نہیں اس آزمائش سے جعفری صاحب کا کیا مقصد تھا مگر اس بہانے غالب کے چند بے مثال شعروں کی یاد پھر سے تازہ ہو گئی جو آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہونے تک برقرار رہی۔ واپسی پر مجھے وڈیو فلم کے کیمرہ مین اور پروڈیوسر عبداللہ کھنڈوانی کی موٹر میں بیٹھنا تھا جس کا ایک دروازہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ ہم لوگ بیدار بخت کے گھر کے باہر برآمدے میں کھڑے تھے کیونکہ اُس سے آگے

اُوپر نیچے اور دائیں بائیں ہر طرف برف ہی برف تھی۔ بیچارے کھنڈوانی ڈِگی میں سے مختلف اوزار نکال نکال کر اس ناہنجار دروازے پر آزما رہے تھے۔ مجھے مصحفی کا ایک شعر یاد آگیا :

بھلا دُرستیِ اعضائے پیر کیا ہووے
کہ جیسے رسّی سے ٹوٹا کواڑ باندھ دیا

بیدار بخت نے کہا کہ آپ رات یہیں رہ جائیں۔ میں جمال صاحب کو فون کر دیتا ہوں یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ دونوں باتیں قابلِ قبول نہیں کیونکہ ایک تو یہ کہ آپ نے صُبح صُبح پاکستان کے لیے روانہ ہونا ہے، دوسرے یہ کہ جمال صاحب کا گھر یہاں سے کم از کم پون گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ عبداللہ کھنڈوانی صاحب نے جس محبّت سے مجھے لِفٹ دینے پر اصرار کیا تھا اس کا تقاضا ہے کہ اب اس مُشکل گھڑی میں اُن کا ساتھ دیا جائے۔

میں اگرچہ ٹیکنیکل مسئلوں میں بالکل صفر ہوں، بجلی کا فیوز تک نہیں لگا سکتا، لیکن وہ جو ہم پاکستانیوں، خصُوصاً پنجابیوں کو، ہر فن مولا بننے کا شوق ہے اُس کے باعث میں بھی ہر چہ بادا باد کہہ کر روئی کے گالوں جیسی مسلسل برف میں کود پڑا۔ ایک دو بار دروازے کو ہلایا جلایا اور پھر زور سے بند کیا، کھٹاک کی ایک آواز آئی اور دروازہ بند ہو گیا۔

کھنڈوانی نے اسے زور سے ہلا کر دیکھا اور مسرّت بھری چیخ کے ساتھ بولا : "یہ تو سچ مُچ بند ہو گیا ہے۔" دو تین بار دروازے کو کھول اور بند کر کے دیکھا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں کبھی کوئی خرابی تھی ہی نہیں۔ کھنڈوانی نے تعریفی نظروں سے میرے پھیلتے ہوئے جسم کو دیکھا اور اپنے مخصوص گجراتی لہجے میں کہا : "ہم نے آج تک ایسا strong poet نہیں دیکھا۔"

میں نے اپنی اور اپنی شاعری کی تعریف میں اس طرح کا معصُوم اور نوکیلا جملہ کبھی نہیں سُنا تھا لیکن چونکہ کوئی اور سُننے والا نہیں تھا اس لیے پی گیا اور کہا کہ یہ سب دیسی گھی کی طاقتیں ہیں۔

"دیسی گھی کی طاقتیں ؟ مطلب نہیں سمجھا ہم . . . ."

میں نے کہا : "اب اس کا مطلب سمجھنے کے لیے آپ کو ایک عدد لطیفہ سُننا پڑے گا۔"

بولے : "سُناؤ۔ سناؤ۔ سناؤ۔ ہم تو خود joke مارنے کا بہت شوقین ہے۔" میں نے پہلے

تو اُسے دیسی گھی کے کوائف اور خصوصیات سے آگاہ کیا اور پھر بتایا: "ایک دیہاتی دیسی گھی کا کنستر یعنی ڈبہ لے کر پہلی بار ریل گاڑی میں سوار ہوا۔ ڈبہ رکھنے کے لیے جگہ ڈھونڈی، نہیں ملی تو اُسے گاڑی روکنے والی زنجیر کے ساتھ لٹکا دیا۔ ڈبے کے بوجھ سے زنجیر کھنچ گئی، گاڑی رُکی، چند لمحوں بعد ریلوے کا عملہ پہنچ گیا۔ دیہاتی کو بِلا ضرورت گاڑی رکوانے کے جُرم میں پچاس رُوپے جرمانہ ہوگیا۔ دیہاتی نے جُرمانہ تو ادا کردیا مگر بار بار خوشی سے ہنستا اور فخر سے مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولا: دیکھا اصلی گھی کی طاقتیں ــــــ ٹرین روک دی ہے۔"

اگلی صُبح ابھی دروازۂ خاور پُوری طرح کُھلا بھی نہیں تھا کہ جمال زبیری صاحب نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ کہنے لگے ہملٹن سے آپ کے لیے کسی اختر نواز صاحب کا فون ہے۔

"ہملٹن سے اختر نواز؟" میں نے حیرت سے پُوچھا۔

"یہی نام بتایا ہے۔" جمال صاحب نے اپنی گونجیلی آواز میں کہا۔

"میں شاعر اختر آصف اور کرکٹر سرفراز نواز کو جانتا ہوں۔ ہملٹن کے بارے میں بھی اتنا معلوم تھا کہ یہ ٹورنٹو کے قریب ہی واقع ایک شہر ہے جہاں ہماری سابقہ ہیروئن اور حالیہ گلوکارہ مسرت نذیر رہتی ہے لیکن ان سب چیزوں کا یہ combination اس وقت میرے لیے بالکل نیا تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے فون اُٹھایا۔ اُدھر سے آواز آئی: "میں اختر نواز بول رہا ہوں، واہ کینٹ والا۔"

اختر نواز سے گزشتہ تین چار برسوں سے واہ فیکٹری والوں کے سالانہ مشاعرے میں ملاقات ہوتی ہے جہاں وہ تعلقاتِ عامہ کے شعبے کا بڑا افسر ہے۔ معلوم ہوا کہ موصُوف آرڈیننس فیکٹری کی طرف سے مصر اور سپین کی اسلحہ نمائشوں میں پاکستانی وفد کے ساتھ آئے تھے اور اب چند دنوں کے لیے یہاں اپنے بھائی کے پاس رُکے ہوئے ہیں۔

اختر بڑا کُھلا ڈُلا اور مزیدار آدمی ہے۔ شاعروں اور شاعری دونوں کا رسیا ہے۔ کہنے لگا کہ مُلاقات آج ہی ہونی چاہیے اور جب تک آپ یہاں ہیں مسلسل ہوتی رہنی چاہیے۔ مجھے اپنا ایڈریس سمجھائیں، میں، بھائی اور گاڑی لے کر آرہا ہوں۔

میں نے کہا: "ایڈریس تو تمہیں میرے میزبان جمال زبیری صاحب سمجھائیں گے البتہ اُن

سے صرف جگہ کا پتا پُوچھنا، راستہ پُوچھا تو ہوسکتا ہے وہ تمہیں کسی اور شہر میں پہنچا دیں۔"

لیکن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جمال صاحب نے پہلے اختر نواز کو راستہ بجھانے کی کوشش کی، جب وہ اچھی طرح کنفیوز ہوگیا تو اُس کے بھائی لیاقت سے مذاکرات شروع کیے جو تقریباً دس منٹ تک جاری رہے، اس دوران میں اتنے "رائٹ اور لیفٹ" ٹرن آئے کہ حلقہ اربابِ ذوق میں ہونے والی نظریاتی بحثیں بھی ماند پڑ گئیں۔

لیاقت نے بتایا کہ وہ کیچوؤں کا کاروبار کرتا ہے۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ کیچوے مچھلیاں پکڑنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں لیکن یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ اس کے سب سے بڑے گاہک میک اپ کا سامان تیار کرنے والے کارخانے ہیں۔ عورتوں کی آرائش، خوبصورتی اور دلکشی میں کیچوؤں کی شمولیت کا تصور ایسا عجیب اور غیر متوقع تھا کہ میں کئی سیکنڈ تک حیرت سے لیاقت کا مُنہ دیکھتا رہا۔ گویا لب و رخسار کی ساری خوش نمائی اور آرائش کے پیچھے اصل میں کیچوے حضرات کلبلا رہے ہیں، لاحول ولا قوۃ!

لیاقت کچھ اور تفصیلات بتانا چاہ رہا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔

ایک دفعہ شفیق الرحمٰن صاحب نے گراؤچو مارکس کے حوالے سے ایک نسائی تشکیلات کی حامل مہمل نظم سُنائی تھی جو کچھ یوں تھی:

I use to adore a sinora,
Once I heard her snora,
I adora no mora.

حسین عورتوں کے خراٹے تو شاید برداشت ہو سکتے ہیں لیکن یہ تصور کہ سُرخی، پوڈر، کریم، شیمپو اور لوشن سب میں کیچوؤں کا خونِ ناحق شامل ہے، بہت ہی حوصلہ شکن تھا۔ میں نے اختر نواز سے کہا:

"ذرا سوچو اگر غالب آج کے زمانے میں ہوتا اور اُس حقیقت سے آگاہ ہوتا، جو ابھی ابھی مجھ پر آشکار ہوئی ہے، تو یہ شعر کس طرح کہتا:

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یُوں
بوسے کو پُوچھتا ہوں میں، مُنہ سے مجھے بتا کہ یُوں

غالباً وہ کچھ اس طرح کی ترمیم کرتا:

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے ہی دکھا کہ یُوں
بوسے کو اپنے پاس رکھ، ویسے مجھے بتا کہ یُوں"

پُورے سفر کے دوران یہ پہلا دن تھا جب میں نے حسین سے حسین چہرے پر بھی دوسری نظر نہیں ڈالی۔

لیاقت ہمیں ٹورنٹو کے planetarium کے سامنے ڈراپ کرکے چلا گیا کہ آپ لوگ نیچرل ہسٹری اور سائنس کے اس میوزیم کے مزے لُوٹیں اور میں ذرا اپنے ٹیکچوؤں کے بزنس کی مزاج پُرسی کر آؤں۔

داخلہ ٹکٹ کے کاؤنٹر پر ایک عفیفہ، جسے ضعیفہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، انتہائی گہرے میک اپ سے مزیّن چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے اختر نواز کے کان میں کہا: "میرا خیال ہے یہ کم از کم چار کیچوؤں کا خرچہ ہے!" "زیادہ۔" اختر نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے آپ یہ تبصرہ باآوازِ بلند بھی کر سکتے ہیں، اسے اُردو نہیں آتی۔"

بڑی بی نے ٹکٹوں کے ساتھ پلینٹوریم سے متعلق کچھ معلوماتی بروشر بھی ہمارے حوالے کیے اور ایک اور کاؤنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اگر ہم کچھ سووینیرز وغیرہ خریدنا چاہیں تو ہماری خدمات کے لیے وہاں عملہ موجُود ہے۔ یہ عملہ ایک ایسی ضعیفہ پر مشتمل تھا جس کے سامنے پہلے والی کل کی بچّی معلوم ہو رہی تھی۔

یہ عمارت غالباً ہم جیسوں کو حیرت اور احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ زمین کی تہوں سے لے کر خلاء کی وسعتوں تک کون سی چیز ایسی ہے جس کا مستند اور قابلِ فہم حوالہ یہاں موجُود نہیں! ہم نے ایک چھوٹے سے ہال میں بیٹھ کر اُس کی چھت پر بنا ہوا مصنوعی ستاروں اور سیّاروں کا جال دیکھا جو ہُوبہُو ہمارے نظامِ شمسی کا replica تھا۔ ہمارے علاوہ وہاں دس سے بارہ برس کی عمر تک کے بہت سے بچے تھے۔ معلوم ہُوا وہ سب کسی سکول سے آئے ہیں اور یہ اُن کی پڑھائی کا حِصّہ ہے۔ ستاروں کی سیر کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جواب دینے والا ایک بیس بائیس سالہ نوجوان تھا جس کی آواز میٹھی، آنکھ ذہین، لہجہ دوستانہ اور گفتگو

انتہائی واضح اور معلومات افزا تھی۔ یہ اس کا روز کا کام تھا مگر نہ اس کے ماتھے پر بیزاری اور یکسانیت کی شکن تھی اور نہ ہی اس کے انداز میں وہ رسمی پن تھا جو عام طور پر ہمارے پروفیسروں کے لیکچروں میں پایا جاتا ہے۔

ہم کچھ "بکے بکے" سے باہر نکلے۔ ہمارے پاؤں تو زمین پر تھے مگر اس 'خلانوردی' کے باعث ذہن کچھ ڈانواں ڈول سا ہو رہا تھا۔ میں نے اختر نواز کی طرف دیکھا، وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک بڑے ہال میں پانچ سے سات برس تک کی عمر کے "بچے" ایک ایسے انسانی مجسمے کے گرد جمع تھے جس میں انسانی جسم کے اندرونی نظام کی مکمل میکانکی تصویر موجود تھی۔ ایک پانچ سالہ 'ڈاکٹر کرسچین برنارڈ' انسانی دل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا اور ایک نوجوان سائنس گریجویٹ اسے اس خضوع و خشوع اور سنجیدگی کے ساتھ دل کے مختلف فنکشن سمجھا رہا تھا جیسے سلیکشن بورڈ کے سامنے اس کی پہلی پہلی پیشی ہو۔ میں نے سوچا، جس معاشرے میں پانچ سال کے "بچے" کو وہ باتیں سمجھا دی جاتی ہوں جن کا شعور ہمارے یہاں شاید (ماہرینِ طب کے علاوہ) لوگوں کو عمر کے آخری حصے تک نہیں ہوتا تو پھر وہ چاند پر کمندیں نہیں ڈالے گا تو اور کیا کرے گا!

جب سے ٹورنٹو آئے تھے سی این ٹاور کا ذکر بار بار سُنا تھا کہ یہ جدید فنِ تعمیر کا حیرت انگیز شاہکار ہے اور اس وقت دُنیا کی بلند ترین عمارت ہے جس کی کل بلندی پانچ سو تریپن میٹر ہے یعنی تقریباً تین فرلانگ کا زمینی فاصلہ عمودی رُخ پر استادہ کر دیا گیا ہے۔ بڑی بڑی لفٹیں سیاحوں اور سیر بینوں کو لے کر مسلسل آمد و رفت میں مصروف رہتی ہیں۔ پانچ سو بیالیس میٹر کی بلندی پر ایک گھومنے والا ریستوران ہے جو تقریباً ایک گھنٹے میں اپنا "چکر" مکمل کرتا ہے۔ اس ریستوران میں صرف داخلے اور ایک ڈرنک کی فیس اٹھارہ ڈالر تھی۔ کھانا کھانے کا موڈ ہو تو پینتیس ڈالر مزید۔ اختر نواز کے بھائی لیاقت نے بتایا کہ ٹکٹ خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے' کے حوالے سے یہاں دوستوں نے کچھ مقامی طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اُس نے ہمیں ریستوران سے ایک منزل نیچے لفٹ سے اُتارا اور 'ابھی آیا' کہہ کر ایک سیڑھیوں والے دروازے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک خوبصورت نوجوان کے ساتھ آیا جس نے اگرچہ ویٹرز کی وردی پہن رکھی تھی مگر اس

وردی کی قیمت ہم تینوں کے لباسوں کی مجموعی قیمت سے زیادہ تھی۔ اُس نے اکبر علی کہہ کر اپنا تعارف کروایا۔ معلوم ہوا موصوف اسماعیلی ہیں۔ آدھا خاندان ہندوستان میں ہے اور آدھا پاکستان میں۔ خود نیروبی میں پیدا ہوئے تھے اور پوری دنیا گھومنے کے بعد آج کل اس ہوٹل میں بطور ہیڈ ویٹر ملازم ہیں اور ہوٹلنگ کے بہت سارے کورس بھی کر رکھے ہیں۔

اکبر نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک اور دروازہ آیا جہاں سے انواع واقسام کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ معلوم ہوا یہ ہوٹل کا کچن عرف مطبخ ہے اور ہم یہیں سے گزر کر ہوٹل میں داخل ہوں گے۔ مجھے یہ طریقہ اچھا نہیں لگا۔ اکبر علی نے شاید میرے چہرے سے میری دلی کیفیت کو پڑھ لیا تھا مسکرا کر بولا: "فکر نہ کریں اس چور دروازے سے داخل ہونے والے آپ پہلے آدمی نہیں ہیں، یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔" "پھر بھی . . . . میں نے متذبذب سے لہجے میں کہا: "اگر اس ہوٹل میں بیٹھنا اتنا ہی ضروری ہے تو ہم . . . میرا مطلب ہے . . ."

"مطلب وطلب کچھ نہیں بھائی صاحب . . . . . ان سالوں نے بھی تو لُوٹ مچا رکھی ہے . . . . . آپ آرام سے بیٹھیں۔"

اکبر علی کی میمن انداز کی اُردو اور ہوٹل کے ماحول کا کچھ ایسا خوشگوار اثر ہوا کہ ناجائز داخلے کا احساس جُرم آرنج جُوس کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی ہوا ہو گیا۔ اکبر علی نے قریبی میز پر بیٹھی ہوئی ایک بی بی کی طرف اشارہ کیا جو بڑے انہماک سے پکچر پوسٹ کارڈ پر کچھ لکھ رہی تھی۔

اگر میری ڈیوٹی ختم ہونے تک اس کو کوئی کھانا کھلانے والا نہ ملا تو معلوم ہوتا ہے آج میرا خرچہ ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ یہ سیاحوں کے اُس مخصوص طبقے سے تعلق رکھتی ہے جو شام کے بعد پلے سے کچھ خرچ نہیں کرتے ــــ خُوب پیٹ بھر کے کھاتے پیتے ہیں، حق نمک ادا کرتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔" "مگر . . . . اکبر صاحب . . . . یہ تو بڑی معقول اور well to do قسم کی خاتون دکھائی دیتی ہے ؟" "ارے بھائی ادھر سب چلتا ہے۔" اس نے بڑی بے تکلفی سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک بار پھر اُس بی بی کا جائزہ لیا: عمر تیس پینتیس برس، صورت معقول، صحت

کے علاوہ معقول تر لباس۔ انداز، میک اپ، دستی بیگ سب میں سلیقے اور تموّل کی جھلک۔ میں نے یقین نہ کرنے کے انداز میں اکبر علی کی طرف دیکھا۔ اُس نے ایک چیمپین کی سی بے نیازی کے ساتھ میرے تذبذب پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر بغیر کچھ کہے پڑوسن کی میز کی طرف مڑ گیا۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہُوا، کرسیاں نزدیک تر ہوئیں اور اس سے پہلے کہ میرا آرنج جوس کا گلاس ختم ہو اکبر علی، اکبرِ اعظم بن چکا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے اٹھا اور چار بہت خوبصورت گلاس لے کر آیا۔ معلوم ہوا یہ تحفہ عموماً تین سو ڈالر سے زیادہ کا بل دینے والے گاہک کو ہوٹل کی طرف سے بطور یادگار پیش کیا جاتا ہے۔ دو گلاس اس نے مجھے دیے اور بقیہ دو اس عزیزہ کو پیش کیے جو اُس وقت تک سارے پکچر کارڈ وغیرہ بھول کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

لیاقت نے بتایا کہ اکبر علی صرف دو تین برس پاکستان رہا ہے مگر اسے پاکستانیوں سے بہت محبت ہے اور وہ اُن کا خصوصی خیال رکھتا ہے۔ پنجابی کے بہت سارے لطیفے اس کو یاد ہیں۔ پاکستانی فلمسٹار ندیم اور شبنم سے اس کی بہت دوستی ہے اور ایک بار اُس نے ہندوستانی اداکاروں ونود مہرہ اور شترو گھن سنہا کو ہوٹل سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ اُن دونوں نے نشے کی حالت میں اس کے ساتھ بد کلامی کی تھی۔

دیوار گیر شیشوں کے اُس پار شام رات کو رستہ دے رہی تھی۔ اکا دکا ستارے چمک رہے تھے۔ میں نے اُس بلندی سے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ ٹورنٹو کا شہر کسی فلم کے سیٹ کی طرح ایک ڈمی معلوم ہو رہا تھا۔ لمبی لمبی امریکن کاریں ڈِنکیوں کی طرح رینگ رہی تھیں اور تیس تیس چالیس چالیس منزلہ عمارتیں وحدت کالونی کے فلیٹوں جیسی دکھائی دے رہی تھیں۔ یگانہ کا ایک شعر بہت یاد آیا:

بلند ہو تو کھُلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

میں نے سوچا اس ذرا سی بلندی سے جب مجھے یہ چیزیں اتنی چھوٹی اور بے وقعت نظر آ رہی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کو یہ دنیا کتنی نظر آتی ہو گی؟ اور پھر اس دنیا میں جرثوموں کی طرح کلبلاتے ہوئے انسان، اور پھر ان انسانوں کے دلوں میں بکھری ہوئی آرزوئیں، حسرتیں، نفرتیں اور پتا نہیں کیا کیا..... بے وقعتی کے ایک گھمبیر اور شدید احساس نے میری رُوح میں ڈیرا جمانا شروع کر دیا

تھا۔ ایلیٹ کی ایک ہی نظم کی دو مختلف لائنیں جیسے ہر منظر پر سُپر امپوز ہونے لگیں :

I have measured my life with coffee spoons.

I have seen horror in a handful of dust.

خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا۔ اکبر علی اُس بی بی کو ہماری میز پر لے آیا تھا۔ باہر ستاروں کی تعداد اور چمک بڑھ گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی ستارے دمک رہے تھے مگر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اکبر علی نے خاتون سے ہمارا اور ہم سے اُس کا تعارف کرایا اور شاید کچھ مزیدار باتیں بھی کیں کیونکہ وہ لوگ بار بار ہنس رہے تھے مگر مجھ پر اُداسی کا وہ مخصوص حملہ شروع ہو چکا تھا جو گزشتہ کئی برسوں سے ہر سال ایک یا دو بار ہوتا ہے اور ہفتوں جاری رہتا ہے۔ مجھے نہ اس عورت سے کوئی دلچسپی رہی تھی اور نہ اکبر علی کی باتوں سے۔ شاد نے چپکے سے کان میں سرگوشی کی :

اسیرِ جسم ہیں، میعادِ قید نامعلوم
رہا یہ وہم، کہ ہم ہیں، سو وہ بھی کیا معلوم

کسی شیشے کے برتن کے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی اور اسی کے درمیان سے کہیں میر صاحب دھیرے سے بولے :

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات !
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

غالب نے میرے بھاری ہوتے ہوئے کندھوں پر ایک دوستانہ تھپکی دی اور بلا شیری کے انداز میں کہا :

گُل، غنچگی میں، غرقۂ دریائے رنگ ہے
اے آگہی، فریبِ تماشا، کہاں نہیں ؟

اپنے اشفاق احمد خاں کے 'بابوں' سے لے کر کیپ کینیڈی کے سپیس سنٹر تک گمان اور عقل کی جلتی بجھتی شمعوں میں روشنی کہاں ہے اور دھواں کس طرف ! اور یہ دونوں چیزیں ہیں بھی یا نہیں ؟ اس ازلی اور ابدی سوال کے تحیّر میں گم نجانے کس وقت ہم لوگ وہاں سے اُٹھے اور کس طرح اُس ٹاور سے نیچے آئے، مجھے کچھ یاد نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ نیچے کھُلے میں ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور

ہمیں زمین پر پاؤں جمانا دشوار ہو رہا تھا۔

ٹورنٹو میں شاعروں کی تعداد اس قدر بڑھ چکی ہے کہ تین چار گھنٹے کا مشاعرہ تو وہ لوگ مقامی وسائل ہی سے ترتیب دے سکتے ہیں اور شاعر بھی وہاں ہر طرح کا ہے: کلاسیکی، نیم کلاسیکی، جدید، جدید تر، جدید ترین اور جدید ترین تر۔ چنانچہ باوزن، بے وزن اور کم وزن۔ ہر طرح کے شعر سننے کو ملے۔ ایک صاحب نے جوش کے انداز کی ایک بہت گھن گرج والی نظم سنائی جس میں وزن کی ہر کمی کو جوشِ خطابت سے پُر کیا گیا تھا۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک مقامی دوست نے سرگوشی کی:

"جس طرح انسانوں کے اوسان خطا ہوتے ہیں اُسی طرح ان کی نظموں کے اوزان خطا ہوتے ہیں"۔ میں نے اس رعایتِ لفظی پر انہیں دل کھول کر داد دی مگر کچھ دیر بعد جب انہوں نے اپنی غزل سنائی تو اُس کے اوزان بھی باقاعدہ خطا تھے۔ اپنی سیٹ پر واپس آ کر انہوں نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جی تو بہت چاہا کہ سچ بولوں مگر مروت آڑے آ گئی اور میں نے مجبوراً ہجوِ ملیح کا سہارا لیتے ہوئے کہا:

"ماشاء اللہ! بڑی اَدق بحر چُنی ہے آپ نے!"

اس مشاعرے کا بنیادی مقصد چونکہ یہی تھا کہ مقامی شاعر مہمانوں کو اپنا کلام سنا لیں اور یوں اگلے روز ہونے والے مشاعرے میں مہمانوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا جا سکے اس لیے ہم لوگ زندگی میں پہلی بار "سامعینِ خصوصی" کے طور پر کسی محفل میں شریک ہوئے۔ پروین کو پتا نہیں کیسے ایک بھولا بھٹکا شعر یاد آ گیا جو ہم نے کئی برس پہلے فیصل آباد کے ایک مشاعرے میں گھڑا تھا، کہنے لگی:

"امجد بھائی ... دوسرا مصرعہ کیا تھا اُس شعر کا کہ

آ جائے کہیں پھر نہ وہ مہمانِ خصوصی"۔

میں نے کہا: "دوسرا مصرعہ تو یہی ہے جو تم نے پڑھا ہے البتہ پہلا کچھ یوں تھا:

رکھے ہوئے سر پر کئی دیوان خصوصی"

مشاعرے کے بعد کرنل انور احمد کے گھر پر کھانا تھا جہاں سردار جعفری کو اُن کی سالگرہ کے حوالے سے تحفہ پیش کیا گیا اور ہم سب سے رُوپہلے اور سنہرے مارکروں سے مختلف یادگاروں پر

دستخط کروائے گئے۔ انور احمد صاحب کی شخصیت میں جو سلیقہ، رکھ رکھاؤ اور grace تھی اس کے تو ہم پہلے ہی قایل ہو چکے تھے مگر اب اُن کی محبت، علم دوستی، کتاب بینی اور جدت پسندی کے جوہر بھی آشکارا ہوئے۔ وہ عقیدتاً قادیانی ہیں اور غالباً یہی اُن کے ترکِ وطن کی بنیادی وجہ بھی ہے مگر بطورِ انسان وہ ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے انسان ہیں اور اُن جیسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اپنے معاشرے کی اس مذہبی گھٹن اور خانقاہی جنونی سنگھیت سے مزید نفرت پیدا ہوتی ہے جس نے اسلام جیسے روشن خیال اور زندہ مذہب کو ایک بوسیدہ، فرسودہ اور انسان دشمن نظام میں بدل دیا ہے۔

مذہب کے حوالے سے اگرچہ میں ذاتی طور پر اکبر الہ آبادی کے اس نظریے کا قایل ہوں:

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مگر اس کے باوجود کبھی کبھی میں مرمر کی ان سلوں کے مجاوروں سے اس قدر ناخوش و بیزار ہو جاتا ہوں کہ خوامخواہ جھگڑنے کو جی چاہتا ہے۔ ابنِ انشا نے "اُردو کی آخری کتاب" میں ایک جگہ دائرے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایک دائرہ اسلام کا بھی ہوتا ہے۔ پہلے اس میں لوگوں کو شامل کیا جاتا تھا آج کل خارج کیا جاتا ہے۔"

یہاں میری ملاقات شاعرہ نزہت صدیقی سے بھی ہوئی۔ وہ بھی قادیانی تھی۔ اس کی گفتگو میں اس حوالے سے بہت زیادہ تلخی تھی۔ میں نے اُسے کہا:

"دیکھو بی بی، پاکستان میں چند مخصوص لوگوں کو چھوڑ کر، جن کا پیشہ ہی فی سبیل اللہ فساد ہے، کوئی بھی تمہارے وجود اور بقا کا دشمن نہیں۔ اس معاشرے میں اگر عیسائی، بُدھ، ہندو، سکھ، دہریے اور پارسی رہ سکتے ہیں تو تم لوگ کیوں نہیں رہ سکتے؟"

جواب میں نزہت نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ مجھے مجبوراً اُسے منیر نیازی کا ایک پنجابی شعر سُنانا پڑا جو اتنا واضح اور مؤثر تھا کہ نہ صرف اس سے گفتگو کا رنگ بدل گیا بلکہ نستعلیق اُردو اہلِ زبان کی سمجھ میں بھی فوراً آگیا:

کج اُنج وی راہواں اوکھیاں سن، کج گل وچ غم دا طوق وی سی!
کج شہر دے لوک وی ظالم سن، کج مینوں مرن دا شوق وی سی

اس شعر میں اگر کچھ کا، کے، کی تبدیل کر لیے جائیں تو یہ سیدھا سیدھا اُردو کا شعر بھی بن سکتا ہے:

کچھ یوں بھی راہیں مشکل تھیں، کچھ گلے میں غم کا طوق بھی تھا
کچھ شہر کے لوگ بھی ظالم تھے، کچھ ہمیں موت کا شوق بھی تھا

شعر کا ترجمہ شعر میں کیا جائے تو مفہوم سے ماورا، جو ایک زبان کا اپنا لُطف ہوتا ہے وہ عام طور پر رہ جاتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس ترجمے میں بھی وہ 'لطفِ خاص' رہ گیا ہے مگر کا، کے، کی کے حوالے سے صُوفی تبسم مرحوم کا ایک بہت پُر لطف جملہ یاد آگیا:

صُوفی صاحب گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان میں بطور ماہر کے بھی ملازم رہے۔ کسی نے اُن سے اُن کے کام کی صحیح نوعیت اور تفصیل پوچھی تو صُوفی صاحب نے اپنے میرے جیسے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "میں یہاں کا، کے، کی ٹھیک کرتا ہوں۔"
اب مشکل یہ ہے کہ اس کا، کے، کی سے لُطف اندوز ہونے کے لیے پنجابی کا اہلِ زبان ہونا ضروری ہے یعنی یہاں بھی ترجمے سے بات نہیں بنے گی۔

انور احمد کے گھر عبدالرحیم انجان سے ایک بار پھر ملاقات ہُوئی۔ ان کی زبانی معلوم ہُوا کہ فیض احمد فیض مرحوم جب بھی ٹورنٹو آتے تھے اُنہی کی طرف قیام کرتے تھے اور اُن کی آخری آمد کے موقع پر تو انجان صاحب کو پُورا ایک مہینہ اُن کی میزبانی کا شرف حاصل ہُوا۔ کسی نے کہا:
"یہ بات زیادہ عام نہ کیجیے انجان صاحب! کہیں لوگ آپ کو فیض کی یادگار کے طور پر محفوظ نہ کر لیں۔"

اس پر مجھے دلدار پرویز بھٹی کا وہ مشہور جملہ یاد آگیا جو اُس نے لیاقت ہال، پنڈی کے سٹیج سے نامور قوال غلام فرید صابری پر کسا تھا۔ ہوا یوں کہ صابری صاحب کو محفل میں بیٹھ کر اپنی قوالی کے مخصوص انداز میں باآوازِ بلند "اللہ" کہنے کی عادت ہے۔ ان کے اس بار بار 'اللہ' کہنے سے دلدار بہت اَپ سیٹ ہو رہا تھا کیونکہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ جاتی تھی۔ ایک بار اُس کے کسی لطیفے کے عین درمیان صابری صاحب نے زور سے 'اللہ' کہا، دلدار نے فوراً لطیفہ

روک کر اُن سے کہا:

"اللہ کو اتنا یاد نہ کیا کریں صابری صاحب! اُس نے یاد کر لیا تو پچھتائیں گے۔"

واپسی پر پھر جمال زبیری نے گائڈ کے فرائض سنبھال لیے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آدھے گھنٹے کا راستہ پانچ منٹ کے شارٹ کٹ کی تلاش میں ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہُوا۔ اس ضمن میں اُن کا آخری جملہ سنہرے حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل مشقت اور بوریت کے بعد جب ہم نے ایک ایسا موڑ کاٹا جو واقعی اُن کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر نکلتا تھا تو انہوں نے بڑے فخر سے اُچھل کر کہا:

"دیکھا۔ دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا اِدھر کو کاٹو...... مجھے رستے کا پتا ہے۔"

ٹورنٹو کا مشاعرہ یونیورسٹی کے ایک ہال میں تھا جس میں سات سو سے زیادہ کُرسیاں تھیں جب کہ ہال میں موجود افراد کی تعداد کم و بیش آٹھ سو اور 'سامعین' کی تعداد تقریباً دو سو تھی، بقیہ چھ سو خواتین و حضرات غالباً مشاعرے کو ایک outing اور تفریح سمجھ کر آئے تھے جس کا اندازہ اُن کی بے موقع داد اور اُس سے بھی زیادہ بے محل خاموشی سے بخوبی ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر انور نسیم آٹوا سے بطور سامع اور حمیرا رحمٰن نیویارک سے بطور شاعرہ آئیں۔ بقیہ سب شعراء سے ہم کسی نہ کسی محفل میں مل چکے تھے۔ حمیرا بہت اچھی شاعرہ ہے اور پروین کے بعد آنے والی نسل میں یقیناً وہ بہت نام پیدا کرے گی۔ یہاں سب سے زیادہ داد افتخار عارف کو ملی جو بلاشبہ اس کا مستحق تھا۔ پڑھنے کا ڈھنگ تو اسے پہلے بھی آتا تھا مگر پچھلے چند برسوں میں اس کی شاعری بھی بہت بہتر ہو گئی ہے۔ اُردو فکشن میں انتظار حسین اور شاعری میں افتخار عارف نے ہجرت کے تجربے کو جس تسلسل اور مہارت سے استعمال کیا ہے اس کی مثال عصری ادب میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اُس کے دو شعر مجھے خاص طور پر بہت پسند ہیں:

مرے خدا، مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

سچے سائیں حضرت بابا مہر علی شاہ
ابا، ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

ایڈمنٹن

ایڈمنٹن تک ہماری فلائٹ کل چار گھنٹے کی تھی مگر اِن چار گھنٹوں کے سفر میں عجیب عجیب گھپلے تھے۔ مثلاً ہم صبح ناشتہ کرنے کے بعد آٹھ بج کر پچاس منٹ پر روانہ ہوئے۔ بارہ پچاس پر ایڈمنٹن پہنچے مگر چونکہ وہاں کا وقت دو گھنٹے پیچھے تھا اِس لیے وہاں کی گھڑیوں میں دس بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے یعنی ہم اپنی طرف سے لنچ ٹائم پر پہنچے اور وہاں ابھی ناشتے کے برتن سمیٹے جا رہے تھے۔ عجیب صُورتِ حال تھی کہ میزبان ناشتے کا نہیں پُوچھ سکتے تھے اور مہمان دوپہر کے کھانے کے بارے میں متذبذب تھے کہ گیارہ بجے دوپہر کا کھانا کیسے کھائیں اور نہ کھائیں تو کہاں جائیں۔

ایئرپورٹ پر عالی کے نیشنل بنک کے پُرانے ساتھی فرید صاحب اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ اُن کی بڑی بیٹی طلعت وہاں کام کرتی تھی۔ اس کا میاں ملازمت کی تبدیلی کے چکر میں کسی دوسرے شہر میں تھا۔ فرید صاحب، اُن کی بیگم، چھوٹی بیٹی ماریا اور بیٹا، جسے پیار سے سب بوبی کہتے تھے، طلعت کے گھر سے قریب ہی ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ تینوں بچے بڑے خُوش رُو، نفیس اور محبت کرنے والے تھے اور اُن کے والدین بھی انتہائی ملنسار، مخلص اور مہمان نواز تھے چنانچہ طلعت کے گھر اُس دن جو کھانا ہم نے کھایا اُس میں یہ سب چیزیں شامل تھیں اور کچھ خالص دیسی ڈشیں مثلاً قیمہ بھرے کریلے (جنھیں ہم بُت کریلے کہتے ہیں)، نرگسی کوفتے، بھنڈی قیمہ، مختلف طرح کے اچار، چٹنیاں اور مربّے اِن پر مستزاد تھے۔

ماریا نے جین اور جیکٹ پہن رکھی تھی چنانچہ عالی نے فوراً اس کا نام بواتے سکاوٹ رکھ دیا جو ایسا چلا کہ اُس کے گھر والے بھی اس میں شریک ہو گئے۔ کھانے کے بعد پردین اندر "زنانے" میں چلی گئی جو ہماری نشست کے کمرے کے بالکل سامنے تھا اور کسی بھوکے کے مُنہ کی طرح کھُلا تھا معلوم

ہُوا وہاں وی سی آر پر ماریا عُرف بوائے سکاوٹ کی منگنی کی فلم دیکھی جا رہی ہے۔ پروین نے بتایا وہ لڑکے اور اس کے گھر والوں کو اچھی طرح جانتی ہے، وہ لوگ کراچی میں اُن کے ہمسائے تھے اور یہ کہ لڑکا عقلاً شکلاً ماریا کے لیے موزوں ہے۔

مَیں نے کہا: "گویا بہت خوبصُورت ہے۔"

پروین نے مُجھے شرارت آمیز نظروں سے گھُور کر دیکھا۔ مَیں نے فوراً جُملہ آگے بڑھایا: "اور معقول حد تک بے وقوف بھی۔"

پروین نے جیسے مُجھے چھیڑنے کا تہیہ کر لیا تھا، بولی: "یہ بے وقوفی آپ نے غالباً اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے اضافہ کی ہے۔"

مَیں نے کہا: "نہیں تو، تُمھارے ہی کسی انگریزی مارکہ فلسفی کا مقولہ ہے کہ خوبصُورت سَروں کے اندر عام طور پر بھُوسا بھرا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر سلیم قریشی، جو اس دوران میں بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہماری نوک جھونک دیکھ اور سُن رہے تھے، بولے: "آپ دونوں کی گفتگو سے مُجھے ایک فائدہ ہُوا ہے اور وہ یہ کہ اب آپ دونوں میرے مہمان ہوں گے اور میرے غریب خانے پہ رہیں گے۔"

مَیں نے کہا: "جناب! اس سفر میں ہم تو سُرمۂ مفت نظر ہیں اور اِس کی قیمت کے طور پر چشمِ خریدار پہ احسان بھی نہیں رکھتے۔ یہ تو آپ میزبانوں کا مسئلہ ہے جس کو جہاں چاہیں رکھیں، مسافروں کے ٹھکانے تو بہر حال بدلتے ہی رہیں گے۔"

سلیم قریشی تاریخ کے پروفیسر ہیں اور یونیورسٹی آف البرٹا میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین کی سینئر پوزیشن پر کام کر رہے ہیں لیکن اُن کی علمیت، خوش مزاجی اور سُخن فہمی کے علاوہ بہت سی خصُوصیات ہم پر آہستہ آہستہ کھُلیں اور بوائے سکاوٹ ماریا کے بارے میں گفتگو کا اضافی فائدہ یہ ہُوا کہ ہمیں آیندہ تین دن ایک ایسے مثالی جوڑے کے ساتھ رہنے کا موقع مِلا جو اس سفر میں ہمارے بہترین اور باکمال ترین میزبان تھے، شاید!

ڈاکٹر سلیم قریشی کی بیگم ریگولا قریشی پہلی نظر میں بالکل متاثر نہیں کرتیں۔ تِیلی دُبلی، طویل قامت، عُمر چالیس سے اُوپر، چہرے کے نقوش امریکی ایکٹر جیمز کوبرن سے مِلتے جُلتے اور ... میرے خیال

ہیں اُس خاتون سے متعلق معمولی باتیں بس اتنی ہی ہیں باقی سب کی سب باتیں اُسے ایک غیر معمولی خاتون بنانے والی تھیں۔ ریگولا نسلاً سوئس جرمن ہے مگر اُردو ایسی بامحاورہ اور نستعلیق بولتی ہے کہ اپنے صلاح الدین محمود بھی اُس کے آگے پانی بھریں، ہندوستانی میوزک پر اتھارٹی ہے اور قوالی کے موضوع پر پی ایچ ڈی کر چکی ہے، "ترنّم" اُس کے مطالعے کا مخصوص موضوع ہے چنانچہ کسی مترنّم شاعر کو ایک بار سُن لے تو اُس کی آواز اور گائیکی کے انداز کی ایسی نقل اُتارتی ہے کہ سُننے والوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا۔ فانی، جگر، ساغر، مجروح اور شکیل کا ترنم تو مَیں نے نہیں سُنا لیکن حفیظ، ناصر، جالب اور عالی کو بہت سُنا ہے۔ لفظوں کی ادائیگی میں کہیں کہیں لہجے کا فرق تھا مگر جہاں تک ترنّم کی لَے اور دُھن کا تعلق ہے وہ بی بی سو فیصد نمبروں کی حقدار تھی۔ عالی نے بتایا کہ جن مرحوم یا زندہ ہندوستانی شُعراء کے ترنّم کی ریگولا نے نقل اُتاری ہے وہ زیادہ بہتر ہے، کیونکہ ریگولا کی ریسرچ کا زیادہ تر زمانہ ہندوستان میں گزرا ہے۔

ڈاکٹران ریگولا اور سلیم کے دو بچّے ہیں: لڑکا اُنیس برس کا ہے اور لڑکی بیس برس کی اور دونوں میں فرق بھی اُنیس بیس ہی کا تھا۔ دونوں بچّے ماں باپ سے علیحدہ الگ الگ فلیٹوں میں رہتے تھے۔ مَیں نے اپنی مشرقی فطرت کے تحت مجبُور ہو کر پُوچھ ہی لیا کہ اِتنے بڑے مکان اور ایسی اچھی ملازمتوں کے باوجود آپ نے بچّوں کو گھر نکالا کیوں دے رکھا ہے جب کہ بقول آپ کے وہ دونوں ابھی طالب علم ہیں؟ سلیم قریشی نے میرے سوال اور اس میں چھُپے ہُوئے طنز کو سُنا بھی اور سمجھا بھی اور پھر اس کی وضاحت یُوں کی کہ اس کارروائی کا بُنیادی محرّک یہاں کا معاشرتی نظام ہے جو نوجوانوں کو انفرادیت، آزادی اور ذات کے سماجی اور معاشی تشخّص کا ایک ایسا تصوّر دیتا ہے جس کے حوالے سے سولہ سترہ برس کی عُمر کے بعد والدین کے ساتھ یا اُن کا دستِ نگر رہنا ایک طعنہ سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ اس کارزارِ حیات میں سب کو اپنی اپنی جنگ اپنے بازوؤں سے لڑنی ہے چنانچہ the sooner the better۔

اُنہوں نے بتایا کہ ہفتے میں دو تین بار بچّوں سے فون پر بات ہو جاتی ہے اور ایک آدھ بار وہ ملنے بھی چلے آتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ لوگ ناشتے یا کھانے پر بھی مل بیٹھتے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ ڈاکٹر سلیم قریشی سے اُن کے اندر کے اُس مشرقی آدمی کا ردِّ عمل معلوم کروں جس کی سماجی تربیت میں اولاد اور

والدین مہد سے لحد تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح باہم دگر پیوست رہتے ہیں مگر پتا نہیں کیوں مَیں خاموش ہو گیا۔ معاش، سماج اور اخلاقیات کے انہی تضادات کا نام شاید زندگی ہے !

بات کسی اور طرف نکل گئی، تذکرہ ہو رہا تھا ریگولا قریشی کا، جس کی اُردو اور موسیقی سے دلچسپی اور دسترس نے مجھے اور پروین کو مبہوت کر دیا تھا۔ ڈائننگ رُوم میں ایک طرف ڈیک رکھا تھا جس سے ملحقہ الماری مختلف کیسٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ کلاسیکی، نیم کلاسیکی، فلمی، غیر فلمی، لوک اور انسٹرومینٹل ہر طرح کے میوزک کا بہترین انتخاب وہاں موجود تھا۔ مَیں نے یوں ہی غلام علی کا ایک کیسٹ نکالا۔ آئٹمز کی فہرست میں میری دو غزلیں بھی تھیں۔ خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی کیونکہ مجھے خود علم نہیں تھا کہ غلام علی نے میری یہ غزلیں بھی گائی ہوئی ہیں چنانچہ وطن سے دس ہزار میل دُور بیٹھ کر مَیں نے اپنی ہی غزل پہلی بار سُنی۔ غزل اور گائیکی دونوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر اس 'انکشاف' کا مزا بہرحال اپنی جگہ تھا۔ ریگولا کچن کے دروازے پر آ کر تقریباً ایک منٹ تک سُنتی رہی پھر بولی: "غلام علی اچھا گاتا ہے، اگر اُستاد بننے کی کوشش نہ کرے تو اور اچھا ہو سکتا ہے۔"

یہ ایک ایسا جامع تبصرہ تھا کہ طبیعت پھڑک اُٹھی۔ مَیں نے محض امتحان کی خاطر اپنی پسندیدہ گُلوکارہ عابدہ پروین کا ایک کیسٹ لگا دیا۔ ریگولا نے داد دینے کے انداز میں سر ہلاتے ہُوئے کہا: "یہ لڑکی بہت اچھی ہے۔ راگ داری اور فوک دونوں کو خوب جانتی ہے، بہت involve ہو کر گاتی ہے اور یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ سلیم بھی اِس کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

ملحقہ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے ہوئے سلیم قریشی نے اخبار سے سر اُٹھایا، اثبات میں ہلایا اور پھر مُسکرا کر بولے: "مجھے اس وقت رُوح سے زیادہ جسمانی غذا کی ضرورت ہے اس لیے فی الحال مَیں عابدہ پروین پر ناشتے کو ترجیح دوں گا۔"

سب لوگ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ ریگولا دوبارہ کچن میں چلی گئی اور پروین نے کہیں سے ڈھونڈ کر لتا کا وہ مشہور بھجن لگا دیا جسے سُن کر بقول، ہمارے ایک دوست کے "دیوی دیوتاؤں پر یقین سا آنے لگتا ہے۔" لتا کہہ رہی تھی :

اے ری مَیں تو پریم دوانی ــــ میرا درد نہ جانے کوئی

ناشتے کے بعد تہہ خانے کی سیر کی جو سلیم قریشی کی سٹڈی کا کام بھی دیتا تھا۔ ایک طرف اُردو کے جدید اور قدیم مشاہیر کی تصاویر ایک بڑے سے بورڈ پر نہایت خوبصورتی سے سجی تھیں۔ سلیم قریشی خود بھی بہت اچھے فوٹو گرافر ہیں چنانچہ یہاں اُن کی کھینچی ہوئی کئی تصویریں موجود تھیں۔ دیواروں پر کچھ پینٹنگز تھیں۔ سلیم قریشی نے بتایا کہ یہ اُن کی بیٹی کے کمالات ہیں جو فائن آرٹ کی طالبہ ہے اور یہ اُس نے تیرہ سے اٹھارہ برس کی عُمر کے درمیان بنائی تھیں۔ مَیں کبھی تصویروں کو اور کبھی ڈاکٹر قریشی کے مُنہ کو دیکھتا تھا اور چُپ ہو جاتا تھا کہ میرے دِل میں مشرق اور مغرب کے تہذیبی تصورات کا فرق پھر ایک سوال بن کر اُبھر آیا تھا۔ مغرب میں جنسی تعلیم نصابِ تعلیم کا حِصّہ ہے اور ہمارے یہاں ایک سربستہ راز؛ وہاں اظہار کی زیادتی ہے اور یہاں اخفاء کی؛ وہاں جنسی آزادی کا مسئلہ ہے اور یہاں جنسی گھُٹن کا۔ مَیں اعتدال پسند واقع ہُوا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ جنس کے بارے میں ہمارا معاشرتی اور اخلاقی رویہ بہت ناقص، غیر فطری اور ضرر رساں ہے لیکن اِس کے باوجود یہ بات میرے حلق سے نہیں اُترتی کہ کوئی باپ (خصوصاً مشرقی اخلاقیات کا پروردہ) ایک اجنبی مرد کو اپنی نوجوان بیٹی کی بنائی ہُوئی ایسی تصاویر دکھائے جن میں انسانی وجود کی تصویر کشی لباسِ فطرت کے ساتھ کی گئی ہو۔ ہوسکتا ہے یہ میرا نفسیاتی مسئلہ یا کمپلکس ہو مگر پتا نہیں کیوں مَیں ایسے کمپلکس کو ختم کرنے کی بجائے اِس کی حفاظت کرنا پسند کرتا ہوں۔

رات کو اِسی تہہ خانے میں ڈاکٹر سلیم کی طرف سے ایک پُر تکلّف کھانے اور نسبتاً کم تکلّف مشاعرے کا پروگرام تھا۔ غایت اس اکٹھ کی ایڈمنٹن کے برصغیریوں سے ہماری اور ہماری اُن سے ملاقات تھی۔ زیادہ تر لوگ یونیورسٹی یا شعبہ تعلیم سے متعلق تھے۔ کچھ شناسا چہرے بھی نظر آئے۔ مُلتان کا نوجوان زاہد مخدوم اور اُس کی بیوی نگہت سلیم طالب علمی کے زمانے سے اپنے ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے معروف تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ نگہت کی باتوں سے وطن کی محبت اور دُوری کے دُکھ کا احساس بُری طرح جھلک رہا تھا۔ زاہد اُس کے برعکس پاکستانی معاشرے کی گھُٹن، خراب سیاسی صورتِ حال، فوجی آمریت اور اجتماعی زوال کے حوالوں سے تنقید کے ذریعے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ مَیں بحث میں پڑ کر محفل کا ماحول خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے طرح دیتا رہا مگر جب چار پانچ احباب اُس کی ہمنوائی میں بولنے لگے تو مجبوراً مجھے کہنا پڑا کہ پاکستان اور وہاں کی صورتِ حال

کی جتنی خرابیاں آپ نے بتائی ہیں مَیں انہیں بغیر بحث کے تسلیم کر لیتا ہوں لیکن یہ بتایئے کہ جب آپ جیسے لوگ، جن کا علم، فکر، احساس اور عمل کسی ملک میں اقداری تبدیلی کا محور ہوتا ہے، دامن بچا کر وہاں سے نکل آئیں گے، اُس 'کیچڑ' سے اپنے اُجلے لباسوں سمیت کنارہ کشی کر لیں گے تو پھر وہاں کی صورتِ حال کس طرح بدلے گی! آپ پاکستان پر اس لہجے میں تنقید کرتے ہیں جیسے وہ آپ کا اپنا نہیں کسی اور دُنیا کا مُلک ہے! مانا کہ پاکستان میں انسانی حقوق کی حق تلفی ہو رہی ہے مگر آپ لوگوں نے بھی تو پاکستان کی حق تلفی کی ہے!

اِس پر بحث کا رُخ بدل گیا۔ کچھ لوگ نرم پڑ گئے اور کچھ اپنا دفاع کرنے لگے کہ کس طرح معاشی تحفظ اور ترقی کے لیے انہیں ترکِ وطن کا فیصلہ کرنا پڑا ہے۔ عالی نے کہا:

"مَیں گزشتہ پچیس برس سے دُنیا بھر میں گھوم رہا ہوں۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے لوگ دُنیا کے بے شمار ملکوں کو اپنی صلاحیت اور محنت سے بہتر اور قوی تر بنا رہے ہیں۔ اگر اُن کی یہی صلاحیت اپنے ملک میں استعمال ہوتی تو آج پاکستان کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ ۱۹۶۲ء میں کوریا والے پاکستان کو اپنا آئیڈیل مانتے تھے مگر آج صنعتی اعتبار سے کوریا ہمارا آئیڈیل بن چکا ہے۔ اِس زوال کی بہت سی وجوہات ہیں اور اُن میں سے ایک بہت بڑی وجہ خود آپ لوگ ہیں اِس لیے کم از کم آپ تو تنقید کرتے وقت ذرا احتیاط ملحوظ رکھا کریں۔"

اِس جوابی کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی ہی دیر میں کم و بیش تمام حاضرین دردمندی اور ایک احساسِ شراکت کے ساتھ پاکستان کے بارے میں اس طرح سے باتیں کرنے لگے جیسے کسی محبوب مریض کے بارے میں اس کے عزیز و اقربا گفتگو کرتے ہیں۔

زاہد اور نگہت مجھ سے مشترکہ دوستوں کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ نگہت اپنے نفسیات والے پروفیسر امتیاز چیمہ کی شاگرد رہ چکی تھی۔ اُس نے سلام کے ساتھ اظہارِ افسوس بھی بھیجا کہ چیمہ صاحب اب محکمۂ تعلیم میں ڈائرکٹر ہو گئے ہیں اور یُوں ایک اچھا اُستاد فائلوں کی صحبت میں داخل دفتر کر دیا گیا ہے۔ زاہد نے سرمد صہبائی کی کافیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ مَیں نے کہا: "سرمد میں خوبی یہ ہے کہ وہ بلیک کافی اور صوفیانہ کافی دونوں کو ساتھ ساتھ چلا لیتا ہے۔ خیر، یہ تو مذاق کی بات تھی۔ کافیاں اُس نے بہت اچھی لکھی ہیں اور اپنے ہم عصروں میں وہ ہمیشہ میرے پسندیدہ شاعر ل

میں رہا ہے۔"

زاہد نے شرارت آمیز انداز میں سرمد کی غیر سرمدی سرگرمیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ مَیں نگہت کی وجہ سے ذرا ہچکچایا۔ وہ مُسکرا کر بولی: "آپ مرد لوگوں کے پاس کتنے کم موضوع ہوتے ہیں گفتگو کے لیے؟"

زاہد نے ہنس کر کہا: "امجد صاحب اور عطاء الحق قاسمی کو تو منیر نیازی نے 'خواتین پسند مصنفین' کا خطاب دے رکھا ہے۔"

"اور وہ خود اِس انجمن کے تاحیات صدر ہیں، یہ شاید تم لوگوں کو پتا نہیں۔"

اِس طرح کی دلچسپ نوک جھونک جاری تھی کہ کمرے کا دروازہ کھُلا اور ایک معقول صورت، معقول لباس، اُدھیڑ عمر کے صاحب بڑے فلمی انداز میں لڑکھڑاتے ہُوئے اندر داخل ہوئے اور ایک بے معنی مُسکراہٹ کے ساتھ چُندھی چُندھی آنکھوں سے حاضرین کو گھُورنے لگے۔ مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی پس منظر سے موسیقی شروع ہوگی اور یہ محمّد رفیع کے پلے بیک گانے پر ہونٹ ہلانا شروع کردیں گے:

مجھے دُنیا والو شرابی نہ سمجھو   مَیں پیتا نہیں ہوں پلائی گئی ہے

اُزیر صاحب سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ کھُلا کہ جناب فلسفے کے پروفیسر ہیں اور ایک مُدّت سے یہیں مقیم ہیں اور اسی طرح مقیم ہیں۔ مَیں نے زاہد مخدوم سے کہا: "لاہور میں ہمارا ایک ٹی وی پروڈیوسر دوست زاہد اُزیر نامی ہے۔ یہاں تم دونوں مل کر اُس کی کمی پوری کر رہے ہو۔"

مخدوم نے اُزیر صاحب کی بدمست نگاہوں اور بے طرح پڑتے ہُوئے قدموں کی طرف دیکھا اور ایک ہچکی سی لے کر کہا: "شراب پینا بھی کرکٹ کی اننگ کھیلنے کی طرح ہے۔ جب تک آپ ناٹ آؤٹ ہیں گراؤنڈ میں ہیں، آؤٹ ہُوئے اور کام ختم، اب پویلین میں جاکے آرام کریں۔"

مَیں نے کہا: "اِس سلسلے میں تمھارے خیالات برادرِ عزیز منیر نیازی سے بہت ملتے جُلتے ہیں۔ ایک دفعہ اُن سے کسی نے پُوچھا کہ کیا بات ہے جب مَیں ذرا سی بھی پیتا ہوں تو میرے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں جب کہ لوگوں کو ڈرم پی کر بھی کچھ نہیں ہوتا؟ منیر نیازی نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا تھا کہ بات یہ ہے برخوردار، شراب کو بھی پتا ہوتا ہے اُسے کون پی رہا ہے!"

اُزیر صاحب کی بدمستیاں جاری تھیں۔ کسی نے اُن کے حوالے سے ایک بڑا مزیدار لطیفہ سُنایا:

"ایک صاحب کسی محفل میں بالکل 'آوٹ' حالت میں مسلسل پیتے جا رہے تھے۔ ایک گوشے میں اُن کی اپنی بیوی سے ملاقات ہوگئی۔ موصوف تھوڑی دیر اُسے غور سے دیکھتے رہے پھر قریب آکر اُس کے ہاتھ سے گلاس پکڑا اور بولے: "بس کرو ڈارلنگ، تمھاری شکل پہلے ہی دُھندلی ہو رہی ہے!"

مشاعرہ شروع ہُوا تو اُزیر صاحب نے بھی اپنا کلام سُنایا مگر "پاؤں رکھتے ہیں کہیں اور کہیں پڑتا ہے" کی طرح اُن کے شعر بھی قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ ایک ہندو شاعر نوشاد جونپوری نے ترنّم سے کلام سُنایا۔ کلام تو بس ٹھیک ٹھاک تھا مگر اُن کی آواز اور ترنّم کا انداز بہت عُمدہ تھا۔ غزل کو وہ کچھ کچھ ٹھمری اور دادرے کے رنگ میں گاتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے منّا ڈے، مظفر وارثی کی آواز میں گا رہا ہے۔ یہاں میزبانوں کے بیٹے سے بھی ملاقات ہوئی۔ سترہ اٹھارہ برس کا خاموش، حال مست، مہذب سا نوجوان اُس غیر محفل میں ایسے بیٹھا تھا جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ' سوئس جرمن ماں، پاکستانی باپ، کینیڈین شہری، بیسویں صدی کا آخری رُبع ـــــ مَیں سوچنے لگا ـــــ ہم اپنے کلچر کو روتے ہیں، کوئی اِس بے چارے کو بھی دیکھے!

ہر شہر کی طرح یہاں بھی عالی صاحب کی رشتے داری نکل آئی۔ سیّدہ نامی ایک خاتون ہمیں لنچ کے لیے لینے آئیں۔ معلوم ہُوا وہ رشتوں کی بہت سی ضرب، جمع اور تقسیم کے بعد عالی کی بھانجی لگتی ہیں۔ پہلی نظر میں بہت ناک چڑھی محسوس ہوئیں مگر کچھ دیر بعد پتا چلا کہ موصوفہ کو دراصل شدید قسم کا زکام ہو رہا ہے۔ ہندو ہوٹل 'انا پورنا' میں پہنچے۔ سردی منفی انیس درجے سنٹی گریڈ تھی اور ہوٹل کے دروازے کے اردگرد اس قدر برف تھی کہ وہاں باقاعدہ سکیٹنگ کی جا سکتی تھی۔ عالی صاحب نے پردین کے جوتوں پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور برف پر چلنے کے آداب سے متعلق ایک عمومی لیکچر کا آغاز کیا لیکن ابھی انہوں نے تمہید ہی باندھی تھی کہ اُن کا اپنا بُرج اُلٹ گیا۔ بھاری جسم پر بہت سے کپڑوں کے اوپر بہت بھاری رُوسی اوورکوٹ میں عالی کا حجم بہت بڑھ چکا تھا چنانچہ جب وہ پھسلے تو یوں لگا جیسے کوئی پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ رہا ہے۔ فوری ردِّعمل کے طور پر سب لوگ پہلے ہنسے اور پھر اُنہیں اٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ اگرچہ وہ خاصے زور سے گرے تھے مگر سیدھا کمر کے بل گرنے اور بھاری کوٹ کی وجہ سے

بچ بچا ہو گیا۔ ہوٹل میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھنے کے بعد عالی نے اپنا جائزہ لیتے ہوئے مجھے اور پروین کو مخاطب کر کے کہا: "لو بھئی تم ہمارے کوٹ کی دبازت پر تنقید کرتے تھے، اب دیکھو کام آ ہی گیا نا؟"

میں نے کہا: "کیوں نہیں۔ لیکن رُوسی کوٹ ہے نا! اس سے کام لینے کے لیے پہلے گرنا پڑتا ہے۔"

دُنیا کے مختلف ملکوں کے مقامی کھانے، کھانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی دوسرے ملک کی خوراک کے مخصوص ذائقے سے مانوس ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ پہلی ملاقات پر بہت کم کھانے آپ کو 'پکڑتے' ہیں۔ مجھے یاد ہے ۱۹۸۲ء میں ہندوستان سے واپسی پر جب میں نے اپنے میزبان راجندر ملہوترہ کے ڈِنر کا تذکرہ اپنے سفرنامے میں کیا تھا تو میں نے ہندوستانی کھانوں کے ذائقے پر بہت تنقید کی تھی۔ بعد میں وقت اور تجربے سے معلوم ہُوا کہ میری مایوسی کی اصل وجہ ہندوستانی کھانوں کے بارے میں بزرگوں سے سُنی ہوئی بے حد تعریفیں اور ذائقے کی تبدیلی تھی۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے اُس وقت ہوئی جب راجندر ملہوترہ نے میرے سفرنامے کا متعلقہ حصّہ پڑھا اور مجھ سے گزشتہ کی معذرت کرتے ہُوئے آئندہ تلافی کا وعدہ کیا۔ اُس دن سے میں نے دل میں عہد کر لیا ہے کہ اب ایسے کسی موقعے پر فوری ردِّ عمل کا اظہار نہیں کرنا لہٰذا 'انا پورنا' کے کھانے کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا، ہو سکتا ہے آئندہ کبھی ایڈمنٹن جانا پڑ جائے یا 'انا پورنا' کی انتظامیہ کے کوئی رُکن کہیں مل جائیں اور انھوں نے میری یہ تحریر بھی پڑھ رکھی ہو۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا!

کشور قریشی کا ذکر میں کیلگری کے مشاعرے اور اُس کے قہقہے کے حوالے سے کر چکا ہوں۔ ایڈمنٹن میں وہ مشاعرے کی منتظمِ اعلیٰ تھی اور 'انا پورنا' کے کھانے میں ہمارے ساتھ شریک تھی۔ پروین نے بتایا کہ کشور یونیورسٹی میں اُن سے چند سال سینئر تھی، اُن دنوں وہ کشور غنی ہُوا کرتی تھی اور بڑے معرکے کی مقررہ تھی۔ کشور کی آواز کا مخصوص کرارا پن، جملوں کی صوتی ساخت اور ادائیگی میں اب بھی مقرروں کے مخصوص stresses and pauses کی جھلک پائی جاتی تھی مگر اس دوران گزرا ہُوا وقت اس کے چہرے اور آواز دونوں میں اپنی نشانیاں چھوڑ گیا تھا۔ دو بچوں، ایک ٹوٹے ہُوئے دل اور ناکام شادی نے مِل جُل کر اُسے کچھ ایسا کر دیا تھا کہ معتبر راوی (یعنی پروین شاکر) کے بیان کے باوجود 'اعتبار' کا پانسہ کمزور پڑ رہا تھا۔ قاسمی صاحب کا ایک شعر بہت یاد آیا:

پُوچھ بیٹھا ہوں مَیں تجھ سے ترے کوچے کا پتا
تیرے حالات نے کیسی تری صُورت کر دی

کھانے کے بعد کشور ہمیں اپنے ساتھ دُنیا کے سب سے بڑے شاپنگ مال کی سیر کے لیے لی گئی۔ پانچ آرمینین نژاد بھائیوں کا تعمیر کردہ یہ مرکزِ خرید و فروخت، مارکیٹ یا شاپنگ سنٹر ایک حیران کُن عمارت ہے۔ اِس میں بلا مبالغہ سینکڑوں دکانیں اور بڑے بڑے سٹور ہیں، چڑیا گھر ہے، مچھلیوں کا ایکویریم ہے، جگہ جگہ خوبصُورت فوارے، سیڑھیاں، اوور ہیڈ پُل اور راستے، چھت کی جگہ لوہے اور شیشے کا ایک طویل اور خوبصُورت سٹرکچر۔ غرض ہر جا کہ می بینم :

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

پرندے اور مچھلیاں پروین کی مسلمہ کمزوریاں ہیں چنانچہ ایکویریم پر نظر پڑتے ہی اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور وہ ایسے انہماک اور اشتیاق سے مچھلیوں کو دیکھنے لگی جیسے باقی عُمر اُنہی کی صحبت میں گزُارنے کا ارادہ ہو، اور سچّی بات یہ ہے کہ ایسی خوبصورت اور انوکھی مچھلیاں مَیں نے بھی آج تک کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ایکویریم کے شیشے کے دوسری طرف ایک شعلہ سا لپکا۔ رنگ برنگی مچھلیوں، پانی اور شام کے جھٹپٹے میں ایک لمحے کے لیے جیسے وقت ٹھہر سا گیا، اپنا ایک بھولا ہُوا شعر یاد آگیا :

لہریں اُٹھ اُٹھ کے مگر اُس کا بدن چُومتی تھیں
وہ جو پانی میں گیا اور بھی دریا چمکا

اِس شعر بلکہ پوری غزل کا سلسلۂ نسب مصحفی کی اِس خوبصورت غزل سے ملتا ہے :

پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
بھیگے سے ترا رنگِ حنا اور بھی چمکا

مَیں نے بہانہ بنا کر دونوں شعر سُنائے، کشور نے داد کے طور پر دو چھوٹے چھوٹے قہقہے مارے مگر پروین شاید میری نظروں کا تعاقب کر رہی تھی، شرارت سے مُسکرا کر بولی :

"یہاں تو آپ کو میر کا وہ شعر پڑھنا چاہیے کہ :

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اِس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری!"

میں نے کہا: "بہرحال، ایک بات تو طے ہو گئی ہے کہ تمہارا دھیان بھی مچھلیوں کی طرف نہیں تھا۔"

ہماری اگلی منزل فرید صاحب کا گھر تھا جہاں سے چائے پی کر ہمیں اپنے اصلی میزبان کی طرف پہنچنا تھا۔ کشور نے بتایا کہ چائے کے مقررہ وقت میں صرف دس منٹ باقی ہیں اور راستہ کم از کم بیس منٹ کا ہے اور اس میں مزید تاخیر کا امکان یوں ہے کہ اس نے متعلقہ گھر صرف ایک بار دیکھا ہوا ہے اور رستوں کے بارے میں اس کی یادداشت اور کچھ بھی ہو قابلِ فخر بہرحال نہیں ہے۔

بہت کم لوگ اپنے بیانات کو اس طرح ثابت کر سکتے ہیں جیسے اس دن کشور نے کیا۔ تقریباً سوا گھنٹہ اس شیر کی بچی نے طلعت کے گھر کے اردگرد کی سڑکوں پر موٹر دوڑائی۔ ہمیں ۵۵ نمبر سڑک پر جانا تھا۔ ۴۹ سے ۵۴ اور پھر ۵۶ سے ۶۰ تک ساری سڑکیں اپنی اپنی جگہ پر موجود تھیں بیچ میں سے ۵۵ نمبر ہر بار غائب ہو جاتا تھا۔ بارش، برف، پھسلن، کشور کی ڈرائیونگ، بدحواسی، تاخیر کا احساس اور بے معنی بوریت کا دباؤ جب ناقابلِ برداشت ہو گیا تو پروین کو ایک آئیڈیا سوجھا، اس نے کہا: "اگر تمہیں فرید صاحب کے فلیٹ کا پتا ہے تو اُدھر چلتے ہیں، وہاں سے طلعت کے گھر کا پتا چل جائے گا۔"

کشور نے خالص پنجابی انداز میں اپنے سر پر دوہتڑ مارا کہ اُسے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا اور گاڑی بڑی سڑک پر ڈال دی۔ ابھی ہم چند ہی قدم چلے تھے کہ اُس نے دوہتڑ دہرایا اور ایک دم بریک مار کر موٹر ایک سائڈ کی سڑک پر ڈال دی اور ہماری سوالیہ نظروں کے جواب میں اُنگلی سڑک کے کنارے لگے ہوئے بورڈ کی طرف اُٹھا دی جس پر ۵۵ کا ہندسہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

طلعت کے گھر ہم ٹھیک ساڑھے چھ بجے پہنچے۔ وہ لوگ ہمارے آنے سے مایوس اور نہ آنے سے سخت پریشان تھے۔ بوائے سکاوٹ ماریا کے چہرے کو پہلی بار مسکراہٹ سے خالی دیکھا۔ پروین طلعت سے باتوں میں مصروف تھی اس لیے وجہ بھی پوچھ لی، معلوم ہوا موصوفہ نے ٹیسٹ کی وجہ سے زیادہ پڑھائی کر لی جس کی وجہ سے سر میں درد شروع ہو گیا۔ گھر میں گُردے کے درد کی گولیاں پڑی تھیں، انہیں سردرد کی سمجھ کر ایک ساتھ چار کھا ڈالیں اور معاملہ ہسپتال تک پہنچ گیا۔ واپسی ہمارے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے ہوئی ہے۔ کچھ دیر اس بات پر چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی مگر جب ایک دم بوائے سکاوٹ کی آنکھوں میں شرم اور ندامت کی وجہ سے آنسو چھلکنے لگے تو موضوع بدل دیا گیا۔

ایڈمنٹن کا مشاعرہ اِس لحاظ سے خصوصاً قابلِ ذکر ہے کہ یہاں سامعین اگرچہ تعداد میں بہت زیادہ نہیں تھے مگر کم و بیش سب کے سب اعلیٰ تعلیمی اسناد یافتہ اور مختلف علوم کے پروفیسر تھے۔ تقیبٹرنما آڈیٹوریم میں وڈیو کیمرہ نصب تھا اور سامعین کی صفوں میں خواتین اور مرد تقریباً برابر تعداد میں تھے مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر سلیم قریشی نے کی اور اپنی دلچسپ باتوں سے مشاعرے کو ایک intimate محفل کا رُوپ دے دیا۔ کیلگری سے اقبال حیدر، اُن کی بیگم، بہنیں اور بہنوئی بھی آئے ہوئے تھے۔ یہاں مجھے زندگی میں پہلی بار کسی مکمل اُردو مشاعرے میں پنجابی کلام بھی سنانا پڑا کیونکہ سامعین کا تقاضا بہت پُرزور تھا اور پنجاب کا پہلا اور آخری نمائندہ وہاں مَیں ہی تھا۔

عالی کے دوہے حسبِ معمول مشاعرے کی جان تھے مگر اِس مشاعرے میں ان کا ایک جُملہ محفل کو لوٹ لے گیا۔ تحریر میں شاید اُس جُملے کی برجستگی، طرزِ ادا اور بے ساختگی نمایاں نہ ہو سکے پھر بھی مَیں کوشش کرتا ہوں۔ عالی نے پہلے تو ایک چھوٹی سی تقریر کی جو کچھ یوں تھی :

"حضرات دوہا بازی اور گلے بازی تو ہم کرتے رہتے ہیں مگر یہاں جو مضمون باندھا گیا ہے اس کا پس منظر کچھ یُوں ہے کہ ساری دُنیا اِس بات پر متفق ہے کہ عشق، مُشک اور جوبن ایسی چیزیں ہیں جو چُھپائے نہیں چُھپتیں۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے ذرا وقفہ دیا اور پھر بڑے دِلچسپ انداز میں کہا :

"ناچیز اِس کے خلاف عرض کرتا ہے۔"

اور پھر بے شمار قہقہوں کے شور میں یہ دوہا پڑھا :

"عشق چُھپے اور مُشک چُھپے اور جوبن تک چُھپ جائے
سچا بول اور جھوٹی کو تیا کبھی نہ چُھپنے پائے"

مشاعرے کے بعد سلیم قریشی کے گھر میں ریگولا اور عالی سے مختلف شاعروں کے ترنّم کی نقلیں سُنی گئیں۔ تین بجے رات اپنے کمرے میں پہنچا تو نیند آ آ کر جا چکی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر پڑی ہوئی ایک کتاب یُونہی اُٹھالی، کتاب کا نام بڑا چونکا دینے والا تھا: Three days and a child.

کتاب کا مصنف ایک نوجوان یہودی افسانہ نگار تھا جس کا نام A.B. Yeho Shua تھا۔ جو مندرجات کی فہرست دیکھی تو پہلی کہانی کا نام کتاب کے نام سے بھی زیادہ دلچسپ تھا :

A poet's continuing silence.

کہانی شروع کی تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ حیرت انگیز جزئیات نگاری، انسانی نفسیات اور کرداروں کی اندرونی کشمکش کے بہت گہرے مشاہدے پر مبنی یہ ناولٹ نما طویل کہانی ایک مہین سے ریشمی دھاگے کی طرح پڑھنے والے کے وجود پر لپٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسے مصنف کے شب و روز کا روزنامچہ تھا جو ایک گھر میں اپنے پیدائشی مخبوط الحواس (retarded) نوجوان لڑکے کے ساتھ رہتا ہے اور گھر میں اُن دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا فرد نہیں۔ باپ کی بیزاری، اُلجھن، رحم، شفقتِ پدری اور love hate relation کا منظر نامہ اتنا مکمل، متحرک اور گہرا تھا کہ مَیں اُن کرداروں کو cold print سے متحرک انسانی اجسام میں تبدیل ہوتے دیکھ سکتا تھا۔

اگلی صُبح گیارہ بجے اُٹھے اور بارہ بجے ناشتے کی میز تک پہنچے تو معلوم ہُوا کہ ایک بجے البرٹا یونیورسٹی کی انگریزی زبان کی فیکلٹی کے ڈین پروفیسر موئلز کے ساتھ لنچ ہے سو ناشتہ گول کر دیا گیا۔ ریگو لا ہمیں لے جانے کے لیے یونیورسٹی سے آئی تھی۔ ہمیں چھوڑ کر اُسے واپس اپنے ڈیپارٹمنٹ پہنچنا تھا کیونکہ اُسے آج اگلے امتحان کا پرچہ تیار کرنا تھا جس کی واحد ممتحن بھی وہ خود ہی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں یونیورسٹیاں بہت آزاد ہیں اور طلبہ اور اساتذہ کو تعلیم کے سلسلے میں نصابوں کا پابند نہیں کیا جاتا۔ اساتذہ کی ترقی شعبے کے ڈین کی سفارش پر ہوتی ہے اور اگر ڈین سفارش نہ کرے تو متعلقہ اُستاد نہ صرف اِس فیصلے کو چیلنج کر سکتا ہے بلکہ ڈین کو اُسے وہ وجوہات بھی بتانا پڑتی ہیں جن کی وجہ سے اس نے سفارش نہیں کی تھی۔ مَیں نے سوچا اگر ہمارے یہاں یہ طریقہ رائج ہو جائے تو یونیورسٹی میں طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ بھی روز فوجداری مقدموں میں ملوث ہوں۔

پروفیسر موئلز بھی بیشتر اساتذہ کی طرح یہودی تھا۔ اسرائیل کی دہشت گردی اور اسلام دُشمنی سے قطع نظر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ گزشتہ دو صدیوں میں انسانی ترقی کے ذمّے دار مرکزی افراد میں سے یہودیوں کو نکال دیا جائے تو باقی بہت کم بچے گا۔ اقبال نے کشمیریوں کو 'نجیب، چرب دست اور تر دماغ' کہا تھا۔ یہودیوں کے بارے میں 'نجابت' کا فیصلہ تو شاید مشکل ہو مگر جہاں تک چرب دستی اور تر دماغی کا تعلق ہے دُنیا کی کوئی قوم فی زمانہ اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عالی نے پروفیسر موئلز کو اپنی کچھ نظموں کے انگریزی ترجمے نظرِ ثانی کے لیے دیے جو پٹیالہ یونیورسٹی

کے پروفیسر راجندر سنگھ ورما نے کیے تھے۔ ورما صاحب نے میری چند نظموں کے تراجم بھی مجھے بھجوائے تھے جو بس ٹھیک ہی تھے۔ مَیں نے عالی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا: "اسی لیے تو پروفیسر مونٹز کو تکلیف دے رہا ہوں۔"

مَیں نے کہا: "مگر اسے کیا پتا کہ اوریجنل نظم کیا تھی؟"

"نہ ہو" عالی نے مخصوص انداز میں ہنکارا بھرنے اور دانت کٹکٹانے کے بعد کہا، "انگریزی تو اس کی مستند ہو گی نا؟ ترجمے کے نیچے اس سالے کا نام آئے گا تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔"

ایڈمنٹن میں ہماری آخری شام بہت اُداس کر دینے والی تھی۔ دورے کے اس سرد ترین شہر کے بارے میں اشفاق سے، ہم نے قیام کی مدت کم کرنے کی فرمائش کی تھی مگر اب یہ عالم تھا کہ وہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بوائے سکاوٹ ماریا اور اس کا بھائی بوبی تصویریں اتار رہے تھے۔ رخصت کے وقت سب لوگوں نے فرداً فرداً ہمیں مختلف تحفے دیے اور ایسی محبت سے رُخصت کیا جیسے ہم اُن کے بہت ہی اپنے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے جذبات بھی اُن سے مختلف نہیں تھے۔

اگلی صُبح ہمیں .L.A یعنی لاس اینجلس روانہ ہونا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہاں موسم خاصا گرم ہوگا۔ لیکن کیا ایڈمنٹن کی یخ بستگی میں جو حرارت ہمیں ملی تھی اس کا مقابلہ باہر کا کوئی موسم کر سکتا ہے؟

میرا خیال ہے — نہیں!

لاس اینجلس

لاس اینجلس ریاست کیلیفورنیا کا وہی مشہور شہر ہے جہاں ۱۹۸۴ء میں اولمپکس ہُوئے تھے، جہاں محمّد علی باکسر رہتا ہے، جہاں فلمی دُنیا کا مرکز ہالی وُڈ واقع ہے، جہاں ڈزنی لینڈ ہے، سٹارداک ہے، روشنی ہے، رنگ ہے، خوشبو ہے اور اِن کے علاوہ وہ سب کچھ بھی ہے جس کی بدولت دوزخ میں داخلہ آسانی سے مِل جاتا ہے۔

ریاست کیلیفورنیا اِس اعتبار سے قُدرت کا ایک عجوبہ ہے کہ اِس کی جغرافیائی حدود کے اندر کم و بیش دُنیا کا ہر موسم اور زمینی کیفیت مِل جاتی ہے: پانی، پہاڑ، برف، صحرا۔ لاس اینجلس شہر کے گرداگرد اگر دو سو میل قُطر کا ایک دائرہ کھینچا جائے تو ایک ہی موسم میں یہ سب منظر آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کسی نے کہا لاس اینجلس ایک بگڑا ہُوا لفظ ہے اصل میں یہ where angeles lost (جہاں فرشتے کھو جاتے ہیں یا کھو گئے تھے؟) تھا اور غالباً یہی وہ جگہ ہے جہاں ہاروت اور ماروت اُترے تھے اور پھر واپس جانے سے انکاری ہو گئے تھے۔

ایڈمنٹن کے منفی c. 19 درجہ حرارت سے جب ہم لاس اینجلس کے مثبت c. 63 ٹمپریچر میں داخل ہوئے تو عالی کا اوورکوٹ ایک بار پھر لطیفے کی شکل اختیار کر گیا کیونکہ یہاں شُرفاء ٹی شرٹیں پہنے پھر رہے تھے اور شُرفیاں (خواتین کے حوالے سے شُرفاء کی یہ جمع ایسی غلط بھی نہیں!) غالب کا مصرعہ اوڑھے گھوم رہی تھیں:

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

ائیرپورٹ پر فارغ بخاری کے صاحبزادے ظفر عباس اور نیّر جہاں ہمارے منتظر تھے۔ نیّر جہاں چند برس پہلے پاکستان آئی تھیں اور اخبارات میں اُن کے مختلف پروگراموں کے بارے میں بہت کچھ چھپا بھی تھا۔ اُن کی شاعری، میڈیکل سائنس کے ایک جدید شعبے میں خصوصی قابلیت، یوگی، غریب الوطنی

اور حالات سے بہادرانہ مقابلے کی تفصیلات بھی مختلف حوالوں سے ہمیں مل چکی تھیں چنانچہ کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہُوا۔ نیرّ جہاں کے ساتھ اُن کے چھوٹے بھائی متین تھے جو بھوپال (ہندوستان) سے آئے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے بائیو میڈیکل انجینئر تھے اور بہت سی چیزیں ایجاد کر چکے تھے۔ اُن کا ایجاد کردہ ایک آلہ اِس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کا تعلق شیر خوار بچوں کی ایسی بیماری سے ہے جس کے باعث سینکڑوں پھول کِھلنے سے پہلے شاخوں سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ متین نے بتایا کہ حمل کے دوران بعض پیچیدگیوں کی وجہ سے بچے کے سر میں پانی جمع ہو جاتا ہے جسے مختلف طریقوں سے نکالنے یا خشک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں کامیابی کا اوسط ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ اُن کے ایجاد کردہ آلے کی مدد سے بچے کے سر کا پانی اُس کے کان کے اندر سے ایک نالی کے ذریعے گزار کر دل تک پہنچایا جاتا ہے جہاں وہ خون میں حل ہو کر صاف ہوتا ہے اور یوں بچہ چند دنوں میں مکمل طور پر صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہڈیوں کے اندر گودے کے سُوکھنے، ختم ہو جانے یا نہ بننے کا علاج بھی انھوں نے دریافت کیا ہے۔ یہ ایک ایسی خوفناک بیماری ہے جس کا تعلق بلڈ لیکومیا اور کینسر سے بہت گہرا ہے اور جس کی وجہ سے بے شمار جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ مَیں نے انھیں بتایا کہ ہمارے ٹی وی کی ایک بہت اچھی اور پیاری فنکارہ طاہرہ نقوی جو میری ذاتی دوست بھی تھی، اِس نوع کی بیماری کے باعث عین عالمِ شباب میں ہم سے رُخصت ہو گئی۔ متین نے بتایا کہ اُس نے ہڈیوں کا گودا بنانے اور اسے دوبارہ ہڈیوں میں بھرنے کے سلسلے میں بہت سے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ نیرّ جہاں کے بارے میں معلوم ہُوا کہ انھوں نے مختلف انسانی اعضا خصوصاً گُردوں کی transplanation کے سلسلے میں خصُوصی کورسز کیے ہیں اور اِس وقت وہ ایک بہت بڑے ادارے میں اس مخصوص شعبے کی چیف ایکسپرٹ کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ وہ مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد رپورٹ دیتی ہیں کہ کوئی عضو کسی جسم کے خون اور ٹشوز کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

نیرّ جہاں کے چھوٹے سے مگر باسلیقہ فلیٹ میں چائے پینے کے دوران ہم لوگ اِن بہن بھائیوں کی قابلیت پر رشک کرنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ نیرّ جہاں نے یہ بتا کر ہمارے قدموں تلے سے زمین نکال دی کہ وہ دونوں تو سٹیلائٹ ہیں، اصل ستیارہ تو اُن کا ایک اور بھائی ہے جس نے میڈیکل سائنس کی دُنیا میں تہلکہ مچا رکھا ہے اور جس کی قابلیت سے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے ماہرین

بھی خائف رہتے ہیں۔ متین کے انداز اور طرزِ گفتار میں نسوانیت کی ایک جھلک سی تھی، موقع ملتے ہی پروین نے میری توجہ اُس طرف مبذول کروائی، مَیں نے آہستہ سے کہا:

"مَیں کیا عرض کروں، تمھارے یو پی کا کیس ہے، البتہ اس سے ایک بات ثابت ہو گئی ہے کہ ہم پنجاب والے اگر زیادہ نستعلیق نہیں ہیں تو یہ کوئی ایسی بُری بات بھی نہیں۔"

نیرّ جہاں بڑی حوصلے والی خاتون ہیں۔ زندگی کے اس جوار بھاٹا میں انھوں نے جس طرح اپنی شخصیت کی اکائی کو قائم رکھا ہے اور جس غیر معمولی جرأت اور مسلسل محنت سے اِس گیند کی طرح لڑھکتی ہُوئی زمین پر اپنے اُکھڑے ہُوئے پاؤں دوبارہ جماتے ہیں اس کی داستان بہت عجیب، خوفناک اور زندگی آموز ہے۔ آزادی کے بعد یو پی کے بہت سے مُسلمان گھرانوں کی طرح اُن کا خاندان بھی تقسیم ہو گیا۔ انھوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ شادی ہوئی۔ شوہر سابقہ مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش میں اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ تین بچیوں اور میاں بیوی پر مشتمل یہ چھوٹا سا گھرانہ درمیانے درجے کی عزت دارانہ زندگی گزار رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کی زمین غیر بنگالیوں پر تنگ ہونا شروع ہو گئی۔ نیرّ جہاں کا خیال تھا کہ غم و غصّے اور نفرت کا یہ طوفان سیاست کی سطح پر اپنا راستہ بنائے گا مگر جب دریا کناروں سے باہر نکلا تو اُس نے سب سے پہلے اُنہی کے گھر کا رُخ کیا۔ فسادیوں نے اُن کے شوہر کو شہید کر دیا اور گھر کو لُوٹنے کے بعد بجلی پانی کاٹ دیا۔ آٹھ روز تک نیرّ جہاں کو تین معصوم بچیوں اور شوہر کی لاش کے ساتھ اپنے خوابوں کے گھر میں اس طرح سے رہنا پڑا کہ ہر لمحہ موت کا پیغامبر بن کر آتا اور رُوح کو کاٹتا ہُوا گزرتا تھا۔ نیرّ جہاں نے بتایا کہ اُن کے مرحوم شوہر کو موم بتیاں جمع کرنے کا عجیب و غریب شوق تھا۔ کسی دوسرے ملک جاتے تو وہاں سے موم بتیاں ضرور خرید کر لاتے تھے۔ یُوں اُن کے گھر میں ہر طرح کی موم بتیوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا جس پر احباب کے دلچسپ تبصرے ہُوا کرتے تھے۔ کون کہہ سکتا تھا ایک دن یہی موم بتیاں اُس روشنی سے محروم تاریک گھر میں اُس مرحوم کے سرہانے جلنے کے لیے جمع ہو رہی تھیں!

اِس واقعے کو تیرہ برس بیت چکے ہیں۔ بی اے پاس گھریلو بیوی اب سرجیکل سائنس کے ایک مخصوص شعبے میں خصوصی مہارت حاصل کر چکی ہے۔ اُن کی معصوم، بے سہارا بچیاں اعلیٰ تعلیم کے مختلف مدارج طے کر کے ڈھاکہ سے دس بارہ ہزار میل دُور ایک مکمل اجنبی معاشرے میں آزادی اور خود اعتمادی کے ساتھ

زندگی بسر کر رہی ہیں اور اُن کی ماں کے سامنے اُن تینوں کے مستقبل کی فکر ہے اور پیچھے اندھیرا ہی اندھیرا ہے اِس کے باوجود اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسا اعتماد ہے کہ زندگی کی معنویت پر یقین آنے لگتا ہے۔

ناشتے کی میز پر مَیں نے نیرّ جہاں کی شخصیت کا ایک اور رُوپ دیکھا۔ وہ ایک گھریلو عورت کا سلیقہ اور سگھڑ پن تھا۔ مزیدار ناشتہ اور کھِلانے والے کا خلوص یکجا ہو جائیں تو یہ عام طور پر مہمانوں کے معدے کے لیے کوئی اچھی صُورتِ حال نہیں ہوتی چنانچہ ہم لوگوں نے ناشتے کی شکل میں لنچ سے بھی فراغت حاصل کرلی۔ نیرّ جہاں، اس کی موجود دو بیٹیاں اور متین، سب لوگ نہ صرف متواضع اور خلیق تھے بلکہ غیر معمولی طور پر ذہین بھی تھے چنانچہ اُن سے گفتگو کا مزا اپنی جگہ تھا۔ میں نے نیرّ جہاں سے پُوچھا:

"آپ نے شاعری سے سیدھے میڈیکل سائنس میں کیسے جست لگالی؟ اِس طرف آپ کا ذہنی رجحان تھا اور نہ ہی ماضی میں اِس تبدیلی کی طرف ہلکا سا اشارہ نظر آتا ہے۔"

"یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں بھیّا۔ مَیں تو ایک سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ مُجھے تو اپنے شاعرہ ہونے کا گُمان بھی نہیں تھا۔ کیا پتا تھا لکھنے والے نے میرا رزق اس جگہ بھی لکھ رکھا ہے۔"

ظفر عباس ہمارے بزرگ دوست اور ترقی پسند شاعر فارغ بخاری کا بڑا بیٹا ہے اور برسوں سے یہیں مقیم ہے۔ سیدھا سادا، محبت کرنے والا نوجوان۔ شروع میں اس کا ارادہ تھا کہ فارغ سے دوستی کے حوالے سے مُجھے کچھ کچھ "چچا" کے بطور دیکھے مگر مَیں نے چھُوٹتے ہی اُسے احساس دلا دیا کہ میری اور اس کی عمروں میں زیادہ سے زیادہ ایک دو برس کا فرق ہوگا اور وہ بھی پتا نہیں کس طرف ہے اس لیے وہ میری عزت بے شک کرے مگر یہ چچا وچا کا تکلف نہ کرے کیونکہ اس صورت میں مجبُوراً مجھے فارغ کو چچا بنانا پڑے گا۔ ظفر عباس کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور ابتدائی ملاقات کے بعد سے اُس نے وہ رویّہ اپنایا جو صحیح اور اُس کی عُمر کے عین مطابق تھا۔ اِس پر مَیں نے اسے فارغ صاحب کا ایک دلچسپ مصرعہ سُنایا: اس عُمر میں بھی بخاری بڑا شرارتی ہے۔

ظفر عباس نے مُسکرا کر کہا: "یہ مصرعہ 'صحیح بخاری' کا ہے —— میرا نہیں۔"

رات کا کھانا پروین کی بچپن کی سہیلی امینہ عرف 'بیچُو' کی بہن کے گھر تھا جو ایک مختک، سادہ

شکل اور ملنسار خاتون تھی۔ اُس کا میاں الیاس اُونچا لمبا خوش نما نوجوان تھا۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُسے شاعری یا شاعروں سے کوئی خاص واقفیت اور دلچسپی نہیں۔ وہاں عارف صاحب سے ملاقات ہوئی جو میرے اور پروین کے مجوزّہ میزبان تھے۔ پروین بیچو سے ملاقات پر اتنی exited تھی کہ اُس نے ہم کو یکسر فراموش کر دیا اور اُسی طرح کی احمقانہ باتیں کرنے لگی جیسی خواتین عام طور سے ایسے موقعوں پر کیا کرتی ہیں یعنی کسی بات کا گزشتہ اور آئندہ بات سے تعلق نہیں ہوتا بس ایک رَو میں بولے چلی جاتی ہیں، بغیر وجہ کے ہنس پڑتی ہیں، ایک دم کچھ سوچ کر سنجیدہ اور پھر رنجیدہ ہو جاتی ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے کسی اور بھولے بسرے واقعے یا سہیلی کا ذکر کر کے پھر ہنسنے لگ جاتی ہیں۔ بیچو بہت زیادہ اُمید سے تھی، اُس کے لیے بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کا میاں سعید ایک اچھے اور سعادت مند شوہر کی طرح اس کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا جس کی وجہ سے الیاس کو چھیڑنے اور بیچو کو اُسے گھورنے میں خاصی آسانی پیش آ رہی تھی۔

کھانے اور گپ شپ کے دوران میں کب پروین اور بیچو کا پروگرام بنا اس کا مجھے علم نہیں لیکن پروین کا یہ اعلان کہ وہ عارف صاحب کے گھر کی بجائے بیچو کے ساتھ ٹھہرے گی اس محفل میں ایک بم کی طرح پھٹا۔ ہر شہر کی طرح یہاں بھی منتظمین کے درمیان مقامی سیاست چل رہی تھی۔ بحث و تمحیص کے بعد مہمانوں کو ٹھہرانے، لانے لے جانے اور مشاعرے کے انعقاد کے سلسلے میں تقسیمِ کار کے مختلف مسائل طے پا چکے تھے۔ نیر جہاں اپنی منضبط طبیعت کے باعث پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی کے حق میں نہیں تھیں۔ کم و بیش یہی خیال ظفر عباس کا تھا۔ ہمارے مجوزّہ میزبان عارف صاحب بظاہر بالکل نیوٹرل تھے جب کہ بیچو اینڈ کمپنی اپنے یک طرفہ فیصلے کے لیے منتظمین کی رسمی اجازت سے بے نیازی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ماحول میں یک دم tension پیدا ہو گئی۔ میرا خیال ہے اگر اس وقت پروین ذرا سمجھ داری سے کام لیتی اور اپنی طرف سے تھوڑی سی معذرت اور ندامت کا اظہار کر دیتی تو معاملہ خوش اُسلوبی سے طے ہو جاتا مگر وہ بھی یوپی کی تھی، سیدھی بیچو فیملی کے گروپ میں جا کھڑی ہوئی اور فیصلہ سُنا دیا کہ ہم تو بیچو کے ساتھ جائیں گے۔

میری پوزیشن بہت نازک ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خواہ مخواہ کی بدمزگی سے کیسے نکلا جائے۔ عارف صاحب نے بڑے رسمی لہجے میں مجھ سے میرا پروگرام پوچھا۔ میں نے کہا:

"پیچو پروین کی سہیلی ہے، میری نہیں، مَیں آپ کے ساتھ چلتا ہوں، یہ دونوں سہیلیاں آج جی بھر کے باتیں کرلیں اور غیبتوں کے شامیانے تان لیں، کل پروین بھی آپ کی طرف آجائے گی۔"

اپنی طرف سے تو مَیں نے یہ بات صورتِ حال کی تلخی ختم کرنے کے لیے کی تھی مگر پروین نے غالباً نیّر جہاں کو چڑانے کے لیے کہا:

"نہیں بھئی، ہماری مرضی، ہم تو پیچو کی طرف ہی رہیں گے ـــ مہمانوں کو بھی کچھ چوائس کا حق ہونا چاہیے۔"

جُملے کا رُخ نیّر جہاں کی طرف تھا مگر یہ لگا سیدھا عارف صاحب کو، اُنھوں نے گھڑی دیکھی اور اپنی جگہ سے اُٹھتے ہُوئے بولے: "مَیں نے اور میرے بیوی بچّوں نے آپ لوگوں کے لیے دو دن لگا کر کمرے تیار کیے تھے، بہرحال آپ کی مرضی!"

نیّر جہاں اور ظفر عباس مجھے سمجھانے لگے کہ پروین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مَیں نے عالی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا جو ایک مہمان سے اِنتہائی انہماک کے ساتھ عالمانہ اور اپنے کالموں جیسی اعداد و شمار زدہ گفتگو کر رہے تھے اور انہیں غالباً پتا ہی نہیں تھا کہ وہاں گفتگو کا موضوع اور مزاج کیسا چل رہا ہے۔ بڑے سرسری انداز میں بولے: "بھئی رہیں آپ لوگ جہاں مرضی مگر اس امر کا خیال رکھیں کہ صُبح دس بجے ہمیں یونیورسل سٹوڈیو پہنچنا ہے۔"

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پیچو کے گھر سے عارف صاحب کا گھر تقریباً ستر میل کے فاصلے پر تھا اور یونیورسل سٹوڈیو اُن کے گھر سے چالیس میل اور پیچو کے گھر سے تقریباً ساٹھ میل تھا، ظفر عباس کا گھر (جس نے ہم لوگوں کو یونیورسل سٹوڈیو لے کر جانا تھا) ایک اور سمت میں کوئی تیس میل دُور تھا۔ فاصلوں اور سمتوں کے اِس چکر نے کچھ ایسا پریشان کیا کہ بالآخر نیّر جہاں کے گھر کو مقامِ اتصال ٹھہرانا پڑا جو اتفاق سے اِن سب فاصلوں کے تقریباً درمیان میں پڑتا تھا البتہ عارف صاحب کا گھر وہاں سے بھی بہت دُور تھا۔ پیچو نے مشورہ دیا کہ آج رات کے لیے (جو اس وقت آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی) مَیں بھی اُن کے ساتھ چلا چلوں، صُبح سعید مجھے اور پروین کو نیّر جہاں کے گھر ڈراپ کر دے گا، سٹوڈیو سے واپسی پر وہ لوگ اُسے وہیں سے لے لیں گے، مَیں اگر چاہوں تو بے شک کل عارف صاحب کی طرف منتقل ہو جاؤں!

اِس ساری بک بک جھک جھک کا نتیجہ یہ نکلا کہ پروین اور نیّر جہاں میں ایک ایسی سرد جنگ کا آغاز ہو گیا جو ہماری وہاں سے روانگی تک مسلسل ترقی پذیر رہی۔ پروین کی ناراضگی کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس نے کلثوم اعجاز محمّدی کو نیّر جہاں پر ترجیح دینا شروع کر دیا اور میری ہر مصالحتی کوشش کا ایک ہی جواب دیا: "آپ بیچ میں نہ بولیں ــ امجد بھائی!"

عام حالات میں پروین بڑی معقولیت اور سمجھ داری کا ثبوت دیتی ہے اور خاص طور پر میری باتیں شدید اختلاف کے باوجود بڑے تحمّل سے سُن لیا کرتی ہے، مَیں آج بھی حیران ہوں کہ دو اتنی اچھی اور معقول خواتین کے درمیان یہ تنازعہ کیوں اور کس طرح پیدا ہُوا! ایسے موقعوں پر مُجھے مشہور کرکٹر سرلین ہٹن کا ایک تاریخی جُملہ بہت یاد آتا ہے، اُس نے کہیں لکھا ہے:

"Cricket pitches are like women, always unpredictable."

ہالی وُڈ کا نام لیتے ہی ذہن فوراً فلم کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لاس انجلیس کے مضافات میں واقع یہ شہرِ فلمی دُنیا کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں دُنیا کا (غالباً) مہنگا ترین رہائشی علاقہ بیورلے ہلز بھی واقع ہے جو امریکہ جیسے امیر ملک میں بھی سٹیٹس سمبل ہے۔ کسی بھی فلم سٹار کی کامیابی اور مالی حیثیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے پاس بیورلے ہلز میں ذاتی مکان ہے یا نہیں! گلیمر، فیشن اور حُسن کے اس گہوارے میں یوں تو کئی سٹوڈیو ہیں مگر یونیورسل سٹوڈیو کو اپنی قدامت، وسعت، وسائل اور تخلیقات کی وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ سٹوڈیو اتنا بڑا ہے کہ اِس کے اندر ازمنۂ قدیم کی وحشی بستیوں سے لے کر خلائی شہروں تک کے سیٹ لگائے جاسکتے ہیں۔ کاؤ بوائے، ریڈ انڈین اور wild west سے متعلق یہاں اِس قدر فلمیں تیار ہوتی ہیں کہ سترھویں اٹھارویں صدی کے پورے پورے شہروں کے مختلف سیٹ یہاں مستقل طور پر لگا دیے گئے ہیں یعنی ایکٹر اور کیمرہ لے آیئے، دو سو سال قبل کا پورا ماحول اپنی ممکنہ جزئیات سمیت آپ کی شوٹنگ کے لیے حاضر ہے۔

امریکہ والوں کا ایک کمال یہ ہے کہ اُنھیں چیزیں بیچنے کا فن آتا ہے۔ لاس انجلیس آنے والے سیّاحوں کے لیے یونیورسل سٹوڈیو کی یاترا ایک اہم فریضے کی حیثیت رکھتی ہے سو اُنھوں نے اس یاترا کو سیّاحوں کے لیے دلچسپ اور اپنے لیے مفید بنانے کا باضابطہ انتظام کر دیا ہے۔ چودہ عدد امریکی ڈالر خرچ کیجیے اور سٹوڈیو والوں کے مہمان بن جایئے جو آپ کو guided tour کے ذریعے سٹوڈیو کے

تمام اہم حِصّوں اور قابلِ ذکر مقامات کی audio visual سیر کروا دیتے ہیں۔

خوبصورت لمبی لمبی ایئرکنڈیشنڈ بسیں آپ کو ایک ایسی جگہ لے جاکر اُتارتی ہیں جہاں ایک گائڈ مائکروفون کے ذریعے سٹوڈیو کے بارے میں آپ کو بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔ آپ کی مخصوص بس اور سیٹ کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔ سیر کے مختلف مراحل سے آگاہ کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے چٹکلے چھوڑتا ہے۔ ماضی کی مشہور فلموں اور اداکاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے کہ کس کا ڈریسنگ رُوم کہاں واقع ہے/تھا۔ مختلف بین الاقوامی شہرت کی حامل فلموں میں استعمال ہونے والا خصوصی سامان (props) کہاں کہاں رکھا ہے، وغیرہ وغیرہ وغیرہ!

عمومی بریفنگ کے بعد اس گائڈ نے ہمیں ایک دوسرے گائڈ کے حوالے کیا جو ایک سیاہ فام، پھرتیلا اور مسخرا نوجوان تھا۔ اُس کے لطیفے سُن کر مجھے اپنا دلدار پرویز بھٹّی بہت یاد آیا۔ مجھے یقین ہے اگر یونیورسل سٹوڈیو کے منتظمین ایک بار بھٹّی کو بولتے ہوئے سُن لیں تو اُس گائڈ غریب کی نوکری پر کاری ضرب لگ سکتی ہے۔ افریقی مسخرے کے ذکر پر مجھے بھٹّی کا ایک بہت زندہ اور پھڑکتا ہُوا جملہ یاد آرہا ہے۔ پنجاب میں اکثر کشمیری 'بٹ' کہلاتے ہیں اور اپنے سُرخ و سفید رنگ کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ایک بار کسی شخص نے دلدار بھٹّی کے سانولے رنگ پر جُملہ کسا تو اُس نے بڑی بے ساختگی سے جواب دیا: "تمھیں شاید اس بات کا علم نہیں اگر میں سوڈان میں ہوتا تو لوگ مجھے بٹ صاحب کہہ کر بلاتے۔"

ہم ایک بہت بڑے ہال میں داخل ہوئے جہاں بیٹھنے کے لیے لمبے لمبے ڈیسک نما تختے بچھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا یہاں چند برس پہلے تک مشہور تاریخی فلموں Ben Hur اور Ten Commandme nts کے کچھ مشہور سینوں کی پکچرائزیشن کی اصلیت دکھائی جاتی تھی، اب زمانہ بدل گیا ہے اس لیے اُن کی جگہ Star Wars نے لے لی ہے۔ مشہور امریکی اداکار Robert Wagner ایک پہلے سے ریکارڈ کی ہوئی وڈیو فلم کے ذریعے سامعین سے اِس طرح مخاطب ہوتا ہے جیسے وہ براہِ راست اُن سے بات چیت کر رہا ہے۔ اُس نے سٹار وارز میں استعمال ہونے والے مختلف کیمرہ ٹرکس، سامان اور سپیشل ایفیکٹس پر روشنی ڈالی اور اس کے ساتھ ساتھ اُن مناظر کی فلمی صُورت اور اصل حقیقت ایک فلم کے ذریعے دکھائی گئی۔ اِس سارے کاروبار کی حُسن کاری، کاریگری اور حیرت انگیزیاں اپنی جگہ

لیکن تمام عرصہ یہ خوفناک خیال میرے ذہن میں سانپ کی طرح سرسراتا رہا کہ انسان کس قدر تیزی سے اپنی جگہ بے حس مشینوں کے لیے خالی کرتا جارہا ہے!

اِس گائڈڈ ٹور کے دوران سٹوڈیو والے ناظرین کی تفریحِ طبع کے لیے چار لائیو شو بھی پیش کرتے ہیں۔ پہلے شو کا نام A team تھا اور اس میں موٹر سائیکلوں اور ڈرائیونگ کے مختلف سٹنٹ دکھائے گئے تھے جن میں سے بعض واقعی بے حد خطرناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔ اصلی وہیکلز، اصلی بندے اور نقلی اسلحے پر مبنی پندرہ بیس منٹ کا یہ شو ایک وسیع میدان میں پیش کیا گیا۔ وہ دن خلافِ معمول خاصا سرد تھا اور تیز ہوا میں کھُلے میں بیٹھنا خاصا مشکل ہو رہا تھا اِس کے باوجود جب شو کے آخر میں حصّہ لینے والے فنکار الوداعی سلام کے لیے ناظرین کے سامنے آئے تو اُن کے چہرے اور لباس پسینے سے تربتر ہو رہے تھے۔ اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا:

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

دوسرا شو ایک مشہور فلم کونان دی باربیرین کے ایک سین پر مشتمل تھا جس میں ماقبلِ تہذیب کی انسانی زندگی کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ اِس شو پر پروین کا ریمارک بڑا مزیدار تھا، بولی: "یہ غالباً اِس لیے دکھایا ہے کہ یہاں بُری فلمیں کس طرح بنائی جاتی ہیں!"

تیسرا شو سدھائے ہُوے جانوروں اور اُن کے مختلف کرتبوں پر مبنی تھا۔ مَیں نے عالی سے کہا: "اِس شو کا نام تو تیسری دُنیا ہونا چاہیے۔ وہاں بھی تو سدھائے ہُوے جانور ہی مختلف کرتب دکھاتے رہتے ہیں۔"

"ہاں ــــ لیکن انسان ذرا مشکل جانور ہے۔" عالی نے ہنکارا بھرتے ہُوے کہا۔

اِتنے میں ایک کُتّا سٹیج پر آیا۔ کرتب دکھانے والی لڑکی نے اپنے دونوں بازو پھیلائے، کُتّا اس سے بغل گیر ہُوا اور دونوں برسرِ عام بوس و کنار کرنے لگے۔ پروین نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، حاضرین نے خوش ہو کر بھرپُور تالیوں کی مدد سے اُن دونوں "محبت کرنے والوں" کو داد دی۔ ہم سے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہُوے ایک 'لوکل' نے زور سے ہنس کر کُتّے کو ایک رقیبانہ انداز کی گالی دی، ایک دم جیسے بابا بُلھے شاہ کی مشہور کافی میرے کانوں میں گونج سی گئی:

اُٹھ بُلھیا، اُٹھ کے یار منا لے نہیں تاں بازی لے گئے کُتّے۔ تَیں تھیں اُتّے۔ دبلھے شاہ، اُٹھ اور

اُٹھ کے اپنے یار کو راضی کر دو ورنہ کُتے بازی لے جائیں گے اور تجھ سے بلند تر رُتبے پر فائز ہوں گے، بعض اوقات علامت جب ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آتی ہے تو کتنی گھناؤنی اور ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے!

چوتھا اور آخری شو بھی مختلف قسم کے سٹنٹوں پر مبنی تھا البتہ یہاں زیادہ زور ایکشن کے سینوں میں استعمال ہونے والے کرتبوں پر تھا: چاقو زنی، دست بدست لڑائی، عمارتوں سے گرنا اور اُن پر چڑھنا، گولی چلانا اور کھانا، جسم میں تیر یا نیزہ پیوست کرنا، کسی کو زندہ زمین میں دفن کرنا یا کسی مشین کے ذریعے سے کچل دینا اور اسی نوع کے دیگر ایکشن دکھاتے گئے مگر اِن سب سے زیادہ دلچسپ ایک نقلی چارلی چیپلن تھا جو مختلف مزاحیہ حرکتوں کے ذریعے لوگوں کو ہنسا رہا تھا اور لُطف کی بات یہ ہے جس آدمی کے ساتھ وہ کوئی شرارت کرتا بعض اوقات اُسے آخر تک پتا نہیں چلتا تھا لوگوں کے قہقہوں کا ہدف اُس کی اپنی ذات ہے۔

سردی اور تیز ہوا کے باعث عالی نے اِس آخری شو کے بارے میں باحسرت دیا س اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور سٹوڈیو کے ٹکٹ کاؤنٹر کے سامنے واقع ایک کیفے میں ملنے کا کہہ کر ہم سے رُخصت ہو لیے۔ اس وقت تو ہم نے اُن کے اس اقدام کو غیر کھلاڑیانہ قرار دے کر اُن پر بہت جُملے بازی کی مگر اب جو سردی نے ہڈیوں کا مزاج پُوچھنا شروع کیا تو معلوم ہُوا کہ تجربہ (چاہے عالی جی کا ہی کیوں نہ ہو) بڑی چیز ہوتا ہے۔

ہم نے کیفے میں داخل ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی، مرد و زن کا ایک ہجوم آتشِ سیال سے فیضیاب ہو رہا تھا۔ عالی ایک دُور دراز کونے میں کافی کا مگ سامنے رکھے مزید سامنے دیکھ رہے تھے چنانچہ کچھ دیر اُنھیں ہمارے آنے کا پتا نہیں چلا۔ مَیں نے عالی کی نظروں کا تعاقب کیا اور اِس نتیجے پر پہنچا کہ اُن کی وہ خود فراموشی کچھ اتنی بے محل بھی نہیں تھی۔ عالی نے اطلاع دی کہ کافی اگرچہ اچھی نہیں مگر اس سردی میں بیر واحد جائز مشروب ہے اِس لیے اِسی سے گزارہ کرو۔ ہم نے اُن کے مشورے پر عمل کیا اور کافی کی جتنی بُرائی انھوں نے کی تھی اُسے اس سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ مَیں نے ایک گھونٹ لیا اور کہا: "پنجابی میں مجبوری کے عالم میں کسی چیز کے برداشت کرنے کو 'کوڑا گھُٹ' (کڑوا گھونٹ) کرنا کہا جاتا ہے، معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ تسمیہ اسی طرح کی کوئی کافی رہی ہو گی۔"

جب سے ہم نے .L.A میں قدم رکھا تھا مختلف حوالوں سے کوئی چار بار سٹار واک کا نام سُن چکے تھے۔ سعید نے کہا: "لاس اینجلس میں ڈزنی لینڈ اور یونیورسل سٹوڈیو کے علاوہ تیسری قابلِ دید چیز سٹار واک ہے۔ آپ چونکہ ڈرامے اور فلم وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا آپ کے لیے تو اِسے نہ دیکھنا گناہِ کبیرہ ہوگا۔"

مَیں نے کہا: "اے عزیزِ باتمیز، اِس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کرو۔"

بولا: "یہ سُننے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہے۔"

ہم نے کہا: "تو پھر چلو۔"

سعید نے ایک جگہ موٹر روکی، جتنی دیر میں کار پارک ہوئی اُس سے چار گنا وقت پیچو کو اُس میں سے نکلنے میں لگا۔ عورتوں کے آدھے گناہ تو صرف حمل کے دورانیے اور وضعِ حمل کی تکلیف کے باعث معاف ہو جانے چاہئیں۔ ماں بننے کی خوشی، راحت اور درجہ اپنی جگہ مگر ایسے عالم میں کسی عورت کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے اُس بے چاری پر انتہائی ترس آتا ہے۔ کیسی کیسی پھُولوں میں تلنے والی عورت ڈینو سار کی شکل اختیار کر جاتی ہے!

Star Walk اصل میں ایک فُٹ پاتھ کا نام ہے جو پتھر کی بڑی بڑی سلوں سے بنایا گیا ہے۔ ہر سل یا سلیب کے درمیان میں ایک ستارہ ہے جس کے اندر شو بزنس کی کسی بہت اہم شخصیت کا نام کندہ ہوتا ہے۔ آسمانِ شہرت کی بلندی کو چھُونے والی امریکی فنونِ لطیفہ کی چیدہ چیدہ نامور ہستیاں یہاں سے گزرنے والوں کے پیروں میں ہوتی ہیں۔ عزت اور مقام دینے کا یہ انوکھا طریقہ غالباً امریکی ذہن ہی ایجاد کر سکتا تھا! سعید نے بتایا کہ اس سٹار واک کا تازہ ترین ستارہ مشہور پاپ سنگر مائیکل جیکسن ہے جس کا نام ابھی حال ہی میں ایک خالی ستارے میں لکھا گیا ہے۔ ہم مختلف ناموں کو پڑھتے اور اپنی معلوماتِ عامہ کا امتحان لیتے ہُوئے ایک سینما ہال تک پہنچے جہاں سے یہ واک شروع یا ختم ہوتی تھی۔ یہ ایک قدیم سینما گھر تھا جس کے صحن میں فلمی دُنیا کے مشہور ستاروں کے ہاتھوں اور پاؤں کے نشانات اور دستخط گیلے گارے میں اس طرح لیے گئے تھے کہ سیمنٹ وغیرہ سُوکھنے کے بعد اُن کے نقش ہمیشہ کے لیے پتھروں میں محفوظ ہو گئے تھے۔ مَیں نے وہاں رُک کر دُور تک جاتی ہُوئی سٹار واک کو دیکھا اور پروین سے کہا: "بھئی مصطفےٰ زیدی کے ایک بہت مشہور شعر کے معنی یہاں آکر بدل گئے ہیں۔"

بولی: "وہ کیسے؟"

"اُس کا شعر ہے نا: اِنہی پتھروں پہ چل کے اگر آسکو تو آؤ!!

مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

اب دیکھو یہ ایسا عجیب و غریب راستہ ہے کہ آدمی آتا تو پتھروں پہ چل کر ہی ہے مگر دیکھو تو یہ پتھر کسی کہکشاں سے کم بھی نہیں ہیں!"

سینما کے صحن کے دائیں جانب ایک کونے میں لکڑی کے ایک پُرانے سے سٹینڈ پر بہت سی تصویریں لگی تھیں۔ مَیں نے سوچا شاید یہاں بھی ہمارے یہاں کے سینما گھروں کی طرح فلموں کے فوٹو سیٹ لگانے کا رواج ہو مگر قریب جا کر دیکھا تو ایک خوشگوار حیرت ہماری منتظر تھی۔ ابتدا سے لے کر اب تک کے تمام آسکر انعام یافتگان (بہترین ایکٹر اور بہترین ایکٹرس) کی تصویریں ترتیب کے ساتھ وہاں چسپاں تھیں اور نیچے درج تھا کہ متعلقہ فنکار کو یہ انعام کس سال اور کس فلم پر ملا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز کیتھرین ہیپبرن کی دو تصویریں تھیں جسے 1932 میں پہلا اور 1967 میں دوسرا آسکر ایوارڈ ملا تھا۔ اس سے آپ اِس بے مثال فنکارہ کے درمیانی پینتیس برسوں کے کارناموں کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

سعید نے مشورہ دیا کہ کھانا چینی اسلامی ریستوران میں کھایا جائے۔ چین میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تو ہمیں پتا تھا مگر .L.A میں اس نوع اور نام کا کوئی ہوٹل بھی ہوگا، یہ بات ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھی چنانچہ ہم نے اِس عجوبے کو دیکھنے کے لیے فوراً ہاں کر دی۔ راستے میں ایک جگہ سعید نے گاڑی روک کر بتایا کہ یہ عمارت یہاں کا اِسلامک سنٹر ہے اور یہاں ہر جمعے کو مشہور باکسر محمد علی کلے اپنے بچوں کے ساتھ نماز پڑھنے آتا ہے۔ اکبر نے برسوں پہلے کہا تھا:

سدھاریں شیخ کعبے کو، ہم انگلستان دیکھیں گے

وہ دیکھیں گھر خُدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

لاس اینجلس کے اسلامی سنٹر کے دروازے پر کھڑے ہو کر چند منٹ دُنیا کو دیکھیے تو ایک ٹکٹ میں دونوں مزے مل جاتے ہیں۔

اِسلامی چینی ریستوران عالمِ اسلام کی زبوں حالی اور چینیوں کی تاریخی جدّ و جہد کا مُنہ بولتا نمونہ تھا۔ ایک ویٹرس نما مالکہ سر سے پاؤں تک عربی طرز کے لباس میں ملفوف سروس کر رہی تھی اور اُس کا میاں

(غالباً) ایک نامکمل الماری کے کچھ تختے جوڑنے یا شاید توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سات آٹھ میزوں میں سے صرف دو پر گاہک موجود تھے جو ہمیں دیکھتے ہی یوں رُخصت ہُوئے جیسے کچھ اُدھار وغیرہ کا معاملہ ہو۔ عربی حور کی مکمل توجہ اب ہماری طرف تھی مگر یہ توجہ کچھ ویسی ہی تھی جس کی ترجمانی رُوحی کنجاہی کے مشہور مصرعے میں کچھ یوں کی گئی ہے :

حالانکہ اِس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

دُنیا کے پانچ چھ ملکوں میں دُلطف کی بات یہ ہے کہ ان میں چین شامل نہیں !) چینی کھانا، کھانے کا موقع ملا ہے مگر یہ اسلامی چینی ریستوران پہلی اور اب تک کی آخری جگہ ہے جہاں میدے کی پُوری نما روٹی بھی موجود تھی اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہی روٹی اس کھانے کا بہترین حصہ تھی۔ چائنہ ٹاؤنز کے بعد اب چینی کھانے بھی مغرب کے شہروں کا لازمی حِصّہ بنتے جا رہے ہیں۔ جوابی کارروائی کے طور پر اب امریکہ نے چین میں جین اور کوکا کولا بھیجا تو ہے مگر دیکھیے ماؤ اور چو این لائی کا چین اِسے کس طرح قبول کرتا ہے ؟

اگلا دن ڈزنی لینڈ کے نام تھا۔ عالی نے بتایا کہ میامی کے قریب اس کا ایک ماڈرن رُوپ بنایا گیا ہے جو سائنسی عجوبوں کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے مگر اصلی ڈزنی لینڈ کا اب بھی کوئی جواب نہیں، ہر عمر کے 'بچوں' کی تفریح کے لیے اس سے بہتر جگہ دُنیا میں اور کہیں نہیں۔

ایک تو میرا جغرافیہ ویسے ہی کمزور ہے اِس پر امریکہ کے شہروں کے فاصلے اور پھر شہروں کے اندر کے فاصلے ایسے ہیں کہ ابنِ بطوطہ کو بھی پریشان کر دیں، سو حرام ہے جو مجھے پتا چلا ہو کہ ہم کدھر سے گزُر کر کہاں جا رہے ہیں اور یہ کہ کل اِسی طرح کے پُل اور سڑک سے گزر کر پوائنٹ A آیا تھا تو آج اُس کے بالکل مخالف سمت واقع پوائنٹ B کیسے آگیا ہے ! چنانچہ میرے اندازے کے حساب سے ڈزنی لینڈ بالکل اسی طرح آیا جیسے کولمبس نے ہندوستان کا راستہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے امریکہ دریافت کر لیا تھا اور شاید اسی لیے یہاں کے لوکلز کو ریڈ انڈین کہتے ہیں ؟

طے یہ پایا کہ مشہور مزاح نگار مرحوم سید محمد جعفری کے صاحبزادے احمد جعفری شام چھ بجے ہیں ڈزنی لینڈ کے مرکزی گیٹ سے وصول پائیں گے چنانچہ اس وقت تک کے لیے ہم ہیں اور ڈزنی لینڈ کی حیرانیاں۔

ڈزنی لینڈ نسلِ آدم کا ایک اجتماعی خواب ہے جسے والٹ ڈزنی نے تعبیر کا خاکہ دیا اور امریکی قوم

نے اِس خلکے میں وہ بے شمار رنگ بھرے جنھیں گنتے گنتے دیکھنے والوں کی آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر ایک ریلوے سٹیشن بنایا گیا ہے۔ یہاں سے ایک ٹرین ہر بیس منٹ کے بعد آپ کو پورے ڈزنی لینڈ کا چکر لگوانے کے لیے روانہ ہوتی ہے۔ اپنے اس سفر کے دوران یہ ٹرین آپ کو دُنیا کے مختلف علاقوں کے فطری مناظر دکھاتی ہوئی چار اسٹیشنوں پر رُکتی ہے جو درصل ڈزنی لینڈ کے چار مختلف حصے ہیں اور ہر حصہ اپنے نام کی مطابقت سے آپ کو ایک نئی دُنیا میں لے جاتا ہے۔ پہلا سٹیشن Frontier Land، دوسرا Fantasy Land، تیسرا Tomorrow Land اور چوتھا Advernture Land۔

اگر آپ پیدل چلتے چلتے تھک جائیں تو اپنے متعلقہ Land کے اسٹیشن سے ٹرین پکڑ سکتے ہیں جو وہاں سے ہر بیس منٹ کے بعد گزرتی ہے۔ ہم نے بھی سب سے پہلے ٹرین سے ڈزنی لینڈ کا ایک چکر لگایا اور یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے رہے کہ اِس جگہ کو صحیح طرح سے دیکھنے کے لیے تو کم از کم ایک ہفتہ درکار ہے، چند گھنٹوں میں تو ہم اس کی بس کچھ جھلکیاں ہی دیکھ پائیں گے۔

پنجاب آرٹ کونسل کی ڈپٹی ڈائرکٹری کے دنوں میں میرا دفتر شاہراہِ قائدِ اعظم پر واقع فری میسن بلڈنگ میں ہُوا کرتا تھا۔ اِس عمارت سے بہت سی پُراسرار روایات منسلک تھیں جن کے بارے میں اکثر لوگ سوال کیا کرتے تھے۔ میرا کمرہ اِس عمارت کے تہہ خانے میں تھا جس سے ملحقہ عمارت کے چاروں طرف پھیلے ہوتے ایک سُرنگ نما برآمدے کو ہم نے آرٹ گیلری میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایک بار وہاں صادقین کی تصویروں کی نمائش جاری تھی۔ میرے ساتھ کچھ دوست صادقین کے مشہور کیکٹس، مڑے تڑے انسانی اعضاء اور انسانی جسموں میں گھونسلہ کیے ہُوئے پرندوں کو دیکھ رہے تھے۔ شمیم اختر، جو اُن دنوں گوجرخاں میں اسسٹنٹ کمشنر تھا اور چھٹی پر آیا تھا، اچانک بولا: "لو بھئی فری میسن کے بھوتوں کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔"

ہم نے پُوچھا: "وہ کیسے ——؟"

"بھُوت یہاں تھے ضرور مگر یہ تصویریں دیکھ کر فرار ہو گئے ہیں کہ کہیں خوامخواہ اُن کا نام نہ لگ جائے۔"

ڈزنی لینڈ کے Haunted Mansion کے دروازے پر پتا نہیں کیوں مجھے یہ واقعہ یک دم یاد

آگیا اور مَیں بے ساختہ ہنس پڑا۔ پروین نے ایک نظر اُس 'بھوت بنگلے' کے بورڈ کو اور پھر میری طرف دیکھا اور بڑی شرارت آمیز سنجیدگی سے بولی: "آگے چلیے عالی جی، ان پر تو ابھی سے جنّات کا اثر شروع ہو گیا ہے۔"

یہ 'آسیب زدہ گھر' انسان کے فطری، تاریخی اور بین الاقوامی واہموں کا ایک عکس در عکس آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ جنّوں، بھوتوں، طلسمی اور مافوق الفطرت طاقتوں اور خون منجمد کر دینے والی دہشت کی رفاقت میں کہنے کو تو آپ صرف دس منٹ گزارتے ہیں یا شاید اس سے بھی کم مگر باہر نکلتے وقت بڑے بڑوں کے چہرے فق، آنکھیں مضطرب اور سانس ناہموار ہوتے ہیں۔ بنانے والوں کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے انسانی فطرت کے بعض مخصوص پہلوؤں کا بہت اچھا مطالعہ کر رکھا ہے۔ تاریکی، خُنکی، صوتی اور بصری تاثرات، بھیانک تصویریں، آواز اور سنّاٹے کی آمیزش میں جب آپ سرکس میں چلنے والے ہنگھوڑوں سے ملتے جُلتے کیبنوں میں بیٹھتے ہیں اور اندھیرے میں یہ 'ہنگھوڑا ٹرین' اُونچی نیچی پٹڑیوں، تاریکی میں یک دم سامنے آتی ہوئی دیواروں اور دہشت ناک مناظر کے درمیان شور مچاتی ہوئی گزرتی ہے تو ایک بار تو سچ مُچ نانی یاد آجاتی ہے۔ مسرّت، تجسّس اور حیرت بھری آوازیں خوف کی سسکیوں اور چیخوں میں بدلنا شروع ہو جاتی ہیں اور خجالت آمیز ہنسی کے ننھّے ننھّے فوارے بار بار پھُوٹتے ہیں۔

بچپن میں سکول جاتے وقت موچی دروازے کی گھاٹی کے ساتھ دائیں ہاتھ پیکو آرٹ پریس کا ایک بورڈ ہم سب بچّوں کے لیے حیرت، لُطف اور تفریح کا ایک مستقل ذریعہ ہوتا تھا۔ اِس بورڈ کو مختلف رنگدار سلاخوں سے بنایا گیا تھا کہ آپ دیکھتے جاتے ہیں اور رنگ بدلتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بورڈ ختم ہونے پر انگریزی کی جگہ اچانک اُردو الفاظ آجاتے تھے۔ ڈزنی لینڈ کے اِس بھوت بنگلے میں بھی ایک ایسا ہی کرتب رکھا گیا ہے۔ ہماری سیٹوں کے بائیں جانب دیوار تھی اور دائیں جانب نشیب میں ایک وکٹورین انداز کا اُونچے دروازوں والا کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک بڑی ڈائننگ ٹیبل اور چند کُرسیاں پڑی تھیں۔ ایک دم اُس کمرے میں کولونیل انگریزوں کے سے لباسوں میں ملبوس چند لوگ نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں؛ چھُری کانٹوں، پلیٹوں اور گلاسوں کی آوازیں آتی ہیں، پیانو بجتا ہے لیکن ایک چھوٹا سا موڑ کاٹ کر جب آپ دوبارہ دیکھتے ہیں تو نہ وہاں کمرہ ہوتا ہے نہ میز کُرسیاں اور نہ آدمی۔

میں غالباً پردین کو موچی دروازے کے پریس والے بورڈ کے بارے میں بتا رہا تھا کہ یک دم ایک کونے سے قدیم رومن انداز کا ایک گلیڈی ایٹر ہم پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا کلہاڑا تھا۔ سائیں کی آواز کے ساتھ وہ کلہاڑا ہمارے پاس سے یوں گزرا کہ ایک لمحے کے لیے سچ مچ موت نظر آگئی۔ چاروں طرف سے ابھرتی ہوئی خوفزدہ چیخوں اور شرمندہ ہنسیوں کے شور میں ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دلوں میں اس کرتب پر لعنت بھیجنے کے بعد منہ سے تعریفیں کرنے لگے۔

inner earth اور Mono Rail اور U-Boat کے ذریعے پانی اور خشکی کی سیر کی۔ ایٹم کے اندر کا مشاہدہ کیا اور غالب کے حوالے سے اُس کو یاد کیا جو واماندگیِ شوق کی ہر سرحد پر کھڑا مسکراتا رہتا ہے:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے !

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

مگر ڈزنی لینڈ کی جس چیز نے ہمیں لُوٹ لیا وہ دُنیا بھر کے بچّوں کا ایک گیت ہے جس کے بول اور ساز بدلتے رہتے ہیں مگر ایک ہی جذبہ اور دُھن خون کی طرح بدن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور خودکار کشتیوں کے ذریعے سطحِ زمین سے نیچے ہم نے ایک ایسی دُنیا کی سیر کی جس میں نوعِ انسانی کے سارے خوبصورت خواب، گیت، افکار اور رنگ ایک چھوٹی سی دُنیا میں جمع ہو گئے تھے۔ اس جادو نگری کا نام بھی It's a small world تھا۔ کشتی کے راستے کے دونوں طرف مختلف روشنیوں کے ذریعے دُنیا کے مختلف ممالک کے بچے اپنے ثقافتی رنگ رُوپ سمیت اپنی خوبصورت اور رُوح میں اُتر جانے والی آوازوں کے ساتھ مل جُل کر اس چھوٹی سی خوبصورت دُنیا کو سجانے اور بچانے کا گیت گا رہے تھے۔ یہ بچے بے جان پُتلیاں تھے اور گیت پہلے سے ریکارڈ شدہ تھا جسے مختلف سپیکرز کے ذریعے چاروں طرف پھیلا دیا گیا تھا مگر سارا منظر کچھ اتنا حقیقی اور پُراثر تھا کہ ہم تینوں مبہوت سے ہوگئے۔ چند منٹ کے سفر کے بعد ہماری کشتی عمارت کا چکر مکمل کر کے دوبارہ روشنی میں اُسی مقام پر آگئی جہاں سے ہم اس میں سوار ہوئے تھے پر پتا نہیں کس جذبے کے تحت ہم تینوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر روانگی کے پلیٹ فارم پر گئے اور ایک کشتی میں بیٹھ کر دوبارہ اُسی رُوح پرور سفر پر روانہ ہو گئے۔

میرے نزدیک اس سارے منصوبے کے سوچنے والے، بنانے والے، گیت لکھنے والا، کمپوزر پیٹ

اور سیٹ بنانے والے، آڈیو اور روشنی کا اہتمام کرنے والے، غرضیکہ سبھی لوگ اس قابل ہیں کہ انھیں اِس ایک نیکی کی وجہ سے سیدھا جنت میں بھیج دیا جائے اور مجھے یقین ہے کہ خُدا کا جو تصور میرے دل و دماغ میں ہے وہ سچ نکلا تو نیکیوں کا معیار سجدے نہیں بلکہ اسی نوع کے زندگی آموز کام ہوں گے۔

عالی کی عینک کے شیشے بھیگنے کی وجہ سے دُھندلے ہو رہے تھے۔ پہلے تو مَیں یہ سمجھا کہ اس کا سبب پانی کے وہ آوارہ چھینٹے ہیں جو کبھی کبھی اُچھل کر کشتی کے اندر آجاتے ہیں مگر جب ہم دوسرا چکر مکمل کر کے باہر نکلے تو اُن کی آنکھوں اور ہمارے دلوں کی طرح اُن کی آواز بھی بھیگ چکی تھی۔ انہوں نے ایک اُداس اور حسرت بھری نظر It's a small world کی اُس عبارت پر ڈالی جو اُس عمارت کی پیشانی پر دمک رہی تھی اور پھر آنسو پونچھتے ہُوئے رِقت بھرے لہجے میں بولے: "ہم سے تو اپنی عمروں میں کچھ نہ ہو سکا، خدا کرے ہمارے بچے ہی اِس گیت کو سچ کر دکھائیں۔"

اِس چھوٹی سی دُنیا سے ہم حقیقت کی دُنیا میں واپس آئے تو فاصلوں کا احساس ایک دم بڑھ سا گیا۔ شام ہو رہی تھی، احمد جعفری آنے والا تھا، مرکزی دروازہ خاصا دُور تھا اور سڑکوں پر کرسمس کی تیاریوں کے سلسلے میں مصنوعی درختوں پر آویزاں روشنیاں جلنا شروع ہو گئی تھیں۔ ہم نے جلدی جلدی جزائر غرب الہند (جنھیں ہم صرف ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیم کے حوالے سے جانتے ہیں) کے بحری قزاقوں، مدفون سمندری خزانوں اور دہشت بھری دُنیا پر ایک نظر ڈالی جسے The world of carr ibbean کا نام دیا گیا تھا۔

پیٹر پین اور مکی ماؤس سے ملاقات کی، پروین نے اُن کے ساتھ تصویریں بنوائیں، t's a small world کے لانگ پلے ریکارڈ اور ڈزنی لینڈ کے سووینیئر خریدے۔ عالی جل بن مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے، وجہ پُوچھی تو پتا چلا کہ نواسے کے لیے Abcort کے نشان والی ٹی شرٹ نہیں مل رہی۔ مَیں نے عرض کیا: "قبلہ گاہی پھیلتی جا رہی ہے شام کی سیاہی، اگر آپ مناسب خیال فرماویں اور دل پر گردِ ملال نہ لادیں تو اُس بنیانِ نشان زدہ کے بجائے کوئی اور شئے دلپذیر خرید فرمالیں کہ کُو دکان کے لیے آپ کی لائی ہوئی ہر چیز تحفۂ بے مثال ہو گی۔"

میرامن اور رتن ناتھ سرشار کی ملی جلی اُردو ہماری continuity بن چکی تھی اور ہم اکثر خاصی خاصی دیر تک اِس پیرائے میں باتیں کیا کرتے تھے چنانچہ عالی نے جوابی تقریر کچھ یُوں شروع کی:

"تس پر اُس مردِ دل گیر نے ایک آہ سرد دلِ پُر درد سے کھینچی، ایک نظر فلک کج رفتار پر ڈالی اور پھر دیارِ فرنگ کے بارے میں کچھ حقائقِ خفیہ و پوشیدہ سے بصد احتیاط پردہ اُٹھایا۔"

اسی طرح کی باتیں کرتے اور ایک بہت بڑے کرمس ٹری کے گرد جمع ہجوم میں سے رستہ بناتے ہم جب باہر کے گیٹ پر پہنچے تو وقتِ مقررہ سے پندرہ منٹ لیٹ ہو چکے تھے مگر احمد جعفری کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔ شبہ ہُوا کہ کہیں وہ ہمارا انتظار کر کے چلا نہ گیا ہو مگر عالی نے کہا کہ سید محمد جعفری کا بیٹا اتنا غبی نہیں ہو سکتا۔

ہم تینوں اپنے لباس کی وجہ سے اس مجمعے میں الگ پہچانے جا رہے تھے چنانچہ فیصلہ ہُوا ایک روشن اور قدرے بلند جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ ڈھونڈنے والے کو دقت نہ ہو۔ ابھی اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے پر بحث ہو رہی تھی کہ احمد پہنچ گیا۔ معلوم ہُوا کہ وہ پچاس میل کا سفر طے کر کے آیا ہے اور یہاں سے عارف صاحب کا گھر تقریباً ستر میل کے فاصلے پر ہے جہاں لوگ کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ مَیں نے اپنے تھکے ہُوئے وجود کو آرام دہ کار کی سیٹ پر گراتے ہُوئے پُوچھا: "یار، آپ لوگوں کی طبیعت اِن فاصلوں سے گھبراتی نہیں ہے؟"

احمد نے اپنی خوبصورت مونچھوں کے نیچے سے مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور بڑے فلسفیانہ لہجے میں بولا: "جس رزق کی تلاش گھر سے بارہ ہزار میل دُور لے آئی ہے اُسے یہ سو پچاس میل کیا کہہ سکتے ہیں؟"

عارف صاحب کا کھانا اور میرے لطیفے ختم ہو گئے تو مہمان اپنے اپنے 'مہمانوں' کے ساتھ رُخصت ہونا شروع ہو گئے۔ میرا قیام آج عارف صاحب کی طرف تھا اور ایسا مَیں نے جان بوجھ کر کیا تھا پروین کی پیچوزدگی اور نیر جہاں اینڈ کمپنی کی خاموش خفگی کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ عارف صاحب بڑے نفیس، کم گو اور معقول انسان تھے چنانچہ انھوں نے اس سارے واقعے کو ایک مہذب آدمی کی طرح بالکل فراموش کر دیا اور اپنے کسی قول یا فعل سے محسوس نہیں ہونے دیا کہ اُن کے دل میں کسی قسم کا بھی کوئی ملال ہے۔

اگلی صبح آنکھ کھُلی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ معلوم ہُوا محکمۂ موسمیات والوں نے شام کو تیز بارش کی پیش گوئی کی ہے اور منتظمین مشاعرہ اس صورتِ حال سے خاصے پریشان ہو رہے ہیں۔ مَیں نے یونہی حوصلہ دینے کی خاطر کہہ دیا کہ محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اِس پر عارف صاحب

کے بچّوں نے بہت بُرا مانا اور مجھے بتایا کہ یہ امریکہ ہے، یہاں محکمہ موسمیات والے اتنی واضح اور تفصیلی پیش گوئی کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کسی گزرے ہُوے واقعے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔

آج کا دن مکمّل طور پر فارغ تھا کیونکہ تمام میزبان مشاعرے کے مختلف انتظامات میں مصروف تھے۔ مَیں نے بھی کئی دن بعد ملنے والے اِس وقفۂ آرام کو غنیمت جانا اور ناشتے کو دوپہر بارہ بجے تک ٹالتا رہا۔ V.C.R. پر 1982 میں بمبئی میں ہونے والے ایک میوزک پروگرام کی فلم چل رہی تھی، نام تھا: Mortal people, Immortal songs - فانی لوگوں کے اِن غیر فانی گیتوں کے پروگرام کی کمپیئرنگ بھارتی فلم سٹار کیفی اعظمی کی بیٹی اور جاں نثار اختر کی بہو، شبانہ اعظمی کر رہی تھی۔ شبانہ ہمارے ماڈرن اور ترقی پسند حلقوں میں بڑی اِن جا رہی ہے۔ کچھ لوگ اِس کی وجہ اس کی اداکاری بتلاتے ہیں اور کچھ بے باکی۔ عزیزی عطاءُ الحق قاسمی کا خیال ہے کہ لوگ شبانہ کو اس کی عمدہ اداکاری کی وجہ سے پسند کرتے ہوں گے کیونکہ 'بے باکی' کے لیے تو اس کے پاس گنجائش ہی نہیں ہے۔

پروگرام تو کوئی ایسا خاص نہیں تھا مگر اِس کی وساطت سے کئی بھولے بسرے چہروں اور نہ بھُولنے والے گیتوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ شروع میں لتا نے ایک بھجن گایا۔ اس کے بعد، ہیمنت کمار، راج کماری، سریندر، جی اے درّانی، طلعت محمود، انور، نتن مکیش، اوشا منگیشکر اور کچھ نوجوان گلوکاروں نے اپنے اور دوسروں کے گیت سُنائے مگر سب سے زیادہ رنگ اپنی ملکہ ترنم نورجہاں نے ہی جمایا جس نے تین گانے گائے اور کچھ اِس طرح سے گائے کہ ہر تان پہ شُعلہ سا لپک جاتا تھا۔ نُورجہاں اُس دن مجھے بالکل اُسی طرح اچھی لگی جیسے بھارت سے ہاکی یا کرکٹ کا میچ جیتنے کے بعد کھلاڑی اچھے لگتے ہیں۔ میرے خیال میں اتنا تھوڑا سا تعصب رکھنے میں کوئی خاص حرج نہیں ہوتا!

مشاعرہ گاہ میں داخل ہُوے تو دیکھا کہ دیواروں پر چاروں طرف دیوی دیوتاؤں کے بُت اور تصویریں لگی ہیں۔ ہم نے یکے از منتظمین سے پُوچھا: "یہ تو یوں لگتا ہے جیسے ہندوؤں کا کوئی مندر ہو!"

"یہ صرف لگتا ہی نہیں، واقعی مندر ہے۔"

ظفر عباس نے بتایا کہ امریکہ میں مذہبی عمارات کے بارے میں لوگوں کا رویّہ بہت معتدل ہے۔

یہاں مذہب اجتماعی سے زیادہ ذاتی حوالہ ہے اِس لیے نہ تو اس پر فسادات ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی جن سنگھیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں بنتی، ٹوٹتی اور شکلیں بدلتی رہتی ہیں لیکن ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی وجہ سے کوئی عبادت گاہ فروخت کرنی پڑ جائے تو اوّلیت کسی ایسے گروہ یا فرقے کو دی جائے جو اسے مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خُدا کا نام بہر حال کسی نہ کسی شکل میں لیا جاتا رہے۔ بارش کے باوجود سامعین کی خاصی معقول تعداد ہماری منتظر تھی لیکن یہاں بھی کچھ کچھ مونٹریال کا سا ماحول تھا۔ مشاعرے کے سامعین اور پکنک کے مشتاقین ایک ہی چھت تلے جمع ہو گئے تھے۔ نشست فرشی تھی مگر ہال کے ایک جانب کچھ پتلون پوش حضرات اور فتنہ بردوش خواتین کرسیوں پر بیٹھے تھے اور دراصل یہی چالیس پچاس لوگ سامعین کم اور تماش بین زیادہ تھے۔ اُن کی اِس کم توجہی کی وجہ اُن کا اور شاعروں کا درمیانی فاصلہ بھی ہو سکتی ہے یا لاؤڈ سپیکرز کی ترتیب بھی جس کی وجہ سے اُنھیں ہماری آواز کم آ رہی تھی۔ وجہ بہر حال جو بھی ہو ایک بات طے ہے کہ یہ لوگ مشاعرے کو ایک ثقافتی + تفریحی شام سمجھ کر آئے تھے کہ اس بہانے دیارِ غیر میں ذرا اپنے بھولے بسرے کلچر کا مصالحہ بھی چکھ لیں گے۔ اِن سامعین میں ایک جوڑا ہماری اور شاید سارے ہال کی توجہ کا مرکز تھا۔ (اس بات کی تصدیق آخر تک نہیں ہو سکی کہ وہ سچ مچ کا جوڑا تھے یا ہنگامی بنیادوں پر اُنھوں نے بیر پُرامن تصفیہ باہمی کر رکھا تھا!) عورت معقول حد تک خوش شکل اور اس سے قدرے زیادہ خوش اندام تھی۔ مرد بھی اچھا خوش رُو اور خوش لباس تھا۔ غالباً دونوں نے پی رکھی تھی کیونکہ ہر دو منٹ میں وہ کم از کم ایک بار بڑے پُرجوش انداز میں بغل گیر ہوتے تھے اور مختصر، درمیانے اور طویل، ہر دورانیے کے بوسوں کے مختلف انداز کچھ اس طرح سے دکھاتے تھے کہ غزلوں کے مصرعے بے وزن اور نظموں کی لائنیں بدآہنگ ہونے لگتی تھیں۔ اس طرح کے مناظر مغرب کی فلموں اور وہاں کی حقیقی زندگی میں بارہا دیکھے تھے مگر اپنے دیسی لوگوں کو برسرِ عام ایسا کرتے دیکھ کر پتا نہیں کیوں بہت بُرا سا لگا۔ وہ لوگ غالباً "جیسا دیس ویسا بھیس" کے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی قائل تھے۔ مشاعرے کے بعد میں نے ظفر عباس سے اِس منظر اور لوگوں کے ردِعمل کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے بھی اس کی یہی وجہ بتائی مگر ساتھ ہی ایک بڑا مزیدار لطیفہ بھی سُنایا:

ایک امریکن کھلاڑی کسی ٹورنامنٹ کے سلسلے میں روم (اٹلی) گیا۔ واپسی پر بے تکلف دوستوں نے کچھ داخلی نوعیت کے استفسار کیے اور پوچھا: "سناؤ معاملاتِ عشق و فسق کیسے رہے!"

کھلاڑی نے کہا: "تم نے وہ محاورہ تو سنا ہو گا کہ روم میں رہو تو وہی کچھ کرو جو رومن کرتے ہیں؟" سب نے اثبات میں سر ہلایا، کھلاڑی نے آنکھ مار کر مسکراتے ہوئے کہا: "میں نے بھی وہاں ایک امریکن سکول ٹیچر پھنسا لی تھی۔"

لاس اینجلس کے زیادہ تر مقامی شاعر باقاعدہ طور پر اچھے شاعر تھے البتہ دو شاعروں نے بہت عجیب حرکتیں کیں۔ ایک تو بزرگ تھے جنھوں نے کسی دوسرے کی غزل بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی کہہ کے پڑھ دی اور اپنے تلفظ کی وجہ سے لفظوں کا وہ حلیہ بگاڑا کہ اصل شاعر سن لیتا تو اندیشۂ نقصِ امن کا ماحول پیدا ہو سکتا تھا۔ دوسرے جاوید نامی ایک جوشیلے سے نوجوان تھے جو امام خمینی کے بے انتہا عقیدت مند تھے اور ایران سے جھگڑے میں امریکہ کے مستقبل کی مکمل تباہی پر ایمان رکھتے تھے۔ بات یہیں تک رہتی تو بھی خیریت تھی لیکن اصل عبرت ناک چیز اُن کی نظم تھی جس کا کوئی مصرعہ دوسرے مصرعے سے دست پنجہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اتنی آزاد اور خود مختار نظم تھی کہ ہماری توجہ "رومیو جولیٹ" کے اُس ڈبل ایکس (XX) مظاہرۂ فن سے بھی ہٹ گئی۔ جاوید صاحب کے زورِ کلام اور ادائیگی کے انداز کو سمجھنے کے لیے آپ بھائی صہبا اختر کو سو، سوا سو سے ضرب دے لیں تو بات کچھ کچھ سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ویسے یہ اُسی طرح کا موازنہ ہے جیسے کسی ستم ظریف نے سید محمد تقی کے ترجمۂ 'داس کیپیٹال' کا اس کتاب کے دوسرے ترجموں کے ساتھ کیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یُوں ہے کہ سید محمد تقی صاحب نے جب کارل مارکس کی مشہورِ زمانہ تصنیف کا اردو میں ترجمہ کیا تو ایک صاحب نے اُن کی محنت کی داد کچھ اس طرح سے دی (دروغ بر گردنِ راوی):

"مجھے انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، روسی، جاپانی اور فارسی زبانیں آتی ہیں۔ میں نے ان سب زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے پڑھے ہیں مگر صاحب، آپ کے ترجمے کا جواب نہیں، عجیب و غریب کام کیا ہے آپ نے!"

تقی صاحب نے اندر سے خوش ہوتے ہوئے مگر بظاہر انکسار کے ساتھ کہا: "ارے نہیں صاحب ... یہ تو معمولی سی کوشش ہے میری .... آخر ایسی کیا بات نظر آئی آپ کو میرے ترجمے میں؟"

"بات یہ ہے جناب کہ اِن زبانوں کے ترجموں میں تو کہیں کہیں بات سمجھ میں آجاتی ہے مگر آپ کا ترجمہ..... سبحان اللہ ــــ ماشاء اللہ....."

سوصہبا اختر کی بات تو کہیں کہیں سمجھ میں آجاتی ہے مگر جاوید صاحب کی شاعری..... سبحان اللہ ــــ ماشاء اللہ.....

ہماری فلائٹ صبح آٹھ بجے کی تھی۔ رات دو بجے، ہم لوگ احمد جعفری کے گھر پہنچے اور سحری کے انداز میں پُرتکلف ڈنر کیا۔ مہمانوں کے رُخصت ہوتے ہوتے چار بج گئے چنانچہ مَیں نے دو گھنٹے سونے پر احمد جعفری سے گپ شپ کو ترجیح دی اور ساڑھے چار گھنٹے کی فلائٹ میں تقریباً چار گھنٹے ڈٹ کر سویا کہ اب آہستہ آہستہ جہاز میں سونے کی مشق ہوتی جارہی تھی۔

ٹورنٹو ایئرپورٹ پر یہ ہمارا تیسرا پھیرا تھا۔ امیگریشن کے کاؤنٹر پر بہت کم لوگ تھے۔ امیگریشن افسر نے پُرسکون انداز میں اس چھوٹی سی قطار پر نظر ڈالی اور پھر عالی کے ایک ساتھ سلے ہُوئے تین پاسپورٹوں کو انتہائی مشکوک انداز میں دیکھنے لگا۔ چند لمحے مختلف صفحوں کو اُلٹا پلٹتا رہا پھر بولا: "یہ تم بار بار کیوں آ جا رہے ہو؟" عالی نے بتایا کہ ہم شاعر ہیں اور مشاعروں کے سلسلے میں ہمیں امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں میں اپنا کلام سُنانا ہے اور چونکہ پروگرام ایسا رکھا ہے کہ ہمیں بار بار بارڈر کراس کرنا پڑتا ہے اس لیے ہمیں بار بار یہاں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ مشاعرہ کس جانور کا نام ہے اور لوگ دوسروں کی شاعری اپنے وقت میں اور پھر اپنی رقم خرچ کرکے کیوں اور کس لیے سُنتے ہیں؟ اُس نے عالی سے پُوچھنے کے بعد کہ اُن کے ساتھ اور کون کون ہے، ہمیں بھی قریب بُلالیا اور ہمارے پاسپورٹوں کو بھی اُسی خضوع و خشوع کے ساتھ دیکھنے لگا، پھر زچ سا ہو کر بولا: "تم لوگوں کے پاس کینیڈا میں صرف ایک بار داخلے کا ویزا ہے، اب تم یہاں داخل نہیں ہو سکتے۔" ہم نے بتایا کہ ہم یہ حرکت اس سے پہلے دو بار کرچکے ہیں اور ابھی ایک آدھ بار اور اسے دُہرانے کا ارادہ ہے۔

کہنے لگا: "تو پھر آؤ، آرام سے بیٹھ کے بات کرتے ہیں، میرے حساب سے تمھیں ایئرپورٹ سے باہر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔"

ہم نے اُسے بتایا کہ ہمارے میزبان باہر انتظار کر رہے ہیں اور اُن کے گھروں پر ہمارا سامان پڑا ہے جس کا ہمارے گھر والے انتظار کر رہے ہیں، مگر اس مردِ خبیث پر ہماری اس مزاح نگاری کا کوئی اثر نہ ہوا، اُس نے ایک بڈھے سے سیکورٹی والے کو ایک طرف لے جا کر کچھ گفتگو کی، پروین کو بیٹھ کر انتظار کرنے کے لیے کہا اور ہمیں اُس بڈھے کے سپرد کر دیا جو ہمیں ملحقہ ہال کے ایک کیبن میں لے گیا۔

ساری کہانی پھر سے دُہرائی گئی اور بڑی مشکلوں سے بڈھے کو سمجھایا گیا کہ اِس دُنیا میں ابھی ایسی قومیں موجود ہیں جو مشاعرے جیسی بے معنی روایت پر یقین رکھتی ہیں اور یہ کہ ہم لوگ شاعر ہونے کے باوجود اپنے معاشرے کے ذمّہ دار اور فعّال شہری بھی ہیں۔

بڈھے نے اِنٹر کام پر کسی سے بات کی اور اس دوران میں ہم پر دو تین ایسی مشکوک نظریں ڈالیں کہ میری جیکیٹ کی بغلوں میں پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا اور عالی کے ہنکاروں میں بھی ایک کی جگہ کئی کئی ساز بجنے شروع ہو گئے۔ فون رکھ کر اُس نے میز سے اپنی ٹوپی اُٹھائی، ہم سے ہاتھ ملایا اور مُسکرا کر کہا: "شریف آدمیو، تم جا سکتے ہو۔"

سچی بات یہ ہے کہ اتنی tension کے بعد اس anti-climax نے طبیعت بدمزہ سی کر دی تھی۔ پروین نے بڑے تردّد اور exited انداز میں ہمیں آتے ہُوئے دیکھا اور مَیں نے محسوس کیا کہ وہ بھی جیسے کچھ بُجھ سی گئی ہے۔ اِس سارے معاملے میں یوں تو کل پندرہ منٹ صرف ہوئے مگر لگتا تھا کئی گھنٹے گزر گئے ہیں، چنانچہ جب ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے آئے ہُوئے دوستوں نے ہماری اس 'غیر معمولی' تاخیر پر کسی قسم کی تشویش کا اظہار نہ کیا تو ہمیں بہت مایوسی ہوئی اور انتقاماً ہم نے بھی اپنے سنسنی خیز تجربے کو اپنے تک محدود کر لیا۔

ٹورنٹو پہنچنے کے بعد ہمارا مشاعروں کا یہ پروگرام ختم ہو گیا۔ اب ہمیں اپنا اپنا واپسی کا روٹ اور شیڈول طے کرنا تھا تاکہ اشفاق کی ٹریول ایجنسی کی وساطت سے پروازوں کی بکنگ کرائی جا سکے۔ میرا شکاگو جانا ضروری تھا کیونکہ عرفان اور افتخار نسیم وہاں شدّت سے میرے منتظر تھے اور چار پانچ مرتبہ اس ضمن میں اُن سے بات بھی ہو چکی تھی۔ پروین کی بھی وہاں ایک سہیلی رہتی تھی چنانچہ اُس نے بھی شکاگو کو اوکے کر دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ لندن کب پہنچا جائے اور وہاں ہم کتنے دن رُک سکتے ہیں کیونکہ گھروں سے نکلے تقریباً سوا مہینہ ہو چلا تھا؟ مَیں نے لندن مکرم جاوید سے فون ملایا، اُس نے بتایا

کہ اُسے میرا خط اور پیغام مل چکے ہیں اور اُن کے مطابق مجھے آج سے تین دن پہلے اُس کے پاس پہنچ چکا ہونا چاہیے تھا۔ مَیں نے بتایا کہ ہمارے پروگرام میں کچھ تبدیلی ہوگئی تھی جس کی اطلاع مَیں اُسے نہیں دے سکا تھا، بہرحال اِس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟

"فرق پڑتا ہے نا یار ___" مکرم نے پریشان لہجے میں کہا، "تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ میرے لیے اپنے بزنس میں سے وقت نکالنا کتنا مشکل ہے۔ مَیں نے تمھارے لیے اپنا سارا پروگرام اس طرح ترتیب دیا تھا کہ تمھیں لندن گھُما پھرا کر میں تمھاری بھابی کے ساتھ چھُٹی منانے نکل جاؤں گا کیونکہ کرسمس کے یہ دن ہی گوروں کے اِس ملک میں بزنس مینوں کے لیے سُکھ کے چند دن ہوتے ہیں اور مجھے پورے سال میں یہی دو ہفتے ملتے ہیں جو مَیں اپنی فیملی کو دے سکتا ہوں۔"

مَیں نے اُسے وہ تمام مغلظات سُنائیں جنھیں بے تکلف دوست ایسے موقعوں پر استعمال میں لاتے ہیں اور طوطا چشمی سے ملتی جُلتی تمام تشبیہیں بھی فراوانی کے ساتھ استعمال کیں لیکن مَیں نے محسوس کیا کہ وہ اِس صورتِ حال سے واقعی پریشان ہے چنانچہ ہم نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ مکرم بیوی کے ساتھ چھُٹی منانے نکل جائے، اس کا سٹاف نہ صرف ہمارے استقبال، رہائش اور سیر و تفریح کے مکمّل انتظام کے ساتھ میری آمد سے روانگی تک خدمت کے لیے حاضر ہوگا بلکہ یارِ عزیز افتخار بٹ کو اس کے نائیجیریا آفس سے بلوا لیا جائے گا تاکہ وہ اس کی عدم موجودگی میں میرے ساتھ کمپنی کرسکے۔

اگلی صبح مکرم کا فون آیا کہ تمام انتظامات مکمّل ہیں۔ افتخار بائیس تاریخ کو لندن پہنچ جائے گا تاکہ اگلے دن گیارہ بجے، ہمیں ہیتھرو ایئرپورٹ سے رسیو کرسکے۔ اس کے بعد اس نے اپنی غیر حاضری کی معذرت کا قصّہ شروع کر دیا جسے روکنے کے لیے مجھے مجبوراً غیر پارلیمانی الفاظ استعمال کرنے پڑے جنھیں بے تکلف دوستوں کے علاوہ اگر کوئی اور استعمال کرے تو بات چاقو اور پستول کے حُدود میں داخل ہوجائے۔

شکاگو

امریکی فلموں اور جاسوسی ناولوں کے حوالے سے شکاگو کی سب سے مشہور چیز وہاں کے بدمعاش ہیں۔ مَیں نے جہاز میں پروین کو عرفان اور افتخار کے بارے میں بریف کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ معلومات آج سے چند برس پُرانی ہیں، اب اگر وہاں اُن کی جگہ بوسیدہ جینوں، کُھلے گلے والی چیک جیکٹوں اور کاؤ بوائے ہیٹوں والے دو ایسے افراد ملیں جن کے ہاتھوں میں پستول اور ہونٹوں پر غلط انگریزی ہو تو تعجب نہ کرنا۔

ذوق کا ایک بڑا عام سا شعر ہے :

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

خواتین کے افسانوں، نوعمر لڑکے لڑکیوں کے خطوط اور ڈائجسٹوں کے 'میرا پسندیدہ شعر' قسم کے کالموں میں یہ اور اِس طرح کے کچھ اور اشعار بڑے 'اِن' ہوتے ہیں اور یُوں اپنے عوامی اور عامیانہ استعمال کی وجہ سے 'دانشوروں' کے حلقے سے 'آؤٹ' ہو جاتے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ فوری ردِ عمل اور روزمرہ زندگی کے عام واقعات اور محسوسات سے متعلق اس قسم کی شاعری کا ایک اپنا مقام ہے اور ہمیں اِن سے امیر گھروں میں پلنے والے غریب رِشتے داروں جیسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ساری تمہید مَیں نے اس لیے باندھی ہے کہ شکاگو ایئرپورٹ پر عرفان صُوفی سے بغل گیری کے دوران یہ شعر مُجھے اس شدّت سے یاد آیا کہ مجھے پروین کی ہُوٹنگ کا خوف نہ ہوتا تو مَیں یقیناً اِسے زبان پر بھی لے آتا۔ غالب نے کیا سدا بہار بات کہی ہے :

افسوس بے شمار سُخن ہائے گفتنی،
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

عرفان صُوفی گزشتہ تقریباً بارہ برس سے امریکہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ اس دوران میں وہ دو تین دفعہ پاکستان آیا مگر وقت کی کمی اور دو طرفہ بے معنی مصروفیات کی وجہ سے بات چیت کچھ اِس طرح سے ہُوئی کہ کبھی بات ہے تو چیت نہیں، کبھی چیت ہے تو بات نہیں ــــ!

امریکی شہروں کا پھیلاؤ کچھ ایسا ہے کہ اکثر بڑے شہروں کے ہوائی اڈے کسی اور شہر کے مضافات میں واقع ہیں۔ اصلی اور پُرانا شہر یعنی down town بنیے کے قرض کی طرح ہوتا ہے یعنی اس کا بیاج اصل سے بڑھ جاتا ہے۔ عرفان نے بتایا کہ وہ شکاگو کے مضافات میں ایک قصبے جولیٹ میں رہتا ہے اور وہیں ملازمت کرتا ہے۔ یہ قصبہ ہوائی اڈے سے تقریباً ستر میل اور ڈاؤن ٹاؤن سے پچاس میل کے فاصلے پر تھا جب کہ ڈاؤن ٹاؤن اور ہوائی اڈے کا درمیانی فاصلہ بھی تقریباً چالیس میل ہے۔ غالب پھر یاد آرہا ہے:

ہر قدم دُوریِ منزل ہے نمایاں مجُھ سے،
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجُھ سے

راستے میں تین جگہ ٹول ٹیکس کے لیے رُکنا پڑا جیسے ہمارے یہاں لاہور سے پنڈی جاتے ہُوئے راوی، چناب اور جہلم کے پُلوں پر رُکنا پڑتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارے یہاں ٹول ٹیکس کے موقعِ واردات پر ٹھیکے داروں کے متعین کردہ لڑکے ہاتھوں میں ٹکٹیں پکڑے ہوتے ہیں جو گزرنے والی کاروں کے ڈرائیوروں کے ہاتھوں سے اِس طرح چشم زدن میں نوٹ پکڑتے اور ٹکٹ دیتے ہیں کہ ٹی وی پروگرام Wonderful world of magic کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جب کہ یہاں ڈرائیور اپنے آپ لوہے کی کُھلے منہ والی جالیوں میں پیسے پھینکتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ سو ثابت ہُوا کہ شکاگو والے انسانوں کی دیانت پر اعتماد میں تو شاید ہم سے آگے ہوں مگر اُن کی زندگیوں میں وہ thrill یقیناً نہیں ہے۔ جو نوٹ اور ٹکٹ کی چھین جھپٹ سے پیدا ہوتی ہے۔

عرفان نے بتایا کہ بعض ریاستوں میں ٹول ٹیکس کے مقامات انقلابِ فرانس سے پہلے کے ٹیکسوں سے بھی زیادہ ہیں۔ نیویارک میں یہ صورتِ حال اور بھی زیادہ خراب ہے کیونکہ وہاں نہ صرف جگہ جگہ ٹول ٹیکس ہیں بلکہ امریکی کالوں یعنی blacks کے لوکل اور ہنگامی ٹیکس بھی ہیں جن کی وصولی عام طور پر چھُرے کی نوک یا پستول کی نال پر کی جاتی ہے اور امریکی لوگ نو واردوں کو خاص طور پر ہدایت کرتے ہیں کہ ایسے

علاقوں میں کبھی زیادہ رقم کے ساتھ یا بالکل خالی جیب نہیں جانا چاہیے۔

"زیادہ رقم نہ لے جانے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے مگر خالی جیب نہ جانے میں کیا مصلحت ہے؟"

"مصلحت یہ ہے کہ اس طرح کے ڈاکو اور اُٹھائی گیرے اکثر نشے میں ہوتے ہیں اور اگر ایسے میں 'شکار' کے پاس کچھ نہ نکلے تو بعض اوقات وہ جھلاہٹ اور فرسٹریشن کی وجہ سے بھی گولی مار دیتے ہیں"۔

اِس پر مجھے وہ ہارٹ اٹیک اور کینسر والا واقعہ بہت یاد آیا جب ایک ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر آپ fats زیادہ استعمال کریں گے تو آپ کو ہارٹ اٹیک کا خدشہ رہے گا اور اگر نہیں کریں گے تو کینسر کا اندیشہ ہوگا۔

جب ہمیں ایئرپورٹ سے نکلے تقریباً ایک گھنٹہ ہوگیا تو یکدم میں نے محسوس کیا کہ پروین بہت دیر سے خاموش ہے۔ مَیں نے وجہ پُوچھی، بولی: "آپ لوگوں کی گفتگو میں کہیں کوئی کاما، سیمی کولن، فل سٹاپ آئے تو مَیں کچھ عرض کروں"۔

مَیں نے کہا: "یہ لاس اینجلس کا بدلہ ہے۔ وہاں تم نے اور پیچو نے تین گھنٹے ایک دوسرے کے علاوہ کسی سے بات نہیں کی تھی"۔

بولی: "تو گویا عرفان صاحب آپ کے 'پیچو' ہیں؟"

مَیں نے کہا: "ہیں — مگر اُس سے کہیں زیادہ presentable ہیں"۔

کہنے لگی: "آپ اسے شادی سے پہلے دیکھتے"۔

مَیں نے کہا: "کس کی شادی سے پہلے — اُس کی یا اپنی؟"

اب پریشان ہونے کی باری عرفان کی تھی کہ ایک اچھے خاصے معقول سیرت وصورت کشمیری بچّے اور ماہرِ نفسیات کا موازنہ ایک خاتون سے کس خوشی میں کیا جارہا ہے! اِس سے پہلے کہ وہ اِس موازنے میں اپنی کامیابی پر خوش ہوتا مَیں نے یہ بتا کر اُس کی خوشیوں پر اوس ڈال دی کہ اِس مقابلے میں اُس کی فتح کی بنیادی وجہ خاتونِ مذکورہ کا زچگی کے آخری مراحل میں ہونا تھا۔

لاہور میں لوگوں کے ناموں کے ساتھ عُرف لگانے کا بہت رواج ہے اور اِس ضمن میں غالباً دُنیا کا کوئی علاقہ لاہوریوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہاں کے عوام، اہلِ حرفہ، مزدور پیشہ، دکاندار اور طالبعلم سب کے سب اس کام میں بہت تیز اور جدت پسند واقع ہُوئے ہیں۔ پُرانے لاہور کی گلیوں، بیٹھکوں

اور سڑکوں پر اب بھی آپ کو ایسے پوتوں نواسوں والے سفید ریش بزرگ مل جائیں گے، جو اپنے ہم عصروں کو بآوازِ بلند ایسے مزاحیہ ناموں سے پکارتے ہیں جن کی عمر نصف صدی سے تجاوز کر چکی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ نام نسل در نسل آگے چلتے ہیں اور متعلقہ شخصیتوں کا اٹوٹ انگ بن جاتے ہیں۔ مثلاً میرے اور عرفان کے محلّے میں مندرجہ ذیل 'مشاہیر' پائے جاتے تھے: بشیر کھپّی، مسعود جھلّا، شید اٹل، بالا پری پیکر، اسلم پسوڑی، حاجی لفنگا، ارشد کوڈی، جانو کپتّی، سعید گھوڑا، رشید تیلا، نثار پتو، ججا پیچ، نسیم کریلا، جیلا بُھکھ، اکرم کال (کوّا)، انیس چیف، بھولا خنجر — وغیرہ وغیرہ!

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے ایک بار دوستوں کے حلقے میں ایک دم بہت سے جاوید جمع ہو گئے چنانچہ اُن میں تمیز اور پہچان کے لیے مندرجہ ذیل عرف عطا کیے گئے: جاوید ڈراما، جاوید پشاوری، جاوید فری کا ہینڈ، جاوید نانی اور جاوید اندھا۔ ایک جاوید ایسا بھی تھا جس کا عرف جامۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا!

اِن بیس برسوں میں یہ سب کے سب زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی اپنی بساط اور قسمت بھر خاصا سفر طے کر چکے ہیں، اِن کی کنپٹیاں چتکبری اور بچے جوان ہو رہے ہیں، معاشی حیثیتیں اور آئیڈل بدل گئے ہیں اور اعصاب میں پارے کی جگہ تھکن نے گھر بنانا شروع کر دیا ہے مگر ایک دوسرے کا عرفیت کے ساتھ نام لیتے ہُوئے اب بھی ایک عجیب طرح کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے بہت مار کھانے کے باوجود کسی ہارتے ہُوئے باکسر کا کوئی مُکّہ مقابل کی ٹھوڑی کے عین نیچے جا لگے۔ پُرانے دوستوں اور گُزری ہوئی صحبتوں کے ذکر میں بھی کچھ عجیب قسم کا فراریّت آمیز مزہ ہوتا ہے۔ آدمی ایسی باتوں کا ذکر بھی انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ کرتا ہے جو راستے کے منظروں کی طرح زندگی کے سفر میں بغیر رُکے گزر گئی تھیں۔

پروین کے کھانسنے پر ہمیں احساس ہُوا کہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے ہم دونوں اس کی موجودگی سے ایک بار پھر بے خبر ہو چکے تھے۔ عرفان نے معذرت آمیز مُسکراہٹ کے ساتھ کہا: "اصل میں ہم بہت دنوں بعد ملے ہیں نا؟"

"کوئی بات نہیں، Please carry on۔ مَیں تو امجد بھائی کو صرف یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ مَیں بھی اس دن پیچو سے کئی سال بعد ملی تھی!"

"ایک بات طے ہے، تم ہو اندر سے اب بھی یوپی کی ___ بات چھوڑتی نہیں ہو۔"

"وہ تو ہم ہیں۔" اُس نے خالص بہاری لہجے میں لہک کر جواب دیا۔

جولیٹ ایک چھوٹا سا بے حد خوبصورت قصبہ ہے جہاں امریکہ کی سب سے بڑی دیواری جیل (covered jail) واقع ہے۔ وہ لوگ اِسے Stateville Correction Centre (مرکزِ اصلاح) کہتے ہیں۔ عرفان نے بتایا کہ یہاں 2100 قیدیوں کو رکھنے کی گنجائش ہے اور عام طور پر یہاں سنگین جرائم اور لمبی قیدوں والے خطرناک قیدی رکھے جاتے ہیں جن کی نفسیاتی صحت اور معاملات کی نگرانی کے لیے وہ یہاں بطور ماہرِ نفسیات کام کر رہا ہے۔

" اتنے خطرناک مجرموں کے درمیان رہتے ہُوئے ڈر نہیں لگتا آپ کو؟"

"بات یہ ہے پروین بی بی، ڈرنا تو اُس معاشرے میں چاہیے جہاں سے انھیں جُرم کی تحریک ہوتی ہے، جیل تو دُودھ کے اُبل جانے کے بعد کی حالت ہوتی ہے، اُس سے کیسا ڈرنا! اور پھر یوں بھی جو سائنس دان مہلک گیسوں کے درمیان رہتے ہیں اگر وہ اُن سے ڈرنا شروع کر دیں تو سائنس کی ساری ترقی رُک جائے!"

مَیں نے کہا: "ایسی ترقی کو تو رُک ہی جانا چاہیے یار جو اس بات پر فخر کرتی ہے کہ ہم نے ایسی گیس ایجاد کر لی ہے جو صرف جانداروں کو ختم کرے گی، اَملاک کو اِس سے نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"معلوم ہوتا ہے اُن لوگوں نے علاّمہ صاحب کا وہ شعر سُن لیا ہے:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود،
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

سو اُنھوں نے 'افکار' والوں کا بندوبست کر لیا ہے۔" پروین نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"افکار کسی رسالے کا نام بھی تو ہے شاید؟" عرفان نے یاد کرتے ہُوئے کہا۔

"ہاں، اپنے صہبا بھائی ___ صہبا لکھنوی نکالتے ہیں اُسے۔"

"صہبا لکھنوی ___" عرفان نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ وہی صاحب ہیں نا جو بڑے زور زور سے زانوؤں پر ہاتھ مار مار کر شعر پڑھتے ہیں؛ مَیں نے ویڈیو میں اُن کا ایک مشاعرہ دیکھا تھا۔"

"وہ صہبا اختر ہے بھائی، اُس میں سے تو تین چار صہبا لکھنوی نکل آئیں گے۔"

"آپ کو پتا ہے امجد بھائی، مشفق خواجہ نے صہبا صاحب کے بارے کیسا ظالم فقرہ لکھا ہے؟"

مَیں نے کہا: "مشفق خواجہ کے اکثر فقرے بہت گہری کاٹ والے ہوتے ہیں اور صہبا صاحب پر وہ مشقِ ستم بھی اکثر کرتا رہتا ہے ___ تم کس فقرے کی بات کر رہی ہو!"

"اُنھوں نے صہبا بھائی کے لندن میں دیے گئے ایک بیان پر تبصرہ کیا ہے جس میں اُنھوں نے کہا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے مَیں 'افکار' کو لندن سے بھی نکالا کروں مگر افسوس میرے وسائل اِس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس پر مشفق خواجہ نے لکھا کہ صہبا صاحب کے وسائل اجازت نہیں دیتے اور لندن والوں کا ضابطۂ اخلاق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہاں سے کوئی ایسا رسالہ نکالا جائے جو صرف مشتہرین کے لیے چھپتا ہو۔"

"یہ فاؤل ہے بھئی۔" مَیں نے بے ساختہ ہنستے ہُوئے کہا۔ "میرے خیال میں اس میں حقیقت سے زیادہ مشفق خواجہ کا بُغضِ مدیرانہ بول رہا ہے، اب وہ خود بھی تو 'تخلیقی ادب' نکال رہے ہیں نا!"

"کچھ بھی ہو ___ جُملہ بہت اچھا ہے ___" عرفان نے اپنے مخصوص انداز میں ایک طرف دیکھ کر دوسری طرف سر ہلاتے ہُوئے داد دی۔

"آپ ویسے رہتے تو امریکہ ہی میں ہیں نا!" پروین نے بڑی سنجیدگی سے پُوچھا۔

"کیا مطلب؟" عرفان نے حیران سا ہو کر پُوچھا۔

"مطلب یہ کہ ہمیں ایئرپورٹ سے چلے ہُوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو چلا ہے، امجد بھائی نے بتایا تھا کہ آپ شکاگو میں رہتے ہیں، آپ نے بتایا کہ آپ کی رہائش شکاگو کے مضافات میں ہے مگر آپ تو چلتے ہی چلے جا رہے ہیں، ہم تو اتنی دیر میں کراچی سے حیدرآباد پہنچ جاتے ہیں۔"

"اسی پھیلاؤ کا نام تو امریکہ ہے۔" عرفان نے ایک ٹرن لیتے ہُوئے کہا۔

"ان کے پاس اتنی وسعت ہے پھر بھی یہ لوگ توسیع پسند ہیں، کتنی حیرت کی بات ہے!"

"اگر اس وقت یہاں میری جگہ اشفاق احمد ہوتے تو تمھیں طمع اور حطمہ کے حوالے سے اس کا رُوحانی حل بتاتے، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ بُھوک کے پیٹ سے بُھوک اور ظلم کے پیٹ سے ہمیشہ ظُلم ہی پیدا ہوتا ہے۔ کیوں عرفان!"

"اِس موضوع پر راج کپور نے 'آوارہ' فلم بھی بنائی تھی کہ شریف کا بیٹا شریف اور چور کا بیٹا چور ہوتا ہے۔" عرفان نے بریک مارتے ہوئے کہا۔ "فی الحال صورتِ حال یہ ہے کہ غریب خانہ آگیا ہے۔"

"بالآخر ــــ" پروین نے لُقمہ دیا۔

عرفان نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گیراج کا دروازہ کھولا، مَیں نے کہا: "یہ آئیڈیا اِن لوگوں نے غالباً علی بابا چالیس چور کے 'کھل جا سم سم' سے لیا ہے۔"

"پُرانے اور پرائے خیالوں کو نئی شکلیں دینے کا نام تو امریکہ ہے۔" عرفان نے دروازہ کھولتے ہُوئے کہا۔

"سعیدہ بھابی کہاں ہیں؟" مَیں نے پُوچھا۔

"وہ آج کل ذہنی اور جسمانی طور پر معذور بچوں کے ایک سنٹر میں کام کرتی ہے اور اِس وقت ہمارے فون کا انتظار کر رہی ہے۔" عرفان نے نمبر ملاتے ہُوئے کہا۔

دُعا سلام کے بعد طے یہ پایا کہ ہم لوگ سامان رکھ کر عرفان کے ساتھ ایک یونانی ریستوران میں پہنچ جائیں تاکہ لنچ سے فراغت حاصل کر لی جائے، اس کے بعد تفصیل سے باتیں ہوں گی۔

شمیم سیفی نے ایک بار کہا تھا کھانے اور موسیقی کے علاوہ عرفان کے کسی ذوق پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے سو اس بیان کی ایک بار پھر تصدیق ہو گئی۔ موٹر میں لتا کے گانوں کا کیسٹ اور ریستوران کا کھانا دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ لتا کہہ رہی تھی:

؎ تم کیا جانو تمھاری یاد میں ہم کتنا روئے ــــ چین سے جب تم سوئے

؎ جو مَیں جانتی بچھڑت ہیں سیاں ــــ گھونگھٹا میں آگ لگا لیتی

اور وہ سدا بہار بھجن جسے سُن کر دل کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں:

؎ اے ری مَیں تو پریم دیوانی، میرا درد نہ جانے کوئی

یونانی کھانوں کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اِن میں ہمارے اِسلامی اور خصوصاً برِصغیر کے کھانوں کی خُوشبُو پائی جاتی ہے۔ مرچ مصالحوں کے استعمال کے علاوہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اکثر کھانے بھی ہمارے کھانوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ عرفان نے بتایا کہ سپین، اٹلی اور مشرقی یورپ کے کچھ ملکوں کی 'خوراک' میں بھی یہ اثرات پائے جاتے ہیں البتہ امریکہ والے اِس ذائقے اور چٹخارے

سے مکمل طور پر محروم ہیں۔ میکسیکن کھانوں میں البتہ تھوڑی بہت 'جان' پائی جاتی ہے مگر وہ مولوی مدن کی سی بات' اُن میں بھی نہیں ہے۔

جو روسٹڈ گوشت ہم نے کھایا اُس کا نام غالباً 'گیرو' تھا جو چکن اور بیف کا ایک ایسا آمیزہ تھا جسے بڑی بڑی گھومنے والی سلاخوں پر لپیٹ کر ایک مخصوص درجہ حرارت پر مسلسل پکایا جاتا تھا۔ ہماری پلیٹوں میں اس کے بڑی نفاست سے کاٹے ہُوئے باریک باریک قتلوں کے ڈھیر پڑے تھے جو ہم نے بڑی رغبت اور تندہی سے چند ہی منٹوں میں اِس طرح نوشِ جان کیے کہ ہمارے ساتھ ساتھ ہوٹل والے کی طبیعت بھی خوش ہو گئی چنانچہ سعیدہ بھابی کی فرمائش پر اس نے انھیں بڑی فراخدلی سے اس کی receipe بھی لکھوا دی۔ مجھے حسبِ معمول مُرغ اور گائے کے آمیزے کے حوالے سے ایک لطیفہ یاد آ گیا:

"ایک ہوٹل نے ایک نئی ڈش کا اعلان کیا جو مُرغ اور گائے کے گوشت کا مجموعہ تھی۔ ایک گاہک نے اعتراض کیا کہ سالن میں مُرغے کا گوشت کہیں نظر نہیں آ رہا، آپ کس تناسب سے دونوں طرح کے گوشت ملاتے ہیں؟ ہوٹل والے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: 'ففٹی ففٹی جناب، ایک مُرغ اور ایک گائے!'"

سعیدہ بھابی کو مَیں نے پہلی بار تب دیکھا تھا جب عرفان سے اُن کی منگنی کی بات چل رہی تھی۔ عرفان اسلامیہ کالج سِول لائنز کے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر تھا اور سعیدہ بھابی مشرقی پاکستان سے بی اے کرنے کے بعد اس کی کلاس کے رستے اُس کے دل میں داخل ہوئی تھیں۔ اس وقت کی شرمیلی سی کم عمر اور زیادہ سنجیدہ لڑکی اور اِس ملنسار، پُروقار، ذمہ دار اور نفیس خاتون میں بہت فرق آ چکا تھا۔ اب وہ ایک آٹھ سالہ پیارے بچے اسد کی ماں، من پسند شوہر کی محبوب بیوی، بہت سے ڈپلوموں والی ماہرِ نفسیات اور امریکہ جیسے آزاد معاشرے میں اپنی روایات کی پابند ایک ایسی عورت بن چکی تھی جس کی آنکھوں اور باتوں میں اپنے ہونے کا اعتماد لہریں لے رہا تھا۔ پروین اور سعیدہ پہلی نظر میں ایک دوسرے کی دوست بن چکی تھیں۔ گفتگو کے موضوعات کے اعتبار سے عورتیں ویسے بھی خود کفیل ہوتی ہیں اور یہاں تو دونوں خواتین چونکہ ضرورت سے بھی کچھ زیادہ پڑھی لکھی تھیں اس لیے اُنھوں نے فوراً اپنا زنانہ ڈبہ علیحدہ کر لیا اور اس پُراسرار زبان میں گفتگو کرنے لگیں جس کے ذریعے

عورتیں چند لمحوں میں ایک دوسرے کی آسوں سے لے کر ساسوں تک کے بارے میں وہ کچھ جان لیتی ہیں جس کا پتا مردوں کو برسوں میں نہیں لگتا۔

مَیں نے عرفان کو بتایا کہ امریکہ آنے سے پہلے مَیں ٹی وی والوں کو اپنے نئے ڈراما سیریل "وقت" کا پلاٹ پروگرام دے کر آیا ہوں جس کی ابتدائی قسطوں میں جیل، جُرم، سزا اور قیدی کا خاصا تذکرہ رہے گا اور یہ کہ میری خواہش ہے کہ امریکہ کی اِس سب سے بڑی جیل کا راؤنڈ بھی لگایا جائے تاکہ پلاٹ کے تانے بانے میں مزید گہرائی اور وسعت پیدا ہو سکے۔ عرفان نے بتایا کہ جیل میں تعمیر کا کام بہت وسیع پیمانے پر جاری ہے جس کی وجہ سے حفاظتی انتظامات زیادہ سخت کر دیے گئے ہیں، بہرحال وہ کوشش کر کے دیکھتا ہے۔ اُس کی یہ کوشش ایک عدد ٹیلیفون کال پر محیط تھی جس کے دوران اُس نے متعلقہ حکام کو بتایا کہ اس کے مُلک سے تیسری دُنیا کے دو بین الاقوامی حیثیت کے ادیب، عمرانیات، سماجیات، اخلاقیات اور پتا نہیں کس کس 'آت' کے ماہر اور ریسرچ سکالر تشریف لائے ہیں اور اپنے عظیم تحقیقی کام کے سلسلے میں آپ کی جیل کا ایک راؤنڈ لگانا چاہتے ہیں۔ اب پتا نہیں یہ اُس کے ذاتی تعلقات کا احترام تھا یا ہمارے اس تعارف کا نتیجہ کہ نہ صرف ہمیں 'جیل یاترا' کی اجازت مِل گئی بلکہ 'کوئی اور خدمت' بھی پُوچھی گئی۔ اِس عجیب و غریب آفر پر ہم بہت دیر تک ہنستے رہے۔

مَیں نے کہا: "یار، یہ ہسپتال، تھانے اور جیل کی نوکری بھی بڑی عجیب ہے۔ آپ مہمان سے یہ بھی نہیں پُوچھ سکتے کہ پھر کب آئیں گے؟"

پروگرام یہ بنا کہ سعیدہ بھابی اپنے کام پر واپس چلی جائیں اور شام پانچ بجے چُھٹی کے بعد اسد کو سکول سے لیتی ہوئی گھر پہنچ جائیں، ہم اتنی دیر میں جیل ہو آتے ہیں۔

پروین نے کہا: "یہاں بچوں کا سکول پانچ بجے تک ہوتا ہے؟"

"سکول سے تو دو بجے چُھٹی ہو جاتی ہے لیکن چونکہ بیشتر گھروں میں مائیں موجود نہیں ہوتیں اِس لیے چھوٹی عمر کے بچوں کو سکول والے day care centre میں پہنچا دیتے ہیں جہاں سے دفتروں سے واپسی پر ماں یا باپ اُن کو لے لیتے ہیں۔"

"یہ تو بچوں سے بڑی زیادتی ہے بھئی۔" مَیں نے کہا۔

"اب یہاں کا سسٹم ہی ایسا ہے تو کیا کیا جائے!" سعیدہ نے کندھے جھٹکتے ہُوئے کہا۔

عرفان کی موٹر ایک تفریحی پارک نما علاقے میں داخل ہُوئی۔ پتا چلا کہ ہم جیل ایریا میں داخل ہو چکے ہیں۔ کار پارک کے سامنے ایک خوبصورت انیکسی نما عمارت تھی۔ بیرونی کمرے میں ایک استقبالیہ کاؤنٹر تھا جس کے پیچھے ایک کالی، موٹی اور ٹھگنی عورت کے ساتھ ایک گورا، دُبلا اور لمبا مرد کھڑا تھا۔ عرفان نے اُن سے بھی ہمارا وہی تعارف کرایا جس کے مطابق ہم دونوں عنقریب نوبل لاریٹ ادیب ہونے والے تھے مگر اُن کم بختوں کی آنکھوں میں اِس کے باوجود کوئی تاثر نہ اُبھرا۔ مَیں نے اُردو میں عرفان سے کہا کہ ان پر اپنا وقت اور الفاظ ضائع نہ کرو کیونکہ انھیں ادب سے اُتنی ہی دلچسپی ہے جتنی جالندھر کے دکاندار کو تھی۔

"یہ کیا بات ہُوئی؟" پروین نے حیرت سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ پر جیل کی دہشت سوار ہو گئی ہے، جالندھر کا یہاں کیا ذکر؟"

"اے عزیزۂ باتمیز، اس اجمال کے پیچھے ایک تفصیل ہے اور وہ کچھ یُوں ہے کہ ایک محفل میں جالندھر کے ایک کاروباری سے کسی نے حفیظ جالندھری صاحب کا تعارف کرایا:

"حفیظ صاحب کو تو آپ جانتے ہوں گے... ترانۂ پاکستان کے خالق...؟" دکاندار نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تعارف کرانے والے صاحب نے قدرے پریشان ہو کر کہا: "ارے بھئی حفیظ صاحب، شاہنامۂ اسلام کے مصنّف، مشہور شاعر..." دکاندار نے پھر سر دائیں سے بائیں گھمایا۔ تعارف کرانے والے نے بے حد بوکھلا کر کہا: "کمال ہے، تم حفیظ صاحب کو نہیں جانتے... بھئی یہ اپنے حفیظ جالندھری ہیں جن کی..." دکاندار تڑپ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور حفیظ صاحب سے بغل گیر ہوتے ہُوئے بولا: "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، آپ بھی جالندھر کے ہیں، بہت خوشی ہُوئی... بہت خوشی ہُوئی۔"

پروین کی جو ہنسی چھوٹی ہے تو وہ نیگیٹو پازیٹو قسم کا گُلی ڈنڈا بھی خوامخواہ ہنسنے لگ پڑا۔

ہمارا دستی سامان اور بٹوے لاکرز میں رکھ کر ہمیں ٹوکن دے دیے گئے۔ معلوم ہُوا کہ بتیس ڈالر سے زیادہ کرنسی اندر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وزیٹر کا علامتی نشان ہماری جیکٹوں اور پروین کے کوٹ کے ساتھ لگایا گیا اور پھر ہوائی اڈوں جیسی تلاشی کے ایک مرحلے سے گزارنے

کے لیے ہمیں علٰحدہ علٰحدہ کمروں میں بھیج دیا گیا۔ اِس تلاشی پر مجھے اپنا عزیز دوست اور معروف شاعر اجمل نیازی بہت یاد آیا جس کی داڑھی، مخصوص خدوخال اور سُرخ وسفید رنگت کی وجہ سے ہم اُسے 'افغان مہاجرین' کہا کرتے ہیں۔ ایک بار لاہور ایئر پورٹ کے لاؤنج سے وہ مختصر وقفوں کے بعد دو تین دفعہ اُٹھ کر باہر گیا۔ ہر بار مذکورہ حلیے کی وجہ سے اس کی مکمل تلاشی لی گئی۔ آخری چکر پر تو سیکیورٹی والوں نے اُسے تقریباً روک ہی لیا۔ اُنھیں تو ہم نے سمجھا بجھا کر معاملہ صاف کر دیا مگر جب واپس آتے ہُوئے مَیں نے اجمل سے اِن چکروں کی وجہ پوچھی تو اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا: "وجہ تو کوئی نہیں تھی، بس جب وہ تلاشی لیتے ہیں تو بہت مزا آتا ہے ... عجیب طرح کی تھرل محسوس ہوتی ہے۔"

تلاشی کے بعد ہم نے اپنے آپ کو استقبالیہ کی عمارت کے پیچھے اور جیل کی مرکزی عمارت کے سامنے پایا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا مگر کمرے میں رکھے ہوئے ٹی وی مانیٹر سیٹ چل رہے تھے یعنی جیلر صاحب وہیں بیٹھے بیٹھے جیل کے تمام اہم مقامات اور ناکوں کی خبر گیری کر سکتے تھے۔ کمرے میں جیلر کے پیشروؤں اور مشہور زندہ، آنجہانی اور مفرور مجرموں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ عقل مندی اُن لوگوں نے یہ کی کہ تصویروں کے ساتھ متعلقہ افراد کا مختصر تعارف بھی لکھ دیا تھا ورنہ اکثر مقامات پر شدید غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

ریکارڈ آفس میں بھی کم و بیش یہی صورتِ حال تھی، فرق صرف یہ تھا کہ یہاں قانون شکنوں کے دوش بدوش جیل کے اُن محافظینِ قانون کی تصاویر بھی تھیں جو ادائے فرض کے دوران جان سے گزر گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس جیل میں اس نوع کے واقعات کی تعداد اِس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہاں عام طور پر خطرناک ترین مجرم رکھے جاتے ہیں جن کے نزدیک انسان کا قتل فلیپر سے مکھی مارنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ مَیں نے کنکھیوں سے دیکھا، پروین کے چہرے سے رنگ اُڑ کر بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے تھوک نگلتے ہُوئے پُوچھا: "آج کل تو حفاظتی اقدامات بہت بہتر ہو گئے ہوں گے، اِن ماڈرن ایکوپمنٹس کی وجہ سے؟"

"ہاں، کچھ بہتری تو ہوتی ہے۔" متعلقہ افسر نے سرسری لہجے میں جواب دیا، "مگر بات یہ ہے خاتون کہ دروازے بند کرنے والوں سے کھولنے والے ہمیشہ زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔"

مَیں نے محسوس کیا کہ پروین کا بیٹھا ہوا حوصلہ اب لیٹنے کے قریب ہے۔ شاید عرفان کو بھی اس

صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا تھا اِس لیے وہ، ہمیں لے کر فوراً اس کمرے سے نکل آیا اور بتانے لگا کہ اعلیٰ ترین حفاظتی اقدامات کی وجہ سے کئی برسوں سے یہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اِس لیے، ہمیں گھبرانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ دو لمبے کاریڈورز سے گزر کر ہم جیل کے ایک ایسے حصّے میں پہنچے جو گول دائرے کی شکل کا ایک بہت بڑا ہال تھا اور جس میں چاروں طرف نیچے سے اُوپر تک قیدیوں کے سیل بنے ہُوئے تھے۔ اِن سیلوں کے سامنے مضافاتی ہوٹلوں کے ورانڈوں جیسی لمبی لمبی راہداریاں تھیں جن کے گرد اگرد سلاخ دار جنگلے لگے ہُوئے تھے۔ بہت سے قیدی طرح طرح کی جینیں اور ٹی شرٹیں پہنے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ اُن کے انداز میں ایک عجیب طرح کی بے تکلفی تھی جیسے چڑیا گھر کے جانور مسلسل دیکھے جانے کی وجہ سے بے نیاز سے ہو جاتے ہیں۔

ہال کے درمیان میں ایک بڑا سا لوہے کا کٹہرا تھا معلوم ہُوا ایمرجنسی کی صورت میں جیل کا عملہ اسے اپنے دفاعی مرکز کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ایک میکنزم کے تحت یہ پورے کا پورا اسٹرکچر اپنی جگہ سے تیس فٹ اُوپر تک کہیں بھی معلق ہو سکتا ہے اور یُوں قیدیوں کے حملے کی زد سے باہر ہو کر اُنہیں کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ یہ اطلاع اُس ماحول اور گزشتہ معلومات کے تناظر میں کچھ زیادہ ہی تشویش ناک تھی۔ عین اُس وقت قریب سے گزرتے ہُوئے دو قیدیوں نے پروین پر ایسی نظریں ڈالیں کہ اُس کی ناک کی پھننگ پر پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ عرفان نے بتایا کہ چند برس پہلے جس شخص نے آٹھ نرسوں کو بیک وقت قتل کیا تھا وہ اِسی نواح میں موجود ہے، اگر ہم چاہیں تو اُس کی 'زیارت' بھی ہو سکتی ہے۔ پروین نے بڑی مشکلوں سے مُسکراتے ہُوئے کہا: "نہیں — ٹھیک ہے، اندازہ تو ہو ہی گیا ہے — کیوں امجد بھائی!"

"ہاں — ویسے بھی یہاں کچھ عجیب سی بُو ہے — دِل گھبرا رہا ہے۔"

عرفان نے کہا: "آئیے آپ کو مسجد دکھائیں۔"

"مسجد؟ یہاں؟ جیل کے اندر . . . ."

"ہاں، یہاں تمام بڑے بڑے مذاہب کے لیے عبادت گاہیں بنائی گئی ہیں۔ گناہ اور توبہ کا رشتہ تو شاید اِس کائنات کا سب سے پُرانا اور مستقل رشتہ ہے۔"

چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد ہم نیچی چھت والے اس کمرے میں پہنچے جسے عرفان، نے مسجد کہہ کر متعارف

کروایا تھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں مسجد کے سارے لوازمات موجود تھے: چٹائیاں، ٹوپیاں، قرآن مجید کے نسخے، حدیث اور فقہ سے متعلق پندرہ بیس کتابیں۔ عرفان نے بتایا کہ یہاں ایک پارٹ ٹائم مولوی صاحب بھی موجود ہیں جو مذہبی معاملات کی بجا آوری اور رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اس نے کیس بنا کر بھجوایا ہے، توقع ہے جلد ہی ایک کُل وقتی مولوی صاحب کی مستقل پوسٹ منظور ہو جائے گی۔

مَیں نے کہا: "پروگرام تو بہت اچھا ہے مگر یہ سوچ لینا کہیں اُلٹی آنتیں گلے نہ پڑ جائیں۔ علامہ صاحب نے جو 'دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد' کہا ہے تو یونہی تو نہیں کہا۔ انگلینڈ میں اِن لوگوں نے کئی مسجدوں پر تالے لگوا دیے ہیں۔"

"میرے خیال میں دونوں طرف برابر کا رِسک ہے۔ مولوی صاحب کو بھی اتنا اندازہ تو ہو گا کہ جیل میں فساد کا مطلب کیا ہوتا ہے!" عرفان نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

جیل میں اُس وقت کوئی اٹھارہ سو کے قریب قیدی تھے جن میں سے تقریباً پندرہ سو سیاہ فام یا دیگر رنگدار نسلوں سے تھے۔ مَیں نے پُوچھا: "گوروں اور کالوں کے اِس عدمِ تناسب کے پیچھے بھی کوئی نسلی تعصب ہے یا ...."

"نسلی تعصب تو شاید نہیں معاشی عدمِ تناسب یقیناً ہے۔ غُربت اور کم وسائل کی وجہ سے یہاں کے کالوں میں جرائم کا رجحان غالب ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے۔"

"مگر یار، امریکہ تو پوری دُنیا کا اَن داتا بنا ہُوا ہے، یہاں کس چیز کی کمی ہے جو یہ ان لوگوں کو اپنے برابر کے مواقع نہیں دیتے؟"

"یہ بڑی لمبی بحث ہے!" عرفان نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہُوئے کہا۔ 'برابری' اور 'مزید برابری' کا چکر ایسا خوفناک ہے کہ دُنیا کا ہر نظام اِس پر قابو پانے میں ناکام ہو گیا ہے۔ نعرے بدلتے رہتے ہیں مگر انسان کی تقدیر نہیں بدلتی۔ انسانی تاریخ میں صرف ایک بار چودہ سو سال پہلے اس کا ایک امکان پیدا ہوا تھا مگر افسوس، سرورِ کائنات ؐ نے حضرت بلال ؓ کو قریشِ مکّہ کی موجودگی میں کعبے کی چھت پر کھڑا کر کے رنگ، نسل، قوم اور طاقت کی جو دیوار گرائی تھی، ہم نے اُسے پھر سے تعمیر کر لیا۔ اب تو بہت مشکل ہے!"

"سپورٹس اور میوزک میں تو زیادہ تر سیاہ فام لوگ ہی آگے ہیں!" پروین نے کہا۔

"اور بھی بہت سے شعبوں میں یہ لوگ گوروں سے آگے ہیں.... لیکن مسئلہ پھر وہی مزید برابری کا ہے۔"

میرا جی چاہا کہ امریکی معاشرے کی نام نہاد جمہوریت، مساوات، آزاد خیالی اور نسلی حقوق کے نعروں پر تنقید کر کے ان کا پھلکا اُڑاؤں مگر میرے اندر سے کسی نے جیسے سرگوشی کے انداز میں پوچھا: "یہ تو پھر گورے اور کافر ہیں، کیا ہم سانولے، گندمی اور دیگر رنگدار لوگ، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اِن سیاہ فاموں کو برابر کے حقوق دینے کو تیار ہیں؟ کیا ہم بھی انہیں ازراہِ تحقیر و تمسخر 'کالے حبشی' نہیں کہتے؟ کیا ہم اِن کے رنگ، گھنگھریالے بالوں، موٹے ہونٹوں اور بھڑکدار رنگوں والے لباسوں کو دیکھ کر زیرِ لب مسکراتے نہیں؟ کیا ہمارے معاشرے میں ان افتادگانِ خاک کے لیے اتنی جگہ بھی ہے جتنی انہیں یہاں میسّر ہے؟"

یہ اور اِس طرح کے بے شمار سوالوں سے گھبرا کر میں نے سر کو زور سے دو تین بار جھٹکا۔ سامنے سے ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام ویسٹ انڈیز کے کھلاڑی کلائیو لائیڈ کی طرح کندھے اور مُنہ آگے کو نکالے، ٹھوڑی اُوپر کی طرف اُٹھائے اور اوپری جسم کو ایک بے ہنگم سے انداز سے جُھلاتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس میں دوستی، تجسّس اور استہزا آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اُس کی کمر کے گرد ایک بینڈیج سی تھی جس کے ساتھ چند پلاسٹک کی نالیاں اور ایک تھیلی بندھی ہوتی تھی۔ ہمارے قریب آ کر وہ رُکا، مُسکرایا اور پھر پروین کی طرف اپنا لمبا سا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ فطری ردِ عمل کے طور پر پروین نے ہاتھ تو ملایا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کا اُوپر کا سانس کہیں اُوپر ہی رہ گیا ہے۔ اُس مردِ بے تکلّف نے اگرچہ مجھ سے اور عرفان سے بھی ہاتھ ملایا مگر اس کی نظریں مسلسل پروین کی طرف رہیں جس کی وجہ سے اُس کے اُوپر رُکے ہُوئے سانس کو نیچے آنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اُس نے پروین کے چہرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہُوئے ایک عجیب سی آواز اور غریب سی انگریزی میں کچھ کہا جو نہ میری سمجھ میں آیا اور نہ پروین کی حالانکہ اس نے انگریزی میں دو دو ایم اے کر رکھے ہیں۔ عرفان نے بھی غالباً اس صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا اِس لیے اس نے آگے بڑھ کر اُسی طرح کی منحنی سی انگریزی میں اُس سے کوئی بات کی جس پر اُس نے زور زور سے سر ہلا

کر "یس، یس" کہا، ایک بار پھر ہم تینوں سے مصافحہ کیا اور جھومتا ہُوا ایک طرف کو چلا گیا۔

"یہ کیا چیز تھی بھائی، اور کیا کہہ رہا تھا!" مَیں نے مصنوعی بے پروائی سے پُوچھا۔

"یہ چیز نہیں 'بڑی شے' ہے اور کہہ کچھ نہیں رہا تھا صرف پروین صاحبہ کے ناک کے کوکے کی تعریف کر رہا تھا اور پُوچھ رہا تھا کیا وہ اِسے چھُو کر دیکھ سکتا ہے؟"

"نہیں — " پروین نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"مَیں نے بھی اُسے یہی جواب دیا ہے۔" عرفان نے مسکراتے ہُوئے کہا، "اور اتفاق کی بات ہے وہ آرام سے مان گیا ہے ورنہ . . ."

"ورنہ کیا!" پروین نے پریشان ہو کر پُوچھا، "آپ کا مطلب ہے کہ . . ."

"آپ گھبرائیں نہیں — اب تو وہ چلا ہی گیا ہے — دراصل اِس سے جیل کا سارا عملہ گھبراتا ہے۔ اِس کے گُردے میں کوئی تکلیف ہے، آپ نے وہ تھیلی دیکھی تھی نا . . . اِس پر کسی قسم کی سختی نہیں کی جا سکتی۔ کم بخت نہ صرف اِس صورتِ حال سے واقف ہے بلکہ ویسے بھی قانون کی بہت سی باریکیاں سمجھتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس بیماری کی آڑ میں یہ پوری جیل کو بلیک میل کر رہا ہے۔ ذرا کوئی اُونچی نیچی بات کرے تو یہ تن کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

"Come on, come on, hit me."

"یہ کیا بات ہُوئی؟" مَیں نے کہا، "اس طرح تو جیل کا ڈسپلن . . ."

"یہ امریکہ ہے مائی ڈیر، یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ قانون شکنی اور جُرم کی حوصلہ افزائی یہاں کے سسٹم کا بنیادی جزو ہے۔ عدالتوں میں مُجرم کو بچانے کے لیے ایسے ایسے رستے ہیں کہ تم لوگ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ یوں لگتا ہے جیسے پورا معاشرہ جج صاحب سمیت مُجرم کا وکیل بنا ہُوا ہے۔ اس کے باوجود اُسے سزا ہو جائے تو جیل میں اُس کے حقوق کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے جیل کا عملہ قیدی ہے اور یہ لوگ یہاں کے ایڈمنسٹریٹر ہیں۔"

"وہ کیسے؟" پروین نے پوچھا۔

"وہ یوں کہ قیدیوں کے حقوق اور اُن کی بہبُود کے ادارے، وکیلوں کی انجمنیں، انسانی حقوق کی تنظیمیں اور مقامی رفاہی ادارے — سب کے سب — اِن کے ساتھ ہوتے ہیں اور اس معاشرے

میں اِن اداروں کی بڑی طاقت ہے چنانچہ جیل والوں کو ایک عام قیدی پر جتنا خرچ کرنا پڑتا ہے اُتنے میں ہمارے یہاں دو وی آئی پی بھگتائے جا سکتے ہیں۔ کچھ جدید جیلیں تو ایسی ہیں کہ انھیں بلا تکلف ریسٹ ہاؤسز قرار دیا جا سکتا ہے۔

"اِس حساب سے تو یہاں کے ترقی پسندوں کو بڑی مشکل ہوتی ہوگی.... میرا مطلب ہے نہ زنداں کی شام، نہ گوشۂ تنہائی، نہ دار و رسن، نہ حلقۂ زنجیر، نہ زبان پہ مہر، نہ ہاتھ قلم، نہ پاؤں فگار!"

"اُس کے لیے یہاں اور طریقے ہیں۔" عرفان نے اپنے مخصوص انداز میں سر کو اُلٹی طرف گھماتے ہُوئے کہا۔ "البتہ ایک بات ہے، یہاں قیدیوں کے حقوق تیسری دُنیا کے کئی ملکوں کے آزاد شہریوں سے زیادہ ہیں۔" عرفان کا یہ جُملہ اس قدر سچا تھا کہ فوراً فیض صاحب یاد آگئے۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں! کس سے منصفی چاہیں!

اِس کے بعد ہم نے قیدیوں کی جسمانی صحت اور ورزش کے لیے بنایا گیا نیا جمنیزیم دیکھا۔ اُس میں جس قدر سہولتیں تھیں اُس سے آدھی بھی، ہماری اولمپکس میں شریک ہونے والی ٹیم کے ٹریننگ کیمپ کو نصیب نہیں ہوتیں۔ جی اور بُرا ہوا!

عرفان نے بتایا کہ اکثر قیدی عدالت میں پاگل یا ابنارمل قرار دیے جانے کے لیے جیل میں ڈنگا فساد کرتے ہیں یا مختلف طرح کی حرکتیں کرتے ہیں تاکہ اُنھیں ہسپتال بھجوا دیا جائے جہاں وہ اور بھی زیادہ مزے سے رہ سکتے ہیں۔ عرفان کا کام ایسے لوگوں کا نفسیاتی تجزیہ کرکے رپورٹ لکھنا ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ وہ اُنھیں مختلف نفسیاتی مسائل کے سلسلے میں بھی مشورت اور راہنمائی مہیا کرتا ہے۔

"یہ تو بڑا خطرناک کام ہے۔" پروین نے کہا، "خدانخواستہ اگر کوئی قیدی..." "نہیں، ایسا ہوتا نہیں ہے۔ وہ محاورہ ہے نا 'دیوانہ بکارِ خویش ہشیار'۔ تو کچھ اُسی طرح کا معاملہ ہے اور ویسے بھی ہمارے پاس حفاظتی اقدامات کا مکمل بندوبست ہوتا ہے۔"

"مَیں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہاں مجرموں کا ایک اپنا ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے جس پر وہ جیل میں بھی بہت سختی سے عمل کرتے ہیں؟" "تم نے ٹھیک سُنا ہے ___ بعض معاملات میں اِن لوگوں کا اندرونی ضابطۂ اخلاق عام معاشرتی اخلاقیات سے زیادہ اچھا، گہرا اور مضبُوط ہے، مثلاً عورتوں پر حملے اور بچوں سے زیادتی کرنے والوں کو یہ لوگ بہت بُرا سمجھتے ہیں اور جیل کے اندر نہ صرف اُن سے نفرت کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ایسے لوگوں کو سخت سزائیں بھی دیتے ہیں۔"

"سزا یافتہ لوگ جب واپس معاشرے میں جاتے ہیں تو اُن کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے یعنی کیا اُن سے میل ملاپ، رشتہ داری اور تعلقات میں کوئی فرق پڑتا ہے؟ اُنھیں ملازمت آسانی سے مل جاتی ہے، لوگ اُن سے نارمل انداز میں ملتے ہیں یا اُن کے جُرم کا سایا بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے؟"

"اِس معاشرے میں ویسے تو کوئی بھی کسی کے ماضی میں دلچسپی نہیں لیتا اور یہی طرزِ عمل سزا یافتہ مجرموں کے سلسلے میں بھی ہے۔ استثنائی صورتوں میں کچھ لوگوں کو ری ایڈجسٹ کرنے میں دقت پیش آتی ہے لیکن پھر بھی ہمارے والا معاملہ نہیں ہے کہ چاہے کسی وجہ سے بھی جیل جاؤ آئندہ زندگی کے سارے جائز راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

عرفان کے استفسار پر مَیں نے اسے بتایا: "ان سوالات کا مقصد اپنے آئندہ ٹی وی سیریل 'وقت' کے سلسلے میں مواد جمع کرنا ہے کیونکہ جرم، معاشرے اور سزا کی یہ مثلث مجھے اکثر پریشان کرتی رہتی ہے اور مَیں چاہتا ہوں اس موضوع کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔"

'دہلیز' میں بھی تو آپ نے یہ اشو ڈِسکس کیا تھا؟" پروین نے کہا۔

"مگر وہ ٹی وی حُکام اور اُن کی پالیسی کی چکّی میں پس کر رہ گیا تھا۔ اُس وقت کے ایک جنرل مینجر نے، جو کبھی میرا انتہائی قریبی دوست ہُوا کرتا تھا، مجھے بتائے بغیر اُس کی آخری قسط میں سے پانچ ریکارڈڈ سین کاٹ دیے تھے۔ جس شام یہ قسط چلی وہ میری زندگی کی سب سے زیادہ ناخوشگوار شام تھی۔"

"مگر کیوں؟" عرفان نے حیرت سے پوچھا "مَیں نے تو سُنا ہے ٹی وی والوں سے تمھارے بڑے تعلقات ہیں اور تم اُن کے بڑے فیورٹ رائٹر ہو۔"

"ہاں ___ وہ بھی ہوں ___ مگر جو کچھ مَیں نے کہا ہے وہ بھی حرف بحرف سچ ہے۔"

"یہ تو چاہت نفرت قسم کا تعلق لگتا ہے۔" عرفان نے بڑی پیشہ ورانہ سنجیدگی سے کہا۔

"شاید وہ بھی ہو ۔۔ اصل المیہ یہ ہے کہ ہمارا ٹی وی عوام کے بجائے سرکار کا نمائندہ ہو کر رہ گیا ہے۔ تخلیقی لوگ یا تو اِس میں سے نکل گئے ہیں یا گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ جو اِس کے باوجود بچ گئے ہیں اُنھیں افسر بنا کر انتظامیہ میں لگا دیا گیا ہے جہاں اُن کا کام وہی ہے، جو فرعون کا بنی اسرائیل سے تھا ۔۔ ایسے میں جو کچھ میرے ساتھ ہُوا وہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ تمھیں پتا ہے بادشاہ کے 'وفادار' بادشاہ سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

"یہ آپ نے کیا موضوع چھیڑ دیا۔" پروین نے عرفان سے شکایت کی، "اس موضوع پر تو امجد بھائی دس گھنٹے نان سٹاپ بول سکتے ہیں۔"

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ مَیں بغیر موضوع کے بھی دس گھنٹے بول سکتا ہوں۔"

"دِل میں کہا تھا۔" پروین نے ہنستی ہُوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

واپسی پر عرفان نے ایک پٹرول پمپ پر موٹر روکی اور کھڑکی کھول کر ایک لیٹر بکس نما ڈبے کے کھلے ہُوئے منہ میں بٹوے سے نکال کر ایک کارڈ رکھ دیا۔ اتنے دنوں میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ امریکہ میں روزمرّہ زندگی کا زیادہ تر کام کارڈوں کے ذریعے ہی چلتا ہے اور ایک عام امریکی شہری کی کُل اوقات چھ سات کارڈوں پر محیط ہوتی ہے مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی حد نہ رہی کہ دو تین منٹ کے بعد نہ صرف عرفان کا بھیجا ہوا کارڈ واپس آ گیا بلکہ اس کے ساتھ کافی سارے ڈالر بھی تھے۔

مَیں نے حیران ہو کر پُوچھا: "یہ کیسا پٹرول پمپ ہے یار، جہاں پٹرول کے ساتھ ساتھ پیسے بھی ملتے ہیں۔"

عرفان نے مُسکراتے ہُوئے پٹرول پمپ کے عقب میں واقع ایک خوبصورت عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "یہ پیسے مَیں نے اپنے بنک سے نکلوائے ہیں۔"

ہماری حیرت دیکھ کر اُس نے وضاحت کی کہ عام طور پر سردی، بارش اور برف کی وجہ سے لوگوں کو بنک تک پہنچنے میں تکلیف ہوتی ہے چنانچہ اُنھوں نے اِس پٹرول پمپ پر ایسا انتظام کر دیا ہے کہ جتنی دیر میں آپ پٹرول لیں اس کے اندر اندر آپ کا چیک کیش ہو کر رقم آپ کو یہیں مل جائے۔

مَیں نے سوچا یہ امریکی بھی عجیب قوم ہیں، آسانی پیدا کرنے پر آتے ہیں تو کسی کام کے لیے چٹکی تک

نہیں بجانا پڑتی اور مشکل کھڑی کرتے ہیں تو ایسی کہ ایک اسرائیل دس عرب ملکوں کے قابو میں نہیں آتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ یو این او میں یو تو U.S.A. کا ہے باقی سب No ہی نو ہے۔

گھر پہنچے تو بھابی سعیدہ نے کھانوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ معلوم ہُوا دفتر سے آنے کے بعد وہ اِسی کام میں جُتی رہی ہیں۔ ہم نے اِس تکلف اور تکلیف کی شکایت کرنا چاہی تو اُس نے بڑی محبت بھری فہمائش کے ساتھ کہا: "آپ مرد ہیں امجد بھائی، آپ شاید نہ سمجھ سکیں، پروین کو پتا ہوگا پسندیدہ لوگوں کے لیے کھانا پکانا عورت کے لیے کتنی بڑی راحت ہوتی ہے۔"

اِس جُملے نے ایسا کلین بولڈ کیا کہ واپسی کے دن تک مجھے دوبارہ اِس موضوع پر بات کرنے کی جرأت نہیں ہُوئی۔ یہ اور بات ہے کہ اس شیر کی بچی نے ہر کھانے پر دو تین نئی ڈشیں ضرور تیار کیں۔ ایک بار عرفان نے چھیڑتے ہُوئے کہا: "میرا جی چاہتا ہے آپ کو ہمیشہ کے لیے یہیں رکھ لوں کیونکہ جب سے ہم یہاں ہیں یہ پہلا موقع ہے کہ سعیدہ کھانا پکانے میں اتنی دلچسپی لے رہی ہے۔"

"جی ہاں ——— ورنہ آپ تو آٹھ برسوں سے فاقے ہی کر رہے تھے۔" سعیدہ نے چوٹ کی۔

"دیکھو بھئی، امجد کو پتا ہے ہم کشمیریوں کی زندگی میں بس دو ہی شوق ہیں، پہلا کھانے کا..."

"اور دوسرا بھی کھانے کا ———" مَیں نے بات کاٹتے ہُوئے کہا۔

"یہ بات آپ نے مجھے شادی سے پہلے کیوں نہیں بتائی؟" سعیدہ نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"وہ اِس لیے کہ شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کی صرف خوبیاں ہی بتائی جاتی ہیں۔" عرفان نے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

"آپ کو تو پتا ہونا چاہیے تھا، بھابی ——— افیئر تو آپ کا غالباً ڈیڑھ دو برس چلتا رہا تھا۔" مَیں نے دانہ ڈالا۔

عرفان اور سعیدہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے ساختہ مسکرائے۔ پروین بولی: "یہاں آپ کی دال نہیں گلے گی امجد بھائی ——— دونوں پارٹیاں مضبوط ہیں۔"

"مَیں بھی یہی چیک کر رہا تھا۔"

"یہ کچھ ویسی ہی چیکنگ نہیں ہوگئی جیسے ایک سردار جی نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کسی سے پُوچھا تھا کہ بتاؤ ہم کس پر بیٹھے ہیں؟ متعلقہ شخص نے پریشان سا ہو کر کہا: 'گھوڑے پر۔ سردار جی، آپ کو

نہیں پتا؟' پتا تو ہے،' سردار جی نے مُسکراتے ہُوئے کہا، 'پھر بھی چیک کر لینے میں کیا ہرج ہے؟'"

عرفان کے اِس لطیفے پر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔ اسد نے، جو ابھی تک بڑی خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا، اپنی بڑی بڑی خوبصُورت آنکھیں جھپکا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر ایسے انداز میں کندھے جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گیا جیسے ہماری ہنسی اور شور سے اُس کے گیان دھیان میں فرق آ رہا ہو۔ اُس کی اِس اَدا پر ایک اور مشترکہ قہقہہ بلند ہُوا۔

"معلوم ہوتا ہے بیٹا ہماری باتوں سے بور ہو گیا ہے۔" پروین نے کہا۔

"شکر کرو اس کا طوطا یہاں نہیں تھا۔" مَیں نے عرفان کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا، "وہ پروفیسر منظور کے بیٹے والا! یاد ہے نا!"

"مَیں نے ہی تو تُمھیں سنایا تھا۔" عرفان نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"پروین کو بھی سُنائیے نا ___" سیدہ ہنسی روکتے ہُوئے بولی، "یہ بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔"

"وہ تو مَیں واقعی ہو رہی ہوں۔ بات اسد کی ہو رہی تھی، یہ طوطا بیچ میں کہاں سے آ گیا؟"

"یہ ایک بڑا مزیدار واقعہ ہے۔" عرفان نے قصّہ گوؤں کے انداز میں سٹارٹ لیتے ہُوئے کہا، "ہُوا یوں کہ ایک بار میرے سائیکولوجی کے اُستاد پروفیسر منظور احمد اپنے نو دس سال کے بچے سے باتیں کر رہے تھے۔ بچے کے ساتھ پنجرے میں اس کا طوطا بھی تھا۔ اِس اثنا میں منظور صاحب کے کچھ مہمان آ گئے اور وہ سب لوگ کسی سنجیدہ مسئلے پر بحث میں لگ گئے۔ بچہ تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر بور سا ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا مگر چند لمحوں بعد پھر آ گیا اور طوطے کا پنجرا اُٹھا کر باہر کی طرف جانے لگا۔ اب کے منظور صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی، اُنھوں نے پُوچھا: 'اسے کہاں لے جا رہے ہو بیٹا؟'

'یہ بور ہو رہا ہے ___ ابو!' بچّے نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔"

مَیں عام طور پر انڈین فلمیں نہیں دیکھتا کیونکہ اُن میں بے موقع سیکس اور بے معنی تشدّد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا، البتہ جب کچھ بہت معقول لوگ کسی فلم کی مُسلسل تعریف کریں تو اُسے دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں چنانچہ جب سیدہ اور عرفان نے '۳۶ چورنگی لین' کی تیسری دفعہ تعریف کی تو مَیں

نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ فلم ہندوستان کے مشہور فلمی خانوادے 'کپور فیملی' کے ششی کپور کی تخلیق ہے اور اِس میں مرکزی کردار اس کی میم بیوی جینیفر نے اَدا کیا ہے اور فلم بھی بزبانِ انگریزی ہے۔ موضوع، سکرین پلے، ٹریٹ منٹ، کردار نگاری اور ایکٹنگ ——— ہر اعتبار سے یہ ایک عمدہ فلم تھی۔

فلم ختم ہوئی تو فلموں کے گرتے ہُوئے معیار پر گفتگو شروع ہو گئی۔ ہم نے یاد کیا کہ ہماری طالبعلمی کے دنوں میں ہر سال دس بارہ ہندوستانی اور تین چار پاکستانی فلمیں ایسی ضرور بنتی تھیں، جنھیں ہر اعتبار سے عُمدہ فلمیں قرار دیا جا سکتا تھا مگر اب، جب کہ فلموں کی لاگت اور تعداد میں تقریباً دس سے پندرہ گُنا اضافہ ہو چکا ہے، اچھی فلموں کی سالانہ اوسط ہندوستان میں پانچ چھ اور پاکستان میں (بمشکل) ایک تک گِر چکی ہے۔ آخری نتیجہ یہی نِکلا کہ اچھی فلم کی بنیاد موضوع اور سکرپٹ ہوتا ہے اور یہی دو شعبے ایسے ہیں جن کی طرف توجہ کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے۔ دونوں ملکوں میں پروڈیوسر کی جگہ فنانسرز نے لے لی ہے چنانچہ اب فلم تخلیق نہیں ہوتی بلکہ بنائی جاتی ہے بالکل اُسی طرح جیسے کوئی کمرشل پلازہ بنایا جاتا ہے اور یُوں ایک سنجیدہ تخلیقی عمل 'لاٹری' کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

عرفان کا موسیقی کا ذوق بہت اچھا ہے چنانچہ وہاں بھی اُس نے ایک بہت خوبصورت آڈیو لائبریری بنا رکھی ہے۔ ایک اچھے کن رس کی طرح اُسے اپنی پسند کے گانے اپنی مخصوص ترتیب کے ساتھ سُنانے کا شوق ہے تاکہ فضا میں ایک خاص موڈ قائم ہو سکے اور بعد میں آنے والا ہر گیت پہلے گیت کے تاثر میں اضافے کا باعث بنے۔ اُس نے کیسٹوں کے انبار میں سے چُن چُن کر لتا، امانت علی خاں اور گیتا دت کے گانے منتخب کیے۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اللہ کی اتنی بڑی زمین پر اپنے وطن اور گھروں سے ہزاروں میل دُور، اجنبی زمین اور غیر ہَوا میں ہم چار آدم زاد اُن گیتوں میں سانس لے رہے تھے جن میں ہماری زبان، مٹی، کلچر اور جذبوں کی مہک شامل تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمان اور مکان واقعی نظر کے دھوکے ہیں، 'وقت' اقبال کے بقول سچ مُچ زمانے کی ایک رَو ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات!

میری اپنی آواز ایسی ہے کہ اگر باتھ رُوم میں بھی گاؤں تو گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں، اِس کے باوجود بعض اوقات کسی آواز میں آواز مِلا کر گانے کو جی چاہتا ہے۔ اب ظاہر ہے ایسی بے سُری آواز کو برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہو سکتی چنانچہ عام طور پر مَیں ایسے انداز میں گنگنا کر اپنا

شوق پورا کر لیتا ہوں کہ ساتھ والے کو شبہ ہی رہے کہ مَیں گا بھی رہا ہوں یا نہیں۔ یہ تمہید دراصل اُس گلوکاری کی ہے جس کا مظاہرہ مَیں نے اُس رات قوالوں کے 'ہمنوا' کے انداز میں کم و بیش تین گھنٹے تک کیا تھا۔ ہُوا یوں کہ کسی دِل کو چھُو لینے والے گیت کے دوران پروین نے لتا کی آواز میں آواز ملائی۔ اس کی آواز نہ صرف معقول تھی بلکہ اُسے سُر کا شعور بھی تھا۔ چند لمحوں بعد عرفان اور سعیدہ بھی بالترتیب گانے اور گنگنانے لگے اور پھر یہ سلسلہ ایسا چل نکلا کہ اصل گانے والا/والی پس منظر میں چلے گئے اور 'حاضر مال' کی آوازیں حاوی ہونا شروع ہو گئیں۔ مَیں نے بھی حوصلہ کر کے بیچ میں کہیں کہیں اپنی اوقات کے مطابق آواز ملانا شروع کی۔ اب یہ ان لوگوں کی شرافت تھی یا ماحول کا اثر کہ مجھے نہ تو کسی نے ٹوکا اور نہ ہی بے سُرے ہونے کا احساس دلایا۔ اُس رات مجھے زندگی میں پہلی بار موسیقی کی قوت کا عملی تجربہ ہُوا۔ انسان کے داخلی سُر کا رُوحِ کائنات کے بُنیادی سُر سے کس قدر گہرا تعلق ہے اور غالب نے جو یہ کہا تھا کہ

ڈھونڈے ہے اُس مُغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برقِ فنا مجھے

تو دراصل وہ کیا کہنا چاہتا تھا! جدید مغربی موسیقی اور آرکسٹرا نے ہمارے گیتوں کے حُسن کو کس بُری طرح پامال کیا ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو کبھی چالیس اور پچاس کی دہائیوں میں بنے ہُوئے گیت ایک ساتھ سُن کر دیکھیے ـــــ دھیمے دھیمے، نرم و نازک، دُکھی اور دل زدہ، سپردگی اور وارفتگی سے چھلکتے ہُوئے، محبت اور سوزِ محبت سے لبریز ـــــ یہ گیت آپ کو ایک ایسی دُنیا میں لے جاتے ہیں جہاں ساری کائنات ایک عظیم سمفنی کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ ایک بے نام سی اُداسی ہمارے رگ و پے میں اُترنے لگی۔ اچانک سعیدہ بھابی کی آواز بھرا گئی، اُس نے گانا بند کر دیا اور بھیگی ہوئی آنکھوں پر آستین کا پردا کر لیا۔ چند لمحوں تک کمرے میں صرف امانت علی خاں کی گہری دُکھ بھری آواز گونجتی رہی۔ وہ یگانہ چنگیزی کی غزل گا رہا تھا:

پُکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا،
خُدا تھے اتنے، مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

ٹیپ روک دی گئی، چند لمحے کوئی کچھ نہیں بولا لیکن ایسا تھا کہ خاموشی بول رہی تھی۔ انسان ہجوم

اور تنہائی دونوں میں گزارہ کر لیتا ہے مگر اجنبی ہجوم اور پردیس کی تنہائی سہارے نہیں جاتے۔ عرفان اور سعیدہ نے بتایا کہ بعض اوقات وہ دونوں گھنٹوں اس کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ دن بھر کی رونق، مصروفیت، دنیاداری اور بھاگ دوڑ کے بعد ملنے والا یہ تخلیہ بہت قیمتی ہے مگر کبھی کبھی طبیعت اُن رنگوں کو بھی دیکھنا چاہتی ہے جسے وہ ہزاروں میل دُور چھوڑ آئے ہیں۔ اَپنے پن کے اِس ماحول میں اپنوں کی یادیں کچھ اور بھی زیادہ مُنہ زور ہو جاتی ہیں۔

"تم دونوں اپنے شعبے میں کوالیفائڈ اور ایکسپرٹ ہو اور پاکستان میں سائی کیٹری کا میدان ہنوز تقریباً خالی پڑا ہے، واپس کیوں نہیں آتے ـــــ میرا خیال ہے وہاں تمھیں کوئی معاشی پریشانی نہیں ہو گی۔" مَیں نے کہا۔

اِس پر گفتگو کا رُخ ایک ایسی سمت میں مُڑ گیا جہاں بحث اور اختلافِ رائے کی بے حد گنجائش تھی، سو وہی ہُوا۔ تھوڑی دیر میں موسیقی کا جادو اور سعیدہ کے آنسو دونوں کہیں پیچھے رہ گئے اور ہم چار نام نہاد پڑھے لکھے دانشور تیسری دُنیا، معاشرتی استحصال، معاشی بحران، اقداری خلا اور پتا نہیں کن کن باتوں پر علم و فضل اور مطالعے اور مشاہدے کے وہ موتی لُٹانے لگے جن کے بدلے میں انسانی خوشی کے علاوہ سب کچھ مل جاتا ہے۔

اس بحث میں صُبح کے چار بج گئے۔ یکدم مُجھے یاد آیا کہ آٹھ بجے افتخار نسیم نے آنا ہے اور اُس نے پورے دن کا لمبا چوڑا پروگرام بنا رکھا ہے چنانچہ اب کچھ دیر سو لینا چاہیے سو یوں یہ محفل 'جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا وہیں سے پھر ملاحظہ کیجیے' قسم کے اعلان کے بعد اگلی رات تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

افتخار نسیم بنیادی طور پر شاعر ہے اور ستر کے عشرے کے ابتدائی چند سالوں میں اُس کا نام اہم نوجوان شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔ 'فنون' کے جدید غزل نمبر میں اس کی دس غزلیں بھی چھپی تھیں مگر پھر ایک دم وہ منظر سے غائب ہو گیا۔ دو تین برس بعد اُس کا شکاگو سے خط آیا کہ تلاشِ رزق میں معقول خواری کے بعد اب اس کے پاؤں زمین پر لگ گئے ہیں اور آج کل وہ مصرعوں کے بجائے آرڈر پر بنائی جانے والی رولس رائس کاروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ چند برس پیشتر وہ پاکستان آیا تو اُس نے بتایا تھا

یہاں قانون کی ڈگری اور فیصل آباد میں اُن کے والد خلیق قریشی مرحوم کے چھوڑے ہُوئے اخبار "عوام" کے باوجود اُس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ گزشتہ ایک مہینے میں اس سے تین چار بار ٹیلیفون پر بات ہوتی تھی۔ اُس کے لہجے کی اپنائیت، ملاقات کے اشتیاق اور پنجابی زبان کی مخصوص بے تکلفی سے اندازہ ہوتا تھا کہ امریکہ ابھی تک اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔

جب عرفان نے مجھے جگا کر اس کے آنے کی اطلاع دی اُس وقت پونے آٹھ بجے تھے۔ گویا وہ وقتِ مقررہ سے بھی پندرہ منٹ پہلے آگیا تھا۔ مَیں کچی اور کم نیند کا غبار آنکھوں میں لیے نیچے اُترا تو افتخار کچن میں آملیٹ بنانے کے مختلف طریقوں کی وضاحت کر رہا تھا۔ اُس نے شکاریوں والی ایک برجس نما جین اور موٹی اُون اور بند گلے کے ایک پُل اوور کے اُوپر بغیر بازوؤں کی لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں لانگ شوز اور سر پہ لمبے لمبے بال تھے۔ اُس کا جسم مائل بہ فربہی تھا مگر چہرہ 'مائل' کی حدوں سے نکل کر تکمیل کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ معانقے اور مصافحے کے دوران اُس نے آملیٹ سازی کے فن پر اپنا لیکچر جاری رکھا۔ معلوم ہُوا امریکہ میں بیچلر لائف اور آملیٹ بنانے میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ کہ افتخار کو انڈے تلتے بارہ برس سے اُوپر ہو گئے ہیں۔

مَیں نے کہا: "گویا تمھارے بارے میں دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ 'باریں برسیں کھٹن گیا تے کھٹ کے لیا ندا انڈا'۔"

سعیدہ نے کہا: "یہ تو عورتوں سے زیادہ کچن کا کام جانتے ہیں۔"

"یہ سب امریکہ کی مہربانیاں ہیں۔" افتخار نے کہا۔ "جب مَیں یہاں آیا تھا تو مجھے چائے بھی نہیں بنانی آتی تھی اور اب مَیں دس پندرہ طرح کے کھانے بنا لیتا ہوں۔ آج رات آپ اس کا عملی مظاہرہ دیکھیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آج رات کا کھانا آپ لوگ میرے غریب خانے پر کھائیں گے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"کھانا کھانے پر تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا البتہ پکانے کا کام اگر تم اپنی بجائے کسی معقول ..... میرا مطلب ہے کسی باقاعدہ قسم کے باورچی کو سونپ دو تو شاید زیادہ مناسب ہو۔ ہم مسافر ہیں اور

یہ دونوں بے چارے بال بچے دار نوکری پیشہ لوگ ہیں، بیماری کی صورت میں ہم سب کا بہت ہرج ہوگا۔"

"تو گویا تمھارے خیال میں مَیں اچھا کُک نہیں ہوں؟"

اِس جُملے کے دوران پروین بھی کمرے میں آگئی۔ اُس نے آتے ہی ایک اجتماعی سلام کیا اور اِس سے پہلے کہ مَیں اُس سے افتخار کا تعارف کرواتا اُس نے اُسے اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر حیران سا ہوکر سعیدہ سے بولی: "آپ کو کُک کی کیا ضرورت پڑگئی ہے بھابی!"

افتخار کا سلام کے لیے اُٹھا ہُوا ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ عرفان نے ہنستے ہُوئے کہا: "اب بولیے افتخار صاحب!"

ناشتے کے دوران اِس صورتِ حال پر ہنسی مذاق ہوتا رہا مگر افتخار کچھ ایسا کانشس ہوگیا تھا کہ اُس نے اِس موضوع پر ہمارے پورے قیام کے دوران دوبارہ زبان نہیں کھولی۔ ناشتے میں ہم نے ایک بہت لذیذ ولایتی باقرخانی بھی کھائی جس کا فرنچ نام اگرچہ بہت مشکل تھا مگر ذائقہ اور شکل وصورت اپنی ہی طرف کی تھی۔ عرفان نے بتایا کہ یہ چیز اُس نے پانچ چھ ملکوں کی بیکری کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد دریافت کی ہے۔ ناشتے کی میز پر ماحول ایک دم اس قدر گھریلو سا ہوگیا کہ مجھے اپنے گھر کی یاد اور بھی شدّت سے آنے لگی۔ گزشتہ ٹیلیفون کے دوران میں فردوس نے بتایا تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے اپنے مائیکے یعنی میرے سُسرال جارہی ہے چنانچہ مَیں نے وہیں کا نمبر گھمایا۔ شکاگو سے کراچی گیٹ وے ایکسچینج، وہاں سے لاہور کا کوڈ اور وہاں سے گھر کا نمبر — کوئی چودہ ہندسوں کا چکر تھا مگر ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ادھر گھنٹی سُنائی دینے لگی۔ مَیں نے سوچا ہمارے یہاں بھی یہی مشینیں نصب ہیں مگر پتا نہیں کیوں گڑھی شاہو سے گارڈن ٹاؤن ملانے بیٹھو تو چھ ناکام کوششوں اور چار رانگ نمبروں سے گزرنا پڑتا ہے، درمیان میں چلنے والی کراس ٹاک اِس کے علاوہ ہے!

فردوس اور بچوں سے بات کرنے کے بعد طبیعت مزید تروتازہ ہوگئی۔ افتخار نسیم ہمارے لیے ایک لمبا چوڑا پروگرام بنا کر لایا تھا۔ اُس نے رُوئے سُخن پروین کی طرف رکھتے ہوئے بتایا کہ وہ دو دن دفتر سے مکمل چُھٹی کر رہا ہے تاکہ یکسوئی سے ہماری میزبانی کر سکے۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ پروین اُس کے بے تکلفانہ انداز سے ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی اور عین ممکن ہے وہ ایک دم کوئی سخت بات کہہ دے۔

مَیں نے دو تین زبردستی کے لطیفے سُنا کر ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ پروین نے اپنی پُرانی کولیگ نجمہ حق کا نمبر ملایا، اس سے شام کی سیر اور رات کے کھانے کا پروگرام فائنل کیا اور افتخار کو سُناتے ہُوئے مجھے اطلاع دی کہ اُس کا ہمارا ساتھ سہ پہر تین بجے تک کا ہے اور اِس دوران میں چونکہ وہ صرف شکاگو کا مشہور آرٹ سنٹر دیکھنا چاہتی ہے اِس لیے 'افتخار صاحب' کے بنائے ہُوئے پروگرام سے اس کی معذرت قبول کی جائے۔

افتخار کے چہرے کی مُسکراہٹ ایک دم مدّھم پڑ گئی۔ اُس نے ایک زخم خوردہ ہرن کی طرح میری طرف دیکھا۔ مَیں نے سفارتی قسم کی گول مول زبان کے ذریعے حالات کو معتدل بنانے کی کوشش کی اور تجویز پیش کی کہ افتخار کا بنایا ہُوا پروگرام بالکل اسی طرح ہم کل پر رے جاتے ہیں۔ پُرامن بقائے باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہُوئے سب نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور یُوں ایک متوقع ناپسندیدہ صورتِ حال پر قابو پا لیا گیا۔

افتخار نسیم تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد یہ کہہ کر چلا گیا کہ موجودہ صورتِ حال میں اس کا دفتر سے چھُٹی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اِس لیے وہ کام پر جاتا ہے تاکہ آج کی چھُٹی کو پرسوں استعمال کر سکے۔ سعیدہ بھابی نے بھی اِسی فارمولے پر عمل کیا چنانچہ آرٹ سنٹر کی یاترا میں ہمارے ساتھ صرف عرفان ہی رہ گیا۔

تاریخ کی زمانی کمی کی وجہ سے امریکہ کی تہذیب میں گہرائی نسبتاً کم ہے۔ امریکن قوم نے اس کمی کو چھپانے یا شاید اِس سے نظر چُرانے کے لیے بلندی اور پھیلاؤ میں پناہ لے رکھی ہے۔ اُن کے شہر بہت بڑے بڑے اور عمارتیں بہت اُونچی اُونچی ہیں لیکن کسی چیز کی عُمر دو تین صدیوں سے زیادہ نہیں۔ وہاں کے آثارِ قدیمہ کچھ دوسری تہذیبوں کے زندہ حصّے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کے تہذیبی اور تاریخی مراکز، میوزیم اور آرٹ گیلریاں اپنی مثال آپ ہیں۔ ایسی کسی بھی عمارت میں چلے جائیے نوادرات کا ایک خزانہ آپ کا منتظر ہو گا۔

مشرق اگرچہ بہت سی عظیم تہذیبوں کا گہوارہ ہے لیکن اس کے حُسن کو 'سحر' کے درجے تک پہنچانے میں سب سے زیادہ ہاتھ مسلمانوں ہی کا ہے۔ چینی، ہندوستانی اور مصری تہذیبیں ہزاروں سال پُرانی سہی لیکن یہ اپنے اپنے مخصوص زمانی اور مکانی دائروں سے باہر نہیں نکل سکیں۔ اِس کے علاوہ اِن

کے مظاہر میں رُوح اور جسم کی ثنویت بھی ہمیشہ دو الگ اور باقاعدہ اکائیوں کی شکل میں نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ فرق اس وقت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے جب آپ کسی وقیع اور بھرے پُرے میوزیم میں ماضی کو اُس کی حنوط شُدہ حالت میں دیکھتے ہیں۔ مُسلمانوں کا ذوقِ جمال، جذبہ توحید اور عظمتِ انسان کا تصور بہت سی ذیلی خصُوصیات کے ساتھ اُن کی تہذیب کے ہر پہلو میں روشن نظر آتا ہے۔ پھر اِس سے قطع نظر کہ میرا تعلق مُسلمان قوم سے ہے میں بطورِ انسان پوری ایمان داری سے سمجھتا ہوں رسُولِ کریمؐ کی وساطت سے اِس کرۂ ارض پر انسانیت نے آج سے چودہ سو برس پہلے جو موڑ کاٹا تھا وہ اِس راستے کا آخری موڑ تھا جہاں سے منزل بالکل سامنے اور صاف دکھائی دیتی ہے۔

اب اِس بحث میں پڑے بغیر کہ منزل سامنے ہونے کے باوجود مسلمانوں نے بالخصوص اور باقی دُنیا نے بالعموم کہاں کہاں اور کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں میں واپس شکاگو کے آرٹ سنٹر میں آتا ہوں، جہاں ہندوستان، کے شعبے میں قرآن مجید کے بہت سے نادر نُسخے اور عربی اور فارسی کی گراں بہا کتابیں رکھی ہُوئی ہیں اور آرٹ سنٹر کا ایک سیہ فام نگران سایے کی طرح ہمارے ساتھ لگا ہُوا ہے۔ شیشے کے اندر کی گئی گُل کاری کے حیرت انگیز نمونوں کو دیکھتے ہُوئے پروین کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اُس نے نگران پر ایک طیش بھری نظر ڈالتے ہُوئے کہا: "یہ کیا ہمیں چور سمجھتا ہے! اُس وقت سے ہمارے ہی پیچھے لگا ہُوا ہے۔"

"ناراض کیوں ہوتی ہو؟ ہو سکتا ہے تمھاری شاعری کا فین ہو۔ آخر تمھاری نظموں کے انگریزی ترجمے بھی تو چھپے ہیں، ممکن ہے کوئی یہاں بھی پہنچ گیا ہو اور اس نے پڑھ لیا ہو۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا ـــــ میری شاعری آثارِ قدیمہ میں سے ہے؟"

"نہیں ـــــ آثارِ قدیمہ تو یہ لوگ بہت چھان پھٹک کر منتخب کرتے ہیں ـــــ کیوں عرفان؟"

عرفان نے مُسکرا کر سر ہلایا اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنی غیر جانبداری کا اعلان کیا۔ پروین عام طور پر جملہ اُدھار نہیں رکھتی لیکن اُس وقت شاید وہ سچ مچ اُس نگران کی خصُوصی توجہ سے اَن ایزی ہو رہی تھی، اُس نے میرے جملے کو نظر انداز کرتے ہُوئے ایک بار پھر اُس آبنوس کے شہتیر کو گھورا اور بولی:

"بھئی مجھے تو بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے ـــــ چلیے، چلتے ہیں۔"

"ابھی تو یہاں بہت سی چیزیں دیکھنے والی ہیں، آئیے تصویروں والے حصّے میں چلتے ہیں۔"

عرفان نے جلدی سے کہا۔

"اور اگر یہ وہاں بھی پہنچ گیا ___ پھر؟"

"پھر جیسا آپ کہیں گی ___ وہی کریں گے۔"

لیکن اُس جم براؤن کے ہم شکل کی ڈیوٹی غالباً اُسی علاقے میں تھی کیونکہ اِس کے بعد وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ آرٹ گیلری میں زیادہ تر تصویریں جدید مصوروں کی تھیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ پینٹنگ کے ساتھ کسی نامور اُستاد کا نام بھی لکھا تھا لیکن ایسی تصویریں بہت کم تھیں جنھیں دیکھ کر مصور کا نام معلوم کرنے کی آرزو ہو۔ ممکن ہے اس کا سبب میرے ذوق کی کمی ہو لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ ہر بڑا فن پارہ کسی نہ کسی سطح پر عوامی ضرور ہوتا ہے۔ بڑی تخلیق عام ذہن سے بلند تر تو یقیناً ہوتی ہے مگر اُس سے ماورا نہیں ہوتی۔ درخت کتنا بھی بڑا اور خوبصورت کیوں نہ ہو اس کی جڑیں بہرحال زمین ہی میں ہوتی ہیں۔ بڑے غلام علی خاں کی گائی ہوئی ٹھمری ہو یا بیتھوون کی سمفنی، غالب کی غزل ہو یا ملٹن کی 'جنتِ گم گشتہ'، مائیکل انجلو کی کلاسیکل نقش گری ہو یا پکاسو کی تجریدیت، ارسطو کا فلسفہ ہو یا اقبال کا پیغام، 'کشف المحجوب' ہو یا مارکس کی 'داس کیپٹال' ___ ہر عظیم چیز کی بنیاد میں بنی نوعِ انسان کا کوئی نہ کوئی مشترک درد یا خواب ضرور ہوتا ہے!

فنونِ لطیفہ میں ہیئت کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور انہیں ہوتے رہنا چاہیے لیکن اِس عمل کے دوران ابلاغ ہی عنقا ہو جائے تو محض جدید کہلوانے کے شوق میں اُس چیز سے سمجھوتہ نہیں کر لینا چاہیے۔ اِس سلسلے میں بہترین رویہ وہی ہے جو اقبال نے پیش کیا ہے:

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا!

بات کسی اور طرف نکل گئی، دراصل میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ کینوس پر کھینچی ہوئی ہر لکیر اور بکھرے ہوئے ہر رنگ سے شاہکار تخلیق نہیں ہوتے۔ یہاں رکھی ہوئی بہت سی تصاویر ایسی تھیں جنھیں دیکھ کر سید محمد جعفری کا مشہورِ عام مصرعہ ذہن میں گونج گونج جاتا تھا: مَیں اتنا ہی جسے سمجھا تھا وہ عورت نکلی!

ایک بڑے سے ہال میں کچھ لڑکے لڑکیاں، اِردگرد اور اپنے آپ سے بے خبر، تصویر کاری میں مصروف تھے۔ ان نو مشقانِ ناز میں سے کچھ کا تعلق خود عالمِ تصویر سے تھا اور کچھ وہ تھے جنھیں تصویر بنا

آتی ہے۔ ایک چہرہ تو ایسا تھا کہ بس دیکھتے ہی رہیے مگر پروین کی تیز فہمی اور ہوٹنگ کا خوف ایسا تھا
کہ مَیں اس پر تیسری نظر نہیں ڈال سکا۔ طالب علمی کے دنوں کی ایک غزل کا شعر یاد آرہا ہے :

یوں اگر سوچوں تو اِک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرا کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں !

میری غزلوں میں یہ واحد شعر ہے جس میں 'ہائے' کا لفظ استعمال ہُوا ہے۔ مجھے ہائے، اُف، آہ اور
اللہ سے شروع ہونے والے سارے مصرعے زہر لگتے ہیں مگر پتا نہیں کیوں مَیں اِس شعر کو باوجود
کوشش کے اپنے کلام سے خارج نہیں کر سکا۔ نہ جانے کیا فرماتے ہیں مفتیانِ عقل بیچ اِس مسئلے کے؟

امریکن فاسٹ فوڈ میں اگرچہ بہت سی الّم غلّم چیزیں ملتی ہیں لیکن ہماری دوڑ بنیادی خوراک
یعنی برگر اور کوک تک محدود تھی۔ زیادہ سے زیادہ اِس میں کافی کا اضافہ کر لیا جاتا تھا اور سچی بات
یہ ہے کہ ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب کی کسی اور چیز میں اٹکا ہو تو ہو اُن کی خوراک سے ہماری
دوستی نہ ہو پائی چنانچہ دوپہر میں جب عرفان ہمیں ریستورانوں کے مشہور سلسلے 'برگر کنگ' کی ایک
قریبی شاخ میں لے گیا تو معقول بھوک کے باوجود مَیں چند لقموں سے زیادہ نہ کھا سکا۔ اشفاق احمد
'تلقین شاہ' کے حوالے سے ٹھیک ہی کہتے ہیں : "ہدایت ! ایں ترقی نئیں کرنی !"

ہم پروین کو نجمہ حق کی طرف چھوڑنے گئے تو وہاں افتخار نسیم پہلے سے موجود تھا۔ معلوم ہوا شکاگو
چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو پاکستانی برادری بہرحال مختصر ہے۔ گفتگو کے دوران پتا چلا کہ ہماری
میزبان اپنے شوہر اور بچوں سمیت چند دنوں بعد پاکستان منتقل ہو رہی ہیں۔ نجمہ حق بڑی تیز طرّار،
چُست اور میٹر آف فیکٹ قسم کی خاتون تھیں۔ برسوں کی پروفیسری کی وجہ سے اُن کی گفتگو میں ایک
مخصوص قسم کی اتھارٹی کا احساس مستقل جگہ بنا چکا تھا۔ اُن کی طبیعت میں انتظام اور سلیقہ کوٹ کوٹ کر
بھرا ہُوا تھا چنانچہ اُنہوں نے فوراً پروین کو اپنی تحویل میں لیا اور اُسے امریکہ میں شاپنگ کے موسم
اور طریقوں پر اتنا مفصل لیکچر دیا کہ شام کا کھانا آدھی رات پر جا پڑا۔ تنگ آکر مَیں نے پروین کو استعارے
کی زبان میں صورتِ بدحال سے آگاہ کیا۔

"پروین، وہ کیا مصرعہ ہے ضمیر جعفری صاحب کا : طبیعت ناملائم، مستقل اُستانیوں جیسی۔ بھئی اِس
میں 'مستقل اُستانیوں' کا جواب نہیں۔"

اُس نے فوراً بات پک کرلی، میرے قریب سے گزرتے ہُوئے آواز دبا کر بولی: "مستقل اُستانی تک تو ٹھیک ہے مگر طبیعت کو آپ ناملائم نہیں کہہ سکتے۔"

مَیں نے کہا: "اب مصرعہ تو پورا ہی پڑھنا پڑتا ہے نا!"

کھانے کے بعد افتخار نے آئیڈیا دیا کہ کافی اُس کے اپارٹمنٹ میں پی جائے۔ ہم سب تیار ہو گئے۔ افتخار کے اصرار پر نجمہ حق اینڈ کمپنی بھی مان گئے مگر پروین بیگم نے تھکن اور نیند کا عُذر پیش کر کے اپنے آپ کو اس پروگرام سے بھی غیر حاضر قرار دے دیا۔ اس کی وجہ سے نجمہ لوگ بھی آؤٹ ہو گئے۔ اَب لے دے کر مَیں اور عرفان باقی رہ گئے تھے اور ہمیں ابھی پچاس میل کا پینڈا کر کے جولیٹ پہنچنا تھا چنانچہ ہم نے بھی دبے لفظوں میں کچھ معذرت نُما کی اور وعدہ کیا کہ کل جب کھانے پر اس کے گھر آئیں گے تو کافی کی دو دو پیالیاں پی کر حساب برابر کر دیں گے۔

افتخار کے پاس صبر کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا چنانچہ اُس نے صبر کیا۔ ہم نے پروین کو نجمہ حق کے سپرد کیا تاکہ وہ اگلی صبح اپنی شاپنگ کرے اور خود جولیٹ کی راہ لی جہاں سعیدہ بھابی ہمارے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی تھی۔

کٹ ہی گئی جُدائی بھی، کب یہ ہوا کہ مر گئے،
تیرے بھی دن گزر گئے، میرے بھی دن گُزر گئے

Lake Shore کے کنارے ایک عمارت کی چالیسویں منزل پر واقع افتخار نسیم کے خوبصورت اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے شکاگو شہر کو دیکھتے ہُوئے پتا نہیں کیوں مجھے عدیم ہاشمی کا یہ شعر بہت یاد آ رہا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ اُبھرنے والے نوجوان شاعروں میں عدیم ہاشمی ایک بہت اہم نام تھا۔ اس کی غزل ایک نئے اور منفرد لہجے کی آئینہ دار تھی۔ ادبی حلقوں میں اُس کی شہرت ہر آنے والی غزل کے ساتھ مزید مستحکم ہو رہی تھی مگر وہ یک دم غائب ہو گیا۔ پتا چلا کہ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں امریکہ چلا گیا ہے اور اُسے وہاں بُلانے میں افتخار نسیم کا ہاتھ ہے جو اس کا رشتے کا بھانجا لگتا ہے۔ چند برس پہلے اُس کا ایک خط آیا تھا جس میں سلام دُعا، خیریت کی اطلاع اور چند اِدھر اُدھر کی باتیں تھیں مگر اُس کا پتا درج نہیں تھا۔ اس کے بعد سے اُس کی بیوی سمیت کسی کو اس کا پتا نہ تھا۔ افتخار

نے ہچکچاتے ہُوئے بتایا کہ وہ اس کے پاس چند مہینے رہا تھا مگر پھر کچھ ایسے واقعات ہُوئے کہ وہ یہاں سے بغیر بتائے کہیں چلا گیا اور اب پتا نہیں کہاں ہے! میں نے محسوس کیا وہ اِس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔ مَیں نے بڑے دُکھ سے سوچا کیسے کیسے اچھے ذہن دُنیاداری کی اس آگ کے خس و خاشاک ہو جاتے ہیں اور یہ وقت کیسا ظالم ہے کہ اِسے خبر تک نہیں ہوتی کہ کون کہاں رہ گیا ہے؟

افتخار کا اپارٹمنٹ اُس کے بیچلر ہونے کا مُنہ بولتا ثبوت تھا۔ ہر طرف بکھری ہُوئی کتابیں، تصویریں، ویڈیو کیسٹ۔ انسانی اجسام کی اور جنل حالت میں لی ہوئی تصویروں سے بھرے ہُوئے رسالے، برتن، کپڑے، فرنیچر غرضیکہ ہر چیز ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہی تھی۔ دو بہت پلی ہُوئی نیم ناراض بلیاں بستر سے لے کر غسل خانے تک ہر جگہ انتہائی بے تکلفی سے آجا رہی تھیں۔

باتوں باتوں میں عدیم کے ایک اور شعر کا ذکر آیا:

بچھڑ کے تجھ سے نہ دیکھا گیا کسی کا ملاپ
اُڑا دیے ہیں پرندے، شجر میں بیٹھے ہُوئے

افتخار نے کہا: "مَیں آج کل ہجرت کے موضوع پر ایک ناول لکھ رہا ہوں۔"

مَیں نے کہا: "اب یہ موضوع بہت پُرانا ہو گیا ہے اور پھر یہ تجربہ تو انتظار حسین کی نسل کا ہے، تم اِس پر کیا لکھو گے؟"

بولا: "مَیں، ۴۷ء کی ہجرت کی نہیں سات سمندر پار کی اُس ہجرت پر لکھ رہا ہوں جس میں روٹی اور گرین کارڈ کا جلوہ، ہم جیسوں کو اپنی زمینوں سے کھینچ کر کشاں کشاں یہاں لے آتا ہے۔ یہ ناول مَیں انگریزی میں لکھ رہا ہوں اور اِس میں ہجرت زدگان کی مختلف قسمیں ڈِس کَس ہوں گی: وہ جو چاہنے کے باوجود ہجرت نہ کر سکے، وہ جو یہاں آئے مگر اس مٹی نے اُن کے پاؤں نہیں پکڑے اور وہ گھروں کو لوٹ گئے اور وہ جو اپنی کشتیاں جلا کر یہاں بیٹھ گئے ہیں، امریکہ امریکہ کرتے خود امریکہ ہو گئے ہیں۔"

مَیں نے کہا: "تم کس گروہ میں آتے ہو—!"

ٹھنڈی سانس بھر کر بولا: "تیسرے میں!"

مَیں نے کہا: "اپنے ناول میں اُن افراد اور خاندانوں کے بارے میں بھی لکھنا جن کی بیٹیاں یہاں

جوان ہو رہی ہیں۔ اُن والدین کے آنسو بھی دکھانا جو راتوں کو تکیوں میں مُنہ دے کر روتے ہیں۔ اُس نوجوان نسل کے دُکھ بھی لکھنا جو صرف حال کے لمحے میں زندہ ہے، نہ اُس کا کوئی ماضی ہے اور نہ مستقبل۔ اُن کے والدین اُن کے جسموں کو امریکہ میں اور روحوں کو پاکستان میں زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ ناممکن ہے۔ آپ لاکھ گرین کارڈ کا لالچ دے کر پاکستان سے لڑکوں کو بلائیں اور اُن سے اِن لڑکیوں کی شادیاں کریں یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ جس طرح ہر کُل جُز و کو کھا جاتا ہے اِس طرح امریکی معاشرہ بھی آپ کو، آپ کے خوابوں اور آرزوؤں سمیت نگل جائے گا۔ اگر آپ اس کے معدے میں زیادہ شور مچائیں گے تو وہ آپ کو چبائے ہُوئے پان کی طرح تھوک دے گا اور آپ ساری زندگی اپنی تنہائی کے ڈسٹ بِن میں پڑے سڑتے رہیں گے۔"

افتخار نے میری باتیں بہت توجہ سے سُنیں اور بتایا کہ اِن میں سے بہت سی باتیں پہلے سے اُس کے خاکے میں شامل ہیں، وہ کوشش کرے گا باقی کے پوائنٹ بھی اپنے پلاٹ میں شامل کر سکے۔

رات کے کھانے کی تیاری کے لیے افتخار نے عدیم کی بہن اور اپنی خالہ کی فیملی کو بطور ہیلپر بلوایا تھا۔ اُن کے آتے ہی سب لوگ کچن میں گھُس گئے اور مجھے وی سی آر کے سپرد کر دیا گیا۔ میری نظر مائیکل جیکسن کے تازہ اور ریکارڈ توڑ وڈیو "تھرلر" پر پڑی۔ امریکہ کی نوجوان نسل (متاثرینِ امریکہ سمیت) مائیکل جیکسن اور اُس کی موسیقی کی دیوانی ہے اور اس کا نام امریکہ میں سب سے زیادہ لیے جانے والے چند ناموں میں سے ہے۔

پلے بیک گائیکی نے بیک وقت سماعت اور بصارت کی صدیوں پُرانی روایت کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ آڈیو ٹیپ کے باریک اور بدرنگ فیتے سے جو آواز نکلتی ہے اُس میں گانے والے کی مکمل شخصیت نمایاں نہیں ہو پاتی۔ چہرے کے اُتار چڑھاؤ، آنکھوں اور ہاتھوں کے انداز اور گلوکار کے وجود کی انفرادی کشش سے آواز کے تاثر میں جو رنگ پیدا ہوتے ہیں وہ آڈیو ٹیپ یا گراموفون ریکارڈ میں منتقل نہیں ہو سکتے۔ اہلِ مغرب نے اِس راز کو بہت جلد پا لیا چنانچہ وی سی آر کے ساتھ ہی گلوکاروں کے شوز اور آئٹمز پر مشتمل وڈیو کیسٹ بننے شروع ہو گئے اور اب تقریباً ہر امریکی گھر میں یہ کیسٹ آپ کو ضروری سامان کی طرح موجود ملتے ہیں۔ مَیں نے مائیکل جیکسن کو تو بہت کم دیکھا اور سُنا تھا لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ سُن اور پڑھ رکھا تھا۔ فرسٹ ہینڈ نالج کی اِس کمی کو دُور کرنے کے لیے مَیں نے سب سے

پہلے 'تھرلر' کا کیسٹ لگایا۔ بیس پچیس منٹ کی اِس ویڈیو فلم میں جنّوں، بھوتوں اور بدروحوں کے درمیان مائیکل جیکسن (جس کی صورت کسی طور بھی قابلِ رشک نہیں کہی جاسکتی!) طرح طرح کے لباسوں اور گٹ اَپ میں گاتا کم اور ناچتا زیادہ پھر رہا تھا۔ اس کی آواز بلاشبہ بہت اچھی ہے مگر آرکسٹرا کے شور اور رقص کی وحشت میں اُس کی طرف بہت کم دھیان جاتا تھا۔ فلم ختم ہونے کے بعد میں بہت دیر تک پریشان رہا کہ اِس 'وحشت زدگی' کے سپرہٹ ہونے اور کریز بننے کے پسِ پردہ کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ کیا ساری کی ساری امریکی قوم نیم پاگل ہوچکی ہے؟ ان کی سائنس فطرت کو تسخیر کرتے کرتے 'انسان' کو روندتی ہوئی اُسے ایک ایسی منزل پر لے آئی ہے جہاں موت، دہشت، بدروح، انہونی کا خوف، تشدّد اور چہروں کی بے چہرگی کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آتا؛ اُن کی رُوحوں میں یہ کیسا خوف بھر گیا ہے کہ وہ بدصُورتی کے 'معمول' بن کر رہ گئے ہیں۔ ہم تیسری دُنیا کے لوگ تو چلو تاریخ کی جبریت، ذہنی و جسمانی غلامی، استعمار اور استحصال کے مارے ہُوئے ہیں اور اِن کی وجہ سے پیدا شدہ بدصورتیوں میں اِس لیے مبتلا ہیں کہ یہ فی الوقت ہمارے مقدروں کی تحریر بن چکی ہیں لیکن اس پہلی دُنیا کے کھاتے پیتے، آزاد اور باوسائل معاشرے کو کیا ہُوا ہے؟ یا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ ابنِ آدم کے سارے عذاب سانجھے ہیں، فرق صرف ناموں اور لفظوں کا ہے؟ پھر یہ سوال بھی ذہن میں آئے گا کہ ہمارے دُکھ سانجھے ہیں تو سُکھ کیوں مشترک نہیں ہیں؟

'تھرلر' نے مجھے کچھ ایسا مایوس اور پریشان کیا کہ مَیں نے سارا ولایتی مال اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور دیسی سامان میں سے دلیپ کمار اور وجینتی مالا کی فلم 'مدھومتی' تلاش کرکے لگادی۔ فلم تو خیر واجبی سی تھی مگر اس کا میوزک بہت اچھا تھا۔ فلم کے دوران میں ہی باقی مہمان پہنچ گئے۔ افتخار کا خیال تھا کھانے کے بعد شعروشاعری کا دَور چلایا جائے لیکن اسد کو بہت تیز بُخار تھا جس کی وجہ سے عرفان اور بھابی خاصے پریشان تھے چنانچہ یہی فیصلہ ہُوا کہ اس محفل کو بشرطِ زندگی کسی آئندہ ملاقات پر ملتوی کردیا جائے۔

اگلا دن امریکہ میں ہمارا یعنی ہمارے قیام کا آخری دن تھا۔ پروین نے تو عقل مندی سے کام لیتے ہُوئے مختلف مواقع پر وقت نکال نکال کر اپنی خریداری کی فہرست کا خاصا حصّہ مکمل کرلیا تھا مگر اب جو مَیں نے فیملی اور دوستوں کے لیے تحفوں اور مختلف فرمائشوں کی تعداد پر نظر ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ

تو خاصا لمبا کام ہے۔ پروین سے مشورہ کرنا اس لیے مناسب نہیں تھا کہ وہاں ’ایک ایک جُملے کا مجھے دینا پڑا حساب‘ کا خطرہ تھا۔ صُبح صُبح اُٹھ کر اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب اسد کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے مَیں نے عرفان اور بھابی کے سامنے یہ گھمبیر سمسیا رکھی اور بزبانِ حال پُکار کر کہا: "سایے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے۔"

سعیدہ نے کہا: "یہ شاپنگ تو آپ کو کینیڈا میں کرنی چاہیے تھی، وہاں چیزیں امریکہ سے سستی ہیں۔"

مَیں نے کہا: "یہ سستی مہنگی کا معمہ تو گزشتہ ایک مہینے سے حل نہیں ہو رہا۔ پہلے خیال تھا سفر کے آخر میں لندن سے خریداری کریں گے مگر اُس پر اجماعِ اُمّت ہو گیا کہ وہاں چیزیں زیادہ مہنگی ہیں۔ کینیڈا میں احباب سے پوچھا تو اُن کا ووٹ امریکہ کی طرف تھا، اب آپ کہہ رہی ہیں کہ کینیڈا بہتر تھا۔"

سعیدہ نے کہا: "میرا تو یہی خیال ہے ــــ کیوں عرفان؟"

عرفان نے کسی سالخوردہ اور گرگِ باراں دیدہ قسم کے ڈپلومیٹ کی طرح ایک ایسا جواب دیا جس کا کچھ بھی مطلب نکالا جا سکتا تھا۔ مَیں نے کہا: "یار مجھے مزید کنفیوز نہ کرو، کوئی حل بتاؤ!"

سعیدہ نے میرے ہاتھ سے فہرست پکڑی، مختلف چیزوں کے بارے میں مجھ سے ضروری وضاحتیں حاصل کیں، پھر اُس فہرست کو تین حصّوں میں تقسیم کیا، ایک کاغذ اپنے پاس رکھا، دوسرا عرفان کو دیا اور تیسرا مُجھے دیتے ہُوئے بتایا کہ یہ چیزیں تو آج دن میں افتخار نسیم کے ساتھ شکاگو کی سیر کرتے ہُوئے بھی خریدی جا سکتی ہیں۔ اِس دوران میں عرفان کا ایک بھانجا اور بھانجی، جو اُس کے قریب ہی رہتے ہیں اور آپس میں شادی شُدہ ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے کزن بھی ہیں، آ گئے۔ ناشتہ بے حد دیسی اور انتہائی مزیدار تھا چنانچہ پراٹھے کھانے کے دوران اِس قدر ناٹبلک قسم کی گفتگو کی گئی کہ افتخار کے آنے تک میز پانی پت کے میدان کا نقشہ پیش کر رہی تھی اور ہم سب افراطِ خوراک کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے۔

افتخار پورے دن کا شیڈیول بتانے لگا تو پروین نے اطلاع دی کہ اُس نے پورے سفر میں نجمہ حق سے بہتر گائیڈ اور شاپنگ کی سُوجھ بُوجھ رکھنے والا شخص نہیں پایا اِس لیے وہ سب سے پہلے اس سے مِل کر اپنی نامکمل شاپنگ مکمل کرے گی اور اس کے بعد کہیں اور جائے گی۔ اس الٹی میٹم کا سیدھا سیدھا مطلب یہ تھا کہ سہ پہر تک کا پروگرام تو کینسل ہو ہی گیا ہے اُس کے بعد کی بات بھی کم و بیش مشکوک

ہی سمجھی جائے۔ افتخار کا یہ شبہ کہ پروین جان بوجھ کر اُسے نظر انداز کر رہی ہے اب یقین کی حدوں کو چھونے لگا تھا لہٰذا اُس نے اِشارے کنائے چھوڑ کر براہِ راست مجھ سے شکوہ کیا۔ مَیں نے بات ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر جب وہ اپنی گردان سے باز نہ آیا تو مجھے مجبوراً اُسے سمجھانا پڑا کہ پروین شاکر اپنی شاعری میں لاکھ بولڈ اور بے جھجک سہی لیکن انگریزی میں ایم اے کرنے یا مردوں کے دوش بدوش اعلیٰ ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک باشعور اور ذمّہ دار خاتون بھی ہے۔ اُس کی ایک اپنی شخصیت اور پسند ناپسند کا معیار ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر پاکستانی ماحول کی پیداوار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم دِل سے اُسے اپنی مہمان اور منفرد ادبی شخصیت سمجھ کر یہ ساری آؤ بھگت کر رہے ہو مگر امریکہ میں اتنے برس رہنے اور یہاں کی عورتوں سے گفتگو کرنے کی وجہ سے تمھیں اندازہ نہیں ہو رہا کہ تمھارا انداز، جو اگرچہ مبنی بر خلوص ہے، بعض اوقات خاصا بے تکلّفانہ ہو جاتا ہے اور یہ خاتون ذرا زیادہ ریزرو قسم کی ہے!

کہنے لگا: "کمال ہے یار، پچھلے سال کشور ناہید بھی یہاں آئی تھی، اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کی، ہر جگہ ہمارے ساتھ جاتی تھی!"

مَیں نے کہا: "اب ہر شاعرہ تو کشور ناہید نہیں ہو سکتی اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ کشور سے تمھارا پہلے سے تعارف تھا، وہ تمھاری سینئر بھی تھی اور دوست بھی، اُوپر سے اس کی طبیعت بھی کُھلی ڈُلی ہے جب کہ پروین کا مزاج اُس سے بہت مختلف ہے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم صلاح الدین محمود سے توقع کرو کہ وہ دلدار پرویز بھٹّی کی طرح باتیں کرنے لگیں۔"

"تمھاری یہ تشبیہہ مَیں کشور تک ضرور پہنچاؤں گا۔" افتخار نے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

"اگر تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ اِس بات کا بُرا مانے گی تو تم غلطی پر ہو، ناراض تو وہ تب ہوتی اگر مَیں اُسے صلاح الدین محمود سے تشبیہہ دیتا۔"

فوڈ اینڈ فلیور نامی ہندوستانی ریسٹوران میں دوپہر کا کھانا نجمہ حق کے مشورے سے کھایا گیا۔ تمام ڈشیں چکھنے کے بعد مَیں نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے آہستہ سے پروین سے کہا: "اگر نجمہ بی بی کی پسند ایسی ہی ہے تو اپنی شاپنگ کا اللہ ہی حافظ سمجھو!"

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے بتایا کہ اچار کی چھوٹی سی پلیٹ، جو مَیں نے نہیں چکھی تھی، اچھی تھی!

افتخار نسیم مجھے سیئرز ٹاور دکھانے لے گیا۔ اس نے بتایا کہ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ اللہ لوک اور خدا رسیدہ عمارت ہے کیونکہ اس کی چھت سے آسمان تک کا فاصلہ کم سے کم پڑتا ہے۔

مَیں نے ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے بارے میں پُوچھا معلوم ہُوا کہ وہ بے چاری توڈیموٹ ہوتے ہوتے اب کہیں دسویں نمبر پر جا پڑی ہے۔ بلندی کے اعتبار سے کینیڈا کے سی این ٹاور کے بعد یہ دُنیا کی دوسری بلند ترین عمارت ہے لیکن اس کو سی این ٹاور پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ صرف دکھاوے کی چیز اور مانومنٹ ہے جب کہ یہ ایک رہائشی، تجارتی اور کاروباری مرکز ہے اور اس کی تعمیر غالب کے اس مصرعے کے حوالے سے کی گئی ہے: یک ذرّہِ زمیں نہیں بے کار باغ کا!

سیئرز ٹاور کی ایک سو چالیسویں منزل پر کھڑے ہو کر ہم نے شکاگو شہر پر شام کے اُترنے کا منظر دیکھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا رش بڑھ گیا تھا اور تاریکی کے ابتدائی حملے سے سنبھلنے کے بعد اب چاروں طرف روشنیاں تیرنے لگی تھیں اور تمام مناظر اپنی اصلی شکلیں کھو کر یک رنگ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ سوچا یہ جدید شہر بھی آگ کے اُس گولے کی طرح ہیں جسے کوئی شعبدہ باز بار بار مُنہ سے نکالتا اور نگلتا رہتا ہے، کئی برس پہلے مَیں نے اپنے شہر کی کہانی لکھی تھی:

سحر اور رات کی اِس بے عمل مصروفیت میں
شہر کی تاریخ بنتی ہے
سینما گھر، کلب، ہوٹل، ادب، اخلاق، شہرت اور سیاست کے
منافع بخش کاروبار چلتے ہیں
کوئی دیکھے تو سارا شہر جیسے فلم کی شوٹنگ میں کھویا ہے
'ہدایت کار' سے سیٹ پر کھڑے 'شوقین چہروں' کی طرح
ہر شخص ادکے کی صدا کے سحر میں محصور ہے
جیسے 'پیک اپ' کی گھڑی ہی منزلِ مقصود ہو
جیسے سب کچھ اس کہانی کے سوا بے سود ہو

اُس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ رُوئے زمین پر بسنے والے سارے شہر ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں اور ان بے شمار منظروں کا پس منظر ایک سا ہے: ایک ہی اَزل گیر و اَبد تاب تنہائی ہے جو کبھی بھیڑ کی

شکل میں جلوہ نما ہوتی ہے اور کبھی دُکھ کی چادر اوڑھ کر کسی بڑ کے نیچے چلّہ کاٹنے لگتی ہے۔ پیٹ کی بھوک ہو یا رُوح کی پیاس، دونوں اپنی اپنی جگہ اٹل حقیقتیں ہیں۔ کہیں اناج کی فراوانی ہے اور کہیں احتیاج کی۔ شام صرف ایک وقت ہی نہیں ایک کیفیت کا بھی نام ہے۔ ستاروں اور چراغوں کے جلنے سے کچھ دیر پہلے، دن بھر کی مشقت سے تھکے ہُوئے لہو میں جو ایک اُداسی سی تیرتی ہے وہ رُوح کے بے لفظ رجسٹر کے سوا کہیں درج نہیں ہوتی، نہ یہ کسی ایکسرے مشین سے نظر آتی ہے اور نہ اینجیو اور کارڈیو گرافی میں کہیں اس کا کوئی ریکارڈ ہوتا ہے۔

شکاگو کی بلند و بالا اور زندگی کی آسائشوں سے معمور عمارتوں، فراخ سڑکوں پر رینگتی ہوئی بڑی بڑی موٹروں اور روشنیوں کے ہجوم میں ہنستے گاتے، ناچتے، سوتے جاگتے، سوچتے، بولتے، لڑتے جھگڑتے، کھاتے پیتے اور ایک دوسرے کے جسموں میں پناہ تلاش کرتے ہُوئے لوگوں کے پہلو میں کسی ہمزاد کی طرح میں نے دُکھوں کے ایک لشکر کو چلتے ہوئے دیکھا۔ شام کے اُس جھٹپٹے میں مَیں نے اُن خدشوں کی آوازیں سُنیں جو شام کی ہَوا کے ساتھ ساتھ بہہ رہی تھیں۔ دُکھوں کے یہ سایے اور خدشوں کی آوازیں رنگ و نسل، اُونچ نیچ، مَوسم اور وقت ــــ ہر طرح کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ بڑے سے بڑے محل کا دروازہ اور محافظ بھی اِن کو روک نہیں سکتے!

دُرِ دِیک ساغرِ غفلت ہے، چہ دُنیا و چہ دیں

امریکہ میں قیام کی یہ آخری شام بھی اُن بے شمار شاموں کی طرح یادوں، خوابوں اور وسوسوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوتی رات کی باہوں میں سوگئی جو میری آنکھوں کے راستے سے ہو کر گزری ہیں۔ کبھی کبھی یُوں لگتا ہے جیسے خیالات بھی جنازوں کی طرح ہوتے ہیں۔ گھر کے صحن سے لے کر قبرستان تک اُن کے علاوہ اور کچھ نہیں سوجھتا۔ اُس وقت محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی سے زیادہ بے معنی اور کوئی چیز نہیں۔ عزیز سے عزیز امانت بھی مٹی کو سونپنے کے بعد مٹی ہونا شروع ہو جاتی ہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اِس کی حالت صحرا کے اُن بگولوں کی طرح ہو جاتی ہے جن کے اُٹھنے اور بیٹھنے کا پتا بعض اوقات خود صحرا کو بھی نہیں چلتا۔

سیز ٹاور سے نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد ہم مشہور رسالے 'پلے بوائے' کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے جس کا دفتر راستے میں نظر آیا تھا۔ مَیں افتخار کو 'پلے بوائے پارٹی جوکس' سے اپنا ذاتی انتخاب سُنا رہا تھا اور

وہ مجھے بتا رہا تھا کہ 'پلے بوائے' کے صفحات پر برہنہ تصویر چھپ جانے سے ماڈلنگ کی شوقین لڑکیوں کی مانگ میں کس قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔

رات کو ایک خالص اطالوی ریستوران میں پیزا (جس کا صحیح تلفظ غالباً پِٹزا ہے) کھایا گیا جو واقعی مزیدار تھا۔ پروین نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا: "غالباً ایسے ہی کھانے کے بارے میں انگریزوں نے یہ مقولہ بنا رکھا ہے: "Happiness is at the end of your fork."

مَیں نے کہا: "اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ زیادہ کھانے سے پہلے سوچ لو کہ خوشی تمھارے کانٹے کے دوسرے سرے پر ہے لہٰذا ہاتھ روک لو۔"

پروین نے عرفان اور سعیدہ کو ساتھ ملاتے ہوئے جوابی حملہ کیا: "کمال ہے امجد بھائی، یعنی اس انگریزی پر آپ نے ایک پوری کتاب ترجمہ کر دی ہے۔ واہ — واہ — کیا بات ہے!"

رات کو پیکنگ کا مرحلہ شروع ہوا۔ شوہروں کے بارے میں بیویوں کی رائے ہمیشہ متنازعہ فیہ رہی ہے لیکن اس بات میں، مَیں اپنی بیوی سے متفق ہوں کہ سوٹ کیس میں سامان کو ترتیب سے رکھنا میرے بس سے باہر ہے۔ مَیں نے سارا سامان عرفان کے ڈرائنگ رُوم میں پھیلا دیا لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اِس کو سمیٹا کیسے جائے اور سچّی بات یہ ہے کہ اگر عرفان میری مدد کو نہ آتا تو وہ کم بخت اٹاچی کیس شاید ابھی تک بند ہونے نہ ہونے کے مراحل طے کر رہا ہوتا۔

مَیں نے عرفان کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

سماسکتا نہیں پہنائے فطرت میں مِرا سودا

عرفان نے دوسرے مصرعے میں برجستہ ترمیم کرتے ہوئے کہا:

غلط تھا، اے میاں امجد، ترا اندازۂ صحرا

ٹورنٹو — ۳

ہمارا واپسی کا ٹکٹ مونٹریال سے کراچی تک کا تھا جسے ہم نے اشفاق کی مدد سے مونٹریال — لندن — کراچی میں تبدیل کرالیا تھا۔ اس سارے پروگرام کا صدر مقام ٹورنٹو تھا اس لیے شکاگو سے ہمیں پھر ٹورنٹو آنا پڑا۔ عالی جی پٹز برگ سے ہوتے ہوئے پیرس، علی سردار جعفری بمبئی، عارف افتخار لندن اور تسلیم الٰہی زلفی جدہ جاچکے تھے۔ گویا اس آخری چکر میں ٹورنٹو والوں کے پاس صرف دو مہمان بچے تھے۔

ٹورنٹو ایئرپورٹ پر حسبِ سابق تمام دوست موجود تھے۔ قیام کی مدت صرف ڈیڑھ دن تھی اس لیے طے یہ پایا کہ اب کے میرا قیام کرنل انور احمد کی طرف ہو جو اشفاق کے گھر سے بہت قریب ہیں تاکہ سب لوگ زیادہ سے زیادہ وقت ایک ساتھ گزار سکیں۔ رات کو سبھی انور صاحب کے گھر جمع ہوئے اور خُوب محفل جمی۔ پروین کے بارے میں نرجس سے معلوم ہوا کہ اُس نے ناصرہ نامی کوئی سہیلی دریافت کرلی ہے اور اب اس کے ساتھ نیاگرا کی وہ روشنیاں دیکھنے گئی ہے جنہیں ہم پچھلی بار وقت کی کمی کی وجہ سے دیکھ نہیں پائے تھے۔

کرنل انور احمد کی عجیب و غریب اور منفرد البمیں اور ٹورنٹو کے مشاعرے کی ویڈیو فلم دیکھی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ فلم چند دنوں میں باقاعدہ مارکیٹ کردی جائے گی اور توقع ہے کہ پہلے ہی ہفتے میں اس کے کم ازکم پانچ سو کیسٹ نکل جائیں گے۔

میں نے کہا: "اگر کیمرہ مین عقل مندی سے کام لیتے ہوئے سامعین کے لانگ شاٹس کے بجائے کلوز میں سلو پیننگ کے ذریعے مختلف شاٹس بنالیتا تو دو چار سو کیسٹ اور بک جاتے۔ ہر شخص اپنی تصویر دیکھنا پسند کرتا ہے!"

"اگر سامعین کے شاٹس بناتے تو شاعر مس ہو جاتے۔" کسی بزرجمہر نے رائے دی۔ "یہ طریقہ یہ

ہے کہ جب بھی شاعر 'مکرر ارشاد' پر دوسری بار پڑھنے لگے تو آپ کیمرہ سامعین پر لے جائیں، شاعر کی آواز اور سامعین کا ردِ عمل دونوں ایک ساتھ مل جاتے ہیں اور شاعر کی کمی بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

میری اس 'ماہرانہ رائے' سے (جو انتہائی مبتدیانہ تھی) گفتگو کا رُخ پاکستان ٹی وی کے اچھے پروگراموں کی طرف مُڑ گیا اور ایک بار پھر وہی سوال سامنے آیا کہ بیرونِ ملک مقیم لاکھوں پاکستانیوں تک اِن پروگراموں کو کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے؟ میں نے وعدہ کیا کہ میں ان کے جذبات ٹی وی کے متعلقہ اربابِ حلّ و عقد تک پہنچا دوں گا ـــــ اگے تیرے بھاگ لچھیے۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر کرنل انور نے اطلاع دی کہ آج وہ لوگ مجھے Klandale لے کر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا: "میرا قصور؟"

بولے: "کیوں؟"

عرض کیا کہ نام سے تو یہ مقام کوئی نازی کیمپ معلوم ہوتا ہے۔ انور صاحب نے بتایا کہ اصل میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ایک ایسا میوزیم واقع ہے جس میں سات کینیڈین مصوروں کے فن پارے مستقل طور پر رکھ دیے گئے ہیں۔ میوزیم اور اُس سے ملحقہ قریباً سوا ایکڑ زمین وہاں کے ایک فن نواز باسی کا عطیہ ہے اور یہ کہ لوگ دُور دُور سے اس میوزیم کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ مُنی اندر سے کیمرہ لے آئی تھی۔ کیمرہ دیکھ کر انور صاحب کی اُنگلیوں میں کُھجلی ہونے لگتی ہے چنانچہ انہوں نے کھٹا کھٹ ناشتے کے دوران ہی دس بارہ تصویریں اُتاریں اور مُنی کو یاد دلایا کہ اپنے بیگ میں فلم کے ایک دو ایکسٹرا رول رکھ لے کیونکہ آؤٹ ڈور میں فوٹو گرافی کا اپنا ہی مزا ہے۔

کلینڈیل ٹورنٹو سے زیادہ دُور نہیں تھا، یہی کوئی تیس چالیس کلومیٹر کا فاصلہ ہو گا مگر یہاں ٹورنٹو کی نسبت زیادہ برف باری ہوتی تھی۔ نوادرات کی دکان کے باہر برف کے کیچڑ میں گاڑی موڑنے کی کوشش کے دوران ایک دو لمحے ایسے بھی آئے جب موٹر، سٹیئرنگ اور بریکوں کی پابندی کے باوجود، کہیں بھی جا سکتی تھی۔ میوزیم کی تین منزلہ عمارت اُس اختشام سے پاک تھی جس کا مظاہرہ ہم اب تک اس نوع کی ہر عمارت میں دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ یہ ایک سادہ اور بامقصد قسم کی عمارت

تھی جس کی ساری پُرکاری اس کی سادگی ہی کی مرہونِ منت تھی۔ مصوروں کے فن پاروں میں اگر کوئی غیر معمولی خصوصیت تھی تو کم از کم مجھے نظر نہیں آئی۔ عام سی تصویریں تھیں جیسی ہمارے یہاں نیشنل کالج آف آرٹس کے طالب علم بناتے ہیں۔ ایک بار پھر اپنے یہاں کے اہلِ ہنر اور اساتذہ فن کی بے قدری کا خیال آیا جنہیں دفنانے کے لیے بھی عام طور پر چندہ کرنا پڑتا ہے!

واپسی میں ٹورنٹو کا ڈاؤن ٹاؤن دیکھا۔ کرسمس کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ سڑکوں اور دکانوں پر اضافی روشنیاں اور رنگ راہگیروں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تھے مگر کیا مجال جو روزمرہ کے معمول میں کسی قسم کا تعطل پیدا ہو۔ ہمارے یہاں عید تو عید روزوں کا استقبال بھی چیزوں کی قیمتیں بڑھانے سے کیا جاتا ہے مگر اُن لوگوں نے ہر جگہ کرسمس سیل لگا رکھی تھی۔ اگر یہ رعایت محض نام کی تھی تب بھی اچھی تھی کہ بہر حال اس میں ایک خوش نیتی تو پائی جاتی ہے۔

کرنل انور نے ایک قدیم طرز کی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا مالک اسے گرا کر یہاں ایک جدید شاپنگ پلازا بنانا چاہتا تھا مگر شہر کی بلدیہ نے اُسے اس بات کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ اس حصے کی قدامت اور ماحول کو قائم رکھنا چاہتے تھے کہ یہ شہر کے تشخص کا ایک اہم حصہ ہے۔ بے حد بحث و تمحیص کے بعد اب انہوں نے اتنی اجازت دی ہے کہ عمارت کے اندرونی حصے کو بے شک ماڈرن بنا لیا جائے مگر اس کی بیرونی حالت اور شکل و صورت اسی طرح رہے گی اور اس کی مرمت وغیرہ میں بھی اس کے اصل طرزِ تعمیر کی پابندی کی جائے گی۔

بیگم انور اور منی مختلف دکانوں میں گھس کر کچھ انکوائریاں کر رہی تھیں اور ہم دونوں اُن کے انتظار میں بغیر کسی مقصد کے شوکیسوں کو دیکھتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک میری نظر ایک ریڑھی پر پڑی۔ ایک عام سا پہیوں والا ٹھیلا جس پر سنہرے رنگ کے بے شمار پتے سجے ہوئے تھے۔ یہ ریڑھی برآمدے کے ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ اُس کے قریب ہی اسٹول پر سیاہ شرٹ اور سکرٹ میں ملبوس تیکھے نقوش اور میک اپ سے عاری چہرے والی ایک ایسی عورت بیٹھی تھی جس کے سیاہ بالوں میں ایک بھوری سی لکیر جیسے آنکھیں مار رہی تھی۔ ہمیں متوجہ پا کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ میں نے سنہری پتوں کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا: "یہ کیا ہے؟" بولی: "یہ مختلف پودوں کے اصل پتے ہیں جنہیں ایک خاص پراسس سے گزار کر اس کھولتے ہوئے سنہرے محلول میں تر کیا گیا ہے جو ایک طرح کا نقلی سونا

ہے۔ اُس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے اپنے گلے میں پڑا ہوا ایک لاکٹ دکھایا۔ سُنہری زنجیر کے آخری سرے پر ایک سنہری پتّا خطرے کی حدوں کو چھُوتا ہوا بڑی سرشاری کے عالم میں جھول رہا تھا۔ میں نے کرنل انور کے مشورے پر دو لاکٹ خرید لیے جو کم از کم اُس وقت بالکل مہنگے نہیں تھے۔

میں نے پُوچھا: "کہاں کی رہنے والی ہو؟"

بات ٹال کر بولی: "آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں — مڈل ایسٹ سے؟"

میں نے کہا: "ایسٹ کی حد تک تمہارا اندازہ صحیح ہے لیکن ہمارا ایسٹ ذرا ساؤتھ کی طرف واقع ہے۔"

"میرا جغرافیہ ذرا کمزور ہے — ملک بتاؤ۔"

"ہم پاکستانی ہیں۔"

اُس کی فرمائشی مسکراہٹ سے مجھے اندازہ ہُوا کہ اُسے پاکستان کا کچھ پتا نہیں ہے اور اگر میں اُس سے یہ کہہ دوں کہ میرا ملک افریقہ یا لاطینی امریکہ میں واقع ہے تو وہ اس بیان کو بھی فوراً قبول کرلے گی۔ میں نے پھر پوچھا: "تم کہاں کی ہو — یہاں کی تو نہیں لگتیں؟"

"میں تل ابیب سے آئی ہوں۔"

کرنل انور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب معلوم ہوا وہ ہم سے اپنا وطنِ مالوف کیوں چھُپا رہی تھی۔ میں نے اُردو میں انور صاحب سے کہا: "آپ کی وجاہت اور جامہ زیبی سے اگر اسے آپ کے لبنانی، اُردنی یا شامی ہونے کا گمان ہُوا ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے مگر مُجھ غریب پر یہ خوش گمانی کیسی؟"

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ایک زوردار قہقہہ لگا کر میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولے: "یہ جو گندمی رنگ ہے نا، اس کی وہی مثال ہے: 'غربت میں جاکے چمکا، گُمنام تھا وطن میں۔'" ہمیں باتوں میں مصروف دیکھ کر اس عفیفہ نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے اپنی تاجرانہ خوش خلقی کو اُتار اور سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور واپس جاکر سٹول پر بیٹھ گئی۔ کرنل انور نے مُسکرا کر کہا: "اسے کہتے ہیں: 'یہودی کی لڑکی'!"

اس سارے سفر کے دوران میں میزبانوں نے ہمارے استقبال اور الوداع میں اتنی محبت اور

مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا کہ بین الاقوامی ہوائی سفر کے بہت سے مسائل کا ہمیں پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ آغازِ سفر میں میامی کی فلائٹ مس کرنے کے بعد سے اب تک ایئر پورٹ ہمارے لیے مسئلہ نہیں بنا تھا مگر اب جو میں کرنل انور اینڈ کمپنی کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچا تو ٹرمینل کے فلائٹ کاؤنٹر کے نواح میں پروین اور اشفاق فیملی کی کوئی نشانی موجود نہیں تھی اور کاؤنٹر بھی خالی پڑا تھا۔ فلائٹ کا ٹائم نزدیک تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور دُور دُور تک نہ تو ناقہ سوار نظر آ رہا تھا اور نہ گردِ ناقہ۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ ہم غلط کاؤنٹر پر کھڑے ہیں۔ اب جو صحیح کاؤنٹر کی طرف بھاگے ہیں تو وہاں الوداعی گروہ کے دس بارہ ارکان مجسّم پریشان کھڑے تھے۔ بغل گیریوں، مصافحوں اور سلاموں کے دوران میں بورڈنگ کارڈ وغیرہ کا مرحلہ طے کیا گیا تو یہ اُلجھن آن پڑی کہ دو بکسوں میں سامان کا وزن مطلوبہ حد سے زیادہ تھا۔ کاؤنٹر والی نے بتایا کہ ایسی صُورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ایئر پورٹ والوں نے وہاں گتّے کے مضبوط کارٹن رکھ چھوڑے ہیں، اُنہیں استعمال کیا جائے۔ جلدی جلدی بکسے کھولے گئے۔ پیکنگ کے عمل میں چونکہ سب لوگ ہاتھ بٹانے لگے تھے اس لیے زیادہ وقت لگا۔ پروین نے بہت سی چیزیں ایک بڑے سے ہینڈ بیگ میں ٹھونسیں جو پُھول کر تقریباً ایک درمیانے سائز کے اٹاچی کیس جیسا ہو گیا۔ میں نے دبے لفظوں میں کہا بھی کہ جہاز کا دستی سامان رکھنے کا خانہ اس توپ خانے کا متحمل نہیں ہو سکے گا مگر پروین بیگم نے ایک کان سے میری بات سُنی اور اُسی سے اڑا دی۔ دستی سامان چیک کرنے والے کاؤنٹر پر ایک نوجوان سے سکیورٹی افسر نے اُس بیگ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی، کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا مگر پھر کندھے جھٹک کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ پروین نے ایک فاتحانہ، طنزیہ نظر مُجھ پر ڈالی، بیگ اُٹھایا اور ایسے انداز میں آگے آگے چلنے لگی جیسے کوئی کیڈٹ سورڈ آف آنر وصول کرنے جاتا ہے!

عام طور پر جہاز کی طرف جانے والا گیٹ اُس کے فلائٹ کاؤنٹر سے چالیس پچاس گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوتا مگر یہ والا گیٹ آ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ ہم تیروں کے نشان دیکھتے اور مختلف کاریڈوروں سے گزرتے ہوئے تقریباً دس منٹ میں منزلِ مقصود پر پہنچے۔ فلائٹ کی روانگی میں پندرہ منٹ باقی تھے اور تمام مسافر جہاز میں سوار ہو چکے تھے۔ دو بے مروّت سی خواتین نے سرزنش بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھا، بورڈنگ کارڈ چیک کیے اور اشارے سے

جانے کے لیے کہا۔ ابھی میں نے "مبنغسی" کہہ کر قدم اُٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک چیخ نما آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو اُن میں سے ایک، دونوں ہاتھوں سے پروین کا رستہ روکے کھڑی تھی اور اُسے بتا رہی تھی کہ یہ ہینڈ بیگ اُسے سامان کے ساتھ چیک اِن کرانا پڑے گا کیونکہ یہ ہرگز ہرگز دستی سامان کی تعریف پر پورا نہیں اُترتا۔ پروین نے اُسے اپنی وکٹورین انگریزی میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر اُس بی بی کے دل میں ذرا رحم نہیں آیا، اُس نے بیگ کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "No, no, no, you will have to check in that horrible looking suitcase of a bag."

میں نے منمناتے ہوئے کہا: "کچھ دیا کرو، اگر ہم اسے چیک اِن کرانے کے چکر میں پڑیں گے تو ہمارا جہاز نکل جائے گا۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا کہ اگر تم بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے دوڑ کر جاؤ تو غالب امکان ہے کہ فلائٹ مِس نہیں ہوگی۔ میں نے دوبارہ اس کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا مگر

کچھ ایسی برف تھی اُس کی نظر میں
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا!

پروین بالکل رونے والی ہو رہی تھی اس لیے میں نے اُسے وہیں رُکنے کو کہا، بیگ اُٹھایا اور اپنا کرکٹ کا زمانہ یاد کر کے دوڑ لگا دی۔ اس دوڑ کے دوران مجھے پہلی بار پتا چلا کہ 'افتاں و خیزاں' کا اصل مطلب کیا ہوتا ہے!

اشفاق وغیرہ نے، جو ابھی تک وہیں تھے، جب مجھے اس حالت میں آتے دیکھا تو اُن کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے۔ میرا چہرہ بھی اس وقت 'صورت بہ بیں، حالم مپرس' بنا ہوا تھا اس لیے ہم سب بغیر کچھ کہے سُنے بیگیج کاؤنٹر پر پہنچے۔ اب پتا نہیں یہ ہماری پریشانی کا احساس تھا یا اہلِ فرنگ کی معروف انسان دوستی کہ کاؤنٹر والی نے میری بات سُنتے ہی بغیر کسی بحث کے بیگ کو ہمارے سامان کے ساتھ بھجوا دیا حالانکہ چند منٹ پیشتر وہ اس ضمن میں صاف انکار کر چکی تھی۔ فلائٹ کے ٹیک آف میں صرف چار منٹ باقی تھے، میں نے دوڑ لگائی جس کی رفتار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کاؤنٹر والی کے 'تھینک یُو' اور میزبانوں کے 'خدا حافظ' کے دوران میں میں تقریباً

بیس گز آگے نکل چکا تھا۔ باہر برف پڑ رہی تھی اور میرے ٹوٹوں میں پسینہ جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پروین نے مجھے دیکھ کر اطمینان کا ایک اتنا لمبا سانس لیا کہ اس کے قریب کھڑی دونوں بے مروت خواتین کی ہنسی نکل گئی۔ ان میں سے ایک نے دانت نکالتے ہوئے کہا:

"I told you, you won't miss the fiight."

بہت دنوں کے بعد اس وقت میرا دل گالیاں دینے کو چاہا!

یوں تو ہر طرح کی ٹینشن بری ہوتی ہے مگر پردیس میں فلائٹ مس کرنے کی ٹینشن ایسی بے ہودہ چیز ہے جس کا مقابلہ شاید کسی اور صورتِ حال سے نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں اپنی سیٹ تک کیسے پہنچا اور اس کے بعد کیا واقعات ہوئے۔ جب میری سانس متوازن ہوئی اور مجھے دکھائی دینے لگا تو جہاز کو پرواز کرتے بیس منٹ ہو چکے تھے۔ بیگ والے واقعے کی وجہ سے پروین کچھ چور سی بنی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ممنونیت اور شرمندگی کی کچھ ایسی ملی جلی فضا تھی کہ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد مجھے اس کے زور سے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا: "کیا ہوا؟" بولی: "اس عورت کا جملہ یاد آرہا ہے۔ کیسے آنکھیں پھاڑ کے کہہ رہی تھی:

"That horrible looking suitcase of a bag.

اس کے بعد اس نے پھر ہنسنا شروع کر دیا اور مانٹریال تک ہنستی ہی چلی گئی جہاں یہ خبر ہمارا انتظار کر رہی تھی کہ مانٹریال سے پیرس جانے والی فلائٹ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے۔

مانٹریال میں زوروں کی برف پڑ رہی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں میں سے ہم نے دیکھا ایک جہاز آ کے رکا ہے اور اس کے پہیوں کے نیچے کوئی دو دو انچ برف ہے۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ دیکھا تو آدھے آدھے پہیے برف کی چادر میں منہ چھپا چکے تھے۔ یہ ان لوگوں کا کمال ہے کہ اس کے باوجود جہاز مسلسل اترتے اور پرواز کرتے رہے۔ ہمارے یہاں چار چھینٹے بارش کے پڑتے ہیں اور آٹھ پروازیں لیٹ یا کینسل ہو جاتی ہیں!

پیرس پہنچے تو ہماری گھڑیوں پر تین اور پیرس کی گھڑیوں پر نو بج رہے تھے۔ وہاں سے لندن کی فلائٹ ساڑھے دس بجے تھی۔ ایک گھنٹے کی اس پرواز کے بعد جب لندن پہنچے تو وہاں بھی ساڑھے دس ہی بجے تھے! میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے!

لندن

بزرگوں سے سُنا ہے کہ ایک زمانے میں 'لندن پلٹ' ہونا ایک ایسی خصوصیت تھی جسے اعلیٰ ڈگری کا درجہ دیا جاتا تھا۔ بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں تو یہ سفر ایک مرکزی نقطے کی حیثیت اختیار کر جاتا تھا، مثلاً:

یہ میرے لندن جانے سے چار سال پہلے کی بات ہے!

جن دنوں میں لندن جانے کا پروگرام بنا رہا تھا!

لندن سے آتے ہی میری شادی ہوگئی!

لندن سے آئے ہوئے دس برس ہو چکے تھے مگر...؟

میں نے لندن میں دیکھا کہ ...... وغیرہ — وغیرہ — وغیرہ!

قیامِ پاکستان سے پہلے برِصغیر سے لندن کی طرف یہاں کی دولت کے علاوہ عام طور پر کچھ طالب علم اور اُمراء کا ایک محدود طبقہ ہی جایا کرتا تھا، مزدور پیشہ اور تاجر حضرات کی تعداد ان سے بھی کم تھی مگر آزادی کے بعد صورتحال انتہائی تیزی سے بدلنے لگی۔ لندن پر سب سے پہلا ہلا اپنے میرپوری بھائیوں نے بولا اور پھر اس کے بعد چل سو چل۔ ڈاکٹر، انجینیئر، تاجر، بینکر، اہلِ علم و ہنر، سیاستدان، فنکار — غرضیکہ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے نمائندے وہاں موجود نہ ہوں۔

مشتاق احمد یوسفی، عبداللہ حسین، ضیا محی الدین، ناہید نیازی، افتخار عارف، ساقی فاروقی، بدیع الزماں، شاہد محمود ندیم، غلام مصطفےٰ کھر، جاوید حکیم قریشی، فارغ بخاری، غلام نادر آزاد، آغا حسن عابدی، سلیم شاہد، جسٹس صمدانی، عظمت نواز باجوہ، ڈاکٹر سعید اختر درانی، ڈاکٹر صفی حسن، الطاف گوہر، شاہد حسین اور بے شمار دوسرے معروف پاکستانی وہاں عارضی یا مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔ کچھ لوگ لندن میں ہیں اور کچھ اس کے نواح میں۔ مزدور پیشہ لوگ زیادہ تر انگلستان کے صنعتی شہروں میں رہتے ہیں

لیکن لندن کا ایک علاقہ، جو ہیتھرو ایئر پورٹ کے قریب ہے اور ساؤتھ ہال کہلاتا ہے، تقریباً سارے کا سارا ایشیائی اور بالخصوص برِ صغیر کے لوگوں کے قبضے میں ہے۔ کسی شاعر کا مصرعہ ہے:

ہم جہاں بیٹھ کے پی لیں وہیں مے خانہ ہے

تو یوں سمجھیے کہ ساؤتھ ہال کو ہمارے بھائیوں نے وطنِ عزیز کا ماحول دینے کی پوری پوری اور کامیاب کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں کہ کوئی بوڑھا انگریز اپنے کسی پرانے دوست کا گھر ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا۔ عمارت اور فلیٹ نمبر تلاش کرنے کے بعد اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اندر سے ایک سردار جی دھوتی کرتے میں ملبوس، مونچھوں سے مکھن صاف کرتے ہوئے نکلے۔ انگریز نے اپنے دوست کے بارے میں استفسار کیا۔ سردار جی نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا:

"No, no, this is my house, no Mr. Barrington lives here."

بوڑھے صاحب نے اپنی ڈائری سے دوبارہ پتا چیک کیا اور سردار جی سے پوچھا کہ یہ فلاں بلڈنگ کا فلیٹ نمبر فلاں نہیں ہے؟ سردار جی بولے: "Yes, address is allright, but I told you no foreigner lives here."

اب لندن میں کسی انگریز کے لیے فارنر کا خطاب سن کر اس بابے پر کیا گزری ہوگی؟ اندازہ آپ بخوبی کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بابا ایشیائی باشندوں کے زبردست ترین مخالف اور برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر اینک پاول کا رشتے دار تھا!

اتنے بڑے لندن شہر میں اگرچہ ہمارے جاننے والوں کی تعداد خاصی معقول تھی مگر میرا پروگرام اپنے بچپن کے دوست مکرّم جاوید سیّد کی طرف رہنے کا تھا جو گزشتہ دس برس سے یہاں ٹریڈنگ کا بزنس کر رہا تھا اور اس میں بہت کامیاب بھی تھا۔ مشاعروں کے پروگرام میں تبدیلی کے باعث صورتِ حال کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ ہماری آمد سے دو دن قبل اسے اپنی اطالوی بیوی لاریا سمیت لاطینی امریکہ کے مختلف ممالک میں جانا تھا جہاں سے اس کی واپسی دو ہفتے کے بعد متوقع تھی یعنی ہماری روانگی کے تین دن بعد۔ اس صورتِ حال میں قصور سراسر ہمارا تھا مگر مکرّم اس قدر شرمندہ ہو رہا تھا کہ میرے بے حد سمجھانے کے باوجود وہ اپنے حقِ میزبانی سے دست بردار نہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ ہمارے استقبال، خبر گیری، رہائش، نقل و حرکت کے انتظامات اور خاطر خدمت کے لیے نہ صرف اس کے لندن آفس کا عملہ

موجود ہوگا بلکہ اُس نے اپنے نائیجیریا آفس سے ہمارے مشترکہ اور پیارے دوست افتخار بٹ کو بھی بلوا لیا ہے تاکہ ہم اور زیادہ ایٹ ہوم محسوس کر سکیں۔

پروین نے اپنے کلکٹر کسٹمز جہاں گیر خاں صاحب کو ہماری آمد کی اطلاع دے رکھی تھی جو وہاں پاکستانی سفارتخانے کے کمرشل اتاشی تھے۔ اُن کی وجہ سے امیگریشن اور کسٹم کا مرحلہ تو دس منٹ میں طے ہو گیا مگر اب جو ہم سامان کی ٹرالیاں لے کر چلے تو چلتے ہی چلے گئے۔ تقریباً آدھ میل چلنے کے بعد جب ہم ایک ایسے کاریڈور میں داخل ہوئے جس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا تو پروین نے ایک لمبا سانس چھوڑتے ہوئے کہا: "یہ راستہ تو برٹش راج سے بھی لمبا ہو گیا ہے!"

لندن ایئرپورٹ پر اگرچہ امریکی ہوائی اڈوں جیسی چمک دمک نہیں تھی مگر اس میں ایک ریٹائرڈ جرنیلوں والی تمکنت اور رکھ رکھاؤ ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ ایئرپورٹ کی عمارت کے اندر کی اس طویل جبری پریڈ کے دوران ہم نے جہاں گیر خاں صاحب سے لندن یاترا کی تمام ضروری اور غیر ضروری تفصیلات حاصل کرنے کے علاوہ اپنا تقریباً سارا پروگرام بھی ڈِس کس کر لیا تھا جس میں اُن کے یہاں قیام کی پُرخلوص دعوت سے معذرت بھی شامل تھی۔

قرائن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم ہوائی اڈّے کے بیرونی دروازے کے نواح میں ہیں مگر ہمارے میزبانوں کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔ جہاں گیر خاں کی آنکھوں میں بہت سے سوالیہ نشان تیر رہے تھے مگر ایک شریف اور باوقار انسان کی طرح ہمیں پریشانی سے بچانے کے لیے وہ جان بوجھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ پروین کی شرمندہ کُن نگاہیں بار بار میری طرف اُٹھ رہی تھیں اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے پُورا ہیتھرو ایئرپورٹ ایک بڑے سے سوالیہ نشان کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ میں نے بے چارگی کے انداز میں اجنبی چہروں کے ہجوم پر ایک اور نگاہ ڈالی۔ آؤٹ آف فوکس انسانی نقوش کے ہجوم میں ایک آشنا چہرہ ریگزار میں نخلستان کی طرح طلوع ہُوا۔ افتخار بٹ اپنے مخصوص ڈھیلے ڈھالے انداز میں مسکراتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ قدِ آدم سے کچھ نکلتے ہُوئے قد والا ایک اور شخص تھا جس کے ہونٹوں پر اس کے قد سے بھی بڑی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ افتخار نے تعارف کرایا کہ یہ اقبال حسین ساہی ہیں جو مکرم کے دفتر کے چیف اکاؤنٹنٹ ہیں اور ہمارے لندن میں قیام کا انتظام و انصرام ان کے ذمّے ہے۔ اقبال اور افتخار کے ساتھ میری کھوئی ہوئی خود اعتمادی، بشاشت

اور ہیتھرو ایئر پورٹ کی روشنی بھی واپس آگئی تھی۔ میں نے افتخار سے تاخیر کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ وہ تو اپنے حساب سے وقت سے خاصا پہلے آئے ہیں کیونکہ انٹرنیشنل فلائٹ کے سب سے پہلے آنے والے مسافر کو بھی کسٹم اور امیگریشن سے نکلنے میں کم از کم آدھ گھنٹہ ضرور لگتا ہے۔ جہانگیر خاں نے اُن کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ ’ایں ہمہ آمدہ من است !‘

اب پتا چلا کہ ہنگامی حالات میں وی آئی پی بننے کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

سامان کو موٹروں کی ڈکیوں میں رکھنے کی ناکام کوشش کے بعد ٹیکسی منگوائی گئی۔ لارڈ کلائیو کی سی شکل و صُورت والے گورے ڈرائیور نے بڑی مستعدی سے سامان لوڈ کرنا شروع کیا۔ میں نے اس کی مدد کرنا چاہی تو افتخار نے مجھے روک دیا۔ بولا: ”اُٹھانے دو اِسے ـــــ ہم نے بھی ڈیڑھ سو سال اس کا بہت سامان اُٹھایا ہے !“

اقبال ساہی نے اُسے ہماری منزل سے آگاہ کیا اور تاکید کی کہ ہمارے پیچھے پیچھے آئے۔ ایئر پورٹ سے ریجنٹ پارک تک کے تقریباً بیس منٹ کے سفر میں ایک لمحے کے لیے بھی وہ سیاہ رنگ کی ٹیکسی ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہے۔ تاریخ کے بہت سے نظریات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے: جو تھا، نہیں ہے، یا جو ہے، نہ ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔

افتخار گزشتہ برس دل کے بائی پاس آپریشن سے گزر چکا تھا۔ میں نے اس کے دل کی صحت اور حالت کا پُوچھا تو اس نے بتایا کہ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور پنجابی محاورے کے مطابق گھوڑے کی طرح فٹ ہے۔ نائیجیریا کا ذکر چھڑا تو اس نے کہا کہ وہاں کے حالات ایسے ہیں کہ انہیں ہرگز حالات نہیں کہا جا سکتا کیونکہ افریقی لوگ سسٹم نام کی کسی چیز کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ جس طرح بنکاک کی امتیازی خصُوصیت وہاں کی عورت ہے اِسی طرح نائیجیریا کی پہچان رشوت ہے جو وہاں اس قدر کھُلے بندوں چلتی ہے کہ اس پر تعجّب کا اظہار کرنا آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے !

ریجنٹ پارک کے قریب اسلامک سنٹر کے مرکزی دروازے کے تقریباً سامنے ایک تین منزلہ بلڈنگ کی دوسری منزل پر ۶۷ نمبر کا اپارٹمنٹ میرے لیے بُک کروایا گیا تھا جو کہ دو بیڈ رُوم، ایک لِونگ رُوم، باتھ اور کچن پر مشتمل تھا۔ اپارٹمنٹ میں ضرورت کی ہر چیز موجُود تھی بلکہ بہت سی ایسی چیزیں

بھی تھیں جن کی مجھے قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ پروین کی رہائش کا انتظام صابر چوہدری کی فیملی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ صابر کا خوبصورت فلیٹ میرے اپارٹمنٹ سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ صابر بھی مکرم کی طرح لندن سے باہر تھا۔ اس کی بیوی اور سالی نصرت، جو اقبال ساہی کی بھانجیاں بھی تھیں، پروین کو مل کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ لوگ سرائے عالمگیر (جہلم) کے رہنے والے تھے؛ سیدھے سادے، مخلص اور محبت کرنے والے لوگ جو مہمان کو دل سے باعثِ رحمت خیال کرتے ہیں۔ اُن کی اس مہمان نوازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے اپارٹمنٹ کا کچن استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور یوں دُنیا یہ جاننے سے بھی محروم رہ گئی کہ انڈہ آملیٹ بننے کے دوران مزید کیا کیا کچھ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے!

لندن میں اپنے جاننے والوں کی فہرست پر نظر دوڑائی تو آنکھوں پسینہ آ گیا۔ ہمارے پاس کل آٹھ دن تھے جن میں احباب سے ملاقات کے علاوہ لندن کو بھی اچھی طرح دیکھنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دن کے لیے برمنگھم بھی جانا تھا جہاں برادرم ڈاکٹر صفی حسن، ڈاکٹر سعید اختر دُرانی اور بھائی غلام قادر آزاد سے مُلاقات طے تھی۔ عاشور کاظمی، شاہدہ احمد اور سحاب قزلباش کو بھی اطلاع ہو گئی تھی اور اُن کے بھی بار بار فون آ رہے تھے۔ بہت غور فکر کرنے کے بعد جو پروگرام بنا وہ کچھ یوں تھا کہ زیادہ تر ایسی تقریبات میں شرکت کی جائے جہاں زیادہ سے زیادہ احباب سے مُلاقات ہو سکے مگر یہاں اب یہ قباحت آن پڑی کہ پروین بیگم کسی ایسی تقریب میں شرکت پر آمادہ نہیں تھیں جس کی ترتیب سے برادرم افتخار عارف کا ذرا سا بھی تعلق ہو یعنی وہی پُرانی ناراضگی ابھی تک چل رہی تھی۔ بھائی بندی اور اخلاق اور ہم سفری — تینوں کا تقاضا یہی تھا کہ میں پروین کا ساتھ دُوں، سو میں نے یہی کیا۔ میرے اس روّیے سے افتخار کو ملال ہونا تھا سو ہوا مگر اس نے ایک سمجھ دار انسان اور اچھے دوست کی طرح اسے لفظ نہیں دیے اور یوں اس بدمزگی کا اندیشہ ٹل گیا جس نے بہت دنوں سے اندر ہی اندر مجھے پریشان کر رکھا تھا۔

افتخار، مکرم اینڈ کمپنی کے زیرِ انتظام چلنے والے ہوٹل اولیور میں مقیم تھا۔ تھوڑے سے کمرے تھے مگر اتنی مختلف قومیتوں کے مسافر وہاں رہ رہے تھے جیسے وہاں یو این او کا کوئی اجلاس ہونے والا ہو۔ معلوم ہوا کہ لندن میں (کم از کم ہوٹل کی حد تک) رنگ و نسل سے زیادہ استطاعت پر

دھیان دیا جاتا ہے۔ اولیور ایک غریب نواز ہوٹل ہے، یہ بات دوسری ہے کہ وہاں کی غریبی ہمارے یہاں سفید پوشی کہلاتی ہے! کاؤنٹر کے سامنے ایک لابی نما کمرہ نشست تھا جہاں ہر وقت ٹی وی آن رہتا تھا۔ وہاں بیٹھنے والے مرد و زن عام طور پر اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتے تک نہیں تھے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس کی وجہ ٹی وی پروگرام تھے یا اُن کے اپنے زیرِ بحث آئٹم پروگرام۔

دیارِ فرنگ میں برسرِ عام دو مردوں کا آپس میں گلے ملنا اُتنا ہی معیوب سمجھا جاتا ہے جتنا ہمارے یہاں مرد کا عورت سے بغل گیر ہونا۔ اس بات کا علم مجھے پہلے سے تھا مگر کرسمس کی رات ہوٹل میں مقیم کیرن اور کیرل نامی دو نیم مدہوش سہیلیوں نے مجھے اور افتخار کو اس موضوع پر جو سیر حاصل لیکچر دیا اور جس جس انداز میں اس مسئلے کے مختلف علمی اور عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی وہ اپنی جگہ پر ایک سبق آموز داستان ہے۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہر علاقے کی تہذیب و تمدن کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں مگر اُن کی سمجھ میں آخر تک یہ بات نہیں آئی کہ تہذیب و تمدن کا عورت اور مرد کے باہمی معاملات سے کیا تعلق ہے!

رات اور نشے کے فروغ کے ساتھ ساتھ اُن کی دلیلوں کی جارحیت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ براہِ راست برِصغیر سے آنے والوں کے 'خواتین' سے متعلق رویوں کا مذاق اُڑانے پر اُتر آئی تھیں۔ اُن کے خیال میں ہم ایشیائی لوگوں کا عورت کی طرف جھکاؤ اور اُس سے گریز دونوں ہی غیر حقیقی اور انتہا پسندانہ تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربات سے جو مثالیں دیں وہ ایسی زوردار تھیں کہ ہمارا دفاعی محاذ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ میں نے افتخار کی طرف دیکھا مگر وہ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا!

کیرن اور کیرل دونوں نسبتاً کم تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ خواتین تھیں اور ایک آزاد اور خود مختار زندگی گزار رہی تھیں۔ جنس پر گفتگو ان کے نزدیک تضیعِ اوقات کے زمرے میں آتی تھی کیونکہ اُن کا متفقہ فیصلہ تھا کہ کھانا کھانے کے لیے ہوتا ہے، بحث کرنے کے لیے نہیں۔ اُن کی باتیں سُن کر ایک بار پھر میرے ذہن میں ایک پُرانی اُلجھن نے سر اُٹھایا کہ اتنا کھلا ڈُلا ہونے کے باوجود اس معاشرے میں جسم فروشی، جنسی جرائم اور ہم جنس پرستی وغیرہ کی اتنی فراوانی کیوں اور کیسے ہے!

مغرب اور مشرق کے مزاجوں کا فرق اُن کے تہواروں اور رسم و رواج میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ہم عید پر بازاروں کو سجاتے ہیں، انگریز کرسمس پر اپنا گھر سجاتا ہے۔ ہم بن پیے مست ہو جاتے ہیں اور وہ گلے گلے شراب میں ڈوب کر بھی اپنے آپ میں رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھیڑ اور دکانداروں کی تجاوزات کی وجہ سے رستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے اور اُن کی سڑکیں بھاں بھاں کرتی ہیں۔ کرسمس کی صُبح ہم نے اقبال ساہی کے ساتھ تقریباً آدھا لندن گھوم ڈالا۔ ہائیڈ پارک میں کھڑے ہو کر تصویریں اُتروائیں کہ یہ بھی لندن یاترا کے آداب میں شامل ہے۔ سپیکرز کارنر میں بہت دیر کھڑے رہے کہ کہیں سے کچھ سامعین ملیں تو ایک عدد تقریر بھی جھاڑ ڈالیں مگر سوائے ایک پولیس والے کے کوئی اُدھر سے نہیں گزرا۔ اب ایک تو ہم ایشیائی ملکوں کے لوگوں کو ویسے ہی پولیس والے کے سامنے بولنے کی عادت نہیں ہوتی اس پر یہ گورا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی برف میں لگا ہوا تھا۔ وہ ہمارے پاس سے یوں گزرا جیسے کوئی درختوں یا پتھروں کے قریب سے گزرتا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس وقت داغ کا یہ شعر بہت یاد آیا:

زمیں پر پاؤں نخوت سے نہیں رکھتے پری پیکر
یہ گویا اس مکاں کی دوسری منزل میں رہتے ہیں

دریائے ٹیمز کو دو تین مختلف پُلوں اور کناروں سے دیکھا مگر ہر بار ایک جیسا پایا۔ انگریز قوم کے مزاج کی طرح! ایک پُل سے کچھ ہی فاصلے پر ٹاور آف لندن واقع تھا۔ اس عمارت سے پُرانے وقتوں میں بادشاہ لوگ عقوبت خانے کا کام بھی لیتے رہے ہیں۔ پتا نہیں تخت اور زندان میں کیسا ربطِ خفی ہے کہ اکثر شاہی محلات اپنے مکینوں کے لیے بندی خانے بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہُوا ہے کہ لوگ بظاہر تخت پر متمکن ہوتے ہیں مگر اُن کی روحیں سُولیوں پر ٹنگی رہتی ہیں!

میرا دھیان لاہور کے شاہی قلعے کی طرف چلا گیا جہاں دیوانِ خاص کے پہلو بہ پہلو وہ عقوبت خانے واقع ہیں جہاں اذیت رسانی کا عمدہ ترین انتظام موجود ہے اور یہ اذیت اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہے جن کے جُرم کی نوعیت اخلاقی نہیں ہوتی۔ اُردو کے بہت عُمدہ نظم نگار اور میرے بہت پیارے بزرگ ہمعصر ظہور نظر مرحُوم نے ایک خاص پس منظر میں ایک شعر کہا تھا، ٹاور آف لندن دیکھا تو یوں لگا جیسے وہ شعر صدیوں پر محیط ہو گیا ہو:

کیا ہے قید مجھے اُس جگہ پہ ظالم نے
جہاں سے صاف مرا گھر دکھائی دیتا ہے

دوپہر کو "لاہور کباب ہاؤس" میں تکے، کباب اور تندوری روٹیاں کھا کر اپنے شہر اور شہر والوں کو یاد کیا۔ یاد بھی کیڑے کے رزق کی طرح ہوتی ہے جو پتھر میں بھی سیندھ لگا کر اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

ویسٹ منسٹر ایبے کہنے کو تو ایک گرجا ہے مگر آپ بلا تکلف اسے انگلینڈ کی تاریخ کا سب سے بھرپور استعارہ کہہ سکتے ہیں۔ حالی نے دلّی کے بارے میں کہا تھا؛ دفن ہوگا کہیں ایسا نہ خزانہ ہرگز! میرا خیال ہے کہ یہی بات اس عمارت کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ عبادت گاہ بھی ہے، شاہی خاندان کی شادیوں کا مخصوص گرجا بھی اور مشاہیر کا قبرستان بھی۔ انگریزی تہذیب اور تمدن کے مختلف شعبوں کے جتنے نامور تزئین کار ہو گزرے ہیں اُن سب کا ایک عمدہ انتخاب اس عمارت کے در و بام میں سانس لیتا ہُوا نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں روحانیات کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اللہ والوں کی قبریں جیتی ہیں یعنی اُن کی موت کے بعد بھی اُن کا فیض جاری رہتا ہے میں سمجھتا ہوں یہ بات اُن لوگوں پر زیادہ صادق آتی ہے جنہوں نے انسانیت کی بقا اور فروغ کے لیے اپنی پوری زندگیاں وقف کر دیں اور دُنیا کو اپنے علم و ہُنر اور کارناموں سے ایسے سدا بہار تحفے دیے جن کی چمک اور حُسن کی چھُوٹ مستقبل کی روش روش پر جلوہ نما ہے۔

ہم نے مختلف مشاہیر کے ناموں کی تختیوں پر نظر ڈالی تو یوں لگا جیسے ویسٹ منسٹر ایبے کے قبرستان میں داخل ہونے کے لیے پہلی شرط تاریخ کے اوراق میں زندہ ہونا ہے۔ انگلستان کی بادشاہت جمہوریت کی آندھی اور سوشلزم کے طُوفان دونوں کو جھیل چکی ہے اس لیے اس کے افراد کی قبریں ان کے ذاتی میرٹ کی وجہ سے نہ بھی ہوں تو بھی انہیں یہاں دفن ہونے کا حق پہنچتا ہے البتہ ان کے علاوہ جتنی قبریں ہیں اُن میں ہر کوئی اپنی جگہ یگانہ اور یکتا ہے۔ صرف شاعروں میں دیکھا تو شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، کیٹس، شیلے اور ٹی ایس ایلیٹ نظر آئے۔ بہت سے ہوں گے جن کی الواحِ مزار پر یا تو ہماری نظر نہیں پڑی یا ہم وقت کی کمی اور تھکن کی زیادتی کی وجہ سے اُن تک پہنچ نہ سکے۔ پروین انگریزوں کی تاریخ کے بارے میں میری معلومات سے باقاعدہ طور پر مرعوب ہو رہی تھی اس لیے میں نے اُسے یہ بتانا مناسب نہیں

سمجھا کر بی اے میں برٹش ہسٹری میرا اختیاری مضمون تھا!

ایک بہت وسیع و عریض اور بے حد بلند چھت والے ہال میں پہنچے تو معلوم ہوا وہیں ڈیانا اور چارلس کی شادی ہوئی تھی اور اُس روز جتنے آدمیوں کو وہاں کرسی ملی اُن کے وی وی آئی پی ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں۔ گزشتہ دنوں کسی نے وی وی آئی پی کی امریکن تعریف بتائی تھی اچھی لگی سو اس موقع کی مناسبت سے اُس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

وی وی آئی پی وہ ہوتا ہے جو امریکی صدر کی رہائش گاہ وائٹ ہاؤس میں مدعو ہو اور مائیکروفون پر اعلان کیا جائے کہ اُس کے لیے کوئی فون کال ہے۔

کسی نے اعتراض کیا کہ اس کے لیے صرف وی آئی پی ہونا ہی کافی ہے، اضافی وی صرف ایسے شخص کے نام کے ساتھ لگنی چاہیے جو وائٹ ہاؤس میں امریکی صدر کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہو، ٹیلی فون کی گھنٹی بجے، صدر سُنے اور پھر ریسیور اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے کہے: "یہ آپ کے لیے ہے۔"

ساقی فاروقی کا نام اور کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ گزشتہ پچیس تیس برسوں سے بڑی عمدہ، سچی اور انوکھی شاعری کر رہا ہے، مگر اُسے دیکھنا، اُس سے باتیں کرنا اور اس کے ساتھ گھومنا بھی اپنی جگہ ایک عجیب و غریب تجربہ ہے ___ ایک ایسا تجربہ جس کے بارے میں فارسی والے 'شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ' بولتے ہیں۔ چند برس قبل جب وہ پاکستان آیا اور اس سے پہلی بار بالمشافہ ملاقات ہوئی تو اُس نے مغربی لباس پر گلے میں موٹے موٹے منکوں والی ایک مالا پہن رکھی تھی اور گفتگو کے دوران شیکسپیرین تھیٹر کے اداکاروں کی طرح ہاتھوں، آنکھوں، چہرے کی مومنٹ اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اتنا زیادہ کام لے رہا تھا کہ مجھے اُلجھن سی ہونے لگی۔ کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیت ن۔ م۔ راشد، افتخار جالب، مظفر علی سید اور صلاح الدین محمود سے پہلی ملاقات پر بھی ہوئی تھی، یہ اور بات کہ ان سب حضرات سے دو چار بار ملنے کے بعد آپ نہ صرف اُن کے 'انداز' کے عادی ہو جاتے ہیں بلکہ ایک آدھ استثنا سے قطع نظر اس سے لطف اندوز بھی ہونا شروع کر دیتے ہیں، سو ساقی کے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ ہوا۔

ساقی اُن چند شاعروں میں سے ہے جن کی گفتگو اور نظموں کے موضوعات میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت اور شاعری دونوں میں ایک مخصوص قسم کا جذباتی 'وفور' ہے، مروجہ اصطلاحات

ہیں اس کیفیت کو سیمابیت، جوش، قوّت اور جذباتیت کہا جاتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں ساقی کے حوالے سے مجھے 'وفور' کے علاوہ کوئی لفظ موزوں نہیں لگتا۔ ساقی جب لندن گیا تھا تو اس وقت وہ اینگری ینگ مین بلکہ اینگری ینگ بوائے تھا مگر اب اس کی کنپٹیوں پر کپاس ڈیرا ڈال چکی ہے۔ (اگرچہ اُس کا چہرہ اب بھی اس کی عمر کے مقابلے میں بہت جوان ہے اور اُس کی آواز کی کھنک بھی قائم و دائم ہے!) اُس کی آسٹرین نژاد بیوی، جسے وہ گنڈی کہہ کر پکارتا ہے، گزشتہ اُنیس سال سے اس کی بیوی چلی آ رہی ہے، سو اُس خاتون کے باکمال ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے جس نے پارے کو مٹھی میں بند کر رکھا ہے۔ اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر کی ڈائننگ ٹیبل پر لندن کی اس بہت سرد شام میں ساقی نے ہمیں اپنی اور گنڈی کی اولیں ملاقاتوں کی داستان بہت مزے لے لے کر سنائی۔ اُس کی بیٹی اِنگا غالباً یہ باتیں بہت دفعہ سُن چکی تھی اس لیے وہ کھانا کھاتے ہی میز سے اُٹھ گئی البتہ گنڈی نے بیچ بیچ میں جو جملے کَسے اُن سے اندازہ ہوا کہ لوہا لوہے کو اگر کاٹتا ہے تو کیسے کاٹتا ہے!

گنڈی نے بتایا کہ جب وہ ساقی سے پہلی بار ملی تو اُسے انگریزی بہت کم آتی تھی اور اُس کی والدہ یعنی ساقی کی ساس تو انگریزی سے بالکل ہی نابلد تھیں چنانچہ جب ساقی اُن کی فیملی سے ملا تو وہ سب اُس کی 'حرکتوں' سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کی سیماب طبعی، شوریدہ مزاجی، تیز تیز بولنے کا مخصوص انداز اور گندمی رنگ اُنہیں ایسے بھائے کہ اُنہوں نے فوراً نہ صرف اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا بلکہ آج تک بیٹی کی بجائے داماد کا ووٹ بنے ہوئے ہیں!

ساقی نے کریڈٹ لیتے ہوئے کہا کہ اُن کے اسی سلوک کی وجہ سے اتنے برس انگلستان میں رہنے کے باوجود اس نے اپنی ساس کے بارے میں کبھی کوئی مذاق نہیں کیا حالانکہ اُس معاشرے میں moth-er-in-law jokes شرفا کی نشستوں کا لازمی حصّہ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا: "تمہارا دین ایمان تمہارے ساتھ، البتہ مجھے اس موضوع پر ایک لطیفہ یاد آ گیا ہے، کہو تو عرض کروں؟"

پروین بولی: "سنائے بغیر آپ نے رہنا تو ہے نہیں، تکلّف چھوڑیے، ارشاد کیجیے۔"

میں نے گنڈی اور ساقی سے اخلاقی مدد لیتے ہوئے کہا: "دیکھو بھئی، میرا ایمان ہے کہ لطیفہ پوری نسلِ آدم کی میراث ہوتا ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے اسے خلقِ خدا تک پہنچانا چاہیے۔ اتنی tense اور پریشان زندگی میں کچھ تو اپنے ہونے کا احساس ہو، سو عرض کیا ہے:

کسی نے کہا کہ agony اور acstasy کسی ایک لمحے میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ دوسرے نے اختلاف کیا اور ایسی مثال دی کہ پوری محفل قایل ہو گئی۔ بولا:

اگر آپ یہ دیکھیں کہ آپ کی نئی اور بہت قیمتی کار ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک ایسے زاویے پر پہنچ چکی ہے جہاں سے اس کا گرنا ناگزیر ہے تو اسے agony کہیں گے لیکن اگر اس میں آپ کی mo-ther-in-law سوار ہو تو یہی agony فوراً acstasy میں تبدیل ہو جائے گی۔

ساقی نے گنڈی کو چھیڑتے ہوئے بتایا کہ پہلی ملاقات میں جب میں نے اسے فلم دیکھنے کی دعوت دی تو اس نے صاف انکار کر دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی پوچھا: "بائی دی وے اس فلم میں ہے کون کون؟" گنڈی نے مسکراتے ہوئے کہا: "بس یہی ایک غلطی ہو گئی۔"

میاں، بیوی کی اس پُر لطف گفتگو کے دوران ساقی کے اپنے ہم عصروں پر تبصرے بھی جاری رہے۔ بقول اُس کے جہاں چار ادیب شاعر جمع ہوں وہاں غیبت کا شامیانہ خود بخود تن جاتا ہے۔ راشد اور فیض صاحب سے لے کر افتخار عارف اور گوپی چند نارنگ تک بے شمار لوگ اُس کے اُڑتے ہوئے تیروں کی زد میں آئے۔ خوفِ فسادِ خلق کے خیال سے میں اس میدانِ کارزار سے صرفِ نظر کرتا ہوں کیونکہ احباب کے دل تو ذرا سی ٹھیس نہیں سہہ پاتے اور یہاں تو . . . مگر ایک جملہ ایسا ہے کہ چھپائے نہ بنے۔

کیٹس کا گھر ساقی کے ہمسائے میں ہے اس کی زیارت تازہ واردانِ ہوائے لندن کو کروانا وہ اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہے۔ برادرم پروفیسر نظیر صدیقی چند برس پہلے ایک مطالعاتی دورے پر لندن پہنچے تو ایک شام وہ اُنہیں بھی وہاں لے گیا۔ کیٹس کا گھر دکھایا اور پھر بڑے رومانٹک انداز میں اردگرد پھیلے ہوئے باغ نما جنگل کی طرف اشارہ کر کے بولا: "اور یہ ہے وہ باغ جس کے درختوں سے اُڑنے والی بلبلوں کے لیے اُس نے ایسی بے پناہ نظمیں لکھی ہیں۔"

نظیر صدیقی نے (دروغ برگردنِ ساقی) بڑے غور سے باغ کا جائزہ لیا پھر پوری سنجیدگی سے پوچھا: "کس درخت سے اُڑی تھی وہ بُلبل؟"

یہ واقعہ سُنانے کے بعد ساقی نے نظیر صدیقی کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اور تقریباً اپنے بال نوچتے ہوئے کہا: "... ذرا .... اُس .... کی بات پر غور کرو .... اُس ...

کو کیٹس کی نظم سے زیادہ اُس ...... درخت کی فکر تھی۔ خدا ان محققوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

ساقی کے گھر سے عبداللہ حسین کو فون کیا گیا کہ وہ بھی کھانے پر مدعو تھا۔ معلوم ہوا جس بھانجے یا بھتیجے کو اُس نے اپنے سٹور پر کھڑا کر کے آنا تھا وہ کسی وجہ سے نہیں پہنچ سکا اور اب اُس کے لیے "اُم الخبائث" کے ذخیرے کو نامحرموں کی تحویل میں چھوڑ کے آنا ممکن نہ تھا۔ عبداللہ کا "اُداس نسلیں" میں نے اپنے کالج کے ابتدائی برسوں میں پڑھا تھا اور تب سے میرے دل و دماغ میں اس کے مصنّف کے لیے اچھے خیالات موجود تھے مگر عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ بیس برسوں میں عبداللہ حسین سے ٹاکرا نہ ہو سکا تھا۔ ہم نے فون پر ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی، آئندہ ملاقات کے امکانات کا جائزہ لیا اور ایک دوسرے کی تحریروں کے بارے میں اچھی اچھی باتیں کیں۔

ساقی نے کہا: "چلو سحاب کی طرف چلتے ہیں۔ اُس نے فیض صاحب پر کوئی مضمون لکھا ہے جسے سُنانے کے لیے آج اُس نے اپنے گھر پر کچھ سامعین جمع کیے ہیں۔ تم لوگوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گی۔"

پروین نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بتایا کہ سحاب قزلباش نے اس کے ذریعے ہم دونوں سے بھی آنے کی فرمائش کی تھی لیکن ہم ساقی سے وعدہ کر چکے تھے اس لیے سحاب سے معذرت کرنی پڑی۔ اب جب کہ وقت ہے تو کیوں نہ ایک تیر سے دو شکار کیے جائیں!

محاورے کے اس برمحل استعمال پر ساقی، جو کہ عام حالات میں بھی تھوڑا بہت پھڑکتا رہتا ہے، بالکل ہی پھڑک اُٹھا اور پھر سحاب کے گھر تک گفتگو کا موضوع محاورات کا "تخلیقی" استعمال ہی رہا۔ میں نے بتایا کہ ایک بار انٹرمیڈیٹ کے پرچے دیکھتے ہوئے میں نے "کلنک کا ٹیکہ لگنا" کا یہ استعمال بچشمِ خود پڑھا ہے: "میرے محلّے میں کل سب نے کلنک کے ٹیکے لگوائے۔ میں گھر پر نہیں تھی اس لیے نہیں لگوا سکی۔"

پروین نے فقرہ چست کیا: "یہ تو آپ ہی کے کسی شاگرد کا لگتا ہے۔" "یہ بیان کسی خاتون کا ہے اور میں لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔"

ساقی نے حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بولا: "بھائی مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جیسے بدلحاظ لوگ ڈیڑھ مہینے سے ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں اور اُن میں ایک بار بھی

لڑائی نہ ہوئی ہو۔ ہم سالے تو اتنی دیر میں دس بار لڑ چکے ہوتے۔"

"اسی کو جنریشن گیپ کہتے ہیں" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ساقی نے میرے غریبانہ سر اور امیرانہ پیٹ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر پھر خلافِ عادت جُملہ روک لیا حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔

سحاب ہمیں دیکھ کر واقعی بہت خوش ہوئیں۔ اپنی بزرگ نسل سے ہم نے اُن کی خوش شکلی اور خوش آوازی کی جو داستانیں سُنی تھیں اُن پر تیس چالیس برسوں کی گرد جم چُکی تھی اور اس برسے ہوئے بادل میں اب کوئی بجلی بھی پوشیدہ نہیں تھی مگر یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ اپنے وقت میں یہ گھٹا کتنی گھنگھور ہو گی۔

جب ہم وہاں پہنچے تو مضمون شروع تھا مگر کچھ اس طرح کہ نفسِ مضمون بار بار جھکائی دے جاتا تھا۔ ہوا یوں کہ سحاب کی نظر کی عینک کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی اور باوجود تلاشِ بسیار کے نہیں ملی چنانچہ اب وہ نورِ بصارت کی کمی نورِ بصیرت سے پُورا کرنے کی کوشش میں اٹک اٹک کر مضمون سے گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ حاضرین میں محسنہ جیلانی کے علاوہ چار پانچ اور لوگ بھی تھے جن کے نام میرے ذہن سے اُتر گئے ہیں۔ مضمون کے بعد شعر و شاعری ہوئی اور اس قدر شدت سے کہ واپسی میں رات کے دو بج گئے۔

صُبح صُبح برادرم غلام قادر آزاد کا فون آیا جو سکاٹ لینڈ کی شدید سردی کے باوجُود محبت کی حرارت سے لبریز تھا۔ موصُوف ضد کر رہے تھے: "میں آپ لوگوں کو لندن سے لیتا ہُوا برمنگھم آجاتا ہوں جہاں آج شام برادرِ عزیز ڈاکٹر صفی حسن نے ایک محفل کا اہتمام کر رکھا ہے۔" میرا جغرافیے کا علم ویسے بھی کمزور ہے اور انگلستان کے ضمن میں تو یہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا مگر اس کے باوجود مُجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ آزاد صاحب جو رُوٹ بنا رہے ہیں وہ سر سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے والا ہے۔ تھوڑی سی تفتیش پر معلوم ہوا ہمارا شبہہ صحیح تھا۔ آزاد صاحب برمنگھم سے کوئی سو میل اُوپر کی طرف تھے اور ہم سوا سو میل نیچے کی طرف۔ گویا وہ برمنگھم سے ہوتے ہوئے لندن آتے اور پھر ہمیں لے کر واپس برمنگھم پہنچتے۔ بڑی مشکلوں سے اُن کو یقین دلایا کہ ہمارے پاس ٹرانسپورٹ کا معقُول سے بھی کچھ بہتر انتظام ہے کہ زندگی میں پہلی بار رولس رائس میں سفر کر رہے ہیں جس میں ٹیلی فُون بھی فٹ ہے۔ یہ اطلاع ہم نے اُن کو بالکل ویسے دی جیسے دیہاتی آدمی پہلی بار شہر دیکھ کر اُس پر تبصرہ کرتا ہے۔

اقبال ساہی کی ناخدائی میں سوا سو میل کا یہ فاصلہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہو گیا۔ راستے میں

ہم نے انگلستان کی ہریالی دیکھی جس سے طبیعت ہری بھری ہو گئی چنانچہ جب ڈاکٹر صفی حسن کے گھر پہنچے تو یوں محسوس ہُوا جیسے ایک کمرے سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے ہیں۔ غلام قادر آزاد اور صفی ہمارے منتظر تھے۔ دونوں بہت پُر خلوص اور محبّت والے انسان ہیں۔ مشترکہ دوستوں اور جاننے والوں کے ذکر کا سلسلہ چھڑا اور پھر چھڑتا ہی چلا گیا۔ احمد حسن حامد کے حوالے سے بات عطاء الحق قاسمی تک پہنچی اور ظاہر ہے جب کوئی بات عطا تک پہنچ جائے تو وہاں سے آگے ذرا رُک کر ہی چلتی ہے۔ میں نے انہیں عطاء کا ایک تازہ جُملہ سنایا جس کی تفصیل یہ ہے:

کالج میں ہمارے ایک ساتھی اُستاد ہیں پروفیسر غلام یٰسین افغانی۔ بڑے مرنجان مرنج اور دلچسپ آدمی ہیں۔ ایک دن عطاء نے اُنہیں بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا: "افغانی صاحب، آپ زندگی میں اور جو کچھ چاہے کیجیے گا..... مگر افغانستان کبھی نہ جائیے گا!"

افغانی صاحب نے حیران ہو کر وجہ پُوچھی۔ عطاء نے اُسی سنجیدگی سے جواب دیا: "اس لیے کہ وہاں تو پہلے ہی ایک روپے کے اسّی افغانی ملتے ہیں۔"

ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی کے بارے میں معلوم ہُوا کہ کہیں قاہرہ وغیرہ کی طرف لیکچر دینے نکلے ہوئے ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں یہ بات بتا تا چلوں کہ امریکی خلائی مشن اپالو چاند سے جو نمونے لایا تھا اُن پر تحقیق کرنے والے سائنسدانوں میں صرف ایک شخص ایشیائی تھا اور وہ ہمارے ڈاکٹر سعید اختر دُرّانی تھے: غربت میں جا کے چمکا، گُمنام تھا وطن میں۔

ہمارا کمال یہ ہے کہ غربت میں جا کر چمکنے کے باوجُود ڈاکٹر صاحب ابھی تک وطن میں گمنام ہیں۔ ڈاکٹر درّانی کا اضافی کمال یہ ہے کہ اتنے نامور سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادب اور شاعری سے بھی باقاعدہ تعلق استوار رکھا ہے۔ کلاسیکل انداز کی صاف سُتھری goody goody شاعری کرتے ہیں اور علامہ اقبالؒ کے قیامِ جرمنی کے بارے میں بے حد اہم تحقیقی مواد بھی گاہے گاہے سامنے لاتے رہتے ہیں۔

غلام قادر آزاد پیشے کے اعتبار سے بینکر ہیں لیکن اُن کا خوبصورت دل بھی ادب کے تیرِ نیم کش کا گھایل ہے۔ اپنے اور ہمارے مشترکہ دوست احمد حسن حامد کی طرح بھاری بھر کم، گول مٹول، کھلے ڈلے اور سراپا اخلاص آزاد سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اُن کے نام کی رعایت سے شعروں کا ذکر چلا تو عجیب

عجیب شعر سامنے آئے مگر میدان پھر بھی اُسی کے ہاتھ رہا جس کا دیوان کھولنے سے پہلے چُومنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا زندہ رہنے والا شعر ہے:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم!

نشست کے لیے جس گھر کا انتخاب کیا گیا تھا اُس کے بارے میں مجھے سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ واپسی پر میرا ایک بہت پسندیدہ مفلر وہیں رہ گیا تھا اور جو سالن میں نے پلیٹ میں ڈالا تھا اُس میں انتہائی دیندار قسم کی مرچیں تھیں کیونکہ میں نے زندگی میں "توبہ توبہ" کا اس قدر وِرد ایک ہی نشست میں کبھی نہیں کیا۔

مرچوں کی اس واردات سے قطع نظر میزبان انتہائی میٹھے اور ملنسار تھے۔ اس محفل میں سوشیالوجی کے ایک استاد محمد حسن عسکری (تنقید والے نہیں) سے ملاقات ہوئی جو وہاں کہیں پڑھاتے تھے مگر سُخن فہموں کی انتہائی اعلیٰ قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ اچھے شعر کو سُن کر ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک اُبھرتی تھی۔ اُن کے چہرے کا تاثر بالکل نہیں بدلتا تھا اور نہ ہی وہ مُنہ سے کوئی تحسینی کلمہ ادا کرتے تھے مگر آپ کو معلوم ہو جاتا تھا شعر کہیں پہنچا، رُکا اور گُونجا ہے۔

چند برس پہلے 'کالا دھندہ گورے لوگ' نامی فلم ریلیز ہوئی تھی۔ اس محفل میں اُس کے پروڈیوسر کفایت حسین سے بھی ملاقات ہوئی جو پیشے کے اعتبار سے کمرشل آرٹسٹ اور ڈیزائنر ہیں۔ اُن سے آئندہ صُبح شیکسپیئر کے آبائی گاؤں کی سیر کا پروگرام بنا۔ معلوم ہُوا گلوکارہ ناہید نیازی اور اپنے ضیا محی الدین بھی برمنگھم میں ہی پائے جاتے ہیں۔ ضیاء سے فُون پر بات ہوئی۔ انہوں نے ناشتے کی دعوت دی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے میزبانِ اوّل یعنی ڈاکٹر صفی حسن اپنے 'استحقاق' سے دستبردار ہونے کے موڈ میں نہیں تھے اور اُن کی بات میں وزن بھی تھا کہ میزبان کے گھر سے کم از کم ایک وقت تو کچھ کھا پی لیں سو میں نے ضیاء سے معذرت کی اور 'یار زندہ صحبت باقی' قسم کی گفتگو سے کام چلایا کہ بزرگوں نے یہ چیزیں آخر کس مقصد کے لیے اختراع کی تھیں؟

شیکسپیئر کا آبائی گاؤں Strat-Ford-upon-Avon کہلاتا ہے جسے عرفِ عام میں On-Avon بھی کہتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ سکہ بند سفر نامہ نگاروں کی طرح میں عمارتوں اور شہروں

وغیرہ کے بارے میں تاریخی معلومات اور اعداد و شمار جمع نہیں کر سکا ورنہ اس موقع پر دو تین صفحے بآسانی سیاہ ہو سکتے تھے!

غلام قادر آزاد صبح صبح چلے گئے کہ انہیں جا کر بنک کا کام دیکھنا تھا اور اُن کی جگہ کفایت، اُن کی بیگم اور دو ننھی مُنّی سی پیاری پیاری بچیاں ہمارے ساتھ شامل ہو گئیں بکھر اور بارش کے درمیان دونوں کاریں آگے پیچھے رواں تھیں ہوا میں نمی اور ٹھنڈک کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی خاموشی جیسے رینگتے ہوئے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ یہ ایک مخصوص 'انگریز' ماحول تھا۔ سنجیدہ، باوقار، سرد مہر اور بر خود غلط۔

اون ایون ماضی میں جو کچھ بھی رہا ہو اب اس کا تشخص اوّل تا آخر شیکسپیر ہے۔ وہ خود تو دل برداشتہ ہو کر بہتر مستقبل اور اظہار کی تلاش میں لندن کی طرف نکل گیا تھا مگر اب دُنیا بھر سے سیاح اُس کی جنم بھومی دیکھنے آتے ہیں اور یوں وہ علاقہ جو ایک فرد کو معاشی تحفظ نہیں دے سکا تھا اب اُسی شخص کی وجہ سے اُس پورے قصبے کی معیشت بہتر ہو گئی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ زندے مُردوں کا رزق کھاتے ہیں۔

شیکسپیر میوزیم سے ملحق اُس کا چھوٹا سا گھر ایک قومی اور ثقافتی یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے اور اس میں شیکسپیر کے عہد، اُس سے متعلق اشیاء، دستاویزات، خبروں اور یادگاروں کو بڑے سلیقے سے جمع کر دیا گیا ہے اور ان میں ایسی ایسی تفصیلات بھی ہیں جنہیں ہم اپنے مشاہیر کی زندگیوں سے اس لیے نکال یا چھپا دیتے ہیں کہ کسی کو اُن کے انسان ہونے کا یقین نہ آ سکے۔ بڑے انسان کو 'انسان' سمجھ کر اُس سے استفادہ کرنے کا یہی گُر ہے جس نے مغرب کو بہت سے میدانوں میں اس قدر آگے پہنچا دیا ہے مگر اس ذکر سے حاصل! ہم لوگ فرشتے اور شیطان کے دو کناروں کے درمیان جھولنے والے وہ آدم زاد ہیں جنہیں 'انسان' بننے یا کہلوانے سے شرم آتی ہے!

چار بجے شام اُردو مرکز، لندن میں افتخار عارف نے ہمارے ساتھ ایک نشست رکھی تھی جو پردین کے بائیکاٹ کی وجہ سے اب صرف 'میرے' ساتھ منعقد ہو رہی تھی۔ خیال تھا وطن عزیز کی طرح وہاں بھی لوگ آدھ پون گھنٹہ تاخیر سے جمع ہوں گے مگر جب پونے پانچ بجے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد افتخار عارف نے لوگوں کی بے چینی اور ہال کی تمام نشستیں پُر دیکھ

کر مشاعرہ شروع کروا دیا ہے۔ اوسلو (ناروے) سے اُردو ماہنامہ "کارواں" کے نوجوان مدیر مجاہد صاحب آئے ہوئے تھے۔ اُنہیں عارضی طور پر مہمانِ خصوصی بنا دیا گیا تھا اور مشہور ماہرِ قانون، پنجاب ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور قانون کے سابق وفاقی سیکرٹری جسٹس اے کے ایم صمدانی صدارت کر رہے تھے۔ حاضرین میں اتنے بہت سے شناسا چہرے نظر آئے کہ میری معذرت کے کلمات معانقوں اور مصافحوں کے ہجوم میں کہیں کھو گئے۔ ایک نیام میں دو تلواریں بے شک نہ رہتی ہوں مگر ایک مشاعرے میں دو بلکہ بعض اوقات تین چار مہمانِ خصوصی بھی بھگت جاتے ہیں سو سٹیج پر ایک کرسی بڑھا دی گئی اور مشاعرہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گیا۔ افتخار عارف نے میرے کان میں بتایا کہ یہ مشاعرہ بھی مُنیر نیازی کے اُس مصرعے کی طرح ہے، "اک واری جد شروع ہو جائے گل فیر اوہ مکدی نئیں!

مشاعرے میں لندن میں مقیم یا موجود بیشتر اُردو شاعر موجود تھے چنانچہ یہ نشست خُوب جمی۔ ایک شاعر، جن کا تخلص غالباً شمسی تھا، کسی حادثے میں بینائی سے محروم ہو چکے تھے چنانچہ جب وہ شعر سنانے کے لیے آئے تو ان کی بیگم بطور پرامپٹر اُن کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ میں نے دیکھا اُنہوں نے شمسی صاحب کی غزل ہندی رسم الخط میں لکھی ہوئی تھی۔ ایک اور نابینا شاعر شوقین بدایونی صاحب تھے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو لاہور کے بچھڑے ہوئے دوست جمع ہو گئے۔ شاہد محمود ندیم (جو کبھی ٹی وی میں پروڈیوسر تھا)، ہمراز احسن (سابق صحافی)، بدیع الزماں (ٹی وی کا مشہور اداکار)، رابعہ سنبل (شاہد کی بیگم)، فارغ بخاری (ہمارے بزرگ ترقی پسند دوست اور شاعر)، ان کے علاوہ عاشور کاظمی، شاہدہ احمد اور بہت سے دوسرے احباب۔

اگلے دن دوپہر کو یوسفی صاحب نے لنچ پر بلا رکھا تھا۔ یوسفی صاحب سے محبت کا رشتہ تو اُن کی تحریروں جتنا پرانا ہے کہ میں اُنہیں اور شفیق الرحمٰن کو اُردو کے سب سے بڑے مزاح نگار مانتا ہوں لیکن اُن سے مُلاقات بہت کم رہی ہے جس کی واحد وجہ مکانی فاصلہ ہے کہ جب اُن سے تعارف ہُوا تو وہ کراچی میں تھے اور جب کُچھ تعلقِ خاطر (اُن کی طرف سے) پیدا ہُوا تو اُنہیں آغا حسن عابدی اُچک کر لندن لے گئے۔ میرے پاس یوسفی صاحب کا دس بارہ برس پہلے کا ایک خط محفوظ ہے جو انہوں نے میرے کسی خط کے جواب میں بزبانِ انگریزی لکھا بلکہ ٹائپ کروایا تھا اور جس میں مجھے خط کی

رسید کے ساتھ یہ اطلاع دی گئی تھی کہ وہ بینکنگ کونسل کے صدر کی حیثیت سے دو ہفتے کے لیے ملک سے باہر جا رہے ہیں اور واپس آ کر مجھے تفصیلی جواب لکھیں گے۔ یہ تفصیل پانچ چھ سطروں میں تھی، دلچسپ بات یہ ہے اس خط کے اُوپر، نیچے اور اِرد گرد خالی جگہ پر اُنہوں نے اُردو میں کوئی بیس پچیس سطروں کا ایک علیحدہ خط لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ مصروفیت کی وجہ سے اُنہیں انگریزی میں خط لکھنا پڑا ہے جس کے لیے وہ معذرت خواہ ہیں!

لنچ سے پہلے اُن سے بی سی سی آئی کے دفتر میں ملاقات طے تھی۔ اُن تک پہنچنے میں بڑے ادب آداب سے گزرنا پڑا۔ بہت سے گوروں اور گوریوں نے ہماری رہنمائی کی، کئی بار نام، کام اور پتا پُوچھا، دو تین مختلف کمروں اور لفٹوں میں اُٹھایا، بٹھایا اور چڑھایا۔ خدا خدا کر کے کوئی دس منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے ریٹائرنگ رُوم میں پہنچائے گئے جہاں یوسفی صاحب ہمارے منتظر تھے۔ میں نے اُن سے چھوٹتے ہی پہلا سوال یہ کیا کہ ایک مزاح نگار ہونے کے ناطے وہ ایسی تھری پیس اور ٹائی کالروالی زندگی کیسے گزار لیتے ہیں کہ مزاح نگار کا رزق تو بے ترتیبی میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے میری بات ایک ایسی مسکراہٹ میں لپیٹ دی جو اُن سے پہلے میں نے صرف فیض صاحب کے چہرے پر دیکھی تھی اور میں اُن کا مُنہ تکتا رہ گیا۔

یوسفی صاحب صاحبِ کمال ہونے کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کے 'کمال پرست' (perfectionist) بھی واقع ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں لفظوں اور جُملوں کو مانجھنے اور اُن کی تراش خراش میں مختار مسعود اُن کے ہم سر ہوں تو ہوں تیسرا کوئی نہیں ہے۔ بتانے لگے کہ اُنہوں نے پچھلے دنوں کوئی تیرہ سو صفحات پر مشتمل اپنے مسودے ضائع کیے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک وہ درجہ کمال کو نہیں پہنچتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ تو آپ نے بہت ظلم کیا بلکہ کمایا ہے، اس لیے کہ آپ کا معیار اُن ہزاروں، لاکھوں قارئین کے معیار سے بہت اُونچا ہے جو آپ کی تحریروں کے بے چینی سے منتظر رہتے ہیں، آپ اپنے ذوق کی بُلندی پر اُن بے چاروں کو کیوں لٹکا رہے ہیں؟ میری بات سُن کر وہ پھر فیض صاحب بن گئے۔ میں نے ٹی ایس ایلیٹ کی مثال دی کہ وہ کسی ادب پارے کو خیال کی سطح پر رد کرنے کے خلاف تھا اور کہتا تھا جو بات ذہن میں آئے اُسے لکھ کر محفوظ کر لینا چاہیے، کچھ وقت گزرنے کے بعد اُسے پھر پڑھیں اور اس وقت فیصلہ کریں کہ وہ چیز قابلِ اشاعت ہے یا نہیں؟

یوسفی صاحب اپنی اُسی بھلی مانس مسکراہٹ کے درمیان ہولے سے بولے:

"یہی تو میں نے کیا ہے!"

لنچ پر جاتے ہوئے راستے میں مَیں نے یوسفی صاحب کو بتایا کہ میں نے اس سفر کے دوران میں ڈائری لکھی ہے اور اب میرا ارادہ ان یادداشتوں کو سفرنامے کی صُورت میں لکھنے کا ہے۔ بولے:

"ایسا نہ کیجیے گا۔"

میری حیرت اور پریشانی دیکھ کر کہنے لگے: "مجھے خدانخواستہ آپ کے لکھنے کی اہلیت پر شک نہیں ہے، دراصل مجھے سفرناموں کی کثرت نے حیران اور اُن کی سطح، انداز اور داستان طرازی نے پریشان کر دیا ہے۔ میں نے ایسی ایسی بوگس، من گھڑت اور افسانوی باتیں پڑھی ہیں کہ اس صنفِ ادب سے میرا ایمان ہی اٹھ گیا ہے۔"

میرا جی چاہا کہ میں بھی جواب میں اُن کی سی فیض صاحب مارکہ مُسکراہٹ پیش کروں مگر کسی نے کہا ہے کہ: این سعادت بزورِ بازو نیست، تو اب پتا چلا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے ابنِ انشا، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، محمد خالد اختر، اشفاق احمد، جمیل الدین عالی اور محمد کاظم کی مثالیں دیں کہ دیکھیے ان لوگوں نے کیسے مزیدار سفرنامے لکھے ہیں۔ قرۃ العین حیدر اور شفیق الرحمٰن کے رپورتاژوں کا حوالہ دیا مگر اُن کی رائے میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا۔ کہنے لگے: "آپ شاعر، ڈراما نگار، نقاد اور مترجم ہیں اور خیر سے خاصے مشہور بھی ہیں، اگر سفرنامہ نہیں لکھیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی؟" میں نے اُنہیں اپنے سفرنامے کے متوقع محاسن سے آگاہ کیا اور بتایا کہ میں اُن تمام برائیوں سے احتراز اور گریز کا ارادہ رکھتا ہوں جن کی وجہ سے وہ سفرنامے سے بدظن ہو چکے ہیں۔ اتنے میں ہوٹل آگیا اور بات درمیان میں رہ گئی۔

اگلے دن صُبح آکسفورڈ سٹریٹ میں واقع مکرّم کا دفتر دیکھا۔ صمدانی صاحب بھی اُسی دفتر کے ساتھ وابستہ تھے اور اُس دن کے لیے اُنھوں نے ہمیں لندن دکھانے اور گھمانے کی پیش کش کر رکھی تھی۔ افتخار نے پیپرمنٹ والی چائے بنائی جسے اجتماعی طور پر رَدّ کر دیا گیا۔ وہ دوبارہ چائے بنانے لگ گیا۔ اس دوران میں اقبال ساہی نے لندن میں اپنے تعلقاتِ عامہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایئر فرانس کے بڑے مشکل ٹکٹ کو پی آئی اے کی فلائٹ پر اس قدر آسانی سے منتقل کرا یا کہ جملہ حاضرین عش عش کر اُٹھے۔

صمدانی صاحب کے ساتھ جب ہم لندن کا ایک دن، ٹائپ مشن پر نکلے تو طے پایا کہ لندن کو اس طرح سے دیکھا جائے جو سیاحوں کا وطیرہ ہے یعنی پیدل چل کر یا سب وے میں بیٹھ کر۔ لندن کی سب وے ٹیوب ٹرین یا زیرِ زمین ریل ٹکنالوجی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ چاروں طرف سمندر سے گھرے ہوئے اس جزیرے میں، جہاں اُوپر سے بھی سارا سال پانی پڑتا رہتا ہے، سطحِ زمین سے ڈیڑھ دو سو فٹ گہرائی میں، لندن کی سڑکوں کے نیچے ایک عجیب و غریب نظام جاری و ساری ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تیز رفتار ٹرینیں آتی ہیں، مسافروں کو اُٹھاتی اور اُتارتی ہیں اور پھر اگلے سٹیشن کی طرف چل سو چل۔ ارضیات کے بارے میں ہمارے علم کی ابتداء سیالکوٹ میں ننھیال کے گھر کے دروازے پر واقع کنواں تھا جس کی گہرائی کوئی چالیس فٹ تھی اور انتہا بھی کم و بیش یہی تھی کہ زمین کے نیچے تقریباً اسی فاصلے پر پانی کی ایک سطح ہوتی ہے جہاں تک سوراخ کر کے پانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات یہ سطح اس قدر بلند ہوتی ہے کہ پانی سیم وغیرہ کی شکل میں اوپر تک آجاتا ہے مگر یہاں یار لوگوں نے سطحِ زمین سے دو سو فٹ نیچے تک گاڑیاں چلا رکھی ہیں اور پانی کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی۔

خیر یہ تو اُس طرح کی خبر ہے جس میں سے خبر کا عنصر غائب ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں سو ہم اس قصے کو یہیں چھوڑتے ہوئے صمدانی صاحب کے ساتھ چلتے ہیں۔ ہمارا پہلا پڑاؤ پاکستانی سفارتخانہ تھا جہاں کچھ دیر کمرشل اتاشی اور پروین کے افسر جہانگیر خاں صاحب سے گپ شپ ہوئی۔ اس کے بعد فرسٹ سیکرٹری منصور عالم صاحب کے پاس کچھ دیر بیٹھے۔ انہوں نے فون پر علی ارشد صاحب سفیرِ پاکستان کو ہمارے آنے کی اطلاع دی۔ اُنہوں نے فوراً اپنے کمرے میں بلوا لیا اور کافی پلوائی۔ انگلستان میں مقیم پاکستانیوں کے مسایل اور شکایات کے تذکرے سے گفتگو کا رُخ دیارِ غیر میں قومی تشخص کی تعمیر اور بقا کی طرف مڑ گیا اور بات پاکستان ٹیلی ویژن تک پہنچ گئی کہ وہ لوگ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ کوئی مدد نہیں کرتے بلکہ بی بی سی یا آئی ٹی وی پر دکھانے کے لیے پروگراموں کے اتنے زیادہ پیسے مانگتے ہیں کہ کوئی اس بھاری پتھر کو اُٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ ٹی وی سے میرے تعلق کی وجہ سے شاید وہ مجھے بھی ٹی وی کا آدمی سمجھ رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے اُنہیں بتایا کہ ٹی وی بہت انصاف پسند ہے، جس آنکھ سے اُنہیں دیکھتا ہے اُسی سے مجھے بھی دیکھتا ہے۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ ٹی وی کسی دوسرے نیٹ ورک یا ویڈیو کمپنی کو ہمارے ڈرامے بیچنے پر اور جنرل فیس کا دس فیصد

ادا کر کے ہم سے دائمی حقوق حاصل کر لیتا ہے تو اُن کے ہاتھ سے کافی کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ میں نے اُن کے پیالی میز پر رکھنے کا انتظار کرنے کے بعد بتایا کہ یہ رائلٹی عام طور پر ایک سو روپے سے بھی کم ہوتی ہے !!!

علی ارشد اور منصور عالم چند لمحے ہکے بکے میری طرف دیکھتے رہے۔ پروین نے انہیں بتایا کہ پندرہ بیس برس کی ریاضت اور محنت کے بعد جب کوئی شاعر ٹی وی کے آل پاکستان مشاعرے میں پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اُسے اس کارنامے پر مبلغ تین سو روپے پیش کیے جاتے ہیں نصف جن کے ایک سو پچاس سے بھی کم ہوتے ہیں کیونکہ ٹی وی والے محکمہ انکم ٹیکس کی ہدایت پر ہر چیک سے تین فیصدی وضع کر لیتے ہیں۔

میں نے کہا: "نظیر اکبر آبادی نے کیا اچھا شعر کہا ہے:

حکم حاکم ہے کہ اس محکمۂ عدل کے بیچ
دستِ فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی"

پروین بولی: "آپ کو شاید علم نہ ہو ایک بار کراچی ٹی وی پر نظیر اکبر آبادی کے نام کا چیک کئی مہینے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں پڑا رہا تھا اور ایک بہت سینئر افسر نے اس پر جواب طلبی بھی کی تھی کہ ٹیلنٹ کو اُس کا چیک کیوں نہیں پہنچایا گیا؟"

علی ارشد اور منصور عالم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے انہیں ایک اور واقعہ سنایا:

غالب کی صد سالہ برسی کے دنوں میں پاکستان نیشنل سنٹر کے صدر دفتر سے تمام نیشنل سنٹروں کو ہدایت دی گئی کہ دیگر تقریبات کے ساتھ ساتھ غالب کی زمینوں میں ایک عدد مشاعرے کا بھی اہتمام کریں۔ اس پر ایک ریذیڈنٹ ڈائرکٹر نے جواب لکھا تھا کہ جناب میں نے شاعر تو سارے بک کر لیے ہیں مگر بتایا جائے کہ غالب کی وہ زمینیں کہاں ہیں جن پر مشاعرہ کروانا ہے کیونکہ مجھے تلاش کے باوجود اُن کا سُراغ نہیں مل رہا!"

علی ارشد صاحب نے ہنستے ہوئے کہا: "چلیے اسی بات پر اب یہ بتائیے کہ آپ لوگوں کے اعزاز میں ہم کس دن مشاعرہ کریں!"

طے پایا کہ ۲۱ دسمبر کی شام موزوں رہے گی تاکہ ہم لوگ لندن میں سال کی آخری رات کی تقریبات

بھی دیکھ سکیں۔ وہاں سے نکل کر پھر سب وے میں سوار ہوئے اور مادام تساؤ کے مومی گھر کے قریبی سٹیشن پر اُترے۔ سب وے میں اور سٹیشن پر بہت رش تھا اس لیے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ پروین کے بڑے بیگ میں سے اس کا چھوٹا پرس کب اور کہاں گرا یا نکالا گیا۔ پرس میں 150 ڈالر اور اُس کے محکمے کا شناختی کارڈ بھی تھا۔ کچھ دیر اس نقصان پر افسوس اور پھر اس حسنِ اتفاق پر شکر ادا کیا گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تک ٹکٹ اور پاسپورٹ بھی اسی پرس میں تھے، اگر اقبال ساہی نے وہ لے نہ لیے ہوتے تو اس وقت بہت لمبی مصیبت پڑ جاتی۔ پنجابی میں ایک محاورہ ہے آدمی موت کو دیکھ کر بخار پر راضی ہو جاتا ہے —— غالباً یہ ایسے ہی موقعوں کے لیے وضع کیا گیا ہے!

مادام تساؤ کے اس مومی گھر کا معاملہ کچھ کچھ لاہور کے شاہی قلعے جیسا ہے یعنی ہر آنے والے کے لیے اسے دیکھے بغیر جانا معیوب سی حرکت بھی جاتی ہے اور سچ پوچھیے تو یہ تاثر کچھ اتنا غلط بھی نہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب مومی مجسّمے ہیں نظر بار بار دھوکا کھا جاتی ہے۔ گئے ہوؤں کے ساتھ ساتھ یہاں کچھ ایسے لوگوں کے مجسّمے بھی ہیں جو اپنے اپنے میدانوں میں تاریخ ساز تو ہیں مگر ابھی خود تاریخ کا حصّہ نہیں بنے یعنی ہمارے آپ کے درمیان سانس لے رہے ہیں۔ ان میں کرکٹ کا انگریز کھلاڑی جیف بائیکاٹ، فٹ بال کا برازیلین ہیرو پیلے اور امریکن ٹینس سٹار جان میکنرو بھی شامل ہیں۔ وقت بھی کیسا ظالم ہے کہ آج یہی میکنرو، جو ابھی تیس برس کا بھی نہیں ہُوا، اپنی بہارِ جانفزا دکھا چکنے کے بعد اب ٹینس کے بڑے مقابلوں میں چھوٹے چھوٹے کھلاڑیوں سے شکست کھاتا نظر آتا ہے۔ یہاں ہم نے ایک انتہائی بدمزہ سینڈوچ کھایا اور اس خیال سے مسرّت حاصل کی کہ ہم یہاں مستقل قیام کے لیے نہیں آئے۔

پروین نے برانٹے سسٹرز کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر بنوائی اور اُن کی تحریروں کی تعریف میں انگریزی لٹریچر کی ایک اچھی طالبہ ہونے کے حوالے سے خاصا علمی قسم کا لیکچر جھاڑا۔ میں نے کہا: "مجھے تو یہ جگہ محمد حسین آزاد کے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار کی سی لگ رہی ہے۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ سفید فاموں کا نسلی غرور یہاں بھی انصاف پر حاوی نظر آ رہا ہے۔ تیسری دُنیا کے بہت سے مشاہیر یہاں موجود شخصیات سے بڑے ہیں لیکن انہیں یہاں جگہ نہیں دی گئی۔
صمدانی صاحب اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کے نیچے دھیرے سے مُسکرائے اور میرے کندھے پر ہاتھ

رکھ کر بولے: "بات یہ ہے امجد صاحب کہ غریب قوموں کا بڑا آدمی بھی امیر قوموں کے بڑے آدمی سے ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ یہاں بھی وہی some are more equal والا معاملہ چلتا ہے۔"

میں نے کہا: "چھوڑیے اسے، آئیے برٹش میوزیم چلتے ہیں، سُنا ہے وہاں اُس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں، جنہیں دیکھ کر اقبال چلا اُٹھے تھے: جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا!"

برٹش میوزیم پہنچتے پہنچتے چار بج گئے۔ معلوم ہوا پونے پانچ بجے دروازے بند اور کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ پُورے سفر کے دوران یہ واحد مقام تھا جہاں داخلے کے لیے ٹکٹ نہیں خریدنا پڑا۔ صمدانی صاحب کے تجربے سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ معلوم ہوا پہلی منزل پر اسلامی دُنیا کے نوادرات اور دوسری منزل پر آرٹ کے نمونے ہیں جن میں جاپانی، چینی اور مصری حصے خاصے کی چیزیں ہیں۔ ہم نے جلدی جلدی دو تین بڑے ہالوں کا چکر لگایا، پیٹیوں میں لیٹی ہوئی مصریوں کی ممیاں دیکھیں جن کے قد غیر معمولی طور پر چھوٹے تھے۔ شاید چالیس پچاس صدیوں کے فاصلے نے اُن کی یہ حالت کر دی ہو۔

پروین نے کہا: "ان کی تو یہ حالت پانچ ہزار سال میں ہوئی ہے، یہاں تو لوگ اپنی زندگیوں میں ہی دیو سے بونے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔"

اُسی کمرے میں دو ہزار سال قبل مسیح کے سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کے خوبصورت تراشے ہوئے برتن الماریوں میں رکھے تھے۔ بعض میں تو اس قدر نفاست تھی کہ شفیق الرحمٰن کا مضمون "ٹیکسلا سے پہلے اور ٹیکسلا کے بعد" یاد آ گیا۔ جی چاہا ان الماریوں کو کھول کر ان برتنوں کے پیچھے مہریں چیک کی جائیں، کہیں یہ بھی تو میڈ ان جاپان، کوریا یا تائیوان تو نہیں ہیں!

ابھی میں اسی سوچ میں گُم تھا کہ نظیر اکبر آبادی کا ایک زندۂ جاوید مصرعہ میوزیم کے در و بام پر لہرانے لگا: اب کوچ نقارہ باج چلا، چلنے کی فکر کرو بابا!

لندن کی سردی کینیڈا کے برف زاروں سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اُوپر سے اُس روز تھکن بھی اُس کے ساتھ ساتھ ہڈیوں میں گھر بناتی جا رہی تھی۔ ہم نے صمدانی صاحب کی طرف دیکھا جو یقیناً ہم سے زیادہ تھکے ہوئے تھے مگر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ اس قدر تر و تازہ تھی جیسے ابھی ابھی گھر سے طلوع ہوئے ہیں۔

اگلے روز اُن کے گھر ناشتے کی دعوت تھی جو وقت اور کھانے کی نوعیت کے اعتبار سے کسی صورت لنچ سے کم نہیں تھی۔ بیگم صمدانی نے بیوٹی کورس کر رکھے تھے چنانچہ انہوں نے پروین پر اپنے کمالِ فن کو آزما کر دکھایا۔ پروین کا چہرہ کسی ایسی لڑکی جیسا ہو گیا جس نے ابھی ابھی میٹرک کے امتحان میں اپنی کامیابی کی خبر سُنی ہو۔

دوپہر کو شاہدہ احمد کے گھر کھانے کی دعوت تھی۔ ہم سے اُن کا پتا اور فون نمبر کھو گئے چنانچہ ہم اُن کے گھر اس وقت پہنچے جب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ وہاں دیگر احباب کے علاوہ مشتاق احمد یوسفی اور عاشور کاظمی صاحب سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی اور خُوب گپ شپ رہی۔ ہماری میزبان شاہدہ احمد بہت ہی اچھی اور خوش اخلاق خاتون تھیں اور ہمیں یہ جان کر بے حد دُکھ ہوا کہ وہ ٹانگوں کے کسی انتہائی موذی مرض میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے اُن کے پٹھے سوکھتے جا رہے ہیں اور خدشہ ہے کہ آئندہ دو تین برسوں میں وہ ٹانگوں کی حد تک بالکل معذور ہو جائیں گی۔ دھیان ایک بار پھر اُن سوالوں کی طرف گیا جنہیں زبان پر لانے کا فوری نتیجہ دائرہ اسلام سے خروج کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

رات کا کھانا افتخار عارف کے گھر پر تھا جہاں شہرت بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی جو اسلامیہ کالج کے میرے اُستاد اور ہمارے سینئر شاعر ہیں۔ بہت دل زدہ اور غمگین تھے کہ اس عمر میں اُنہیں جلاوطنی کا دُکھ سہنا پڑ رہا ہے مگر مجبوری یہ تھی کہ اُن کی بیگم فرخندہ بخاری سیاسی وجوہات کی بنا پر پاکستان میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ بی بی سی اُردو سروس کے رضا علی عابدی ملے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُردو سروس کے انچارج ڈیوڈ پیج کو ہمارے آنے کی اطلاع ہو گئی ہے اور کل صُبح ہمیں انٹرویوز کے لیے تکلیف کرنا ہو گی۔

بی بی سی کے 'بُش ہاؤس' کی اُردو سروس کا ماحول بھی کم و بیش وی او اے اور اپنے ریڈیو پاکستان جیسا تھا۔ وہاں راولپنڈی کے نوجوان شاعر شاہد ملک سے ملاقات ہوئی جو تازہ تازہ وہاں آیا تھا۔ انٹرویوز مُجیب صدیقی نے کیے جو سراسر سرسری نوعیت کے تھے۔

پاکستانی سفارتخانے میں مشاعرے کی محفل خاصی دلچسپ تھی۔ سامعین میں خواجہ شاہد حسین بھی نظر آئے۔ نشست فرشی تھی اور سُننے والے شوقین، خُوب لطف رہا۔ سامعین میں چوڑی دار پاجامے سے لے کر ولایتی پائپ تک ہر طرح کے لوگ موجود تھے اس لیے واہ واہ سُبحان اللہ کے ساتھ ساتھ ویل سیڈ

اور ویری گڈ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

۳ر جنوری کی صُبح لندن میں ہمارے قیام کی آخری صُبح تھی۔ ایک مہینہ بائیس دن بعد ہمارا رُخ واپس اپنے وطن کی طرف ہو رہا تھا۔ لندن کی کہر، سردی اور سفر کی تھکن کے اُس پار مجھے لاہور کی چمکتی صُبحیں اور جنوری کا خوبصورت موسم دکھائی دے رہا تھا اور اس پر سُپر امپوز ہوتے ہوئے میرے اپنوں اور پیاروں کے چہرے۔

صابر چوہدری کے گھر کی کھڑکی سے میں نے بارش میں بھیگتے ہوئے لندن کو دیکھا۔ زمان و مکان کے مختلف تصورات میرے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ ایک نظم کی لائنیں جیسے کھڑکی کے شیشے پر اپنے آپ رقم ہونے لگیں۔ ایک ایسی نظم کی لائنیں، جسے بہت دن بعد کسی اور شہر، کسی اور موسم میں مکمل ہونا تھا:

دن رات کے آنے جانے میں
دُنیا کے عجایب خانے میں
کبھی شیشے دھندلے ہوتے ہیں، کبھی منظر صاف نہیں ہوتے

یہ دھندلے شیشے اور یہی نیم روشن اور ناصاف منظر —— زندگی کے سکے کے دونوں طرف شاید یہی کچھ ہے —— یا —— شاید کچھ اور ہے!

۲

ہندوستان میں سات دن

انبالہ

سہارن پور

دہلی

انبالہ

تیرہ مارچ کو بارہ بج کر دس منٹ پر جب ہم انڈین بارڈر کراس کر کے ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچے تو ہماری حالت آج سے ۴۴ سال پہلے یہاں سے گزرنے والے مہاجرین کے قافلوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ میں نے پہلے عطا کی طرف اور پھر ارد گرد پھیلی ہوئی اُن گنت رنگ برنگی پگڑیوں کی طرف دیکھا جن کے نیچے کم و بیش ایک ہی جیسی شکلوں والے بہت سے آدمی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

پاکستانی کرنسی بدلنی ہے؟ امرتسر کے لیے ٹیکسی چاہیے؟ کوئی چیز لائے ہیں؟ (زیرِ لب لہوروں آئے او بادشاہو؟

مختلف آوازوں کے اس ہجوم پر مستزاد ان دو مزدوروں کی بھیک مانگتی ہوئی آنکھیں تھیں جو ہمارا سامان اُٹھا کر لائے تھے اور اس کے قریب یُوں کھڑے تھے جیسے جانے کے لیے راستہ نہ مل رہا ہو۔

"لو بھائی عطاء الحق قاسمی، تم امرتسر کے بہت قصّے سُنایا کرتے ہو، اب تم ہی انھیں سنبھالو۔"

عطاء نے میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا اور مکھن لگایا: "انتظامی معاملات میں تمہارے سلیقے کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔"

مَیں نے رہنمائی کی یہ سندِ توصیف بڑے اطمینان سے وصول پائی اور سب سے قریب کھڑے ٹیکسی والے سے ایسے سرسری لہجے میں پوچھا جیسے یہاں سے میرا روز کا آنا جانا ہو۔

"ہاں جی فیر، ٹھیک ٹھیک کتنے پیسے ہون گے؟" (ہاں جی تو پھر ٹھیک ٹھیک کتنے پیسے ہوں گے؟)

ٹیکسی والے نے میری بے تکلفی سے متاثر ہوئے بغیر بتایا کہ ٹیکسی کا ریٹ مقرر ہے اور

کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ ثبوت کے لیے اُس نے مجھے قریب ہی لگا ہُوا ایک بورڈ پڑھنے کی ہدایت کی اور سامان ڈگی میں رکھنا شروع کر دیا۔ بھیک مانگتی ہُوئی آنکھوں کے ایک جوڑے نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا: "مہاراج کچھ چاۓ پانی ..."

میں نے بتایا کہ ان کی مزدوری ادا کی جا چکی ہے، اور ایک بورڈ پر بڑی وضاحت سے لکھا ہُوا ہے کہ مزدوروں کو براہِ راست ادائیگی نہ کریں۔ اس پر اس نے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف چلا گیا۔

ٹیکسی ہندوستان کی بنی ہُوئی تھی اور یہ بات اگرچہ اس کی حالت سے ظاہر ہو رہی تھی لیکن ہم یہ سوچ کر چپکے بیٹھے رہے کہ ہم نے تو آج تک ایسی موٹر بھی نہیں بنائی۔ ڈرائیور نے تقریباً ٹیک آف کرنے کے انداز میں انجن سٹارٹ کیا۔ ہم دونوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔ ابھی تین دِن قبل ہم سرگودھا جاتے ہُوئے ویگن اور ٹرک کے ایک اِنتہائی خوفناک تصادم میں مُعجزانہ طور پر بچ چکے تھے۔ لیکن اِس ٹیکسی والے کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ قُدرت اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کا ارادہ کر رہی ہے۔ اس سے پیشتر کہ پہیے سڑک سے بلند ہوتے ایک چیختی ہُوئی بریک جمہُوریّت میں ایمرجنسی کی طرح لگی اور اگلا دروازہ کھول کر ایک فوجی افسر گاڑی میں داخل ہُوا۔ ٹیکسی دوبارہ مائل بہ پرواز ہُوئی۔ سڑک کے چاروں طرف ہرے بھرے کھیت اور ٹیکسی کے اندر ایک سنگین خاموشی تھی جو دَم بدم گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ میں نے عطار کی طرف تذبذب بھری نظروں سے دیکھا، کہ کہیں اس آرمی آفیسر کی آمد اس کے گزشتہ سفر نامۂ ہندوستان (مسافتیں) سے تو متعلق نہیں جس میں اس نے ہندوستانی مُسلمانوں کی حالتِ زار کا بہُت دلدوز نقشہ کھینچا تھا اور جس کے نتیجے میں تین سال قبل اسے ہندوستانی حکومت نے ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی اُلجھن بتا رہی تھی کہ وہ بھی یہی سوچ رہا ہے۔

خاموشی مزید خاموشی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ہرچہ بادا باد کے انداز میں نووارد کو مُخاطب کر کے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اُس نے مُڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مُسکراتے

ہُوئے بتایا کہ اُس کا نام ایشور سنگھ ہے اور وہ کسٹم کے محکمے کا افسر ہے۔ ہم نے دوبارہ اس کی وردی پر نظر ڈالی جو رنگ اور تراش خراش میں بالکل فوجی لگتی تھی اور پہلی نظر میں کوئی بھی اِس سے دھوکا کھا سکتا تھا۔ عطاء نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور آدھے سے زیادہ سگریٹ کھڑکی سے باہر اُچھال دیا۔ خطرناک پاکستانی ادیبوں کی گرفتاری پر مامور آرمی کا کمانڈو چند لمحوں کے اندر اندر ایک مفت خورے کی شکل اختیار کر چکا تھا عطاء نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”اپنے لاہور میں پولیسے بھی اسی طرح ٹیکسی رکشوں میں لفٹ لیتے ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کسٹم آفیسر ایشور سنگھ سے پوچھنے لگا کہ امرتسر سے فرنٹیر میل ایک بجے ہی چلتی ہے نا! ایشور سنگھ نے گھڑی دیکھتے ہُوئے بڑے اطمینان سے کہا:

”ہاں بس ابھی نکلی ہی ہو گی۔“

”لیکن ابھی تو بارہ پینتیس ہُوئے ہیں؟“ مَیں نے حیرت سے کہا۔

”آپ کے اور ہمارے ٹائم میں آدھے گھنٹے کا فرق بھی تو ہے نا۔“ ایشور سنگھ مُسکراتے ہُوئے بولا۔

”یعنی جس وقت آپ کے بارہ بجتے ہیں ہمارے یہاں ساڑھے گیارہ ہوتے ہیں۔“ عطاء نے شرارت سے کہا۔

”جی ہاں۔“ ایشور سنگھ نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ”اور جب آپ کے بارہ بجتے ہیں ہمارے یہاں ساڑھے بارہ کا وقت ہوتا ہے۔“

ہم تینوں ہنس پڑے ٹیکسی والے نے مُڑ کر ہماری طرف دیکھا اور ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اب سامنے سے آتی ہُوئی بسیں اُڑن طشتری کی طرح گزر رہی تھیں اور ہم ان شعروں کے مصرعوں کو وزن میں یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن میں غریب الوطنی کی موت کا مضمون باندھا گیا ہے۔

ٹیکسی امرتسر کے بارونق بازاروں سے گزرتی ہُوئی ایک پُل پر پہنچی جہاں بہت سے

پولیس کے سپاہی سڑک کے ایک طرف خواہ مخواہ کھڑے تھے۔ ٹیکسی والے نے انھیں مخاطب کر کے بآوازِ بلند کچھ مہمل قسم کے جملے کہے۔ جواباً ان میں سے بھی ایک نوجوان قسم کے سپاہی نے اسی نوع کے جذبات کا اظہار کیا اور دونوں ہاتھ ہلاتا ہوا ٹیکسی کی طرف بڑھنے لگا۔ ہم نے مشرقی پنجاب میں گڑبڑ کی خبریں تو سُنی تھیں مگر یہ قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ سول نافرمانی اور راست اقدام تک پہنچ چکا ہے۔ اس سے پیشتر کہ ہم ڈرائیور کو بھاگ نکلنے کا مشورہ دیتے سپاہی ہمارے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے بڑے سٹائل سے ڈرائیور کی طرف کی کھڑکی پر ہاتھ رکھا اور پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ دونوں نے ہنسی کے درمیانی وقفوں میں جو چند باتیں کیں ان میں سے صرف ایک جملہ ہماری سمجھ میں آیا جو کچھ یوں تھا :

"ایہوای پُل سی نا جتھے آپاں پھڑے گئے ساں ؟ اَج گرو دی کرپا نال آپاں اُتھے ای کھڑے آں۔" ٹیکسی دوبارہ چلنے پر ڈرائیور نے ہمیں بتایا کہ یہ سپاہی اُس کا بڑا بھائی تھا اور اسے یاد کرا رہا تھا کہ ایک دفعہ (اس کے سپاہی بننے سے پہلے) ان دونوں کا یہیں چالان ہُوا تھا اور آج وہ گرو کی مہربانی سے اسی چوک میں کھڑا دوسروں کے چالان کر رہا ہے۔

ہم نے بمشکل ہنسی روکتے ہُوئے اِس حُسنِ اتّفاق کی داد دی۔ ٹیکسی بس اسٹینڈ میں داخل ہُوئی اور ہم جیسے لاہور کے لاری اڈے میں آ گئے۔ وُہی گندگی، وُہی ہجوم، ڈیزل کی بدبُو اور بے معنی ہارن۔ کسی بھی بس کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ آ رہی ہے یا جا رہی ہے۔ ایک قلی نُما مزدُور نے ہمیں اِطلاع دی کہ انبالے کی ڈائریکٹ بس چار بجے ملے گی۔ اس کے لہجے کے وثوق سے ہم بے حد متاثر ہُوئے اور پوچھا کہ لُدھیانے کی بس کون سی ہے اور ٹکٹ کہاں سے ملے گا؟ اُس نے ایک ایسی سمت میں اشارہ کیا جہاں بہت سی بسیں نیم کھڑی تھیں اور کہا کہ آئیے آپ کو ٹکٹ دِلوا دُوں۔ ٹکٹ بیچنے والے ایک فٹ پاتھ نما برآمدے میں لکڑی کی چھوٹی چھوٹی میزیں سامنے رکھے سودیشی ریل والے بکنگ کلرک کی طرح بیٹھے تھے۔ میں نے لُدھیانے کے دو ٹکٹ مانگے اور یُوں ہی پوچھ لیا کہ کیا انبالے کی ڈائریکٹ بس چار بجے سے پہلے بھی چلتی ہے؟

بکنگ کلرک نے بڑے اطمینان سے کہا: "جس بس میں آپ جا رہے ہیں وہ ڈائریکٹ انبالے ہی کی بس ہے اور کوئی دس منٹ میں روانہ ہو رہی ہے۔ میں نے مُڑ کر قُلی کی طرف دیکھا جو بڑی بے شرمی سے آنکھیں نکالے کھڑا تھا اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ سُنّی مُسلمان ہونا اپنی جگہ لیکن اب کسی سُنی سُنائی بات پر اعتبار نہیں کرنا۔ امرتسر سے انبالے کا فاصلہ معلوم کرنا چاہا تو چار مُختلف جوابات میں مجمُوعی طور پر تقریباً دو سَو کلومیٹر کا فرق تھا۔ بہت سی ضرب جمع تفریق کے بعد اوسط ایک سو ساٹھ میل کے لگ بھگ نکلی۔ وطنِ عزیز میں بس والے (اگر منزل پر پہنچ جائیں تو) یہ فاصلہ کم و بیش ساڑھے چار گھنٹے میں طے کراتے ہیں۔ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ یہ بس آٹھ بجے انبالے پہنچے گی۔ دِل کو اطمینان سا ہُوا کہ چلو "موت کا منظر، مرنے کے بعد کیا ہوگا" سے تو نجات ملے گی۔ بکنگ کلرک نے بیالیس رُوپے کے عوض تقریباً آٹھ آنے کی ردی میرے ہاتھ میں تھما دی۔ خُدا جھُوٹ نہ بُلوائے تو کُل چودہ ٹکٹیں تھیں۔ پتا چلا کہ ہر سٹاپ کی علیحدہ علیحدہ ٹکٹ کاٹی جاتی ہے۔ سلیقے، تنظیم اور احتیاط کا یہ مُظاہرہ دیکھ کر سکھّوں کے بارے میں مشہُور کیے گئے لطیفوں پر بے اعتمادی سی پیدا ہو گئی۔ بس کے اندر کا منظر انتظار حسین کے افسانوں جیسا تھا۔ یعنی سب کے سب مُسافر ایک دُوسرے کی طرف سے مشکوک نظر آ رہے تھے۔ عطاد تو خیر پتلُون قمیض میں تھا اس لیے اوپرا نہیں لگ رہا تھا لیکن میری شلوار قمیض سب کی نظروں میں آ گئی۔ میں نے بے شمار کنکھیوں سے بچنے کے لیے سیٹ پر بیٹھتے ہی آنکھیں بند کر لیں مگر دُوسرے ہی لمحے عطاد نے میرا شانہ ہلایا:

"کچھ کھا نہ لیں یار؟ بھُوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔"

"بھُوک تو مجھے بھی لگ رہی تھی لیکن ایک تو دن بھر کی tension اور سفر سے طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی تھی اور دُوسرے یہ خیال بھی ذہن کے کسی گوشے میں تھا کہ حرام حلال کا پتا کیسے چلایا جائے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ فی الحال کچھ پھل وغیرہ کھا کر ٹائم پاس کرتے ہیں، اِس کے بعد دیکھا جائے گا۔ بس روانہ ہُوئی اور شہر سے نکلنے سے قبل

ہی فرّاٹے بھرنے لگی۔ میں نے عطاء کو بتایا کہ یہ خصوصی رفتار غالباً ہمارے اعزاز میں ہے کیونکہ میں نے ڈرائیور کو بتایا تھا کہ ہمیں جلدی انبالے پہنچنا ہے۔

"بہتر ہوتا اگر ہم اس پر یہ بھی واضح کر دیتے کہ ہم وہاں زندہ پہنچنا چاہتے ہیں"۔ عطاء نے یہ کہتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ اُسے پتا ہے کہ میں اس کی چین سموکنگ سے بہت چڑتا ہوں اس لیے اکثر سفر کے دَوران وہ خصوصی اہتمام سے سگریٹ نکالا کرتا ہے چنانچہ وہاں بھی اس نے بڑے سٹائل سے سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں دبا کر حسبِ معمول جس جیب میں لائٹر رکھا تھا اُسے چھوڑ کے باقی سب جیبیں ٹٹولنے لگا۔ لیکن اِس بار میری باری تھی۔

"مجھے افسوس ہے پیارے مگر آئندہ چھ گھنٹے تم سگریٹ نہیں پی سکو گے۔"

عطاء نے مکھّی اُڑانے کے انداز میں ہاتھ ہلایا اور کہا کہ تم آدھے سِکھ ہو۔ میں نے کہا: "میں تو آدھا ہوں لیکن تمہارے اِردگرد والے پُورے ہیں اور اِسی لیے اُنھوں نے بس کے اندر باقاعدہ سگریٹ نہ پینے کا اِعلان لکھ رکھا ہے۔" اِعلان کا پڑھنا تھا کہ عطاء کی ساری شگفتگی ایک پَل میں ہوا ہو گئی۔ چھ گھنٹے کے لیے سگریٹ کی مناہی اس کے لیے چھ سال قید با مشقّت سے کم نہ تھی۔ رہی سہی کسر اس موضوع پر میری جُملے بازی نے پُوری کر دی۔

ہمارے دائیں جانب کی نشست پر ایک صاحب مسلسل اپنے انگوٹھے کو عجیب و غریب زاویوں پر گھما رہے تھے۔ اُن کی اِس فنّی ریاضت میں صِرف چند لمحوں کے لیے اس وقت خلل آیا جب جالندھر سے کچھ پہلے ایک سٹاپ سے چند اُستانی نما خواتین بس میں سوار ہُوئیں۔ کوئی سیٹ خالی نہیں تھی مگر ہم یہ دیکھ کر بہت حیران ہُوئے کہ نہ کسی نے ان کے لیے سیٹ خالی کی اور نہ ہی ان کی آنکھوں میں اس کی توقع یا چہروں پر تکدّر دکھائی دیا۔ ہم دونوں اپنی جگہوں پر ذرا سا کسمسائے کہ اگر وہ ہماری طرف دیکھیں تو کچھ شولری کا مظاہرہ کیا جائے مگر وہ سیٹوں کے درمیان اس

بے تکلفی سے کھڑی باتیں کرتی رہیں جیسے اپنے سٹاف رُوم میں بیٹھی ہوں۔ انگوٹھے والے صاحب دوبارہ اپنے کام میں لگ چُکے تھے۔

جالندھر میں بس کا سٹاپ دس منٹ کا تھا۔ عطاء کہیں سے نہایت بدمزہ پُوریاں نما کوئی چیز لے آیا تھا اور چنوں کا دونا مجھے پکڑا کر کھڑکی کے قریب کھڑا کسی مل کی چمنی کی طرح دھُواں نکال رہا تھا۔ بس چلی تو اُستانیاں اور انگوٹھے والے صاحب کے سمیت بہت سی سواریاں بدل چکی تھیں۔ ہم سے اگلی سیٹ پر دو سکھ نوجوان آ گئے تھے جو اپنے لباس اور انداز و اطوار سے پڑھے لکھے اور نسبتاً خوش حال نظر آتے تھے۔ میرے ڈرامے "وارث" کی مشرقی پنجاب میں مقبولیت کا اخبارات میں بہت ذکر ہُوا تھا۔ "اپنی بات" میں بے شمار خط بھی آتے تھے، اور خود مجھ سے بھی اُدھر سے آنے والے کئی لوگ بڑے مداحانہ انداز میں مل چکے تھے اس لیے میں نے بڑے فاتحانہ انداز میں عطاء کی طرف دیکھ کر ٹی وی کی بات چھیڑی۔ بات ہندوستانی پروگراموں سے ہوتی ہُوئی پاکستان ٹی وی کے پروگراموں کے اعلیٰ معیار تک پہنچی تو میں ذہنی طور پر "وارث" کا قصیدہ سُننے کے لیے بالکل تیار ہو چکا تھا مگر چند لمحوں بعد یہ اشتیاق پریشانی میں ڈھلنے لگا کیونکہ وہ دونوں گھوم پھر کر عمومی باتیں کر رہے تھے اور عطاء کی نظروں میں تبسم کی کرنیں لشکارے مار رہی تھیں۔ تنگ آ کر مَیں نے خُود ہی پُوچھا:

"ہمارا ڈراما 'وارث' تو آپ نے دیکھا ہو گا؟"

"بارش؟"

"نہیں جناب 'وارث'... وہ جو یہاں بہت مقبول ہُوا ہے۔ جس میں وہ چوہدری حشمت تھا۔ وہ مونچھوں والا حشمت؟" "ہاں کچھ تھا تو ایسا... میں نے دیکھا نہیں سُنا ہے اس کے بارے میں"۔ عطاء کی آنکھیں زور زور سے ہنسنے لگیں۔ اُس نے بڑی ظالمانہ سنجیدگی سے میرا تعارف کرایا: "یہ اس کے رائٹر ہیں — امجد اسلام امجد!"

"امزد ... کیا بتایا آپ نے ؟"

میں نے جلدی سے انگریزی کا باتصویر رسالہ، جو جالندھر سے خریدا گیا تھا، کھول لیا جو بظاہر ایک سوسائٹی میگزین تھا مگر جس میں شائع شدہ تمام تصویریں انتہائی پرائیویٹ تھیں۔

جالندھر کے بعد بس کا اگلا بڑا اسٹاپ لُدھیانہ تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان حفیظ جالندھری اور ساحر لُدھیانوی بہت یاد آئے۔ اندھیرا آہستہ آہستہ اردگرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں اُتر رہا تھا اور ہم سے تھوڑے فاصلے پر ایک ایسی فربہ اندام خاتون آ بیٹھی تھیں جن کی ساڑھی دیکھ کر ہندوستان میں کپڑے کی قلت کا شدت سے اندازہ ہوتا تھا۔ گلزار وفا چودھری نے کشور ناہید کے خاکے میں لکھا ہے کہ وہ ساڑھی اِس طرح باندھتی ہیں کہ 'بساطِ عجز' میں جو کچھ ہے وہ سامنے آجاتا ہے مگر اِس خاتون کے مقابلے میں ہمیں کشور کی ساڑھی عرب کی عبا محسوس ہو رہی تھی۔

اِس بے پایاں جُثے اور نصف صدی پُرانے چہرے کے باوجود خاتون موصوف بڑی زندہ دل اور بیدار نظر دکھائی پڑتی تھیں کیونکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ایسی غلط انداز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتی تھیں کہ ہم مجبور ہو کر ایک دُوسرے کی بغلیں جھانکنے لگتے تھے۔

ہاں یاد آیا۔ یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ جس سفر کی رُوداد لکھ رہا ہوں یہ کس سلسلے میں کیا گیا تھا۔ دراصل ہم دونوں انبالہ میں ایک اِنڈو پاک مُشاعرے میں شرکت کے لیے جا رہے تھے جو 'شامِ بہار' ٹرسٹ کی طرف سے ہر سال اسی موسم میں مُنعقد کیا جاتا ہے۔ اِس ٹرسٹ کے چیئرمین راجندر ملہوترہ صاحب چند ماہ قبل پاکستان آئے تھے اور ہم لوگ کو اس میں مدعُو کر گئے تھے۔ مدعو تو انھوں نے اور بھی بہت سے شعراء کو کیا تھا مگر ویزے کے حصُول میں اتنی بہت سی دُشواریاں پیش آئی تھیں کہ ہمیں کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ ہمارے علاوہ اِس میں اور کون کون شرکت کر رہا ہے۔ یہ تو انبالہ پہنچنے پر پتا چلا کہ راولپنڈی سے سیّد ضمیر جعفری اور سُلطان رُشک، جھنگ سے رفعت سُلطان، ساہیوال سے بسمل صابری اور جہلم سے جوگی جہلمی، امداد ہمدانی، تنویر سپرا اور اقبال کوثر بھی پُہنچ چکے

ہیں۔ قتیل شفائی بھی، جو چند دِن پہلے دلّی کے ایک مُشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے، وہاں پُہنچے ہُوے تھے۔ ہمیں سیدھا راجندر ملہوترہ صاحب کے گھر پہنچایا گیا جہاں جگن ناتھ آزاد اپنی بھرپُور محبّت اور جپھیوں کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ معانقوں اور مصافحوں کے طویل دَور میں جو چند نام ہمارے کانوں میں پڑے ان میں مخمُور سعیدی، سبودھ ساقی، راشد ممتاز، اظہر عنائتی، رفعت سروش اور ساحر ہوشیارپوری تو معرُوف تھے باقی حضرات میں سے شاعروں کا پتا مُشاعرے میں جا کر چلا۔ ملہوترہ صاحب کے گھر پر کنہیا لال پوسوال سے بھی مُلاقات ہُوئی۔ پوسوال صاحب کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ صُوبہ ہریانہ کے ہوم منسٹر ہیں اور گُزشتہ بائیس برس سے مسلسل الیکشن جیتتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن اِن اطلاعات سے پہلے ہی اپنے حُسنِ اخلاق، جامہ زیبی اور سخن فہمی کی وجہ سے وہ ہم پر ایک اچھا تاثر قائم کرچکے تھے۔ بات بات پر اساتذہ کے ایسے باموقع شعر (اچھے والے) پڑھتے تھے کہ ہمیں بے اختیار اپنے اورینٹل کالج کے اُستاد ڈاکٹر ناظر حسن زیدی یاد آجاتے تھے۔

مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو اس کا اہتمام دیدنی تھا۔ پنڈال جس قدر بڑا تھا اُس سے زیادہ خوبصُورت تھا اور ہجوم کا یہ عالم کہ دُور تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ شروع کی دس پندرہ قطاریں افسران کے لیے مخصوص تھیں۔ اِس کا علم ہمیں تین وجوہات کی بُنیاد پر ہوا: ایک تو یہ کہ وہاں قیمتی ساڑھیوں کی بھرمار تھی، دوسرے یہ کہ وہ لوگ مُنہ سے زیادہ چشم و ابرُو اور سر کی جُنبشِ خفی سے داد دیتے تھے اور تیسرے یہ کہ شروع کی قطاریں ہوتی ہی افسروں کے لیے ہیں۔ صدرِ مُشاعرہ کے۔ ایل۔ پوسوال تھے۔ آغاز میں انبالہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر دوشی وال نے ایک لکھا ہُوا سپاسنامہ بڑی تگ و دو کے بعد پڑھا، جس کے بعد مسٹر پوسوال نے ایک ایسی دلچسپ حرکت کی کہ ہمیں یقین ہوگیا کہ اس شخص کو الیکشن میں کوئی نہیں ہرا سکتا۔ ہُوا یوں کہ سٹیج پر تقریباً تیس پینتیس شعراء تھے یعنی کم سے کم تین گھنٹے صاحبِ صدر کو دوزانو یا چوکڑی مار کر بیٹھنا تھا۔ مسٹر پوسوال نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ مجھے شعر کا مزہ شاعر کے رُوبرُو بیٹھ کر سُننے میں آتا ہے اور سٹیج پر یہ ممکن نہیں۔

اِس لیے مَیں سامنے کی صف میں بیٹھوں گا اور یُوں اُنھوں نے سارا مُشاعرہ مزے سے صوفے پر بیٹھ کر سُنا۔

چُونکہ کسی ہندوستانی مُشاعرے میں شرکت کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا اِس لیے بہُت سی باتوں پر سخت حیرت ہو رہی تھی۔ ایک تو یہ کہ دو تین کو چھوڑ کر سب کے سب ہندوستانی شاعروں نے ترنّم سے کلام سُنایا اور دُوسرے یہ کہ وہ اپنے بھائی صہبا اختر، دِلاور فِگار، ساقی فارُوقی اور صلاحُ الدّین محمُود کی طرح باقاعدہ پَرفارم کرتے تھے۔ تیسری حیرت کی بات یہ تھی کہ ہلکے پھُلکے اور فَٹ سمجھ میں آجانے والے شعروں پر داد نسبتاً زیادہ ملتی تھی۔ ان سب کا سبب ہمیں اُس وقت معلُوم ہُوا جب یہ بتایا گیا کہ مشاعرے کے تین چار ہزار سامعین میں سے بمشکل پچاس لوگ ایسے تھے جو اردُو لکھ یا پڑھ سکتے تھے۔ گویا ان کے لیے مُشاعرہ ایک طرح کا ورائٹی پروگرام بھی تھا جس کا خیال شعرا کو رکھنا پڑتا تھا۔ مُشاعرہ دس بجے رات سے ساڑھے تین بجے صُبح تک چلا۔ ایک ایسے علاقے میں، جہاں سرکاری طور پر اردُو کی حیثیت پنجابی، ہندی اور انگریزی کے بعد چوتھے نمبر ہے، لوگوں کا یہ ذوق اِس بات کا غمّاز تھا کہ اردُو ہی صحیح معنوں میں اس برّصغیر کی لنگوا فرینکا ہے۔

میں اور عطا چُونکہ طویل سفر سے بہُت تھکے ہُوئے تھے اِس لیے ملہوترہ صاحب نے مُشاعرہ ختم ہوتے ہی ہمیں ایک ڈرائیور کے ساتھ پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس میں بھجوا دیا۔ وہاں پہنچے تو چاروں طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ ڈرائیور چوکیدار کو ڈھونڈنے چلا گیا۔ گھڑی دیکھی تو چار بج رہے تھے۔ سردی اور تھکن کی وجہ سے بُرا حال تھا اور جی چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی کمبل ملے تو وہیں ڈھیر ہو جائیں اور شاید میں کچھ دیر کے لیے سو بھی گیا تھا کیونکہ ڈرائیور کی چوکیدار کو پُکارتی ہُوئی آواز مجھے یُوں سنائی دے رہی تھی جیسے بہُت دُور کہیں سمندر پار سے آرہی ہو۔ پتا نہیں کتنی دیر بعد اُس نے آکر بتایا کہ چوکیدار تو نہیں ملا کیونکہ وہ چھٹی پر ہے البتہ اس کا ایک نائب مِلا ہے۔ ہم نے کہا: "بھائی ہم نے چوکیدار کے آٹوگراف نہیں لینے، جو بھی ہے تم کمرہ کھلوا دو۔" وہ ہمیں ایک

نیم تاریک برآمدے کی طرف لے گیا جہاں ایک آدمی کمبل لپیٹے چُندھیائی ہُوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیور اور اس آدمی میں کچھ مکالموں کا تبادلہ ہُوا جو ہم لہجے کی غرابت اور اپنی تھکن کی وجہ سے ٹھیک طَور پر سُن نہ سکے۔ بہرحال اِن مذاکرات کے نتیجے میں اِس آدمی نے ایک کمرے کی گھنٹی بجائی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرے کا دروازہ کُھلا۔ ایک سایہ نمودار ہُوا۔ کمبل والے آدمی نے ممیاتی ہُوئی آواز میں اس سے کوئی بات کی جس پر سائے نے بڑے غصّے میں کچھ کہا اور کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ ہم حیران کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! اب جو ہم نے اِس سارے سین کی تفصیل پُوچھی تو ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بَل پڑ گئے۔ ساری تھکن اور سُستی ہوا ہو گئی۔ کمبل والا آدمی ایک سرکاری ڈرائیور تھا جو اپنے صاحب کے ساتھ آیا ہُوا تھا۔ صاحب کمرے میں سو رہا تھا اور وہ برآمدے میں۔ اب پتا نہیں کیسے ہمارے والے ڈرائیور نے اسے چوکیدار کا نائب سمجھ لیا اور نامعلوم اُس نے آگے سے کیا سمجھا کہ اپنے صاحب کو رات کے چار بجے جگا کر پُوچھنے لگا کہ ان لوگوں کا (یعنی ہمارا) کمرہ کون سا ہے؟

اگلے دن صبح آنکھ کھلی تو صبح کو گزرے بہت دیر ہو چکی تھی۔ کمرے میں عطاء کے خرّاٹے دندنا رہے تھے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ میری آنکھ انھی غیر انسانی آوازوں سے کھلی ہے لیکن نیند کا غبار ذرا کم ہُوا تو کچھ اس قسم کی آوازیں سُنائی دیں جیسی امریکی فلموں میں جرمن سپاہیوں کے بُوٹوں سے نکلا کرتی ہیں۔ پھر اس میں ہتھیاروں کی آوازیں اور فوجی پریڈ کے کاشن بھی شامل ہو گئے۔ میں گھبرا کر اُٹھا تو ہمارے کمرے کے سامنے اور برآمدے میں آٹھ دس ہتھیار بند سپاہی اور قدرے فاصلے پر کچھ کاریں اور جیپیں کھڑی تھیں۔ ماحول میں بڑی سنگین سی خاموشی تھی۔ میں نے عطاء کو جگا کر یہ منظر دکھایا۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ یہ سب کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ ایک دَم باہر کچھ شور سا ہُوا اور کاروں کے دروازے کھٹا کھٹ بند ہونے لگے۔ ہم بھاگ کر دروازے پر آئے تو کاریں اور جیپیں مین گیٹ سے نکل رہی تھیں اور سپاہی اٹن شن کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایک میلا سا نوجوان پتا نہیں کس طرف سے نکل کر آیا اور نمسکار کر کے پوچھنے لگا: "ناشتہ لے آؤں"۔ ہم نے کہا پہلے

یہ بتاؤ کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟ پتا چلا کہ کوئی منسٹر صاحب کسی دَورے پر آئے ہُوے تھے اور یہ سب شور وغوغا اور دہشت گردی انھی سے متعلّق تھی۔

تھوڑی دیر بعد راجندر ملہوترہ آئے اور بتایا کہ ہمیں انبالہ کے ڈی آئی جی کنور رنبیر سنگھ یادو کے پاس جانا ہے کیونکہ ابھی پولیس اسٹیشن پر ہماری آمد کی باقاعدہ رپورٹ ہونی ہے اور سہارنپور کے مشاعرے میں شرکت کے لیے ہمارے ویزے کا انتظام بھی رہتا ہے۔ سہارنپور کا مُشاعرہ اگلے دن یعنی ۵ ارمارچ کو ہونا تھا اور اس کے لیے سبُودھ بہاری لال ساقی نے گزشتہ رات ہی ہم سے وعدہ لے لیا تھا۔ ملہوترہ صاحب نے بتایا کہ یادو صاحب اور ان کی بیگم شعروشاعری سے بہت دِلچسپی رکھتے ہیں اور انھوں نے یہ محبت بھری شرط عاید کی ہے کہ ہم ان کے ساتھ چائے پئیں اور اپنا کلام ریکارڈ کرائیں، تو یہ دونوں کام ان کے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہو سکتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی ضمانت پر اس شرط کو تسلیم کر چکے ہیں۔ انھوں نے یہ بات اتنے بھولے اور دِلچسپ انداز میں کہی کہ مجھے بے اختیار عطاء کے سفرنامۂ امریکہ (شوقِ آوارگی) کا وہ واقعہ یاد آگیا جب اس سے کسی لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا تھا کہ کیا سچ مچ تمھارے ملک میں شادیاں دُلہا دُلہن کے بجائے اُن کے والدین کی مرضی سے طے ہوتی ہیں اور لڑکا لڑکی شادی سے پہلے ایک دُوسرے کے صُورت آشنا بھی نہیں ہوتے؟ تو عطاء نے اُسے بتایا تھا کہ یہ بات صرف ایک حد تک دُرست ہے یعنی شادیاں طے تو دُلہا دُلہن کے والدین ہی کرتے ہیں مگر طے کرنے سے پہلے وہ لڑکے یا لڑکی سے اس کی رائے ضرور لیتے ہیں۔ اگر وہ ہاں کر دیں تو یہ شادی کر دی جاتی ہے لیکن اگر انکار کر دیں تو ....

"اِنکار کر دیں تو کیا ہوتا ہے؟" لڑکی نے اِشتیاق سے پُوچھا۔

"پھر بھی کر دیتے ہیں۔" عطاء نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

راجندر ملہوترہ ذہین آدمی تھے۔ میرے یہ واقعہ سُنانے پر پھڑک اُٹھے۔ کہنے لگے:

"ہاں کچھ ایسی ہی صُورتِ حال ہے۔ میں نے آپ سے پُوچھے بغیر وعدہ بھی اِسی لیے کر لیا تھا کہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔"

ملہوترہ صاحب کی گاڑی میں ہم دُوسرے ریسٹ ہاؤس پہنچے جہاں ہمارے باقی ساتھی ٹھہرے ہُوئے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے آثارِ قدیمہ بکھرے پڑے تھے اور ایک کُرسی پر مخمُور سعیدی تقریباً اسی پوز میں بیٹھے ہُوئے تھے جس میں ہم نے ان کو گزشتہ رات آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُنھوں نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر پھر اپنی جسمانی حالت اور کششِ ثقل میں مطابقت نہ پاتے ہُوئے اسے راستے ہی میں چھوڑ دیا۔ ان کو دیکھ کر غالب کا یہ شعر یاد آرہا تھا:

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صُورت خانۂ خمیازہ تھا

ایک طرف بسمل صابری غالباً کوئی انٹرویو دے رہی تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر جہلم کی پارٹی یعنی جوگی جہلمی، امداد ہمدانی، تنویر سپرا اور اقبال کوثر شیو، ناشتے اور لباس کی تبدیلی سے فارغ ہو کر چلنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ قتیل شفائی دِلّی سے اپنے ساتھ آئے ہُوئے ایک صاحب کو (جو آخر تک ان کے ساتھ رہے) اپنے بُوٹ دکھا کر کہہ رہے تھے کہ یہ کسی سے بدل گئے ہیں۔ ساتھ والے کمرے سے ضمیر جعفری صاحب اپنے دانتوں کے سیٹ کی عدم موجودگی کے باوجود اُسی مُحبت بھری اور خُوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ نمُودار ہُوئے جو ان کی شخصیت کا حِصّہ ہے اور اعلان کیا کہ وہ سہارنپُور کے مُشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے کیونکہ انھیں دِلّی پہنچنا ہے، پتا چلا کہ سُلطان رَشک اور رفعت سُلطان بھی ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اندر کمرے میں سُلطان رَشک ناقابلِ تحریر لطیفوں کی ایک انگریزی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے جس کے بارے میں اُنھوں نے ہمیں بتایا کہ بہت مہنگی ہے۔

وہاں پر موجود لوگوں کی اَوسط عُمر نکالی جائے تو وہ کسی صُورت میں ۴۵ سے کم نہیں بنتی تھی لیکن ماحول بالکل کالج کے ہوسٹل جیسا تھا۔ وطن سے دُور اجنبی در و دیوار کے درمیان آشنا چہروں کا یہ چھوٹا سا ہجُوم مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ راجندر ملہوترہ کئی سال سے مُشاعرے کرا رہے ہیں اِس لیے اُن کے واسطے شاعروں کا یہ غیر رسمی پہلُو نیا تو نہیں تھا لیکن صاف معلوم

ہو رہا تھا کہ عُمروں کے فرق کے باوجُود ہم سب کی آپس کی بے تکلّفی اور خوش دلی پر مبنی جُملے بازی یقیناً ان کے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔

یادو صاحب کے گھر پہنچے تو وہ اور ان کی بیگم مدھو ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یادو ہاکی کے انٹرنیشنل کھلاڑی رہ چکے ہیں اور ان کی بیگم سنسکرت میں ایم اے تھیں۔ میں نے جب اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ان کے دونوں بچّوں کی عُمریں اٹھارہ اور بیس سال ہیں جب کہ وہ خوُد ابھی بالکل جوان لگتے ہیں تو عطاء نے میرے کان میں چُپکے سے کہا: "اِتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ یہ لوگ یُوسُف کامران اور کشور ناہید سے زیادہ جوان تو نہیں۔" دیکارڈنگ کا مرحلہ شروع ہوا تو رفعت سُلطان کو اپنے علاوہ ہر شاعر کے پڑھنے کے دَوران کھانسی آئی۔ چائے آئی تو اقبال کوثر یہ کہہ کر پھنس گئے کہ وہ ٹھنڈا پیئیں گے۔ ٹھنڈا منگوانے کے لیے آدمی بھجوایا گیا اور ہم سب چائے سے فارغ ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا بے چارے اقبال کوثر کی خجالت بڑھتی گئی۔ ایک طرف انھیں یہ احساس تھا کہ ہم سب ان کے ٹھنڈے کی وجہ سے کھانے سے لیٹ ہو رہے ہیں، دوسری طرف میزبانوں کا خیال تھا کہ بس چند لمحے اور۔ اس وقت سے لے کر واپسی تک ٹھنڈے کی یہ فرمائش ایک مستقل مذاق بنی رہی اور ہم سب اقبال کوثر کی معصوم وضاحتوں کا مزہ لیتے رہے۔ سٹینڈرڈ ہوٹل میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہُوئے تو راجندر ملھوترہ صاحب نے ہمیں بتایا کہ مسٹر پوسوال نے عطاء، بسمل صابری اور مجھ کو رات کے کھانے پر پنجوڑ آنے کی دعوت دی ہے جو انبالہ سے تقریباً پچاس میل دُور ہے اور ساتھ ہی یہ لالچ بھی دیا کہ راستے میں ہم چندی گڑھ بھی دیکھ سکیں گے جو پنجاب ہی نہیں بلکہ پُورے ہندوستان کا بُہت ہی خوبصُورت شہر ہے اور وہاں کا Rock Garden خاص طَور پر دیکھنے کی چیز ہے۔ چُونکہ یہاں بھی ہماری نارضامندی سے طے شدہ پروگرام میں کِسی قِسم کی تبدیلی متوقّع نہیں تھی اس لیے ہم نے اس حقیقت پسند خاتون کے مشورے پر

عمل کیا جس نے کہا تھا کہ جب کچھ باتیں ناگزیر ہو جائیں تو عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا جائے۔

کھانے اور چندی گڑھ جانے کے درمیان کچھ وقت بچتا تھا اِس لیے ہم نے سوچا کہ اسے غنیمت جان کر مشاعرے کے ہندوستانی شرکاء سے مل لیا جائے، کیونکہ شنید یہ تھی کہ ان میں سے چند ایک سہارنپور کے مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے۔ وہ لوگ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کے کمرے میں جمع تھے، لیکن ٹھہریے، آگے بڑھنے سے پہلے ملک زادہ صاحب کا کچھ تعارف ہو جائے۔ اپنے یہاں پاکستان میں کیونکہ اس طرح کی کوئی شخصیت وَن پیس میں نہیں پائی جاتی اِس لیے تشبیہہ یا مثال سے سمجھانا بہت مشکل ہے۔ یُوں سمجھیے کہ خواجہ شفیع دہلوی، راغب مُراد آبادی اور بھائی افتخار عارف کو اگر جمع کر لیا جائے تو حاصل جمع ملک زادہ منظور احمد نکلے گا۔ ملک زادہ منظور صاحب لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔ اُردو کے علاوہ انگریزی کے بھی ایم اے ہیں اور ہندوستان میں ہونے والے تقریباً ایک تہائی بڑے مُشاعروں میں بطور پیشہ ور سٹیج سیکرٹری شریک ہوتے ہیں۔ اپنی 'نظامت' کے دوران وہ حاضر جوابی، ذہانت اور شاعری سے واقفیت اور شعور کا بہت دلچسپ مُظاہرہ کرتے ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ بہت زیادہ کرتے ہیں۔ شاعروں کا تعارف ایسے انداز میں کراتے ہیں کہ بیک وقت پانچ چھ شاعر چوکنّے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ دیکھیں قُرعۂ فال کس کے نام نکلتا ہے۔ اِس کے باوجُود کئی دفعہ ایسا ہُوا کہ تعارُف کے بعد انہوں نے جس شاعر کا نام لیا اُسے مُطلق اندازہ نہیں تھا کہ موت اُس سے اتنی قریب کھڑی ہو گی۔ ہمارے پُوچھنے پر ملک زادہ صاحب نے بتایا کہ یہ سب کچھ اس پیشے کے اُستادی گُر ہیں اور ان کے بغیر یہاں مشاعرہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اُن کی بات میں اُسی طرح کا اور اُتنا ہی وزن تھا جتنا ہماری فلموں کے پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کے دلائل میں ہوتا ہے لیکن ہم نے اِس خیال

سے بحث نہیں کی کہ آخر کوئی کوئی فلم چل بھی تو جاتی ہے۔

ملک زادہ صاحب کے کمرے میں والی آسی، انور ندیم، راشد ممتاز اور صہبا اختر کی طرح کے ایک جوشیلے شاعر بھی تھے جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا، اتنا یاد ہے کہ ان کے نام میں انجم آتا تھا اور کسی کالج میں اردو پڑھاتے تھے۔ ابھی ہم ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک نوجوان سالڑکا اندر داخل ہوا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایک فری لانس صحافی ہے اور ہم سے انٹرویو کرنا چاہتا ہے اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ اسے شاعری یا اردو سے بالکل واقفیت نہیں ہے۔ ویسے اگر وہ یہ وضاحت نہ بھی کرتا تو اس کے سوالات اِس سلسلے میں خود مکتفی تھے۔ پاکستان اور پاکستانی ادب کے بارے میں اس کی معلومات اتنی ہی تھیں جتنی گوئٹے مالا کے موسم اور سبزیوں کے بارے میں ایک عام شریف آدمی کی ہوتی ہیں لیکن اُس کے لہجے میں ایسا جارحانہ اعتماد تھا جس کی مثال اپنے یہاں صرف اقبال ساجد کی گفتگو یا محمد مصدق کی دُنیائے لطیفہ کے اِشتہاروں میں نظر آتی ہے۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس بَلا سے کیسے نمٹا جائے کہ لکھنؤ کا خُوش نما شاعر انور ندیم درمیان میں آگیا۔ اب پتا نہیں یہ ہماری موجودگی کی وجہ سے تھا یا انور ندیم پہلے سے ہی شیشہ مے کی طرح بھرا بیٹھا تھا، اس لئے شوقیہ صحافی کی وہ گت بنائی کہ اُلٹا ہمیں ریفری بن کر گفتگو ختم کرانی پڑی۔

والی آسی مُشاعروں کے علاوہ لکھنؤ میں کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں اور پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں نہ صرف بغیر اجازت کے چھاپتے ہیں بلکہ اتنے فخر سے اپنے اس کارنامے کا ذکر کرتے ہیں جیسے مُخاطب سے انھیں شکوے کی بجائے شکریے کی توقع ہو۔ اندازہ کیجیے کہ جو شخص قتیل شفائی جیسے زمانہ دیدہ شخص کو "اس" جیسے مسئلے پر چُپ کرا دے وہ کتنا بڑا کاریگر ہوگا۔ والی آسی صاحب سے مل کر مجھے اپنی فلم انڈسٹری کا ایک مشہور مصنف بہت یاد آیا جس نے میرے

ایک ٹی وی ڈرامے کو تقریباً حرف بحرف ایک فلم میں ڈال دیا تھا اور میرے استفسار پر بڑے اطمینان سے کہا تھا :

"امجد صاحب ! یہ سب آپ کو فلم انڈسٹری میں لانے کے چکر ہیں ۔ السلامُ علیکمُ ۔"

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد سے ہمیں پتا چلا کہ اس وقت سٹیج سیکرٹری شپ کے میدان میں ان کے صرف تین حریف ہیں لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ سوائے بشیر بدر کے کسی کو اپنے لیے فوری خطرہ نہیں سمجھتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خلافِ معمول گزشتہ دنوں ڈی سی ایم (دِلّی کاٹن ملز) کے مُشاعرے میں ان کی جگہ اس بار بشیر بدر کو سٹیج سیکرٹری بنایا گیا تھا ۔ اِس چپقلش کا منظر ہم نے سہارنپور کے مشاعرے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جس کا ذکر آگے آئے گا ۔

کنور رنبیر یادو کی موٹر چندی گڑھ کی طرف جانے والی صاف سُتھری اور ہموار سڑک پر رواں دواں تھی اور بسمل صابری پچھلی سیٹ پر یادو اور مدھو یادو کے درمیان سینڈوچ یا کباب میں ہڈی بنی بیٹھی رُوحی بانو جیسے بکھرے بکھرے انداز میں انگریزی بول رہی تھی ۔ لطیفوں کا دَور شروع ہُوا تو یادو کو بھی اپنی پولیس افسری کے احساس سے نجات ملنا شروع ہُوئی لیکن اس نے جو پہلا لطیفہ سنایا اس کی باری عام طور پر بہت ہی نجی قسم کی محفلوں کے اختتام پر آیا کرتی ہے ۔ مسز یادو منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور بسمل صابری بھی، جو عام طور پر لطیفہ ختم ہونے سے پہلے ہنس پڑتی ہے، اپنے ناخنوں میں کچھ تلاش کرنے لگی ۔ عطا نے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا اور پھر پچھلی سیٹ کی طرف مُڑتے ہُوئے ایک ایسا لطیفہ سُنایا کہ مسز یادو نے گھبرا کر اپنی خوبصورت عینک اتار دی ۔ اس پہلے راؤنڈ کے ختم ہونے پر کچھ دیر موٹر میں مکمّل خاموشی رہی اور اس کے بعد ایسے لطیفوں کا دَور شروع ہُوا جنھیں بآسانی "حُور" اور "زیبُ النّسا" میں شائع کیا جا سکتا ہے ۔

چندی گڑھ واقعی خُوبصُورت شہر ہے ۔ اپنے اسلام آباد کی طرح جدید، سرسبز

اور کھُلا کھُلا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام آباد پہاڑ کے بالکل دامن میں ہے جب کہ چندی گڑھ وادی میں ہوتے ہُوئے بھی پہاڑی سلسلے سے فاصلے پر واقع ہے۔ چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے مارکیٹیں بند تھیں اِس لیے ہم صرف ان کی بڑی بڑی عمارتوں کی جھلک ہی دیکھ سکے۔ موٹر باغات کے ایک طویل سلسلے کے ساتھ ساتھ چلتی ہُوئی ایک جگہ رُکی تو یادو نے کہا:

"آیئے جی۔ راک گارڈن آگیا ہے۔" ایک چھوٹے قد کی فصیل نما دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے ہم ایک ایسے دروازے پر پہنچے جس کی اُونچائی زیادہ سے زیادہ چار فٹ ہوگی۔

"آؤ جی۔" یادو نے کہا اور بڑے اطمینان سے رکُوع کے انداز میں جھُک کر اس دروازے سے گزر گیا۔ سُنا ہے کہ کچھ بادشاہوں نے اللہ لوک قسم کے صُوفیاء سے سجدۂ تعظیم کروانے کے لیے اِس طرح کے دروازے اپنے درباروں میں بنوا رکھے تھے۔ میں نے پہلے جھُک کر چور نظروں سے جائزہ لیا کہ دروازے کے اُس پار کیا ہے مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک تنگ سی راہداری تھی، جو تھوڑی دُور جاکر ایک طرف مُڑ جاتی تھی۔ میں نے عطاء کی طرف دیکھا کہ یہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ ایسی جگہیں تو ماہرینِ ارضیات کے دیکھنے کی ہوتی ہیں۔ ہم شاعروں کو تو پتھر سے پتھر دل صنم، پہاڑ سے عزیزی فرہاد اور چٹانوں سے سر مار کر مرجانے کے مضمونوں سے غرض ہے لیکن ذرا آگے بڑھے تو پتا چلا کہ پتھروں سے بھی شاعری کی جاسکتی ہے۔ یہ راک گارڈن، جسے گلشنِ سنگ کہنا چاہیے، انسانی تخیل، محنت، لگن اور جدت طرازی کا مُنہ بولتا شاہکار ہے۔ اِس میں استعمال ہونے والی تمام چیزیں اس ملبے اور wastage سے بنائی گئی ہیں جو چندی گڑھ شہر کی تعمیر میں بچ رہا تھا۔ اِس میں ناکارہ اینٹیں، پتھر، ٹائلیں، ڈبے، ٹین، بوریاں، سینٹری کا ٹوٹا ہُوا سامان، کانچ کے ٹکڑے، بے کار سریا، نلکوں کی ٹونٹیاں غرضیکہ ہر وہ چیز، جو عمارتوں کی تعمیر میں کسی نہ کسی شکل میں ضائع ہوتی ہے، ایسی فنکارانہ

صناعی سے استعمال کی گئی ہے کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ بغیر چھت کی یہ عمارت کم و بیش چھوٹے بڑے چالیس کمروں پر منقسم ہے جو داخلے کے دروازے جیسے چار فٹے دروازوں سے باہم دِگر ملے ہُوئے ہیں اور ہر کمرے میں trash سے مختلف چیزیں، اشکال، مُورتیاں، compositions اور علامتی پیکر اس انداز میں بنائے گئے ہیں کہ ہر بے معنی چیز بامعنی ہو گئی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کا سب ایک فردِ واحد کی محنت اور تخلیقی صلاحیت کی پیداوار ہے۔

مسز یادو نے بتایا کہ یہ شخص پی ڈبلیو ڈی میں سپروائزر کے معمُولی عہدے پر فائز تھا اور چنڈی گڑھ کی تعمیر کے منصوبے سے وابستہ تھا۔ اِسی دوران میں یہ آئیڈیا اس کے دماغ میں آیا جو مختلف مرحلوں سے گزرتا ہُوا آج ایک گارڈن کی صُورت میں ہمارے سامنے ہے۔

میں نے سوچا: اپنا یار محمّد منشا یاد بھی اِسلام آباد کے تعمیراتی منصوبے سے کم و بیش اسی طرح وابستہ رہا ہے اور آج کل بھی سی ڈی اے میں تعلّقاتِ عامّہ کا افسر ہے، کیوں نہ یہ آئیڈیا اسے دیں تاکہ افسانوں کے علاوہ بھی اس کا نام زندہ رہ سکے۔ لیکن پھر ایک دم خیال آیا کہ اسلام آباد آئیڈیوں کا نہیں دستخطوں کا شہر ہے۔ وہاں بڑی بڑی عمارتوں میں فائلیں شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتی رہتی ہیں اور سارا شہر ان کی موسیقی میں مست رہتا ہے۔ وہاں دفتروں میں سرکاری مُلازم نہیں ان کے گریڈ بیٹھتے ہیں۔ اٹھارہ گریڈ سے نیچے کے آدمی کو تو وہاں چپڑاسی بھی سلام نہیں کرتا۔ منشا یا اس جیسے کسی سرپھرے اردو میڈیم کی بات کس نے سننی تھی۔ کیونکہ ملبے سے تعمیر جیسے دیسی آئیڈیے کے لیے نہ تو انگریز بہادر کوئی نوٹ یا ریفرنس چھوڑ گیا ہے اور نہ ہی امریکہ والے ان لائنوں پر سوچ رہے ہیں۔ میرا ذہن ایسی ہی فضُول باتوں میں اُلجھا ہُوا تھا کہ یک دم یادو نے ایک ٹوٹی ہُوئی منقش دیوار کی طرف اِشارہ کیا: "مدھوجی، کیوں نہ ہم بھی اپنے گھر میں ایک ایسی ہی دیوار بنوالیں۔ اس آدمی کو میں جانتا ہوں، اس کو بُلوالیں گے۔"

مدھو نے اثبات میں سر ہلایا اور پتھر کی ایک کُرسی پر ہاتھ رکھتے ہُوئے بولی:
"لان کے لیے اس طرح کی کُرسیاں بھی بنوائیں گے"۔

ایک لمحے کے لیے اِس گلشنِ سنگ میں وقت جیسے رُک سا گیا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ میں نے سوچا: آج سے ہزاروں لاکھوں سال پہلے جب پہلی بار کسی نے گھر یا دیوار کے بارے میں سوچا ہوگا تو اُس نے یہ بات پتا نہیں کن لفظوں میں کہی ہوگی۔

چنڈی گڑھ سے پنجوڑ تک کا سفر راک گارڈن کے سحر میں ہی گزر گیا۔ لیکن آگے ایک اور حیرت ہماری منتظر تھی۔ یہ مہاراجہ پٹیالہ کا شاہی باغ تھا۔ مغل طرزِ تعمیر اور جدید آرائش کا ایک خوبصورت اور پُرشکوہ امتزاج۔ یہ باغ چار منزلہ ہے اور اس میں آپ اُوپر سے نیچے کی طرف جاتے ہیں۔ صدر دروازہ پہلی منزل پر ہے جو بلندی کے اعتبار سے چوتھی منزل ہے۔ گھاس کے وسیع قطعے کے درمیان شالامار باغ کے انداز کی مصنوعی نہر ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوارے اور روشنیاں نصب ہیں۔ اِس کے بعد ایک عمارت ہے جس سے گزر کر نیچے یعنی دُوسری منزل کی سیڑھیاں اُترتے ہیں۔ اِس عمارت کا نام "جل محل" ہے۔ دُوسری اور تیسری منزل کے درمیان بھی اسی طرح کی ایک عمارت ہے جو دو طرف سے کھلی ہے۔ اس کو "رنگ محل" کہتے ہیں۔ اِسی طرح تیسری اور چوتھی منزل کے درمیان واقع عمارت کو "شیش محل" کہتے ہیں مگر اب اس کی شکل بدل کر اسے ایک جدید طرز کے کیفے میں تبدیل کر دیا گیا ہے جس کے چاروں طرف فواروں کی پھواریں پڑتی رہتی ہیں۔ یادو غالباً پوسوال صاحب کی پیشوائی کے لیے دروازے پر ہی رُک گیا تھا۔ مدھو اپنے بارے میں ہمیں بتا چکی تھیں کہ وہ روزانہ یوگا کی مشقیں کرتی ہیں اور بسمل کے بارے میں بھی ہم جانتے تھے کہ وہ محکمۂ تعلیم میں کھیلوں سے متعلق شعبے میں ہے چنانچہ دونوں کی تیک رفتاری اور سانس کی ہمواری پر تو ہمیں تعجب نہیں تھا البتہ یہ ڈر ضرور لگا ہُوا تھا کہ کہیں ہمارا مردانہ وقار خطرے میں نہ پڑ جائے۔

چنانچہ جب مدھو نے یہ مشورہ دیا کہ رنگ محل تک واپسی کا سفر باغ کی حد بندی کے ساتھ ساتھ نیم دائرے کی شکل میں کیا جائے تو مجبوراً ہمیں چند دن قبل ہونے والے ٹریفک کے حادثے کا سہارا لینا پڑا۔ واپسی میں بسمل نے مدھو کی کمر میں جس بے تکلفی سے ہاتھ ڈال رکھا تھا اسے میر حسن نے اپنی مثنوی میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں مست جُوں ہاتھ گردن میں ڈال

عطا نے یہ منظر دیکھ کر کہا: "تھرڈ ورلڈ کا ایک بہت بڑا مسئلہ تقسیمِ کار کا بھی ہے۔ ابھی تک ہم لوگ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ کون سے کام عورتوں کے کرنے کے ہیں اور کون سے مردوں کے۔" اور پھر تلقین شاہ کے لہجے میں آہ بھر کر بولا:

"اوئے ہدایت! تیں ترقی نئیں کرنی۔"

رنگ محل کے کمرۂ خاص تک پہنچنے کے لیے ہمیں پندرہ بیس تنگ اور چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں پہ چڑھنا پڑا۔ یادو نے ہمیں بتایا کہ مہاراجہ صاحبان جب ان سیڑھیوں پر چڑھتے تھے تو خوبرو کنیزیں دو رویہ کھڑی ہوتی تھیں۔ ہم نے حیرت سے کہا:

"یہ تو اتنی تنگ ہیں کہ ایک آدمی کا گزرنا مشکل ہے کنیزیں کہاں کھڑی ہوتی تھیں؟ اور فرض کرو وہ کھڑی ہو بھی جائیں تو راجہ صاحب کیسے گزرتے تھے؟"

یادو نے آنکھ مار کر کہا: "اسی کا نام تو بادشاہی ہے۔"

عطا نے کہا: "آپ کو چاہیے مہمانوں کو سمجھانے کے لیے کبھی کبھی اس منظر کا عملی مظاہرہ بھی کیا کریں۔" یادو نے کہا:

"فی الحال کنیزیں تو مہیا نہیں ہو سکتیں، پسند کریں تو گارڈ کے کچھ آدمی منگوا لوں!"

اس پہ ہم تینوں ہنس پڑے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر مدھو رُکیں اور مُڑ کر مجھ سے کہنے لگیں:

"لگتا ہے کوئی اچھا joke ہوا ہے۔ ہمیں بھی سنائیں۔"

میں نے سٹپٹا کر یادو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پکا پلپیا تھا، اقرارِ جرم کروانے کے انداز میں بولا: "ہاں ہاں سنائیے۔ مدھو جی آپ کی شاعری سے زیادہ آپ کے لطیفوں کی fan ہیں۔"

جملہ براہِ راست اور شدید تھا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ سچ مچ اصل بات بتا کر یہ اُدھار ہاتھ کے ہاتھ چکا دُوں مگر حوصلہ نہ ہو سکا اور میں نے آئیں بائیں شائیں کر کے بات ٹال دی۔

رنگ محل کا کمرۂ خاص واقعی کمرۂ خاص تھا۔ یہ دراصل ایک بہت بڑا بیڈ رُوم تھا جس میں محض احتیاطاً سامنے کے کونے میں ایک صوفہ سیٹ بھی رکھ دیا گیا تھا۔ ایک سائڈ پر موسیقی والوں کے لیے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہُوا تھا۔ کمرے کی دیواریں اور دروازے اپنی اورجنل شکل وصُورت میں تھے البتّہ چھت پر false ceiling لگائی گئی تھی مگر اس میں بھی نقّاشی کا وہی انداز برقرار رکھا گیا تھا جو دروازوں اور کھڑکیوں میں تھا۔ بیڈ بہت خوبصُورت اور بہت بڑا تھا۔ یادو نے بتایا کہ یہ مہاراجہ پٹیالہ کا ماسٹر بیڈ رُوم تھا اور اب بھی کبھی کبھی شوقین مزاج اور امیر لوگ اسے حجلۂ عروسی کے طور پر خاصی بھاری رقم خرچ کر کے بُک کروا لیتے ہیں۔

"یہ تو اتنا بڑا ہے کہ بیک وقت دو شادی شدہ جوڑے یہاں ہنی مون منا سکتے ہیں۔"

اِس سے پیشتر کہ یادو اس بات کا کوئی جواب دیتا، پوسوال صاحب آ گئے۔ وہ ہماری خاطر کوئی تقریب اُدھوری چھوڑ کر آئے تھے اور بڑی نستعلیق اردو میں تاخیر کی معذرت چاہ رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ہمیں اپنے گھر پر مدعو کرنا چاہتے تھے لیکن چند دن پہلے ان کی جوان بیٹی فوت ہو گئی ہے جس کی وجہ سے گھر کا ماحول بے تکلّف محفل کے لیے سازگار نہیں۔ وہ ایف سی کالج لاہور کے پڑھے ہوئے تھے اور اتنے برس گزرنے کے بعد بھی لاہور کا جادُو ان کے سر چڑھا ہُوا تھا چنانچہ

اساتذہ کے اچھے اور انتخابی مہم میں چلنے والے چالو شعروں کے علاوہ انہوں نے ہمیں لاہور کے کچھ پرانے پنجابی شعراء کا ایسا کلام بھی سنایا جو صرف سنایا ہی جا سکتا ہے۔

پوسوال صاحب کی ایک خوبی جو مجھے بہت اچھی لگی یہ تھی کہ سیاسی آدمی ہونے کے باوجود انھوں نے ایک بھی بات ایسی نہیں کی جس سے سیاست کی بو آتی ہو چنانچہ ہلکی پھلکی باتوں اور شعر و شاعری پر مشتمل یہ پُر لطف محفل رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک چلتی رہی۔ واپسی میں سنسان سڑک پر لتا کے پرانے گانوں کے ایک ٹیپ نے جو مزا دیا وہ اس خوبصورت شام اور رات کا موزوں ترین اختتام تھا۔

اگلی صبح (۱۵ مارچ) کو بھی آنکھ دیر سے کھلی۔ عطاء نے کہا کہ ناشتہ کہیں باہر چل کے کیا جائے۔ انبالہ لاکھ یو پی کی سرحد پر سہی، ہے تو پنجاب ہی کا حصہ، خوراک سے مار نہیں کھاتا ہوگا۔ چنانچہ ماڈرن کو لمبس اور واسکوڈے گاما حلوہ پوری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ریسٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر ایک چوک تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن گلِ امید کی خوشبو کسی طرف سے نہ آئی۔ بڑی تلاش کے بعد ایک خان ہوٹل نما جگہ نظر آئی لیکن وہ کڑاہی سے صرف سموسے بنانے کا کام لیتا تھا۔ اب سموسے ہم لاہور میں بھی اکثر کھاتے ہیں اور بڑے شوق سے کھاتے ہیں لیکن صبح گیارہ بجے سموسوں سے ناشتہ کرنا خاصی ٹیڑھی کھیر تھی مگر ہم نے بھی کسی نہ کسی طور اُسے سیدھا کر لیا۔

واپس ریسٹ ہاؤس پہنچے اور ملہوترہ صاحب کے گھر فون کیا۔ پتا چلا کہ وہ صبح سے ہمارے سہارنپور کے ویزے لگوانے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ اب کیا کریں؟ اخبار پڑھنا شروع کیا۔ ہمارے مشاعرے کی رپورٹ بھی شائع ہوئی تھی لیکن ناموں کے سلسلے میں عجیب گھپلے بازی تھی۔ ضمیر صاحب جمیر ضعفری تھے تو قتیل شفائی قتال شافی۔ مجھے ازراہِ بے تکلفی صرف امجد لکھا گیا تھا اور عطاء کا نام سرے سے غائب تھا۔ اسی طرح رفعت سلطان اور سلطان رشک کے اختلافات بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور ان کے ناموں کے مختلف حروف ملا کر ایک نیا نام ایجاد کیا گیا تھا جبکہ بقول

رُوحی کہتا ہی : حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی !

دوپہر کا کھانا ملہوترہ صاحب کے گھر پر تھا۔ وہاں ان کے منجھلے بیٹے ستیش، اس کی بہت گریس فل بیوی اور دو پیاری پیاری بیٹیوں سے مُلاقات ہوئی۔ بچیاں سکول سے آرہی تھیں اور ان کے چہرے وسط مارچ کی بہت ہلکی گرمی کے باوجود تمتما رہے تھے۔ ملہوترہ نے بتایا کہ ان کے تین بیٹے ہیں جن میں سے دو مُلک سے باہر ہیں۔ بیگم تین چار سال قبل انتقال کر چکی ہیں اور اب وہ ستیش، بہو اور نواسیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ کاروبار معقول سے بھی کچھ اچھا ہے۔ باسٹھ برس کی عُمر کے باوجود ان میں جوانوں کی سی چستی تھی۔ ہم نے اس کا راز جاننے کی کوشش کی تو انھوں نے بڑے مزے سے کہا :

"بس جی آپ جیسے پڑھے لکھے اور اچھے شاعروں کی صحبت کا فیض ہے۔ اِس کے علاوہ مجھے نایاب نسل کے کُتّے رکھنے کا بھی شوق ہے اور میں کتّے پالنے والوں کی عالمی انجمن کا باقاعدہ ممبر بھی ہوں۔"

اب کتا چاہے کسی بزرگ ہی کا کیوں نہ ہو کوئی شریف آدمی اس کے ساتھ بریکیٹ ہونا پسند نہیں کرتا۔ ملہوترہ صاحب کو بھی شاید اپنے جُملے کے اِس پہلو کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ انھوں نے جو وضاحتی معذرت شروع کی اُسے سُن کر اکبر اور مُلّا دو پیازہ کا "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" والا واقعہ یاد آگیا۔

اکبرِ اعظم کے بارے میں مشہور ہے کہ اَن پڑھ ہونے کے باوجُود اُسے چیزوں کے بارے میں جاننے اور ان کی تہہ تک پہنچنے کا بہت شوق تھا چنانچہ ایک دفعہ جب اس کی موجودگی میں کسی نے "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کی ضربُ المثل اِستعمال کی تو اکبر پُوچھنے لگا کہ اس کی وضاحت کرو اور مثال دے کر سمجھاؤ کہ گناہ سے اس کا عُذر کس طرح بدتر ہو سکتا ہے ؟ اب جناب سارے نورتن سوچ میں پڑ گئے۔ جو بھی مثال وہ دیتے تھے، اس میں گناہ عُذرِ گناہ سے زیادہ نکلتا تھا۔ آخر مُلّا دو پیازہ نے بادشاہ سے ایک دن کی مُہلت طلب کی اور کہا کہ میں کل تک آپ کو اس کی مثال پیش کروں گا۔ دربار برخاست ہو گیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ حمام کر رہا تھا کہ اچانک مُلّا اندر گھس آیا۔ بادشاہ اُسے دیکھ

کر بہت ناراض اور جز بز ہوا اور پوچھنے لگا کہ اُسے اِس گستاخی کی ہمت کیسے ہوئی ؟ مُلّا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ ظلِ الٰہی میں معافی چاہتا ہوں، میں سمجھا تھا شاید ملکہ حضور حمام کر رہی ہیں - یہ بات سُن کر بادشاہ کو تو آگ لگ گئی - قریب تھا کہ وہ جلاد کو بُلوا کر مُلّا کا قصہ پاک کر اتا کہ مُلّا نے دوبارہ ہاتھ جوڑے اور عرض کیا بُرا نہ مانیے گا حضُور! میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ عُذرِ گناہ، گناہ سے بدتر کیسے ہو سکتا ہے -

ابھی ان کی وضاحت کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ کمرے میں ایک انتہائی خوفناک اور غیر معمولی طور پر بڑا کتا داخل ہوا - شاید اِسی قسم کے کسی کُتّے کو پطرس مرحوم نے "بہت ہی کتا" کہا تھا - اگرچہ ملہوترہ صاحب نے اُسے فوراً ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا لیکن اس مختصر عرصے میں ہی کچھ ایسی دہشت ہم پر طاری ہوئی کہ لقمے حلق سے اترنے مشکل ہو گئے - جب حواس ذرا قابو میں آئے تو پتا چلا کہ ملہوترہ ہمیں اپنے کُتوں کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے - ان کی کتنی باتیں ہم نہیں سُن سکے اس راز سے اب شاید کبھی پردہ نہ اُٹھ سکے - باہر نکلے تو کتوں کی تعداد بڑھ کر "چار شیروں" تک پہنچ چکی تھی - ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکے اور چک پھیریاں لے کر ہمیں چکھنے لگے -

ملہوترہ صاحب ہمارا حوصلہ بڑھانے کے لیے بتا رہے تھے کہ یہ دیکھنے میں جتنے خوفناک ہیں دوستوں کے لیے اُتنے ہی بے ضرر اور جاں نثار ہیں - ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ویسے نسلاً یہ one man's dog ہیں یعنی مالک کے علاوہ کسی کو spare نہیں کرتے، یہاں تک کہ اگر ان کی وابستگی بیوی سے ہو تو شوہر کو محتاط رہنا پڑتا ہے - ہم نے سوچا کسی محقق سے سگِ لیلیٰ کی نسل معلوم کریں گے، عین ممکن ہے جس طرح ہم شاعر لوگ مجنوں کے سلسلۂ عشقیہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کتوں میں بھی کوئی اس کا رشتے دار ہو اور کل کے اخباروں میں "صدیوں پرانی دشمنی کا بدلہ" قسم کی سُرخی لگی ہو - اس اثنا میں اندر سے ستیش اینڈ کمپنی نکل آئے - وہ لوگ کوئی فلم دیکھنے جا رہے تھے - ملہوترہ نے کہا: "آپ لوگ چاہیں تو آرام کر لیں - میں آپ کو کچھ دیر بعد پک کروں گا۔" ہم نے جلدی سے

کہا: "نہیں نہیں آرام کیا کرنا ہے۔ چلتے ہیں... ویسے، بائی دی وے، یہ کُتے کب آرام کرتے ہیں؟" ملہوترہ اِشارہ سمجھ گئے اور فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ ان کتّے کے بچّوں کو لے جا کر بند کر دیں۔

سہارن پور

شامِ بہار ٹرسٹ کے نوجوان ہندی افسانہ نگار سیکرٹری چندن کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ اس کو لے کر ہم تقریباً ساڑھے تین بجے انبالے سے سہارنپور کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں جمنا نگر کے قریب ملہوترہ صاحب نے ہمیں ہندوستانی اداکار سنیل دت کا آبائی گھر دکھایا اور بتایا کہ اس علاقے کی ترقی کے لیے اُس نے بہت نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ انھی کی زبانی معلوم ہُوا کہ اپنی بیوی نرگس کی موت کی رسمیں اُس نے بمبئی کے علاوہ یہاں آکر بھی پُورے اہتمام سے ادا کی تھیں۔ سنیل دت بطورِ ایکٹر مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا لیکن یہ باتیں سُن کر میرے دل میں بطور انسان اس کے لیے عزت پیدا ہُوئی کیونکہ میں نے بیشتر نیچے سے اُوپر آنے والے لوگوں کو اپنا ماضی disown کرتے دیکھا ہے۔ شاید وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی عظمت دراصل اُسی پستی سے متعین ہوتی ہے جہاں سے انہوں نے اپنا سفر آغاز کیا تھا۔

سبودھ بہاری لعل ساقی، جو سہارنپور میں ہمارا میزبان اور مشاعرے کا منتظمِ اعلیٰ تھا، ایک خُوبصُورت اور نفیس انسان ہے۔ اس کا گھر بھی اس کی شخصیت کی طرح نکھرا نکھرا اور پُرسکون تھا۔ ہمارا استقبال اُس کے والد نے ایک چھوٹے سے مگر پھُولوں سے بھرے ہُوئے لان میں کیا۔ یہ ایک شائستہ گھرانا تھا۔ اردو اور فارسی سے محبت ان لوگوں کے خُون میں شامل ہے۔ سبودھ کے والد اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور طالب تخلص کرتے ہیں۔ اُن کے انداز و اطوار میں دِلّی والوں کی وہ مخصُوص نفاست اور رکھ رکھاؤ نظر آیا جو ہم نے پُرانی ہندُوستانی فلموں اور کتابوں میں دیکھا اور پڑھا تھا۔ یہ اور بات کہ آگے چل کر خُود دِلّی میں ہمیں اس کا نام و نشان تک نہ ملا۔ طالب صاحب کو بھی

میری طرح کرکٹ سے بہت لگاؤ تھا چنانچہ ہم دونوں پُرانے شکاریوں کی طرح ایک دُوسرے کو اپنے تجربات اور مشاہدات سے آگاہ کرنے لگے اور اگر عطا کے سگریٹ ختم نہ ہو جاتے تو ممکن تھا مشاعرے کا وقت ہمیں وہیں ہو جاتا۔

سہارنپور امرتسر سے دہلی تک غالباً واحد شہر ہے جس میں مُسلمانوں کی اب بھی اکثریت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ زیادہ تر لوگ دستکار ہیں اور لکڑی کے کام میں بہُت شہرت رکھتے ہیں۔ شہر کے جن حصّوں سے ہم گُزرے وہ بہُت گنجان آباد اور خاصے گندے تھے۔ مجمُوعی طور پر پُورے شہر کے منظر پر غُربت اور پسماندگی کا ایک سایہ سا مُحیط تھا۔ پہلی بار مسجدیں نظر آئیں اور اذان کی آواز سُنائی دی۔ مُشاعرہ گاہ جس کالج کی گراؤنڈ میں تھی اس کا نام بھی اسلامیہ کالج تھا۔ پرنسپل کے کمرے میں کالج کے بانی کی تصویر کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی تصویر بھی آویزاں تھی۔ پرنسپل صاحب اور ان کے دفتر دونوں کی حالت خاصی خستہ تھی اور جو ٹیلی فون وہاں رکھا تھا وہ غالباً گراہم بیل کے ذاتی اِستعمال میں رہ چُکا تھا۔ مشاعرہ چُونکہ باٹکٹ تھا اور پہلی دفعہ اس انداز میں منعقد ہو رہا تھا اس لیے منتظمین کی بے چینی اور پریشانی بہت نمایاں تھی۔ کچھ لوگوں کو ہم نے بار بار تیزی سے اِدھر اُدھر آتے جاتے اور باقی لوگوں کو مزید پریشان کرتے دیکھا مگر مشاعرے کے آخر تک وہ کوئی بھی کام کرتے نظر نہیں آئے۔ مشاعرہ فراق اور جوش کی مشترکہ یاد میں تھا لیکن مشاعرہ گاہ میں دونوں بزرگ شعراء کی جو تصویریں لگائی گئی تھیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اگر ان تصویروں کو وہ اپنی زندگیوں میں دیکھ لیتے تو شاید آج یہ مشاعرہ مرحوم مصوّر کی یاد میں منعقد ہو رہا ہوتا۔ مُشاعرے کے وقت سے کچھ ہی دیر پہلے بجلی چلی گئی۔ متبادل انتظام کے طور پر جنریٹر موجُود تھا جو فوراً چلا دیا گیا لیکن جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہتیں اِسی طرح اس جنریٹر کی موجُودگی میں کسی شاعر کا پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ ملک زادہ منظور احمد، جو یہاں بھی سٹیج سیکرٹری تھے، ایک ایسے موسیقار کی طرح تلملائے ہوئے پھر رہے تھے جس کے ساز سُر نہ ہو رہے ہوں۔ انھیں دیکھ کر آغا حشر مرحوم کے کسی ڈرامے کا

ایک مکالمہ یاد آرہا تھا: "توفیق کس حال میں ہے۔ شیر لوہے کے جال میں ہے۔" یہاں
جن دو نئے قابلِ ذکر شاعروں سے مُلاقات ہُوئی وہ (ڈاکٹر) بشیر بدر اور شمیم جے پوری
تھے۔ دونوں کے بارے میں پتا چلا تھا کہ بڑے معرکے کے مشاعرہ باز ہیں۔ شمیم صاحب کے
بارے میں تو ہم زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن "فنون" کے حوالے سے بشیر بدر جدید
غزل کا حوالہ تھا اور ہمارے لیے یہ بات بہُت تعجُّب انگیز تھی کہ اس طرح کا شاعر
مشاعرے میں کس طرح ہِٹ ہو سکتا ہے۔

بجلی کے انتظار اور بہُت بڑے ہجوم کی بے چینی کے براہِ راست اظہار سے تنگ
آکر ملک زادہ صاحب نے مشاعرہ شروع کر دیا۔ وہ تو خیر گزری کہ تھوڑی دیر بعد ہی
بجلی آگئی اور جنریٹر سے جان چھُوٹ گئی، ورنہ ہم تو شاید مہمان ہونے کے ناطے سے
بخش دیے جاتے مگر منظُور صاحب کا شاید یہ آخری مشاعرہ ہوتا۔ قتیل صاحب اپنے
دِلّی والے ساتھی کے ساتھ خاصی دیر سے آئے اور غالباً سٹیج کی ناہمواری کی وجہ سے
کئی بار گرتے گرتے بچے۔ سہارنپُور کے سامعین نسبتاً زیادہ سخن فہم اور alive تھے
لیکن اس کے باوجُود ملک زادہ منظُور احمد کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے لگ رہے تھے۔
مشاعرے کے دوران جب بشیر بدر اور ان کے درمیان ایک، battle of
wits (جسے عطا۔ نے battle of half wits کا نام دیا!) شروع ہُوئی تو
اس کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ یہ سب کچھُ اس پیشہ ورانہ چپقلش کا شاخسانہ تھا جو ان
دونوں حضرات کے درمیان موجُود تھی۔ بشیر بدر کو بہت داد ملی لیکن جس انداز میں انھوں
نے اپنی شاعری perform کی مجھے یقین ہے کہ اگر وہ پاکستان کے کسی سٹیج پر ہوتے تو
دُوسرا شعر نہ پڑھ پاتے۔ ایک اچھے اور معقُول شاعر کو اس طرح اداکاری کرتے دیکھ کر
افسوس ہُوا مگر یہ سوچ کر چُپ ہو رہے کہ مُعاشرے اور ماحول کے جبر کی ایک ہی
صُورت تو نہیں ہوتی۔ شمیم جے پُوری کا ترنم بہت اچھا تھا۔ بڑے دھان پان سے آدمی
تھے اور اس قدر زور لگا کر پڑھتے تھے کہ ہر لحظہ ان کے ٹوٹنے کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔
مشاعرہ ختم ہُوا تو بسمل صابری نے بشیر بدر کو پکڑ لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مشاعرے کے

دوران بشیر بدر نے اس کو انتہائی غیر مُہذّب انداز میں باتیں بند کرنے کو کہا تھا جبکہ وہ باتیں نہیں کر رہی تھی اور اگر کر بھی رہی ہوتی تو بھی کسی خاتون کو ایسے انداز میں ٹوکنا تہذیب کے منافی ہوتا۔ بشیر بدر کا کہنا تھا کہ اُس نے بِسمل کو نہیں بلکہ اُس کے نزدیک بیٹھے ہُوئے ایک ہندوستانی شاعر کو ٹوکا تھا۔ جب ہم اس سین میں داخل ہُوئے تو دونوں کا حال ایسے لڑاکوں جیسا ہو رہا تھا جنھیں کوئی چھڑانے والا نہ مل رہا ہو چنانچہ فوراً ہی صلح صفائی ہو گئی۔

دہلی

صبح کے چار بج رہے تھے اور ہم ابھی تک یہ طے نہیں کر پائے تھے کہ سہارنپور سے دلّی جاتے ہُوئے دیوبند کس طرح دیکھا جائے۔ بڑی مشکل سے رُوٹ اور ذرائع رسل و رسائل تو تقریباً طے ہو گئے مگر اب مسئلہ یہ آپڑا کہ دارُالعلوم دیوبند دو دھڑوں میں کشیدگی کی وجہ سے بند تھا، اور وہاں جانے کے لیے خصُوصی اجازت درکار تھی۔ عطاء اس لیے بے چین تھا کہ اس کے نزدیک یہ ایک تیر سے دو شکار والی بات تھی یعنی دیوبند بھی دیکھ لیں گے اور اسے اخبار کے لیے سٹوری بھی مل جائے گی لیکن اس ساری بحث کا جو آخری نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ پونے چھ بجے ہم سہارنپُور کے لاری اڈے پر تھے جہاں سے ہمیں ایک ڈی لکس بس کے ذریعے سیدھے دِلّی جانا تھا۔ یہ بس اتنی ہی ڈی لکس تھی جتنی ہماری گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی لگژری کوچ ہوتی ہے۔ سبودھ تو خیر ہمیں چھوڑنے کے لیے ہمارے ساتھ آیا تھا لیکن وہاں پہلے سے بھی تین چار میزبان حضرات موجُود تھے۔ پتا چلا کہ یہ ہمارے لیے سیٹیں روکنے کی خاطر آئے ہُوئے ہیں کیونکہ اس بس میں ٹکٹ اسی کو ملتی ہے جس کے پاس سیٹ کا قبضہ ہو۔ بس تقریباً بھر چکی تھی ہمارے بائیں ہاتھ کی طرف سنگل سیٹ پر بس میں موجُود دس پندرہ خواتین میں سے واحد صنفِ لطیف بیٹھی تھی۔ میں نے عطاء سے کہا: "لو بھائی اب یہ تمہارا اور مُستنصر تارڑ کا علاقہ شروع ہو گیا ہے، لیکن یہ خیال رکھنا کہ اگرچہ ہنوز دِلّی دُور است مگر اتنی بھی نہیں دُور است" عطاء نے دُزدِیدہ نظروں سے اس عفیفہ کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہا کہ یہ سو فی صدی اس کا کیس ہے کیونکہ خاتون کے ہاتھ پاؤں ناک کان آنکھ وغیرہ سب صحیح سلامت ہیں۔

اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے میں کسی خاتون کے داخلے کی پہلی شرط اس کا کسی نہ کسی طرف سے معذور ہونا ہے۔ سبودھ اور دیگر میزبانوں سے ہماری گفتگو کے دوران اس کو غالباً پتا چل گیا تھا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور غریب الوطن ہیں کیونکہ بس سٹارٹ ہوتے ہی اُس نے ایک ایسی میٹھی اور چھتنار نظر ہم پر ڈالی کہ آتش کے شعر پر ایمان تازہ ہوگیا:

سفر ہے شرط، مُسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

اِس خطرناک عُمر میں اتنی صبح صبح اس کا اکیلے اکیلے سفر کرنا جہاں اُس کے اپنی ذات پر اعتماد کا اظہار تھا وہاں اُس کے بیٹھنے کے انداز میں ایسی پُروقار بے اعتنائی تھی جیسے اسے پتا ہو کہ اسے ایک نظر دیکھ کر گزر جانا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن یہ سب باتیں اُس وقت تک تھیں جب تک دِن کا اُجالا پُوری طرح نہیں پھیلا تھا اور اُس کا چہرہ اور جسم کسی آئس برگ کی طرح صرف ۱/۸ نظر آرہا تھا۔ واضح رہے اس انکشاف کے درمیان تقریباً ایک گھنٹہ حائل تھا جس میں ساٹھ منٹ اور چھتیس سو سیکنڈ ہوتے ہیں۔ لڑکی سے پیچھے کی نشست پر کپڑے کے دو نوجوان تاجر بیٹھے تھے۔ اِس سے پیشتر کہ ہم اس کی پہلی نظر کا کوئی معقول جواب دے پاتے وہ دونوں بیچ میں کُود پڑے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے مجھ سے اپنے متموّل کاروباری ہونے کا تعارُف اِس طرح کرایا کہ مُنہ میری طرف اور رُوئے سُخن کسی اور کی طرف تھا اور اس کے بعد پاکستان کے بارے میں کچھ ایسے سوالات کی بوچھاڑ کر دی جن میں سے ہر ایک کئی کئی سوالوں کا مجمُوعہ تھا۔ میں نے شروع شروع میں تو سنجیدگی سے جواب دینے کی کوشش کی مگر جب محسُوس کیا کہ وہ

جتّی رووے یاراں نوں
لے لے ناں بھراواں دے

والا ہاتھ دکھا رہے ہیں تو میں نے بھی اسی نوع کی جوابی کارروائی شروع کر دی۔ بنیند عطا

کے لیے اس طرح کے قحط کا درجہ رکھتی ہے جس کے دنوں میں بقول شیخ سعدی دمشق والوں نے عشق کو فراموش کر دیا تھا چنانچہ تھوڑی دیر بعد میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ گوڈے گوڈے نیند میں تھا۔ اگلی سیٹ کا جادو چُونکہ ٹوٹ چُکا تھا اس لیے میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور غالباً سو بھی گیا تھا کیونکہ جب بس دِلّی پہنچ کر رُکی تو اُس لڑکی نے اُترتے وقت ہم دونوں پر ایک ایسی غضب ناک نظر ڈالی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا بہُت مُشکل ہے۔

دِلّی میں ہمارا سارا پروگرام منیر احمد شیخ کی وساطت سے طے ہونا تھا جو وہاں ہمارے سفارت خانے میں پریس کونسلر تھے لیکن چُونکہ ہمیں نہ ان کے گھر کا پتا تھا اور نہ ہی ہم سفر اور شب بیداری کی وجہ سے سیدھے اپنے سفارت خانے میں جانے کی حالت میں تھے اِس لیے یہی طے پایا کہ فوری طور پر کسی ہوٹل میں پڑاؤ کیا جائے۔ ٹیکسی والا ہمیں دِلّی کے ایک مہنگے علاقے میں لے گیا جہاں گیسٹ ہاؤس نُما ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ کرائے خاصے زیادہ تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کناٹ پیلس کے نزدیک واقع رنجیت ہوٹل میں ڈیرا ڈالیں جس کا پتا ہمیں راجندر ملہوترہ نے دیا تھا، مگر La Sagrita گیسٹ ہاؤس کی منیجر مسز پاوا نے یہ کہہ کر ہمیں نفسیاتی محاذ پر شکست دے دی کہ وُہ بھی لاہور کی رہنے والی ہے۔ رہی سہی مزاحمت اُس نے پنجابی بول کر اور یہ کہہ کر ختم کر دی کہ آپ لوگوں کے ساتھ انتہائی رعایت کی جائے گی۔

لا سگریٹا کا کمرہ نمبر ۲۰۵ پہلی نظر میں بالکل او کے تھا۔ ہر چیز نک سک سے درست نظر آ رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دُوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں تسلّی دی کہ کرایہ زیادہ سہی مگر ناجائز نہیں۔ ٹیلیفون اُٹھایا تو فوراً ایک ایسی آواز نے گڈ مارننگ کہا جس کی عمر مسز پاوا سے کم از کم چالیس سال کم دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے مُنیر احمد شیخ کا نمبر دیا، اسی مُترنم اور میٹھے لہجے میں "ابھی ملاتی ہوں" کہا گیا اور خاموشی چھا گئی۔ عطاء باتھ رُوم میں تھا اور میں ٹیلیفون کورنیس امروہوی کے تجویز کیے ہوئے

ایک عمل کے انداز میں گھُور رہا تھا۔ خاصے طویل وقفے کے بعد گھنٹی بجی۔ آواز کچھ عجیب سی تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا پتا یہاں اِس طرح کی گھنٹی ہو۔ فون اُٹھایا تو دوبارہ گھنٹی بجی۔ کوئی دروازے پر تھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ساڑھی میں لپٹی ایک عجیب و غریب چیز کھڑی تھی۔

"ذرا پلیز اپنے پاسپورٹ دیجیے، ایک کالم رہ گیا ہے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ آواز ہو بہو وہی تھی جو کچھ منٹ پہلے میں نے فون پر سُنی تھی۔ پریم چند نے اپنے کسی کردار کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ عُمر کے اس حصّے میں تھی جہاں بدصُورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" کاش پریم چند نے اِس حسینہ کو ایک نظر دیکھ لیا ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے تناسخ کے نظریے میں سچائی محسوس ہُوئی کیونکہ بیس بائیس کی عمر میں اِس طرح کا جسم اور چہرہ کسی پچھلے جنم کی سزا ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے نظریں جُھکاتے ہُوئے کہا:

"ایک نمبر دیا تھا ابھی مَیں نے؟"

"جی ہاں ... میں ابھی ملواتی ہُوں ... دراصل ہمارے پاس ایک ہی لائن ہے ... ابھی ملواتی ہُوں ..."

خُدا خُدا کر کے ٹیلیفون مِلا تو ایک اور بُری خبر ہماری منتظر تھی۔ مُنیر شیخ صاحب دو دن قبل پاکستان واپس جا چکے تھے۔ اپنے سفیر ستّار صاحب کا پتا کیا تو معلوم ہُوا کہ وہ مدراس گئے ہُوئے ہیں اور اکیس تاریخ کو لوٹیں گے یعنی ہماری روانگی سے ایک دن بعد .....

"ہور چُوپو" میں نے عطاء سے کہا۔

اُس نے مجھے ایک طرف ہٹاتے ہُوئے حسبِ معمول اپنے لباس میں موجود تمام جیبوں کی تلاشی لی اور پھر اٹیچی کیس سے اپنی مشہورِ زمانہ ٹیلیفون ڈائری نکالی جو اپنی شکل و شباہت میں قبل مسیح کے مخطوطوں کو مات کرتی ہے۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد اُس نے بتایا کہ مجتبیٰ حسین اور خلیق انجم حیدرآباد گئے ہُوئے ہیں۔ ذہین نقوی اور

آمنہ ابوالحسن کا نمبر نہیں مل رہا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے یہاں سے کوئی فون نہیں اُٹھا رہا۔ میں نے کہا اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ اب سے ہم صحیح معنوں میں پردیس میں ہیں۔ تھوڑی سی مزید کوشش کے بعد آمنہ ابوالحسن کا نمبر مل گیا۔ بہُت خُوش ہوئیں لیکن پتا چلا کہ ان کے میاں بھی حیدرآباد گئے ہُوئے ہیں اور انھیں بچّوں کو سکُول سے لانا ہے اِس لیے فوری طور پر ان کا آنا ممکن نہیں اور اصرار کیا کہ ہم ان کی طرف آجائیں۔ ہم نے اُن سے پُوچھا کہ سُندر نگر (جہاں ہمارا لاسگریٹا واقع تھا) سے کون کون سے قابلِ دید مقامات قریب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آپ لوگ بستی نظام الدّین سے آدھے میل کے فاصلے پر ہیں۔

اِتنا تو ہمیں پتا تھا کہ امیر خسرؒو خواجہ صاحبؒ کے مزار کے احاطے میں دفن ہیں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ پیرومُرشد مرزا غالب بھی اسی نواح میں ہوتے ہیں۔ مزارات وغیرہ سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں کیونکہ میرے نزدیک کسی بڑے تخلیق کار یا بزرگ کی عزّت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے عمل سے روشنی حاصل کی جائے، لیکن پتا نہیں کیوں ان تینوں بزرگوں کے نام سُن کر دل بے اختیار سا ہو گیا۔ یقیناً عطاء کی بھی یہی حالت ہوئی ہوگی کیونکہ ایک لفظ بولے بغیر ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔

خواجہ صاحبؒ کی درگاہ مین روڈ سے دائیں طرف مُڑنے والی ایک ذیلی سڑک پر ہے۔ وہاں ہمیں پہلی دفعہ مسلمان ناموں والے ہوٹل اور دُکانیں نظر آئیں۔ اِسلامی کتابوں کی دکانوں، پھُول والوں کے کھوکھوں اور فقیروں کی ٹولیوں سے گزرتے ہوئے ہم درگاہ میں داخل ہُوئے تو پہلے امیر خسرؒو کا مزار تھا۔ چاروں طرف ایک بے سروسامانی کی سی کیفیّت تھی۔ تقریباً سو برس تک مختلف سلاطین اور شاہی خاندانوں کا مقرب، طوطیِ شکّر مقال، میدانِ سُخن کا شہنشاہ اور خواجہ غریب نوازؒ کا محبُوب مُرید۔ وہ نابغہ روزگار شخص سنگِ مرمر کے ایک نشان تلے اس امر سے بے نیاز سو رہا تھا کہ اس کے لکھے ہُوئے لفظوں کی کمندیں کتنی صدیوں کو اپنا اسیر کر چکی ہیں۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم خواجہ صاحبؒ کے

احاطے میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے مختلف جگہوں پر رکھی ہوئی چندے اور نذرانے کی صندوقچیوں پر نظر پڑی۔ برّصغیر کی اتنی بڑی درگاہ کی خستگی دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ ہندوستان کے مُسلمانوں کی مالی حالت واقعی بہت پتلی ہے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں وہیں بیٹھ گیا۔ خُدا، کائنات اور ان مقدس لوگوں کے درمیان وہ کون سا رشتہ ہے جو ہم عامیوں کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن کبھی کبھی اپنے ہونے کا ایسا بھرپور احساس دلاتا ہے کہ دِلوں پر آیتیں سی اُترنے لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے نفسیات والے فرد کو قوموں کے اجتماعی لاشعور پر تقسیم کر کے اس کا کوئی سبب ایجاد کر لیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جس طرح کائنات کی وُسعت کے آگے ریاضی کے قاعدے اور اعداد و شمار بے بس ہو جاتے ہیں اسی طرح انسان کا باطن بھی اس کے "علم" کی چار دیواری میں کبھی قید نہیں ہو گا۔

باہر نکل کر حسبِ توفیق ہم نے ایک صندوقچی میں کچھ رقم ڈالی لیکن اس سے پیشتر کہ ہم آگے بڑھتے، پتا نہیں کدھر کدھر سے نکل کر چھ سات صاف سُتھرے کپڑوں میں ملبوس داڑھیوں والے نوجوان ہمارے اردگرد جمع ہو گئے اور نذرانہ گزارنے کی تاکید کی۔ ہم نے بتایا کہ ہم اس کام سے فارغ ہو چکے ہیں۔ اِس پر ایک صاحب نے ایک رجسٹر نکال لیا اور کہنے لگے کہ اپنا نام پتا لکھوائیے۔ ہم نے جان چُھڑانے کے لیے لکھوا دیا۔ کہنے لگے اب عمارت کے لیے کچھ دیتے جائیے! بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ سب سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے مختلف خاندانوں کے نمائندے ہیں اور مختلف مدّوں میں چندے وصول کرتے ہیں اور اِس سلسلے میں ان کے درمیان "کاروباری" جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی مزار کی خستگی کی اصل وجہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خستگی نہیں بلکہ ان مجاوروں کی بے ہُنری تھی۔ دُنیا بھی عجیب جگہ ہے۔ کہیں زندوں کا رزق مُردے کھاتے ہیں اور کہیں مرنے والوں کے رِزق سے زندہ لاشیں پلتی ہیں۔

درگاہ سے نکلے تو دُھوپ اور بھوک دونوں میں تیزی آ چکی تھی۔ محبوب ہوٹل کے تنور سے نکلتے ہُوئے گرم گرم نانوں نے ہمارے دامنِ دل کو کھینچتے ہوئے بتایا کہ جا ایں جاست۔

کھانا اگرچہ واجبی سا تھا لیکن بِل اپنے پُرانی انارکلی والے پیپل ہوٹل سے بھی کم تھا۔ میں نے عطاء سے کہا: "اگر ہم یہی کھانا کسی بڑے ہوٹل میں کھاتے تو کم از کم اس سے دس گُنا زیادہ بِل آتا۔" "اور ذائقہ اِس سے بھی گیا گزرا ہوتا" عطاء نے میری بات سیکنڈ کرتے ہُوئے کہا۔

اِس پر مجھے کراچی کا ایک بڑا ہوٹل یاد آگیا ہے جہاں ایک اِنتہائی بدمزہ بیف برگر کا بِل جب چھتیس رُوپے طلب کیا گیا تو میرے ایک ساتھی نے بڑی معصُومیّت سے پُوچھا تھا: "کیوں بھائی اِس برگر میں جس بھینسے کا قیمہ استعمال کیا گیا ہے اُس نے کوئی مقابلہ جیتا تھا؟"

تھوڑی دُور چلنے کے بعد ہم نے ایک راہ گیر سے غالب کے مزار کا پتا پوچھا تو معلوم ہُوا کہ ہم بالکل اُس کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ یہ مزار مُغلوں کے پُرانے شاہی قبرستان کے بیرُونی احاطے میں واقع ہے۔ قبرستان کے دروازے سے چند فٹ ادھر بائیں جانب غالب کی قبر ہے جس کے گرداگرد سفید پتّھر سے ایک چبوترہ اور ایک منقش سائبان تعمیر کیا گیا ہے، لیکن یہ ساری تعمیر اتنے مختصر رقبے میں ہے کہ مزار کے اندر فاتحہ خوانی کے لیے بیک وقت چھ سے زیادہ آدمی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ لوحِ مزار پر غالب کے اشعار ہی اس کا تعارُف کرا رہے ہیں۔ پتا نہیں کیوں اُس وقت مجھے یہ شعر بہت یاد آیا:

ہر نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عُمر میں
حیف ہے ان پر جو کھوویں زندگانی مفت ہے

ہم دونوں مقبرے کے اندر بہت دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ چند قدم کے فاصلے پر اپنے وقت کے وہ لوگ سو رہے تھے جن کا سکّہ خُود وقت پر چلتا تھا۔ عالیشان محلّوں میں زندگیاں گزارنے والے یہ بے نام بڑے آدمی اِس قرض کی مے پینے والے اپنے ہی درباری شاعر کے مُقابلے میں کتنے بے حقیقت تھے۔ تاریخ کے waste land میں، جہاں افراد تو کیا پُوری پُوری تہذیبیں گردبادوں کی طرح بے ٹھکانہ ہو جاتی

ہیں، یہ کیسا نخلِ سبز تھا کہ جس کی چھاؤں اردو زبان و ادب سے ذوق رکھنے والے ہر شخص کی رُوح میں خیمہ کیے ہُوے ہے۔ ہم، جو ابھی خوابِ ہُنر میں ہیں مگر اپنی چار دن کی جزیروں جیسی شہرت پر پھُولے نہیں سماتے، اس سمندر گیر صاحبِ ہُنر کے رُوبرو اپنی ہیچمدانی پر نادم و شرمسار کھڑے تھے۔ کیا اپنی گرمیِ نشاطِ تصوُّر میں اُس نے جس گلشنِ ناآفریدہ کا خواب دیکھا تھا وہ کبھی ظہُور میں آئے گا! کیا ہُنر کی قسمت میں کوئی منزل نہیں ہے؟ میرے ذہن میں اس کے دو شعر گوُنجے:

وہ سحر مُدعا طلبی میں نہ کام آئے!

جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

کچھ آنسو میرے دل کے اندر کی طرف گرے اور شاید آنکھوں میں آجاتے لیکن ایک لمحے کے لیے مجھے یوُں لگا جیسے میرے جھُکے ہُوئے سر پر اُس نے اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اُس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا:

گُل، غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے

اے آگہی، فریبِ تماشا کہاں نہیں؟

ہاں، ٹھیک ہی تو کہا ہے اُس نے۔ یہ سب کچھ فریبِ تماشا ہی تو ہے ورنہ منوں مٹّی تلے دبی ہوُئی یہ ایک مشتِ خاک مجھ سے کس طرح ہمکلام ہو سکتی تھی!

مزار سے باہر لیکن اسی احاطے میں غالب کی بیوی اور بھانجے عارف کی قبریں ہیں۔ وہاں فاتحہ پڑھ کر مُڑے تو فقیروں کے ایک خاندان نے گائیڈ کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا۔ ان کی لیڈر ایک نوجوان عورت تھی جس کی گفت گُو میں سوائے "گالب صاحب" کے اور کسی بات کی سمجھ نہیں آتی تھی اور وہ وقفے وقفے سے ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش بھی کر رہی تھی کہ جو رقم ہم اُسے دیں گے وہ انصاف کے ساتھ تمام لوگوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ اہلِ خیر پر خدا کی کیسی رحمت ہوتی ہے کہ ان کا سلسلۂ فیض کسی نہ کسی رنگ میں

چلتا ہی رہتا ہے۔

ہوٹل واپس پہنچے تو ریسپشن کاؤنٹر پر مسز پاوا نے تیسری مرتبہ اپنے ٹمپل روڈ، لاہور والے مکان کے متعلق بتایا۔ عطاء نے میرے کان میں کہا: "اس سے ذرا پوچھو تو سہی وہ دلّی کہاں ہے جس کے بارے میں میر نے کہا تھا:

دلّی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی!

میں نے بھی آواز دبا کر جواب دیا کہ وہ کوچے تو میر کی زندگی میں ہی خوابِ و خیال ہو گئے تھے۔ اب تو یہی کچھ ہے جو سامنے نظر آ رہا ہے۔

عطاء نے کہا: "یہ تو پرانی بلکہ بہت پرانی دلّی ہے۔"

ہم نے مسز پاوا سے درخواست کی کہ ہماری فون کال ذرا جلدی ملا دیا کریں کیونکہ دلی میں ہمارے قیام کا پروگرام اسی مواصلاتی رابطے پر منحصر ہے۔ اب پتا نہیں یہ ہماری درخواست کا اثر تھا یا یہ خوف کہ کہیں گاہک ہاتھ سے نہ نکل جائے، جو نمبر بھی ہم نے دیا کھٹ سے ملا دیا گیا۔ آمنہ ابوالحسن نے بتایا کہ غالب اکیڈیمی کے ذہین نقوی صاحب سے ان کی بات ہو گئی ہے اور وہ کل صبح ہمارے منتظر ہوں گے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بتایا کہ پرسوں دوپہر ہم فارغ رکھیں کیونکہ جامعہ ملّیہ میں شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبہ ہمارے ساتھ ایک خصوصی محفل کا اہتمام کر رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو مجلس کے پروڈیوسر رفعت سروش نے اطلاع دی کہ پاکستان کے مہمان شعراء کی ایک خصوصی نشست وہ اپنی اردو مجلس کے لیے ریکارڈ کر رہے ہیں جس کی تفصیل وہ کل بتائیں گے اور یاد دلایا کہ وہ اِس سلسلے میں انبالے میں ہم سے پکّا وعدہ لے چکے ہیں۔ دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی اِس لیے کھانا ہم نے کمرے میں ہی کھانے کا فیصلہ کیا اور زندگی میں پہلی بار رات کے کھانے میں مکھن ٹوسٹ اور جیم کا انتخاب کیا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ کیوں؟

۱۷ مارچ کو صبح آٹھ بجے کے قریب جب میری آنکھ کھلی تو کھلا ہوا رسالہ میرے

نیچے دبا ہوا تھا۔ مجھے ایک دم یاد آگیا کہ سونے سے پہلے میں ایک ایسا مضمون پڑھ رہا تھا جس میں مصنّف نے انتہائی بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے اپنے کچھ ایسے تجربات بیان کیے تھے جن پر جوش صاحب کی "یادوں کی برات" کا گمان ہوتا تھا۔ عطاء اپنے خراٹوں کے مکمل آرکسٹرا کے ساتھ سو رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر دانت صاف کیے۔ اخبار منگوا کر حسبِ معمول سب سے پہلے کھیلوں کا صفحہ پڑھا، پھر باقی صفحوں کی موٹی موٹی سُرخیاں دیکھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پُورے اخبار میں ایک بھی فلم کا اشتہار نہیں تھا۔ سینما کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود اخبار میں فلموں کے اِشتہار نہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اتفاق کی بات ہے بعد کے دنوں میں کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ میں کسی سے اِس کا سبب بھی نہ پُوچھ سکا۔ باتھ رُوم میں شیو کے لیے گرم پانی کا نل کھولا تو پانی ٹھیک ٹھاک گرم تھا لیکن شیو کے دوران ہی اس کا درجۂ حرارت کچھ اس تیزی سے گرنا شروع ہوا کہ جب مُنہ ہاتھ دھونے کی باری آئی تو وہ باقاعدہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ منیجر کو اطلاع دی تو اُس نے بتایا کہ ہوٹل کے مکینک کو بھجوایا جا رہا ہے۔ چند لمحوں بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ روم سروس والا بیرہ اندر آیا اور 'حکم' پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا کہ فی الحال ہمیں اس کی نہیں ہوٹل کے مکینک کی ضرُورت ہے۔ اس نے ایک پیچ کس دکھاتے ہوئے اطلاع دی کہ وہی ہوٹل کا مکینک بھی ہے۔ میں نے اسے گیزر کی خرابی سے آگاہ کیا۔ اُس نے باتھ روم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بغیر کسی چیز کو چھوئے فیصلہ سُنا دیا کہ مرمّت میں کچھ دیر لگے گی اور مشورہ دیا کہ ہم لوگ کسی اور باتھ رُوم میں نہا لیں۔ نئے باتھ رُوم میں پہنچا تو پہلے سین کا "ایکشن ری پلے" منتظر تھا۔ لیکن میں چونکہ اُس وقت تک بے خطر ہو کر ٹب میں کُود چکا تھا اس لیے سوائے موسیقی سے دست و گریباں ہونے کے کچھ نہ کر سکا اور وہ سب مشہور گانے گا ڈالے جن کی طرزیں میری اپنی ایجاد کی ہوئی ہیں۔

آمنہ ابو الحسن ٹھیک وقتِ مقررہ پر آگئیں۔ ان کے میاں مصطفےٰ علی اکبر آل انڈیا ریڈیو کے مشہور اُردو نیوز ریڈر ہیں اور ذاتی حیثیت میں اپنے آبائی وطن حیدر آباد کی سیاست

سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ آمنہ بار بار معذرت کر رہی تھیں کہ اگر انھیں ہمارے آنے کا پہلے سے علم ہوتا تو وہ اپنے میاں کو روک لیتیں اور یُوں ہمارے دلّی کے قیام کے دوران ان کی موٹر ہمارے کام آجاتی۔ جس خلُوص سے اُنھوں نے یہ بات کی وہ اُن کی پُروقار اور مہمان نواز شخصیّت کی آئینہ دار تھی۔ غالب اکیڈیمی پُہنچے تو ذہین نقوی ہمارے مُنتظر تھے۔ اُنھوں نے ہمیں اکیڈیمی کی عمارت کے مختلف حصّوں کی سیر کرائی اور ان سب منصُوبوں پر روشنی ڈالی جن پر کام ہو رہا ہے یا جو ابھی زیرِ ترتیب ہیں۔ عمارت بڑی نفیس، کُشادہ اور مضبُوط ہے۔ اُردو رسمُ الخط کے تحفّظ، ترویج و ارتقاء اور اسے ایک ذریعۂ معاش بنانے کے لیے اکیڈیمی میں کتابت کے مختلف اسالیب کے ساتھ ساتھ آرائشی خطّاطی کی بھی تربیّت دی جاتی ہے۔ اِس کے علاوہ اکیڈیمی کی ایک اپنی مستقل آرٹ گیلری بھی ہے جہاں چند دن پہلے مشہُور پاکستانی مصوّر صادقین کی ایک بہُت ہی کامیاب نمائش مُنعقد ہُوئی تھی۔ اِس کے علاوہ ایک خاصے بڑے کمرے میں غالب کی زندگی کو تصویروں، دستاویزوں، تحریروں اور اس کی ذات سے متعلق دیگر یادگاروں سے مُزیّن کر کے ایسا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے کہ آپ اس کی شخصیّت کو اس کے عہد کے پس منظر میں دیکھ سکیں۔ اسی طرح غالب لائبریری میں غالب سے متعلق بے شمار مطبُوعہ مواد کے علاوہ بیش قیمت مسوّدات بھی محفُوظ کیے گئے ہیں۔ غالب سے متعلق واقعات، خطُوط اور شخصیات کی علیٰحدہ علیٰحدہ فائلیں کھولی گئی ہیں۔ مثلاً اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ غالب کا شاگرد مُنشی شیو نرائن کون تھا اور اس کے بارے میں غالب اور دُوسرے لوگوں نے کیا لکھا ہے تو آپ کو منشی شیو نرائن کی فائل میں یہ سب کچھ ایک جگہ پر مل جائے گا۔ ہم نے یہ فائلیں دیکھ کر ذہین نقوی صاحب کو بہُت داد دی اور بتایا کہ فائلیں ہمارے یہاں بھی کھلتی ہیں اور اکثر حکومتیں بدلنے کے ساتھ ساتھ ان میں موجُود افراد کے گناہ و ثواب بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن یہاں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عطا نے ذہین نقوی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے اس ہُنر کو زیادہ عام نہ کریں ورنہ سی آئی ڈی والے انھیں بطور ریکارڈ کیپر پکڑ کر اپنے محکمے میں لے جائیں گے۔

اکیڈیمی کی عمارت اور انتظام دیکھ کر ہمارا خیال تھا کہ یہ بھی ہمارے مرکزی اُردو بورڈ کی طرح کا سرکاری گرانٹ سے چلنے والا کوئی ادارہ ہے لیکن جب ذہین نقوی نے بتایا کہ یہ سب کا سب ایک فردِ واحد کی محنت، لگن اور غالب پسندی کا کارنامہ ہے تو شروع میں سچ مچ ہمیں یقین نہیں آیا۔ ذہین صاحب نے تفصیلات ہوتے ہوئے کہا کہ ہمدرد ٹرسٹ کے حکیم محمد حمید (جو پاکستان والے حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی ہیں) نے ۱۹۶۸ء میں بستی نظام الدینؒ کے مجاوروں سے اراضی کے دو ٹکڑے خریدے۔ ایک پر غالب اکیڈیمی کی عمارت تعمیر کی گئی اور دُوسرے پر ایک کمرشل بلڈنگ بنا کر اس کا کرایہ مستقلاً اکیڈیمی کے نام کر دیا ہے جو تقریباً دس ہزار روپے مہینہ بنتا ہے۔ بھارت کے مرحوم صدر ذاکر حسین بھی اکیڈیمی کے سلسلے میں بہت سرگرم تھے لیکن موت نے انھیں زیادہ مُہلت نہیں دی۔ یہ بھی پتا چلا کہ حکیم صاحب موصوف کا ادب سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح لکھنے لکھانے اور سیاست وغیرہ سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ حکیم سعید کے ذکر سے مجھے خیال آیا کہ یُوں تو وہ بھی شامِ ہمدرد، یونیسکو کے خوبصورت باتصویر رسالوں اور ہمدرد وقف کی مطبوعات کے ذریعے سے ادب کی سرپرستی کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہو اگر ان سب کی جگہ وہ کوئی ایسا ہی مستقل نوعیت کا کام کر جائیں۔

ذہین نقوی صاحب ابھی یہ کہانی سُنا ہی رہے تھے کہ سیّد ضمیر جعفری اور سُلطان رُشک آ گئے۔ انبالے سے چونکہ ہم لوگ سہارنپور اور وہ دلی چلے گئے تھے اس لیے جلدی جلدی گزشتہ دو دنوں کے اہم واقعات کا تبادلہ عمل میں لایا گیا۔ ضمیر صاحب ۱۹۴۶ء کے بعد پہلی بار دلّی آئے تھے اور اس عُمر اور اپنے مُٹاپے کے باوجود ہم لوگوں سے زیادہ مُستعد اور پُرجوش نظر آ رہے تھے۔ ان کی پُوری شخصیت موسمِ بہار کی شاموں جیسی ہے۔ غالب نے جب یہ کہا تھا:

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

تو مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے محبوب کی نہیں تو یقیناً ضمیر صاحب جیسی کسی باغ و بہار شخصیت کی صحبت میں ہوگا۔ ہاں یہ میں نے ضمیر صاحب کے مٹاپے کا جو ذکر کیا ہے تو اس کا تعلق بھی ان کے اپنے ہی ایک شعر کے ساتھ ہے جو کچھ یوں ہے:

یہ بڑھاپا تو مجھ کو خدا نے دیا!
ہے مٹاپا مگر میرا خود ساختہ

ضمیر صاحب کے آتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا اور ذہین نقوی صاحب کے بارے میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ ہنسنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ وہیں باتوں باتوں میں پتا چلا کہ شمس الرحمان فاروقی بھی آج کل دلّی میں ہیں اور وہیں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان حسین صاحب نے مجھے ان کے گھر اور دفتر کے فون نمبر بھی لکھوا دیے۔ فاروقی سے میری خط و کتابت بہت مختصر ہے لیکن تاریخی اعتبار سے یہ تقریباً بارہ برس پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں اُن کے پرچے "شب خون" میں چھپتا بھی رہا ہوں اور گزشتہ برس لاہور میں اُن سے ملاقات بھی ہوئی تھی، چنانچہ میں نے فوراً ان کے دفتر کا نمبر گھمایا۔ گھنٹی دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو کے انداز میں دیر تک بجتی رہی۔ حسین صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ شاید ابھی لنچ بریک ختم نہیں ہوا۔ بعد میں فاروقی نے بتایا کہ اگر ہم اسی نمبر پر ٹرائی کرتے رہتے تو یہ لنچ بریک کبھی ختم نہ ہوتا کیونکہ وہ نمبر اُن کے دفتر کا نہیں تھا۔

غالب اکیڈیمی سے نکلے تو سوچا کہ اس وقفے کو غنیمت جان کر کوئی فلم دیکھ لی جائے کیونکہ اس کے بعد کی مصروفیات میں اس کی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ رکشے والا ہمیں ہوٹل سے قریب ہی واقع سٹیڈیم سینما میں لے گیا جہاں ہندوستانی "لَو سٹوری" لگی ہوئی تھی۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کے دنوں کا بنا ہوا ایک عارضی سینما گھر تھا۔ فوجیوں کے لیے بنایا گیا تھا چنانچہ ابھی وہاں ٹکٹ کا ریٹ باقی سینماؤں کی نسبت تقریباً نصف یعنی سوا تین روپے تھا جب کہ ہمارے یہاں یہی ٹکٹ دس روپے میں ملتا ہے۔ "لَو سٹوری" گزشتہ برس کی کامیاب ترین فلموں میں سے تھی اور پاکستانی پریس میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ چھپتا رہا تھا۔ ہیرو کمار گرو ماضی کے ایک ہیرو راجندر کمار کا بیٹا تھا۔ ہندوستان

میں آج کل teenage رُومانس پر مبنی فلمیں بنانے کی لہر چلی ہُوئی ہے اور پُرانے ایکٹر دھڑا دھڑ اپنی اولادوں کو سامنے لا رہے ہیں۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ بعض کیسوں میں سینئر نسل بھی ابھی تک فلموں میں مرکزی کردار ادا کر رہی ہے جیسے شِشی کپُور اور اس کا بیٹا۔ فلم شرُوع ہُوئی تو ابتدا ہی سے اندازہ ہو گیا کہ اس میں کہانی کم اور "سٹوری" زیادہ ہے۔ کِرداروں کا تعارُف اِس طرح کرایا گیا جیسے ٹی وی پر کرکٹ میچ کی جھلکیاں دکھائی جا رہی ہیں۔ ہیرو اور ہیروئن کے والدین کو برسبیلِ تذکرہ دِکھانے کے بعد ہیرو اور ہیروئن کی مُلاقات ہُوئی اور پھر فلم کے اختتام تک ہوتی ہی چلی گئی۔ سوائے میوزک کے پُوری فلم اِنتہائی بے معنی اور بے ربط واقعات کا ایک ملغُوبہ تھی اور اِنٹرول کا وقفہ اس قدر مختصر تھا کہ اس میں زیادہ سے زیادہ آپ اپنی سیٹ پر پہلُو بدل سکتے ہیں۔ غالباً اسی نوع کی قید کو قیدِ بامشقّت کہا جاتا ہے۔

ہمارے ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر سُندر نگر کا شاپنگ سنٹر تھا۔ عطاء کو عارف نظامی کے لیے ایک کتاب ڈھونڈنا تھی اور مجھ سے اشفاق صاحب نے اجاریہ رجنیش کی کتابوں کے بارے میں کہہ رکھا تھا، چنانچہ ہم سب سے پہلے کتابوں کی دکان میں داخل ہُوئے۔ کتابوں کے مُعاملے میں ہندوستان میں جہاں جہاں ہم گئے انگریزی کا غلبہ بُہت واضح تھا۔ رسائل بھی زیادہ تر انگریزی میں تھے اور ان کی بیشتر تعداد ایسے مواد اور تصویروں سے پُر تھی جنھیں ہمارے یہاں لوگ گناہوں کی طرح چھپا کر رکھتے ہیں مگر وہاں ہر عُمر کے مرد و زن نہ صرف ان کی سرِعام خریداری میں مصرُوف تھے بلکہ خریدنے سے پہلے اچھّی طرح ٹھوک بجا کر دیکھتے بھی تھے۔ بیشتر رسائل کے اندرُونی صفحات پِن لگا کر بند کر دیے گئے تھے۔ وجہ پُوچھی تو دُکاندار نے بتایا کہ یہ مُفت بینوں سے بچاؤ کے لیے حفاظتی اقدام ہے کیونکہ دُوسری صورت میں لوگ خریدنے کے بجائے تصویریں وغیرہ دیکھ کر دل پشوری کر لیتے ہیں اور یُوں ان کے کاروبار کا نقصان ہوتا ہے۔ ہماری مطلُوبہ کتابیں وہاں نہیں تھیں لیکن مجھے انگریزی لطیفوں کے چند ایسے مجمُوعے مل گئے جو میرے لیے نئے تھے۔

عطاء نے جُملہ کسا:

"لگتا ہے ٹی وی والوں سے صلح کے بعد اب تم کوئی مزاحیہ سیریل لکھنے کا ارادہ کر رہے ہو۔"

میں نے کہا: "نہیں یہ میں تمہارے لیے بطور ریفرنس بکس کے خرید رہا ہوں کیونکہ میرے سنائے ہوئے لطیفے جو تم اپنے کالموں میں میرا حوالہ دیئے بغیر درج کرتے ہو میں نے انھی کتابوں سے پڑھے ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تم اور کچھ نہیں تو کم از کم لطیفوں کی حد تک تو خود کفیل ہو جاؤ گے۔"

چند قدم کے فاصلے پر نوادرات کی ایک دکان تھی۔ عطاء نے اس میں داخل ہونے کی کوشش کی تو میں نے اُسے روکا کہ پہلے شوکیس میں لگی ہوئی قیمتوں کی پرچیوں پر ایک نظر ڈال لو۔ اُس نے وہ نظر ڈالی اور پھر "ایک بار دیکھا ہے اور دوسری بار دیکھنے کی ہوس نہیں ہے" کی مجسّم تصویر بنا ہوا جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اگلی دکان چائے کی تھی لیکن یہاں چائے جس شکل میں ملتی تھی اس کی کیفیت کولرج کے لفظوں میں کچھ یوں تھی:

Water water every where

And not a drop to drink

مالک دکان مسٹر ہیکل کے چہرے پر ایسی بے چارگی اور آواز میں ایسی لجاجت تھی کہ بڑے سے بڑا سنگدل گاہک بھی اس دکان سے خالی ہاتھ نہیں نکل سکتا تھا اور ہم تو رقیق القلب ہونے کے ساتھ ساتھ پردیسی بھی تھے چنانچہ اُس نے ہمیں طرح طرح کے ڈبوں سے اتنا لاد دیا کہ ہم شاعر کے بجائے چائے کے ہول سیل ڈیلر نظر آنے لگے۔ اُس نے یہ چائے ہمارے ہاتھ بالکل اسی طرح بیچی جیسے ڈپٹی نذیر احمد کے "توبتہ النصوح" میں مرزا ظاہر دار بیگ نے کلیم کو چنے کی دال کھلائی تھی۔ ہیکل کو اردو اور فارسی سے بھی شغف تھا جس کا اُس نے عملی مظاہرہ بھی کیا۔ گویا اب ہم چاہتے بھی تو اُس کے جال سے نہیں نکل سکتے تھے۔

ہوٹل پہنچے تو مسز پادا نے بظاہر بڑے سرسری انداز میں ہماری شاپنگ کا جائزہ لیا لیکن اس کی آنکھوں میں تیرنے والی شک کی پرچھائیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے ان

لفافوں میں چرس یا ہیروئن ہونے کا خاصہ قوی شبہ ہے۔ ہم نے یہ محسوس کرکے اپنے انداز کو جان بوجھ کر کچھ اور مشکوک بنا لیا۔ میں نے بڑے تشویش بھرے انداز میں پوچھا کہ ہمارے بعد کوئی فون تو نہیں آیا۔ مسز پاوا نے کہا: "نہیں۔" میں نے مزید متشوّش ہو کر بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا:

"ابھی آئے گا ہم اپنے کمرے میں ہیں، فوراً ملوا دیجیے گا۔"

یہ کہہ کر میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیکٹوں کو اس طرح سمیٹا جیسے انھیں مسز پاوا کی نظروں سے چھپانا مقصود ہو۔ وہ واقعی پریشان ہو گئی کیونکہ اس بار اُس نے ہمیں اپنے لاہور والے مکان کی کوئی بات نہیں سنائی۔ نو بجے کے قریب رفعت سروش کا فون آیا کہ ریکارڈنگ کل بارہ بجے ہو گی۔ میں نے بتایا کہ ہم اُس وقت کے لیے ڈاکٹر نارنگ سے جامعہ ملیہ آنے کا وعدہ کر چکے ہیں اس لیے وہ ڈاکٹر صاحب سے بات کر کے اپنا یا اُن کا وقت بدل لیں کیونکہ دوسری صورت میں ہمیں مجبوراً مشاعرے میں شرکت سے معذرت کرنا ہو گی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ رفعت صاحب سے اُن کی بات ہو گئی ہے اور یہ طے پایا ہے کہ ہم جامعہ ملیہ سے فارغ ہو کر ڈھائی بجے کے قریب ریڈیو سٹیشن پہنچ جائیں گے۔

اٹھارہ کی صبح کو ہم جلدی جاگ گئے۔ گیارہ بجے جامعہ ملیہ سے ایک طالب علم نے ہمیں لینے آنا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ اس سے قبل ہم قطب مینار دیکھ آئیں۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو معلوم ہوا کہ قطب مینار جنوبی دلّی میں ہے۔ گویا ہمیں دلی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانا تھا۔ اس ٹیکسی کا ڈرائیور بھی سکھ تھا لیکن اس کا اندازہ اس کی ڈرائیونگ سے کرنا بہت مشکل تھا۔ راستے میں ہم نے صفدر جنگ پل کے قریب وہ جگہ دیکھی جہاں سنجے گاندھی کا جہاز کریش ہوا تھا۔ وقت کی کمی اور فاصلے کی زیادتی کے بین بین سفر کرتے ہوئے ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں قطب مینار پہنچے تو شفیق الرحمٰن کی تزکِ نادری میں لکھا ہوا نادر شاہ کا حکم بہت یاد آیا جس میں ٹورسٹوں کی سہولت کے لیے تمام تاریخی عمارتوں کو

ایک جگہ پر جمع کرنے کا آئیڈیا پیش کیا گیا تھا۔

قطب مینار اُن عمارتوں میں سے ایک ہے جن کا حُسن لفظ اور کیمرے میں قید نہیں ہوسکتا۔ اِس کے اصل جوہر تو اس کی قُربت میں ہی کھلتے ہیں۔ یہ سنگ تراشی، نقاشی اور فنِ تعمیر کا ایک حیرت انگیز مجمُوعہ ہے۔ اِس کی بلندی کے سائے میں کھڑے ہوں تو اپنا وجُود اس قدر بے حقیقت محسُوس ہوتا ہے کہ دُم گھٹنے لگتا ہے۔ انسان جب اپنی تخلیق کے سامنے اتنا بے بس ہوتا ہے تو پھر وہ پُوری کائنات سے کس طرح نبرد آزما ہولیتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ازل اور ابد کی بے انت وسعتوں میں کہیں نہیں ہے لیکن یہ مبہوت کردینے والی عظمت کچھ ایسی باتیں سوچنے پر مجبُور ضرور کر دیتی ہے جس کی فرصت ہمیں اپنی بے حد مصرُوف زندگیوں میں سلے بھی تو نہیں ملتی۔ مینار کے علاوہ اردگرد کی تمام عمارات ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں اور اگرچہ مختلف جگہوں پر سنگی کتبوں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ کون سی عمارت ہے (تھی) اور اس کے ساتھ اس کی مختصر تاریخ بھی درج کی گئی ہے لیکن شکستہ دیواروں اور پتھروں کے نیم ایستادہ ڈھانچوں کے سوا آپ کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اِنتہا یہ ہے کہ جب ہم اس عمارت میں داخل ہُوئے جِسے "مسجدِ قوت الاسلام" کہا گیا تھا تو بہُت دیر تک ہم اسی تذبذب میں رہے کہ یہ کوئی اور جگہ ہے۔ جس احاطے میں ہم کھڑے تھے وہ تو صحنِ مسجد سے مشابہ تھا لیکن محراب و منبر کی اور کوئی علامت قابلِ شناخت حالت میں نہیں تھی۔ ایک طرف ڈیوٹی پر موجُود عملے کے کچھ افراد کھڑے تھے۔ میں نے ایک سے پوچھا کہ کیا یہی مسجدِ قوت الاسلام ہے تو اُس نے بڑے مُبلغانہ جوش کے ساتھ کہا:

"مہاراج یہ ہے تو مُسلمانوں کی مسجد مگر اس کا نام معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ مُسلمانوں نے ستائیس جین اور ہندُو مندر مسمار کر کے ان کے پتھروں سے اسے بنایا تھا۔"

باہر نکلے تو دروازے پر یہی مضمون ایک پتھر پر لکھا نظر آیا۔ چند قدم آگے بڑھے تو گائیڈ غیر ملکی ٹورسٹوں کو یہی کہانی مزے لے لے کر سُنا رہا تھا۔ میں نے عطاء کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ بھی کشیدہ ہو چلا تھا۔ اُس نے کہا:

"اِسی لیے میں کہتا ہُوں کہ جو لوگ تقسیم کو غلط سمجھتے ہیں اُنھیں چند مہینوں کے لیے ضرور یہاں بھجوانا چاہیے۔"

ہم تاریخ اور جُغرافیے کے اِس باہمی عمل اور ردِّ عمل پر باتیں کرتے ہُوئے خواجہ قطبُ الدّین بختیار کاکیؒ کا مزار بھی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے جسے ہماری تاریخی معلومات کے پیشِ نظر یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ دو تین لوگوں سے پُوچھا، اُنھوں نے جواب میں صرف شانے ہلا دیے۔ ایک پان سگریٹ کی دُکان والا نظر آیا، سوچا یہیں کا ہے، اس سے پتا کرنا چاہیے۔ اُس نے انتہائی بے نیازی سے جواب دیا:

"وہ تو اِدھر نہیں ہے..."

"تو پھر کہاں ہے؟" ہم نے پُوچھا۔

"ادھر مہرولی میں ہے۔" اُس نے ہاتھ سے ایک ایسا مُبہم اشارہ کیا جس سے کوئی بھی سمت مُراد لی جا سکتی تھی۔

"مہرولی کیا ہے بھائی؟"

مگر بھائی نے ہماری بات کو تضیعِ اوقات سمجھتے ہُوئے مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ اِس سے پیشتر کہ میں اِس بدلحاظ آدمی سے بزبانِ پنجاب گفتگو کرتا عطاء نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا:

"مٹی پاؤ پہلوان جی۔ ناراض ہونے کا ٹائم نہیں ہے، ویسے بھی یہ آپ کے جوڑ کا نہیں۔"

ہوٹل پہنچے تو جامعہ ملّیہ کا ایک نوجوان طالب علم، جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا، ہمارا منتظر تھا۔ جامعہ کا شُعبۂ اُردو دو مُختلف عمارتوں میں واقع ہے۔ کلاسیں جامعہ کی مرکزی عمارت میں ہوتی ہیں اور اساتذہ کے کمرے اور سیمینار رُوم اس عمارت میں واقع ہیں جہاں ہمیں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے کمرے میں نہیں تھے، البتہ اُن کے رُفقا میں سے مُظفر حنفی، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر صُغرا مہدی اور دو اور اُستاد ہمارے اِستقبال کے لیے موجُود تھے۔ سب لوگ بڑی محبت سے ملے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر عنوان چشتی

اور ایک اور نوجوان ڈاکٹر بھی تشریف لے آئے جن کے بارے میں پتا چلا کہ مُطالعۂ اقبال سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ ان کا نام بڑا آسان اور یاد رہ جانے والا تھا مگر ایک ساتھ زیادہ لوگوں سے تعارُف میں یہی بُرائی ہے کہ نام آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ چائے کے دوران زیادہ تر "کون کہاں ہے" قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نارنگ بھی پہنچ گئے۔ دراصل جامعہ ہنگاموں کی وجہ سے کئی دنوں سے بند تھی اور باقاعدہ طور پر اُسی دن کھُلی تھی۔ ایسے میں مختلف تدریسی شعبوں کے سربراہ جس پریشانی میں مُبتلا ہو سکتے ہیں اس کے آثار ان کے چہرے سے ہویدا تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جامعہ کا مُجوّزہ میر تقی میر سیمینار جس میں شرکت کی دعوت اُنھوں نے چند دن قبل مجھے بذریعہ مُنیر احمد شیخ بھجوائی تھی، حالات ناسازگار ہونے کے باعث مُلتوی کرنا پڑے گا اور اب غالباً دسمبر میں ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ اِس التوا میں آپ کا کوئی قصُور نہیں، دراصل یہ سارا چکّر میر کے ستاروں کا ہے جو اُسے پسِ مرگ بھی چین نہیں لینے دیتے۔ میر کی بات چلی تو اس کے ایسے اشعار کا ذکر بھی چھڑا جن میں کسی لفظ کو بڑے اچھوتے اور نئے انداز میں پیش کیا گیا تھا:

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر رہتا، سراسیمہ نہ آتا یاں

ابھی میں دُوسرا مصرعہ پڑھ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھُلا اور فہمیدہ ریاض اندر داخل ہُوئی۔ اِس شعر اور اُس کی آمد میں ایک ایسا ربطِ خفی تھا کہ چند لمحوں کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ فہمیدہ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے ہندوستان میں ہی مُقیم ہے اور یہاں جامعہ ملّیہ میں اُسے شاعرہ درجامعہ (Poetess in the Campus) کے طور پر پروفیسر گریڈ میں تعینات کیا گیا ہے۔ پاکستان میں اُس کے طرزِ عمل کے بارے میں جو خبریں ہم تک پہنچی تھیں وُہ بے حد افسوسناک تھیں۔ کسی حکُومت، نظریے یا طریقۂ کار سے اختلاف کا یہ حل نکالنا کہ آدمی وطن چھوڑ کر زبردستی کی جلاوطنی اختیار کر لے اور اپنے درد کا درماں غیروں سے چاہے، کِسی طور بھی موزُوں اور مُناسب نہیں ہے لیکن یہ ایک مُسلّمہ اصُول ہے کہ جو اپنوں کا نہیں بنتا اُسے کوئی بھی نہیں اپناتا۔ گھر کا جھگڑا گھر کی دیواروں کے اندر ہی نمٹایا جائے تو

اچھا لگتا ہے۔ فہمیدہ ہماری نسل کی بہت اہم اور توانا آواز ہے لیکن جب سے اُس نے اپنے آپ کو سیاسی دانشور اور مزاحمتی تحریک کا نمائندہ تصوّر کیا ہے اُس کی شخصیت اور شاعری دونوں اپنے محور سے ہٹ گئی ہیں۔ شاید اُسے خُود بھی اس کا احساس تھا کیونکہ اُس کے تپاک میں ایک عجیب طرح کی بے کلی سی تھی جو چھُپائے نہیں چھُپ رہی تھی۔ اس کے آتے ہی ماحول میں ایک دم سرد مہری سی آگئی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہُوا کہ اُس کی اس تقرری پر جامعہ سے متعلق تمام اساتذہ سخت ناخوش ہیں اور ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی تقریب میں اُس کو مدعُو نہ کیا جائے کیونکہ اُس کے طرزِ عمل کی وجہ سے انھیں اکثر اپنے مہمانوں کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا ہے لیکن وہ اُسے شرکت سے روک بھی نہیں سکتے کیونکہ اُسے "اوپر" سے بھیجا گیا ہے۔ میرے دل کو دھکّا سا لگا۔ ایک اِتنے اچھے اور تخلیقی ذہن رکھنے والے فنکار نے بے حُرمتی کا یہ سَودا کیسے کر لیا؟ یہ کیسا نعرۂ حُرّیت ہے جو ایک غیر سرزمین پر حقِ نمک بن کر رہ گیا ہے۔ یہ کس طرح کی مزاحمت ہے جو میدانِ عمل سے دُور ہوا میں تلواریں لہرا رہی ہے؟ میرے ذہن میں پھر میر کا مصرعہ گونجنے لگا:

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا

سیمینار رُوم میں چالیس کے قریب طلباء و طالبات ہمارے منتظر تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ہم دونوں کا مختصر سا تعارُف کرایا اور پھر طلبہ اور اساتذہ کو دعوت دی کہ وہ ہم سے شعر و ادب اور ہماری اپنی تحریروں کے بارے میں سوالات کریں۔ یہ مرحلہ خاصا دلچسپ تھا۔ عطاء نے حسبِ معمول یہ کہہ کر جان چھُڑالی کہ فی البدیہہ جواب دینا یا سٹیج پر آکر بات کرنا اُس کے بس سے باہر ہے اور میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا کہ یہ میرا مختارِ عام ہے، اِس کی رائے میں مجھے شامل سمجھا جائے۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ تقریبًا ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔ وہاں لوگ پاکستان کے ادبی پس منظر سے بہت زیادہ آگاہ نظر آئے۔ افتخار جالب اینڈ کمپنی کی لِسانی تشکیلات، وزیر آغا کے اِنشائیے، ظفر اقبال کی گلافتابی غزل اور جدید علامتی افسانے کے پنپ نہ سکنے کے محرّکات کا جو جائزہ ڈاکٹر نارنگ اور شمیم حنفی نے پیش کیا اسے اگر یہاں دُہرا دیا جائے تو باقیوں کا تو مجھے علم نہیں البتہ

کوٹ ادّو سے ڈاکٹر انور سدید ردّعمل بھیج بھیج کر ملک بھر کے ادبی پرچوں اور ادبی اڈیشنوں کے مدیران کی جان عذاب میں ڈال دیں گے لہٰذا میں ان سب لوگوں کا پیشگی شکریہ قبول کرتے ہُوئے اِس بات کو یہیں ختم کرتا ہوں۔

شاعری کا سلسلہ شروع ہُوا تو فہمیدہ ریاض نے "الذوالفقار" کے نام سے ایک نظم سُنائی۔

عطاء نے میرے کان میں کہا:

"اگر فہمیدہ یہ سوچ کر پاکستان سے بھاگی ہے کہ اِس طرح کی نظموں پر اُسے گرفتار کر لیا جائے گا تو وہ غلطی پر ہے کیونکہ یہ جُرم قانُون کی نہیں شاعری کی حدود میں آتا ہے، اور بُری اور کمزور شاعری پر ہم نے آج تک کسی کو گرفتار ہوتے نہیں دیکھا۔"

ایک دفعہ تو میرے جی میں آئی کہ فہمیدہ سے اِس مسئلے پر بات ہو ہی جائے مگر پھر یہ دیکھ کر چُپ ہو رہا کہ ہمارے میزبان پہلے ہی خاصے شرمندہ اور پریشان ہو رہے تھے اور اس نوع کی بحث میں بدمزگی پیدا ہونے کے امکانات انتہائی زیادہ تھے۔ میں سوچنے لگا اگر فہمیدہ نے یہی نظم پاکستان میں رہتے ہُوئے پڑھی ہوتی تو حبیب جالب کی طرح ہم سب کے دلوں اور نظروں میں اس کے لیے کتنی عزّت اور محبّت ہوتی۔

جالب کا شعر ہے:

کہاں قاتل بدلتے ہیں، فقط چہرے بدلتے ہیں
عجب اپنا سفر ہے، فاصلے بھی ساتھ چلتے ہیں

فہمیدہ کو ہندوستانی حکومت سے وظیفہ لینے کی کیا مجبُوری تھی! اور فرض کیجیے کہ جالب نے یہی شعر کابل ریڈیو سے پڑھا ہوتا تو کیا پھر بھی یہ اُتنا ہی بامعنی اور شدید ہوتا جتنا کہ اب ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

جامعہ سے نکلتے نکلتے سوا دو بج گئے۔ آل انڈیا ریڈیو تک رہنمائی کے لیے نوجوان افسانہ نگار شمسُ الحق ہمارے ساتھ چلے۔ اُن کے افسانے پڑھنے کا تو مجھے اتّفاق نہیں ہُوا لیکن معاصر افسانے پر ان کی گفتگو بہت سُلجھی ہُوئی اور ان کے وسیع اور گہرے مُطالعے کی آئینہ دار تھی۔ رفعت سروش کے کمرے میں پُہنچے تو وہاں کوئی ویرانی سی ویرانی کا عالم

تھا۔ مُلحقہ کمرے میں ایک سال خوردہ سی خاتون اور ایک عیال دار سے صاحب اپنے آپ سمیت دونوں جہان سے بیزار بیٹھے تھے۔ بہُت مشکل سے ہم انھیں سمجھا پائے کہ ہمیں رفعت سروش صاحب سے ملنا ہے جو ایک انٹرویو کے سلسلے میں ہمارے مُنتظر ہیں۔ یہ سُن کر دونوں تھوڑی دیر کے لیے مراقبے یا شاید غشی میں چلے گئے۔ مرد نے پہلے سنبھالا لیا اور خاتون کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ مجھے سٹوڈیوز تک جانے کی اجازت نہیں ہے، اِس کے پاس پروانۂ راہداری ہے۔ آپ لوگ بیٹھیں، ہم پتا کرواتے ہیں۔ ہمیں رفعت سروش کی یہ ادا اچھّی تو نہیں لگی پھر بھی شک کا فائدہ دیتے ہوُئے بیٹھ گئے۔ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت پُرانی ہونے کے باوجوُد بہُت خوبصُورت اور باوقار تھی لیکن کمروں کی کمی اور سٹاف کی زیادتی کی وجہ سے اندر کا حال خاصا خراب تھا۔ ایک ایک کمرے میں تین تین چار چار بلکہ بعض اوقات اِس سے بھی زیادہ پروڈیوسر اوتھ کمشنروں کی طرح میزیں لگائے بیٹھے تھے۔ رفعت سروش کا نام تو ہم نے یہاں آکر سُنا تھا البتّہ اردو سروس کے حوالے سے جس لکھنے والے کا نام بہُت معرُوف ہے وہ محمُود ہاشمی ہیں اور چُونکہ دِلّی سے ہو کر آنے والے تقریباً بھی اہلِ قلم کو اُن کے علم و فضل اور ذوقِ سلیم کا مدّاح پایا تھا اِس لیے سوچا کہ یہاں بیٹھ کر بے کار وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ اُن سے مل لیا جائے۔ اُن کے کمرے میں پُہنچے تو طبیعت خُوش ہو گئی۔ ملنے کو تو اکثر لوگ بہُت محبّت، تپاک اور گرمجوشی سے ملتے ہیں لیکن پہلی نظر میں ہی اُنسیت پیدا کر لینے والی آنکھیں کم کم دکھائی دیتی ہیں۔ ہندوستان میں اب تک جتنے لوگوں سے مُلاقات ہوُئی تھی (اور بعد میں بھی جو لوگ ملے) اُن میں سے جدید ادب اور اس کے رویّوں پر اِتنی گہری نظر رکھنے والا اور کوئی نہ تھا باتوں باتوں میں کے۔ کے نیّر کا ذکر آیا تو محمُود ہاشمی نے بتایا کہ وہ بھی اِن دِنوں دلّی سٹیشن پر ہی ہیں۔ نیّر صاحب سے کیونکہ چند برس پہلے لاہور میں دو تین بہت دلچسپ مُلاقاتیں رہی

تھیں اور نوجوان شاعر اور ڈراما نگار اصغر ندیم سیّد کی شادی میں بھی ہم اکٹھے شریک ہُوے تھے، سو چا کہ اِس نشست میں انھیں بھی شامل کر لیا جائے۔ اُن کا کمرہ نزدیک بھی تھا اور وہاں تخلیہ بھی میسّر تھا چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ محفل وہیں جمائی جائے۔ نیّر صاحب اپنے ریڈیو انٹرویوز کی وجہ سے پُورے برِصغیر میں جانے پہچانے اور مانے جاتے ہیں اور انھیں اِس فن میں بجا طور پر صاحبِ اُسلُوب کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہم محمُود ہاشمی سے بین الاقوامی تناظُر میں جدید اردُو ادب کی معرُوضی صُورتِ حال پر بڑی ثقہ قسم کی گفتگو کر رہے تھے، لیکن ادھر نیّر صاحب نے اپنی شگفتہ پنجابی میں ”جی آیاں نوں“ کہا، اُدھر جیسے ہمیں بہانہ مل گیا۔ اب جو پنجابی شرُوع ہُوئی ہے تو ایسی چلی ہے کہ دس منٹ کے اندر اندر اچھا بھلا دفتر، ریڈیو پاکستان، لاہور کا دیہاتی پروگرام بن گیا۔ محمُود ہاشمی بے چارے پریشان کہ یہ اچھے بھلے شریف آدمی پلک جھپکنے میں انور سجّاد کے افسانوں سے دلدار پرویز بھٹّی کے فقروں تک کیسے پہنچ گئے۔

کافی دیر کے بعد جب ماحَول کچھ پُرسکُون ہُوا تو نیّر صاحب نے محمُود ہاشمی سے پُوچھا کہ انھیں ریکارڈنگ کے لیے قابُو کیا ہے یا نہیں۔ اِس دَوران ہمیں رفعت صاحب کی سٹوڈیوز میں عدم موجودگی کی اِطّلاع مل چُکی تھی اور ہم دِل ہی دِل میں انٹرویو کے آئیڈیے پر تین حرف بھیج چُکے تھے اِس لیے میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر ساری بات صاف صاف ان لوگوں کو بتا دی کہ کس طرح رفعت صاحب نے خود ہمیں اپنے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی، اِصرار کر کے ہم سے وعدہ لیا، یاد دہانیاں کرائیں اور اب جب کہ ہم کئی کام چھوڑ کے یہاں پہنچے ہیں تو ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا چنانچہ اِس حُسنِ سلوک کی وجہ سے اب ہم ذہنی طور پر انٹرویو کے لیے تیار نہیں ہیں مگر نیّر صاحب اور محمُود ہاشمی کی محبّت اور اپنائیت نے ہمیں بے بس کر دیا اور پندرہ منٹ بعد ہم آل

انڈیا ریڈیو کے سٹوڈیو نمبر آٹھ میں بیٹھے ومبلڈن کے ڈبلز فائنل کی طرح مائیکروفون پر جُملے اچھال رہے تھے۔ ہم نے خُود بھی دیکھا اور سُنا تھا اور ہمیں بتایا بھی گیا تھا کہ ہندُوستان میں ریڈیو اور ٹی وی پر پاکستانی ادیبوں اور فن کاروں کو گھیر گھار کر ان سے ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جن کے جواب سے دو قومی نظریے کی نفی ہوتی ہو لیکن پتا نہیں کیوں ہمارے ساتھ کسی نے بھی ایسی چکر بازی کی کوشش نہیں کی!

در اصل یہ "پتا نہیں کیوں" مَیں نے محض تکلّفاً لکھ دیا ہے کیونکہ دُوسری صُورت میں خُود ستائی کا ایک پہلُو نکلتا ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ کو اپنے قومی وجُود پر مُحکم ایمان ہو اور آپ اِس کا اِظہار کرنے کی اہلیت اور ہمّت بھی رکھتے ہوں تو کسی کو آپ کی طرف اُنگلی اُٹھانے کی جُرأت نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آپ اپنے گھر میں ماں، باپ، بہن، بھائی یا بیوی بچّوں سے کتنے ہی خفا کیوں نہ ہوں لیکن کسی دُوسرے کی ہمدردی یا دخل اندازی کو یہ کہہ کر روک دیتے ہیں کہ "مُعاف کیجیے گا، یہ میرا نجی مسئلہ ہے" تو ایسی ہی حد بطورِ "پاکستانی" لگانے میں کیا حرج ہے؟ خواہ مخواہ کی معذرت کو حقیقت پسندی کا نام دے کر ہمارے کچھ دوست جس غیر ضروری احساسِ کمتری کا مُظاہرہ کرتے ہیں، غور کیا جائے تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

پانچ بجے غالب اکیڈمی میں تقریب تھی لیکن دِن بھر کی دوڑ بھاگ میں شکم کے سلسلے میں جو بے اعتنائی اور زیادتی روا رکھی گئی تھی اُس نے اب مظلوم قوموں کی طرح اپنے حقُوق کی جدّوجہد شروع کر دی تھی۔ اِس بار بھی قرعۂ فال بستی نظام الدّین کے نام ہی نکلا کیونکہ ایک تو ہمیں جانا بھی وہیں تھا اور دُوسرے وہاں کھانا کسی نفسیاتی دباؤ کے بغیر کھایا جا سکتا تھا۔ اقبال ہوٹل دیکھنے میں محبُوب ہوٹل سے بہتر اور بڑا تھا مگر کھانے کے سلسلے میں "معیار" کا تکلّف سِرے سے پالا ہی نہیں گیا تھا۔ اِدھر اپنے بھائی عطاءُ الحق قاسمی کا بھی کم و بیش یہی مسئلہ ہے چُنانچہ

اُس نے یہ کھانا بھی انتہائی انہماک سے رَج کر کھایا۔ اِس انہماک پر مجھے ایک مزیدار جُملہ یاد آگیا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ کسی محفل میں ہمارے بہت ہی پیارے بزرگ اور دوست عارف عبدُ المتین صاحب کا یہ مصرعہ کسی نے سُنایا کہ:

"پھُولوں پہ اِنہماک سے شبنم گرائیے۔"

اِس پر احمد راہی نے کہا:

"ذرا اس شعر کا منظر تصوّر میں لانے کی کوشش کرو، یُوں لگتا ہے جیسے شاعر نے اپنے سامنے پھُولوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے، ایک طرف مٹکے میں شبنم بھر کے رکھّی ہُوئی ہے۔ شاعر مٹکے سے ڈراپر میں شبنم بھرتا ہے اور پھر انتہائی احتیاط سے فی پھُول تین قطرے شبنم ڈالتا جا رہا ہے۔"

غالب اکیڈمی میں نہ صرف یہ کہ سب لوگ ہمارے مُنتظر تھے بلکہ ان کے آگے میزوں پر پڑی کھانے پینے کی اشیاء بھی خاصی معقُول تعداد میں ہماری جان کو رو رہی تھیں۔ وہیں کُنور مُہندر سنگھ بیدی سحر سے بھی مُلاقات ہُوئی۔ اگرچہ وہ گُزشتہ برسوں میں کئی بار لاہور آئے ہیں لیکن "ہمہ یاراں دوزخ" میں صدیق سالک نے ان کی جانب سے کچُھ ایسی بدظنی پیدا کر دی ہے کہ کبھی مُلاقات کی تحریک نہ ہو سکی۔ پتا نہیں سودا کے لفظوں میں سالک نے انھیں کس آن میں دیکھا تھا، مجھے تو وہ خاصے بدحواس سے نظر آئے۔ یہ خصُوصیت ان میں سن و سال کی افزائش نے پیدا کی ہے یا جوشِ قدح کا کرشمہ تھا، اِس کا فیصلہ اُس وقت کرنا ممکن نہ تھا۔ بسمل صابری اور اقبال کوثر سے معلُوم ہُوا کہ ان کے ویزے میں کوئی قانُونی سُقم تھا جس کی وجہ سے وہ دو دن بہت پریشان رہے ہیں یہاں تک کہ اقبال کوثر غریب کو تو انبالے کا ایک چکّر بھی لگانا پڑا۔ بسمل کا مُعاملہ قتیل صاحب نے کوشش کر کے دلّی ہی میں طے کرا دیا تھا لیکن بعد از خرابیِ بسیار۔ انیس دہلوی، رئیس مرزا، واجد سحری، ابرار کرتپوری اور ذہین نقوی کی معیت میں

جب ہم لوگ نیچے ہال میں پہنچے تو کرسیاں تقریباً بھر چکی تھیں۔ اسٹیج پر فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اعلان ہوا کہ اس تقریب کی صدارت مالک رام کریں گے۔ غالبیات کے سلسلے میں مالک رام کا نام اتنا وقیع اور معتبر ہے کہ ہم نے تقریباً سکول کے بچّوں کے سے اِشتیاق کے ساتھ انھیں دیکھا۔ شیروانی، پائجامے اور ٹوپی میں ملبوس، عینک کے شیشوں سے آنکھیں مارتی ہوئی روشن اور مُتبسّم آنکھیں اور ایک بہت ہی شفیق چہرہ۔ تحقیق اور تنقید ان سے ان کی زندہ دل شخصیت کا ایک رنگ بھی نہیں چھین سکی تھی۔ اگر واقعی چہرہ کسی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے تو یہ چہرہ ایک مُکمّل اور بے داغ آئینہ تھا۔

آمنہ ابُوالحسن صاحبہ نے شعُراء کے سلسلے میں ایک مختصر تعارفی مضمون پڑھا، اِس کے بعد مُشاعرہ شرُوع ہُوا جس کی نظامت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے سنبھالی۔ انھوں نے مہمانوں کے گلے میں ہار ڈالے اور اپنی ایک نظم کے بند سے مُشاعرے کا آغاز کیا۔ بیدی صاحب کی شاعری اور نثر دونوں ہی روایت کے پسینے میں شرابور تھیں۔ انھوں نے ہر شاعر کا تعارُف ایسی سانچے میں ڈھلی ہوئی ادبی اصطلاحات کے ساتھ کرایا کہ لفظ و معنی کے تمام رشتے :

آپ اپنی آگ کے خَس و خاشاک ہو گئے

مالک رام بھی ہماری طرح "بندہ جائے فِقرہ نہ جائے" کے قائل معلوم ہوتے تھے۔ بعض جُملے تو ایسے برجستہ اور شریر تھے کہ ہنسی روکنا محال ہو جاتا تھا۔ دُوسری طرف یہ احساس بھی تھا کہ سب لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ عطاء نے اِس کا یہ حل نکالا کہ ایسے موقعوں پر ہار مُنہ کے سامنے رکھ کر انھیں سُونگھنے کی ایکٹنگ کی جائے۔ مالک رام صاحب نے ہماری توجہ رفعت سُلطان کی طرف مُنعطف کرائی جو اپنی کتابوں، بیاض اور جیبوں سے نکالے ہُوئے کاغذوں کے ڈھیر میں سے غالباً اس غزل کا انتخاب کر رہے تھے جو انھیں یہاں پڑھنی تھی۔ وہ اِس کام میں اتنی دیر تک اور ایسے صمیمِ قلب سے محو رہے کہ

پُورا ہال ان کی طرف متوجّہ ہو گیا۔ رہی سہی کسر کنور مہندر سنگھ بیدی نے ان کے اور سُلطان رشک کے ناموں میں گڑبڑ پیدا کر کے کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طور وہ مائیک کے سامنے پہنچے اور مطلع پڑھا۔ اتفاق سے مطلع انتہائی کمزور تھا۔ مالک رام نے ایک لمبا سانس لے کر ہماری طرف دیکھا اور بڑے معصوم لیکن شرارتی لہجے میں کہا:

"اچھا، تو یہ غزل ڈھونڈ رہے تھے، رفعت صاحب!"

اس بار ہاروں کی آڑ بھی ہمارا ساتھ نہ دے سکی۔ بیدی صاحب کے خُود ساختہ اور مالک رام کے بے ساختہ جُملوں کی وجہ سے یہ مختصر سی محفلِ مُشاعرہ ہمارے لیے ایک یادگار چیز بن گئی۔ آخر میں پاکستانی شُعرار کی طرف سے ضمیر جعفری صاحب نے غالب اکیڈمی اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ حاضرین میں فکر تونسوی، شمسُ الرحمٰن فارُوقی، نسیم مخمُوری اور اے پی کے عزیزُ الرحمٰن تو جانے پہچانے چہرے تھے۔ ان سے مُلاقات ہُوئی۔ بہُت سے ایسے احباب سے بھی مُلاقات ہُوئی جن کے نام صرف سُن رکھے تھے۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی ملے جو اس شام سے پہلے تک سربسر اجنبی تھے۔ تصویریں اور آٹو گراف اِس طرح کی تقریبات کا لازمی حصّہ ہیں سو اِس حصّے کے دوران دو واقعات ہُوئے یعنی فکر تونسوی غائب ہو گئے اور رفعت سروش حاضر۔ ہمیں ان واقعات کے نتائج سے شدید اختلاف تھا جس کا اظہار ہم نے رفعت صاحب کو "ٹھنڈا کندھا دکھا کر" کیا۔

شمسُ الرحمٰن فارُوقی سے طے پایا کہ وہ دو گھنٹے بعد ہمیں ہمارے ہوٹل میں ملیں گے۔ واجد سحری، جو برادرم مظفّر وارثی کے اِنتہائی عزیز دوست اور مدّاح ہیں، مُصِر تھے کہ کہیں بیٹھ کر کچھ دیر گپ شپ کی جائے چنانچہ ان کے ساتھ جا کر ہم نے وہ ہار غالب کے مزار پر چڑھائے جو ہمیں پہنائے گئے تھے اور یادگار کے طور پر ایک تصویر بھی اُتروائی اور پھر ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ عطاء کو اپنے والد صاحب کے لیے کچھ کتابیں خریدنا تھیں۔ ہم قریب ہی واقع ایک اِسلامی کتابوں کی دُکان میں داخل ہُوئے تو ایک مُلازم نے ٹوکا کہ جُوتے دُکان کے باہر اُتاریں۔ معلوم ہُوا کہ

یہ احتیاط اُن مذہبی کتابوں کی وجہ سے کی جاتی ہے جو دکان کے فرش پر ڈھیروں کی صورت میں رکھی ہُوئی ہیں۔ دُکان خاصی بڑی تھی اور اس میں اِتنی جگہ موجُود تھی کہ ان سب کتابوں کو الماریوں اور شیلفوں میں بآسانی رکھا جا سکتا تھا لیکن مذہب کے سلسلے میں ہمارا سب سے بڑا المیہ بھی تو یہی ہے کہ ہم نے کتابوں، رسموں اور مزاروں کو اس کا نعم البدل سمجھ لیا ہے اور اصل کی جگہ اُس کی نقل کو مقصُود بالذات بنا لیا ہے۔ مجھے یُوں محسُوس ہُوا جیسے خواجہ صاحبؒ کی درگاہ کے مجاور ہی نام بدل کر اس دکان میں آ بیٹھے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

خُود بدلتے نہیں قُرآں کو بدل دیتے ہیں
ہُوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ہوٹل پُہنچے تو آمنہ ابُوالحسن کا پیغام ملا کہ مجتبیٰ حُسین (ابراہیم جلیس مرحُوم کے برادرِ خُورد) حیدر آباد سے آ گئے ہیں اور ان کے گھر میں بیٹھے ہمارے فون کا انتظار کر رہے ہیں۔ انھیں اطّلاع دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اور شمسُ الرّحمٰن دونوں پہنچ گئے۔ کنہیا لال کپُور اور فکر تونسوی کے بعد ہندُوستان میں مجتبیٰ حُسین ہی ایسے ہیں جنھیں نمائندہ مزاح نگار کہا جا سکتا ہے۔ احمد حسن حامد اور چاچا منصُور قیصر جب امیر خسروؒ کے عُرس کے سلسلے میں دلّی گئے تھے تو واپسی پر ان کے حُسنِ اخلاق اور مُشکل ترین کاموں کو انتہائی تیزی سے تکمیل دینے کی صلاحیّت کے بھی بڑے مُعترف تھے لیکن پہلی نظر میں نہ تو وہ مزاح نگار لگتے ہیں اور نہ ہی اُن سے یہ توقّع کی جا سکتی ہے کہ وہ خط ٹھیک سے پوسٹ کر سکیں گے۔ میں نے عطاء کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر وہ مجتبیٰ کی جپھی بلکہ جپھّے میں اس بُری طرح پھنسا ہُوا تھا کہ:

زبانِ ہر سرِ مُو حالِ دِل پُرسیدنی جانے

شمسُ الرحمٰن فارُوقی "صاحبانِ عرُوض" میں سب سے کم عُمر ہیں اور شاید اسی لیے اپنے بقیّہ تین ہم عصروں (شانُ الحق حقّی، جابر علی سیّد، آصف ثاقب)

کی نسبت زیادہ مستعد بھی ہیں۔وہ اگرچہ گزشتہ کئی برسوں سے سرکاری افسری،شاعری، تنقید، شب خون کی ادارت اور غالب کے شعروں سے چھیڑ خانی وغیرہ کو ایک ساتھ چلا رہے ہیں لیکن ان کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ ایک غیر مجلسی قسم کے لیے دیئے رہنے والے عالم خشک قسم کے آدمی ہیں۔ خود لاہور میں گزشتہ برس کی ملاقات کے بعد میرا اپنا تاثر بھی یہی تھا مگر اس رات غیر رسمی اور کھلی ڈلی فضا میں اُن کا جو رُوپ سامنے آیا اس پر ان کے برسوں کے رفیق مجتبیٰ حسین بھی حیران تھے اور بعد میں بار بار کہتے رہے کہ میں نے فاروقی کو آج تک کبھی اتنا بے تکلف اور جملے بازی کا رسیا نہیں دیکھا جتنا وہ اس وقت نظر آرہا تھا۔ بہر حال یہ پُرلطف محفل رات بارہ بجے تک چلتی رہی اور اس دوران میں ہوٹل کے طلسمی ٹیلیفون سے مجتبیٰ حسین نے وہیں بیٹھے بیٹھے جس طرح کل کے لیے فرنٹیر میل پر ہماری سیٹیں ریزرو کروائیں، کمشنر آفس میں واپسی کے اندراج کا بندوبست کیا اور پورے دن کے لیے ایک ڈرائیور والی گاڑی کے انتظام کی نویدِ جانفزا سُنائی وہ اپنی جگہ پر فسانۂ عجائب کا ایک نیا باب ہے۔ سو ثابت ہوا کہ ضروری نہیں انسان کا اصل رُوپ پہلی نظر میں ہی ظاہر ہو جائے۔

۱۹ مارچ دلّی میں ہمارا آخری دن تھا۔ مجتبیٰ کے عزیز حسینی صاحب ساڑھے دس بجے گاڑی لے کر پہنچ گئے لیکن ابھی تک ہم طے نہیں کر پائے تھے کہ اتنے بہت سے کاموں کو ممکنہ وقت پر کس طرح تقسیم کیا جائے کہ جو اب سارے کاموں کے پورا ہونے کی صورت میں نکلے۔ "فلمی ستارے" کے ایڈیٹر انیس دہلوی نے ہمیں دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا جن کا دفتر ترکمان گیٹ میں تھا۔ تین بجے ہمیں جنوبی دلّی میں مجتبیٰ کے دفتر پہنچنا تھا جہاں سے ہمیں خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جانا تھا۔ (مزار کا علاقہ مہرولی قطب مینار سے اس قدر نزدیک تھا کہ اگر وہ سگریٹ والا اچھوتا سا انسانیت کا ثبوت دیتا تو ہم وقت کی تنگی کے باوجود گزشتہ

روز ہی وہاں کا چکّر لگا سکتے تھے۔) چار بجے ہمیں فاروقی صاحب کے دفتر پہنچ کر راجندر ملہوترہ (انبالہ) اور کلدیپ سنگھ (امرتسر) کو بالترتیب اپنی روانگی اور آمد کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون دینا تھی۔ چھ بجے ایوانِ غالب میں اپنے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں شریک ہونا تھا اور ۹ بجے فرنٹیر میل سے امرتسر کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اِس آمدورفت کے درمیانی وقفوں میں ہمیں جامع مسجد کے قریب سے بیگ خریدنے تھے، کناٹ پیلس سے کتابیں اور بھائی انوار فیروز کے بتائے ہُوئے لکڑی کے گلاس خریدنے تھے، کمشنر آفس میں ویزا فارموں پر مُہریں لگوانی تھیں اور اپنے اپنے اہلِ خانہ کو مُنہ دکھانے کے لیے کچھُ تحفے تحائف خریدنے تھے۔ ان سارے کاموں میں اگر آپ اُس فاصلے کو بھی جمع کرلیں (جسے بہرحال درمیان میں پڑنا تھا) تو مُعاملہ مُلکی سیاست سے کسی طور کم پیچیدہ نہیں تھا۔

عارف نظامی اور اشفاق صاحب کی فرمائش کردہ کتابیں تو ہمیں جلد ہی مِل گئیں مگر انوار فیروز کے گلاسوں نے پھڈّا ڈال دیا۔ ہم انھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے کراکری کی ایک بہُت بڑی دُکان میں گھُس گئے۔ مالک دُکان نے ہماری زبان یا شاید شلواروں قمیضوں سے پہچان لیا کہ ہم پاکستانی ہیں۔ اب وہ دوالے ہو گیا کہ کچھ دیر بیٹھیں۔ وجہ یہ بتائی کہ اُس کا آبائی شہر بھی لاہور ہے۔

شِو راج ٹھیٹھ کاروباری تھا اور غالباً اپنی عقل کو ہندسوں تک محدُود رکھنے کا عادی تھا کیونکہ اُسے تقسیمِ پاک وہند پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کاروبار کی صُورت بہت بہتر ہوتی۔ ایسے آدمی سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا لیکن جب اُس نے ذرا زیادہ لبرٹی لینے کی کوشش کی تو مجبُوراً ہمیں "ایک لوہار کی" سے کام لینا پڑا۔ گلاسوں کے بارے میں پتا چلا کہ یہ مدھیہ پردیش کے امپوریم سے ملیں گے اور ان کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ جس درخت کی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں اس میں کچھ "شوگر کُش" قدرتی مادے شامل ہیں

جو پانی میں حل ہو جاتے ہیں اور باعثِ شفا بنتے ہیں۔ تین گلاسوں کے اِس سیٹ کی قیمت تقریباً ستّر رُوپے تھی۔

"یہ تو سَر کے پیچھے سے ہاتھ لا کر ناک پکڑنے والی بات ہُوئی۔ اِس سے تو بہتر ہے کہ آدمی کاٹھ کا بُرادہ پانی میں اُبال کر پی جائے۔ آخر جوشاندہ بھی تو لوگ پیتے ہیں"۔ میری اس مناظرے والی دلیل کا عطار کے پاس چُونکہ کوئی جواب نہیں تھا اِس لیے اُس نے حسبِ معمول اسے اَن سُنا کر دیا۔

انیس دہلوی کا گھر ترکمان گیٹ سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ اور دو گلیوں کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں ایک احتجاجی جلوُس ملا جس میں احتجاجی کم اور پولیس والے زیادہ تھے۔ انیس دہلوی نے بتایا کہ دِلّی کو خوُبصورت اور وسیع تر کرنے کے لیے آنجہانی سنجے گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں یہاں بُلڈوزر چلوا دیے تھے اور مکینوں سے وعدہ کیا تھا کہ انھیں نئے تعمیر ہونے والے رہائشی فلیٹ تبادل گھروں کے طوَر پر دیے جائیں گے۔ اب ساڑھے پانچ سو فلیٹ تو تیار ہو گئے ہیں لیکن چُونکہ بے دخل ہونے والے خاندانوں کی تعداد تقریباً آٹھ سو ہے اِس لیے جھگڑا پڑا ہوُا ہے اور یہ جلوُس اسی جھگڑے کی ایک کڑی ہے یعنی جمہوُریّت کی تعریف یہ ہُوئی کہ مارتا ضرُور ہے مگر رونے بھی دیتا ہے۔

ترکمان دروازہ اندر سے بالکل لاہور کا بھاٹی دروازہ نکلا۔ گلیاں، مکان، ٹریفک، تھڑوں پر بیٹھے اور سڑک پر کھڑے لوگ، حکیموں کی دُکانیں۔ ہر چیز ملتی جُلتی تھی۔ سائن بورڈ بھی اردو میں تھے۔ جگہ جگہ افغانستان پر رُوسی جارحیّت کے خلاف کسی جلسے کے پوسٹر لگے ہوُے تھے۔ انیس دہلوی نے بڑی مہارت سے ایک پوسٹر ہمیں اکھیڑ کر دے دیا۔ ان کا گھر تغلق دَور کی ایک ایسی مسجد کے پہلوُ میں ہے جو عام رہائشی مکانات سے خاصی بلند سطح پر بنائی گئی ہے۔ مکان کے نچلے حِصّے میں انیس دہلوی کے رسالے "فلمی ستارے" کا دفتر ہے جو بیک وقت جاسُوسی ناول شائع کرنے والا پبلشنگ ہاؤس بھی ہے اور مایُوس اور لاعلاج

مریضوں کی آخری پناہ گاہ بھی۔ انیس دہلوی نے بتایا کہ آخر الذکر کاروبار سب سے
زیادہ چلتا ہے اور روزانہ درجنوں لوگ ان سے بذریعہ ڈاک ایسی ادویات
منگواتے ہیں جنھیں کھا کر عمرِ رفتہ کی بازگشت سُنائی دینے لگے۔

انیس دہلوی بڑے مخلص اور دل سے محبّت کرنے والے آدمی ہیں۔ جامع
مسجد کے علاقے میں خریداری کے دوران جس طرح انھوں نے آگے بڑھ کر بیگ
اُٹھائے اور ہمارے بے حد اصرار کے باوجود اُنھیں اُٹھائے رکھا وہ ایک ایسا
اظہارِ محبّت تھا جس کا بدل کوئی ارب پتی اپنے خزانوں کے مُنہ کھول کر بھی نہیں
دے سکتا۔ کھانا خوش ذائقہ ہو اور کھلانے والے کا خلوص بھی شریکِ طعام ہو تو
دو آتشے کی سی کیفیّت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس وقت چُونکہ ہماری اِشتہا بھی
شریکِ محفل تھی اِس لیے کچھ سہ آتشہ قسم کی چیز بن گئی۔ ان سے ہمیں دلیپ کُمار
کی دُوسری شادی کے بارے میں تازہ ترین اِطّلاعات بھی ملیں لیکن اب وہ پُرانی باتیں
ہو چُکی ہیں اس لیے تکرار سے کیا حاصل!

اپنے دفتر میں مُجتبیٰ ہمارے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ مہرولی پہنچے۔ ایک طویل
راہداری سے گزر کر، جس کے دونوں طرف گداگر ٹولیوں کی صُورت میں بیٹھے تھے،
ہم ایک ڈیوڑھی تک پہنچے جہاں ایک بڑے مُعزّز صُورت بزرگ سفید براق کپڑوں
میں ملبُوس ایک اور صاحب سے مصروفِ گفتگو تھے۔ اُنھوں نے بڑے پُروقار
اور شیریں لہجے میں ہمیں "السلامُ علیکم" کہا اور ہاتھ سے ایک طرف کو اشارہ کرتے
ہُوئے بولے: "ادھر تشریف لے آئیے۔"

ان کی صُورت اور طرزِ کلام ایک لمحے کے لیے مجھے دو صدیاں پیچھے لے گیا اور
یُوں محسُوس ہُوا جیسے رتن ناتھ سرشار کا کوئی خاندانی نواب "فسانۂ آزاد" سے نکل کر اس
ڈیوڑھی میں آن بیٹھا ہو۔ فاتحہ خوانی کے بعد ہم لوگ واپس لوٹے تو وہ صاحب ابھی
تک وہیں تھے۔ ہمیں دیکھ کر بڑے پُرتپاک انداز میں اپنی جگہ سے اُٹھے، دوبارہ
اُسی رَس بھرے انداز میں سلام کیا اور قریب آ کر کہنے لگے:

"بس حضور، اب ہم پیرزادے رہ گئے ہیں، خواجہ صاحب کے نام لیوا، ان کی اولاد کے لیے حسبِ توفیق کچھ عطا کرتے جایئے، اب ہماری سفید پوشی آپ ہی لوگوں کے دم قدم سے ہے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کانوں میں کوئی پگھلا ہوا سیسہ ڈال رہا ہو۔ یا خدا اگر یہ واقعی اس عظیم بزرگ کی نسل سے ہیں تو ان کے خون سے وہ درویشی کہاں گئی جس کے ڈر سے منعم کو بخشش کا یارا نہیں ہوتا تھا۔ اِن ہٹّے کٹّے، سلامت ہاتھ پیروں والے لوگوں اور ان معذوروں، اپاہجوں اور کاہلوں میں سوائے مانگنے کے طریقے کے اور کیا فرق ہے؟ یہ اپنا نسب نامہ بیچنے کے بجائے کوئی آبرو مندانہ کام کیوں نہیں کرتے؟

مجھے سچ مچ غصہ آگیا تھا۔ عطا نے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر میں نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ دینا ہی ہے تو ان سے زیادہ مستحق لوگ باہر موجود ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا دفتر "سماچار بھون" کی گیارھویں منزل پر تھا۔ داخلے کے پاس کے لیے ہم ریسپشن کاؤنٹر پر پہنچے تو عین سیڑھیوں کے اُوپر آرائشی چھت میں دو بڑے بڑے رخنے نظر آئے جن میں کبوتر بلا تکلف آ جا رہے تھے۔ میں نے کہا:

"یہ غالباً قاصد کبوتر ہیں جو محکمہ ڈاک والوں نے ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر پال رکھے ہیں۔" "اور شاید انھی میں سے کسی کے دادا پردادا کو مخاطب کر کے طفیل ہوشیار پوری نے اپنا مشہور فلمی گیت:

واسطہ ای رب دا تُوں جائیں وے کبوترا
چِٹھّی میرے ڈھول دی لے آئیں وے کبوترا

لکھا تھا۔" عطا نے گرہ لگائی۔

عام سرکاری دفاتر کی طرح یہاں بھی خواتین خاصی تعداد میں مُلازم تھیں۔ کم از کم ہماری لفٹ کی حد تک تو انھیں واضح اکثریت حاصل تھی لیکن معلوم

ہوتا تھا کہ ان کی زیادہ تعداد نچلے درجے کے عُہدوں تک محدود ہے کیونکہ ہم جس طویل راہداری سے گزر کر فارُوقی صاحب کے کمرے میں پہنچے وہاں تقریباً دو درجن کمروں میں سے صرف ایک پر زنانہ نام کی تختی تھی۔ فارُوقی نے بتایا کہ کلدیپ سنگھ کو اُنھوں نے فون کر دیا تھا، وہ گھر پر نہیں تھا۔ رات تک اس کی آمد متوقع ہے اس لیے آپ کا پیغام اُسے مل جائے گا، احتیاطاً گھر سے دوبارہ فون کر دُوں گا۔ انبالے فون ملانے کی کوشش کی تو "لائن خراب ہے" کی اطلاع ملی۔

"چلو، یہ قصہ بھی تمام ہُوا،" عطا نے کہا۔ "اب ہمیں جلدی سے بازار کا چکّر لگا لینا چاہیے کیونکہ فنکشن کا وقت ہونے والا ہے۔" بازار کے ذکر پر فارُوقی کے اُس ماتحت نے، جو ہمیں پانی پلا رہا تھا، چونک کر پہلے ہماری طرف اور پھر فارُوقی کی طرف دیکھا اور آدھا جگ مجھ پر گرا دیا۔

"ہم قرول باغ جا رہے ہیں بھائی، شالیں خریدنے کے لیے۔" مُجتبیٰ نے اسے بتایا۔ اس پر وہ ایسے انداز میں مُسکرایا جو قدرت صرف غبی لوگوں کو عطا کرتی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں "مجھے سب پتا ہے بچُّو" کہتا ہُوا کمرے سے نکل گیا۔

شالیں خریدنے کے دوران فارُوقی نے جس زنانہ سُوجھ بُوجھ اور اندازِ مول تول کا مُظاہرہ کیا اسے دیکھ کر ہمیں آمنہ ابوالحسن اور نسیم مخمُوری کی کمی بالکل محسُوس نہیں ہُوئی جو ہمیں اس شاپنگ کے سلسلے میں رضاکارانہ خدمات پیش کر چکی تھیں۔ ایک دو شالوں کو فارُوقی نے ایسے انداز میں رَد کیا جیسے وہ وزن سے گرے ہُوئے شعر ہوں تو دکاندار کو بھی جوش سا آ گیا۔ اب جو جناب شالوں کی بوچھاڑ شروع ہُوئی ہے تو ہم، جو پہلے ہی کپڑے کی کوالٹی، رنگ اور ڈیزائن کے سلسلے میں صفر ہیں، بالکل ہی چکرا گئے۔ فاروقی صاحب ہر گرم کپڑے پر ہاتھ پھیر کر اس کے ٹیکسچر کو پرکھتے اور پھر بتاتے کہ اس میں کتنے سبب اور کتنے وتد ہیں اور کہاں

کہاں زحافات کا اِستعمال غلط کیا گیا ہے۔ اب مصیبت یہ تھی کہ جو چادر وزن پر پُوری اُترتی تھی وہ صنائع بدائع سے مار کھاتی تھی اور جس کا لفّ و نشر اچھا تھا اس میں سکتہ پڑتا تھا۔

بھاگتے دوڑتے ایوانِ غالب پہنچے تو سب سے پہلے کنور مہندر سنگھ بیدی پر نظر پڑی جو شکل سے پریشان نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے جلدی جلدی ہمارا سامان ایک سٹیشن ویگن میں رکھوایا جو انھوں نے ہمیں ریلوے سٹیشن پہنچانے کے لیے منگوا رکھی تھی اور ہمیں ساتھ لیے بغیر ہال میں پہنچ کر جلسہ شروع کر دیا۔ دروازے پر بلراج مینرا سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ایک دو بہت ضروری باتیں کرنا تھیں مگر بیدی صاحب کے اعلان کی وجہ سے مجبوراً ہال کی طرف بھاگنا پڑا۔ پہلی لائن میں غزل کو نیم وحشی صِنفِ سُخن قرار دینے والے بزرگ نقّاد کلیمُ الدّین احمد بیٹھے تھے جنھیں حکُومتِ ہند سے تازہ تازہ پدم شری کا خطاب ملا تھا۔ سٹیج پر بھارت کے مرحُوم صدر فخرُ الدّین علی احمد کی بیوہ محترمہ عابدہ احمد اور ہندُوستانی کابینہ کے دو مُسلمان وزرا بیٹھے تھے اور حاضرین میں بھی اہلِ ذوق کے ساتھ ساتھ کچھ افسر قِسم کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ یہاں بھی آغاز میں ہمیں پھُولوں کے ہار پہنائے گئے جو غیر معمُولی طور پر وزنی اور اِنتہائی خوبصورت تھے۔

اِبتدائی استقبالیہ تقریروں کے بعد سب پاکستانی شُعرا نے اپنا کلام سنایا اور خُوب خُوب داد سمیٹی۔ چائے پر مُجتبیٰ نے قاضی سلیم سے ملوایا جو اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ حیدر آباد کی طرف سے راجیہ سبھا کے رُکن بھی ہیں۔ بہت محبّت سے ملے اور فرمائش کر کے ہمارے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ بقیہ دو وزیر بھی، جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے، بڑے غیر وزیرانہ انداز میں ملے۔ اس پر مجھے اپنے ایک سابق افسر یاد آئے جنھوں نے ایک غیر مُلکی مہمان سے اپنا تعارُف کرواتے ہُوئے بتایا تھا کہ وہ مسٹر فلاں ہیں اور ان کا گریڈ ۲۱ ہونے والا ہے۔

گاڑی کا وقت ہو رہا تھا اِس لیے ہم جلدی جلدی ہاتھ ملاتے اور گلے ملتے

باہر نکلے تو ہمارے سامان والی ویگن غائب تھی۔ بیدی صاحب سے اس کے بارے میں پُوچھا تو بڑے گھبرائے ہُوئے بولے :

"اچھا تو آپ اس میں نہیں گئے۔"

عرض کیا کہ "اگر ہم جا چکے ہوتے تو آپ سے مُخاطب کیسے ہوتے۔" کہنے لگے : "تو پھر اس میں کون کون گیا ہے؟" اب تو ہمارے پاؤں تلے سے زمین سرکی، ہم نے کہا: "تو کیا ویگن چلی گئی ہے؟" بولے : "ہاں ابھی ابھی نکلی ہے۔ آپ فوراً اسے پکڑیں۔" پھر خُود ہی کہنے لگے کہ "اب تو کوئی گاڑی بھی نہیں ہے، آپ جائیں گے کیسے؟"

جب مسیحا مریض سے علاج دریافت کرنے لگے تو مریض کو کیا کرنا چاہیے! میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ قدرے فاصلے پر نیم تاریکی میں ایک موٹر کھڑی تھی۔

"یہ کِس کی کار ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی۔" پتا نہیں کِس نے بتایا۔ میں بھاگا بھاگا واپس گیا اور ڈاکٹر نارنگ کو ساری صُورتِ حال بتائی۔ کہنے لگے :

"کوئی بات نہیں۔ مَیں ابھی آپ کو کہیں سے ٹیکسی لے دیتا ہوں۔" میں نے کہا : "وقت بہُت کم ہے اور ریلوے سٹیشن پر اگر ہم دیر سے پہنچے تو خدشہ ہے کہ جو ساتھی ہمارا انتظار کیے بغیر ویگن لے کر چلے گئے ہیں وہ ہمارے سامان سمیت اسے واپس بھجوا دیں اور یُوں ہم کہیں درمیان میں ٹاپتے نہ رہ جائیں۔"

خیال تھا کہ اِس رِقّت انگیز تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب ہمیں سیدھے پُرانی دِلّی کے ریلوے سٹیشن پر لے جائیں گے لیکن وہ بھی شاید بہُت زیادہ جلدی میں تھے اِس لیے سب سے پہلی جو ٹیکسی نظر آئی اس کے ڈرائیور کو اُنھوں نے اچھّی طرح سے سمجھا دیا کہ ہمیں سٹیشن تک پہنچنے کی کتنی جلدی ہے۔ ٹیکسی نے سٹیشن تک پہنچنے میں دس منٹ لیے۔ اتفاق سے ویگن ٹیکسی سٹینڈ کے سامنے ہی کھڑی

تھی۔ مجھے اصل غصہ سُلطان رشک پر تھا کہ چلو ضمیر صاحب بزرگ ہیں، بسمل عورت ہے، رفعت سُلطان، رفعت سُلطان ہے مگر اُسے تو یہ خیال کرنا چاہیے تھا کہ دو ساتھی کم ہیں۔ اُس نے بیان دیا کہ ان لوگوں کو بیدی صاحب نے اتنی گھبراہٹ میں مُبتلا کر رکھا تھا کہ اس سے پیشتر کہ وہ سنبھل سکتے ویگن چل چکی تھی۔ وہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ شاید ہمارے لیے کسی اور سواری کا بندوبست کیا گیا ہے۔ سامان کے لیے یہ وضاحت پیش کی کہ اس کی موجودگی کا علم انھیں یہاں آکر ہُوا ہے۔ ابھی ہم یہ شکوے گلے کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب مسرّت آمیز چیخیں مارتے ہُوئے آئے۔ ان کے ہاتھ مُعانقے کے لیے کُھلے ہُوئے تھے اور رُخ بسمل کی طرف تھا۔ خیریت ہُوئی کہ عین آخری لمحے میں ان کی کامن سنس بیدار ہو گئی اور وہ ذرا سے ترچھے ہو کر ضمیر جعفری صاحب کی آغوش میں جا گرے۔ وہ شخص تیز تیز بولنے والے ان آدمیوں میں سے تھا جو کٹے ہُوئے ٹیلیفون پر گھنٹوں گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس کی باتوں سے ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں ہمارا اِنتظار کر رہے تھے۔ کیوں کر رہے تھے؟ یہ راز آخر تک نہیں کُھلا۔ ہم نے سامان قُلیوں کو اُٹھوایا اور تقریباً بھاگتے ہُوئے اس پلیٹ فارم پر پہُنچے جہاں سے فرنٹیر میل چلنے والی تھی۔ پسینے اور تھکن سے میرا بُرا حال تھا اور چند دن قبل لگی ہُوئی چوٹیں، جنھیں میں تقریباً بھول چُکا تھا، نئے سازوسامان کے ساتھ اپنا جلوہ دکھانے لگی تھیں۔ جس بورڈ پر مُسافروں کے ناموں اور ڈبوں کی فہرستیں لگی تھیں اس کے گرد بھیڑ زیادہ تھی اِس لیے میں سیدھا انکوائری کاؤنٹر پر گیا اور بتایا کہ ہم لوگ پاکستان سے آئے ہیں، ہماری رہنمائی کریں۔ اِنکوائری کلرک نے میرے دُور تک پھیلے ہُوئے ماتھے پر چمکتا ہُوا پسینہ دیکھا، میرے ہاتھ سے ٹکٹیں پکڑ کر ان پر ایک نظر ڈالی اور بائیں طرف اِشارہ کرتے ہُوئے کہا:

"وہ سب سے پہلا ڈبہ آپ کا ہے، لیکن ٹرین ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔"

میں ذہنی طور پر اتنے بڑے اینٹی کلائمکس کے لیے تیار نہیں تھا اِس

لیے سامان ڈبے میں رکھنے کے بعد بھی بہت دیر تک چُپ چاپ بیٹھا رہا عطاء ایسے موقعوں پر ہمیشہ ڈیٹ پر آئی ہوئی لڑکی کی طرح سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا کرتا ہے چُنانچہ سامان رکھنے کے فوراً بعد وہ سگریٹ سُلگا کر پلیٹ فارم کی سیر کرنے لگا۔ یہ محسوس کر کے، کہ سامنے والی برتھ پر بیٹھا ہُوا آدمی میری بدحواسی سے محظُوظ ہو رہا ہے، میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ایک انتہائی بے تُکا سا سوال کیا:

"یہ فرنٹیر میل ہی ہے نا؟"

"ہاں جی!" اُس نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "آپ پاکستانی ہیں شاید!"

میں نے گزشتہ دو تین دن سے بغیر تعارُف کے پہچانے جانے پر مُتعجب ہونا چھوڑ دیا تھا اِس لیے اگلا سوال کیا:

"یہ گاڑی لیٹ کیوں ہے؟"

"پیچھے سے ہی لیٹ آرہی ہے۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

اتنے میں وہی تیز تیز بولنے والا آدمی کسی طرف سے بھاگتا ہُوا آیا اور مجھے بازُو سے کھینچتا ہُوا بولا:

"یہ آپ کہاں بیٹھے ہیں؟ فرنٹیر میل تو وہ سامنے کھڑی ہے، اُٹھیے، سامان اُٹھائیے اپنا۔ جلدی کیجیے ورنہ گاڑی نکل جائے گی۔"

اُس کی آواز میں ایسی تشویش تھی کہ میں بھی گھبرا گیا۔

"گھبرائیے نہیں جناب، یہ بھی فرنٹیر میل ہی ہے۔" میرے ہم ڈبہ نے میری ڈھارس بندھائی۔ "یہ ڈبے دِلّی سے لگتے ہیں، اِس لیے اس پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔"

"مروا نہ دینا بھائی۔" میں نے بے اختیار کہا۔

"میں خُود امرتسر جا رہا ہُوں۔" اُس نے مُسکرا کر کہا، "اور بیس سال سے ریلوے کی نوکری میں ہُوں۔" اُس کی اس بات پر "مسٹر تیز گفتار" بھی مخمصے میں پڑ

گیا اور بالآخر کچھ دیر کے بعد قائل ہو کر چلا گیا۔ میں نے عطاء کی تلاش میں پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی تو واجد سحری، ذہین نقوی اور ابرار کرتپوری جنگ عظیم کے دنوں میں کسی جرمن ریلوے سٹیشن پر اتحادی مفرور قیدیوں کی طرح مشکوک انداز میں چاروں طرف دیکھتے نظر آئے۔ میں نے آواز دے کر انھیں بُلایا۔ تھوڑی دیر میں عطاء بھی آگیا اور گاڑی چلنے کے وقت تک خُوب دھما چوکڑی مچی۔ اِس دوران ٹکٹ کنڈیکٹر تین چار مُسافروں کے جلو میں کئی بار ہمارے دروازے کے سامنے سے گزرا اور ہر بار ہمیں سُنانے کے انداز میں اُونچی آواز میں بولا کہ وہ سرکاری قانون کا غلام ہے اِس لیے سیٹ کے سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اتنے طویل مذاکرات صرف سیٹ کی قیمت بڑھانے کے لیے کر رہا ہے چنانچہ وہی ہُوا۔ گاڑی چلنے پر ان اُمیدواروں میں سے ایک بڑے فاتحانہ انداز سے ڈبے میں داخل ہُوا۔ سیاہ جرسی اور پتلوُن میں ملبوس یہ ایک مائل بہ فربہی خُوشنما نوجوان تھا۔ گفتگو شروع ہُوئی تو پتا چلا کہ ریلوے مُلازم کا نام اوم پرکاش اور سیٹ خریدنے والے نوجوان کا نام کیول سیٹھ ہے اور وہ دونوں امرتسر کے رہنے والے ہیں۔ جب انھیں یہ پتا چلا کہ میں "وارث" کا مُصنّف ہُوں تو ان کے انداز میں یک دم تعلّق کا رنگ پیدا ہو گیا۔ کیول سیٹھ ایک سیدھا سادا مُخلص قسم کا نوجوان تھا۔ اُس نے بتایا کہ اس کی فیملی کپڑے کے بزنس میں ہے اور بھگوان کی بڑی کرپا ہے۔

ہمارا پروگرام امرتسر میں چند گھنٹے کلدیپ سنگھ کے پاس ٹھہرنے کا تھا تا کہ ایک نظر شہر بھی دیکھ لیں اور عطاء کے دادا مرحوم کی قبر پر فاتحہ بھی پڑھ لیں۔ امرتسر سٹیشن سے کلدیپ کے گھر فون کیا تو پتا چلا وہ کسی جھٹکے کے سلسلے میں جالندھر گیا ہُوا ہے، گزشتہ رات اس کی واپسی متوقع تھی لیکن ابھی تک نہیں آیا۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے؟ کیول غالباً اس دوران میں کہیں قریب ہی کھڑا ہماری باتیں سُن رہا تھا۔ ابھی ہم ایک ٹیکسی والے سے امرتسر کی سیر اور واہگہ بارڈر تک کا کرایہ طے کر ہی رہے تھے کہ وہ آگیا اور اطلاع دی: "گاڑی کا اِنتظام ہو گیا

ہے، آپ لوگ میرے گھر چلیں۔ وہاں مُنہ ہاتھ دھوئیں، ناشتہ کریں پھر میں آپ کو بارڈر تک پہنچا آؤں گا۔" اِس سے پیشتر کہ ہم کوئی بات کہتے اُس نے ٹیکسی والے کو رُخصت کیا اور قلیوں سے کہا کہ وہ سامان اٹھا کر باہر لے چلیں کیونکہ اس کے ہم زُلف کا ڈرائیور گاڑی لے کر پہنچنے ہی والا ہو گا۔

کیول کے گھر اس کے بھائی روِیندر اور ماتا پِتا کے علاوہ اس کی چھوٹی چھوٹی دو بیٹیوں سے مُلاقات ہُوئی جن میں سے چھوٹی، جس کا نام شِیتل تھا، بے حد شریر تھی۔ اس کی معصُوم شرارتوں سے ہمیں اپنے بچے زیادہ یاد آنے لگے۔ وہاں سے ایک بھرپُور اور مزیدار ناشتہ کرنے کے بعد ہم عطاء کے دادا جان کی قبر ڈھونڈنے نکلے۔ اب موٹر کیول کا ہم زلف چلا رہا تھا اور کچھ اس انداز سے چلا رہا تھا جیسے ہم عطاء کے دادا جان کی نہیں خُود اپنی قبریں ڈھونڈنے نکلے تھے۔ قبر جس مسجد میں تھی اسے اب گُوردوارے میں تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن قبر محفُوظ ہے۔ ہمیں فاتحہ پڑھتے دیکھ کر ایک سکھ کسی کمرے سے نکلا اور قبر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا:

"یہ ان مولوی صاحب کا استھان ہے جنھوں نے یہ مسجد بنائی تھی۔"

واہگے کے رستے میں بھی ہمل کی ڈرائیونگ نے "دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا" والا مصرعہ بار بار یاد کرایا۔ کیول کے ایک دوست کی وجہ سے انڈین کسٹم والوں نے ہمیں بہت جلد فارغ کر دیا اور ظاہر ہے دُوسری طرف تو اپنا پاکستان تھا۔ امیگریشن کے انسپکٹر اللہ دتا اور کسٹم کے افسروں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ٹھنڈی ٹھار بوتلیں پلوائیں اور اس طرح ہمیں رُخصت کیا جیسے ہم ہاکی کا فائنل جیت کر آئے ہوں۔

ٹیکسی شالامار باغ کے قریب سے گزر رہی تھی۔ میلے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور میں پچھلی سیٹ پر یادوں کے ہجُوم میں گھرا ہُوا سوچ رہا تھا کہ چند میل پیچھے بھی یہی ہَوا اور ایسے ہی کھیت اور مکان تھے لیکن وہ کیا چیز ہے جو اپنے وطن کو دُنیا میں سب سے انوکھا، پیارا اور بے مثال بنا دیتی ہے؟